ساہتیہ اکادمی سے اعزاز یافتہ انڈو-انگلش ناول
سانپ اور رسّی
راجہ راؤ
साहित्य

ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا جانے والا راجہ راؤ کا یہ ناول آج تک لکھے گئے بہترین انڈو اینگلیں ناولوں میں سے ایک ہے۔ لکھنے والوں اور اخبارات ورسائل نے اس ناول کو بے پناہ سراہا ہے۔ راما سوامی ایک ہندوستانی لڑکا ہے اور میڈلین ایک فرانسیسی لڑکی ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے کچھ ہی دنوں بعد ان دونوں کی فرانس کی ایک یونیورسٹی میں ملاقات ہوتی ہے۔ ان دو نوجوان دلوں کے توسّط سے مصنّف نے مغرب اور مشرق کے قرب ورفاقت، تضاد و توازن کی انتہائی تمازت انگیز تصویر کشی کی ہے۔ ان کا ملنا اور ایک دوسرے کا ہو جانا اور بالآخر جُدا ہو جانا، ناول کا مرکزی موضوع ہے۔ دیگر لکھنے والوں کی عمر بھر کی کوشش کے مقابلے میں اس ایک ہی ناول کی وساطت سے راجہ راؤ نے کہیں بہتر طریقے سے انسانی رشتوں کے زیر و بم عشق کے معنی و مفہوم کا انکشاف کیا ہے۔

راجہ راؤ کا جنم ۱۹۰۹ء میں میسور کے ایک قدیم براہمن گھرانے میں ہوا۔ ۱۹ برس کی عمر میں وہ یورپ کے لیے عازم سفر ہو گئے، وہاں سوربون کی مونٹ پلیر یونیورسٹی میں ادبی تحقیق سے منسلک ہو گئے۔ انھوں نے اپنی اوّلین تخلیقات فرانسیسی اور انگریزی میں لکھیں اور شائع کیں اور انھیں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ ناقدوں نے انھیں پسند کیا۔ کئی برس تک فرانس میں قیام کرنے کے بعد وہ امریکہ کی ٹکساس یونیورسٹی میں درس و تدریس میں مصروف ہو گئے۔

راجہ راؤ کے اس ناول کا اردو ترجمہ اردو کے ممتاز شاعر اور ادیب بلراج کومل نے تیار کیا ہے۔

ISBN 81-7201-810-X

قیمت : ۱۸۰ ایک سو اسّی روپے

سانپ اور رسّی

ساہتیہ اکادمی سے اعزاز یافتہ انڈو۔ انگلش ناول

سانپ اور رسّی

مصنّف

راجہ راؤ

ترجمہ

بلراج کومل

ساہتیہ اکادمی

Saanp aur Rassi: Urdu translation by Balraj Komal of Raja Rao's award-winning in English *The Serpent and the Rope.* Sahitya Akademi, New Delhi (1996) Rs. 180/-

پہلا ایڈیشن : ۱۹۹۶ء

ساہتیہ اکادمی

ھیڈ آفس :

رویندر بھون - ۳۵ فیروز شاہ روڈ ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

سیلس آفس :

سواتی مندر مارگ - نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

علاقائی دفاتر :

جیون تارا بلڈنگ - چوتھی منزل ، ۲۳ اے/۴۴ ایکس - ڈائمنڈ ہاربر روڈ ، کلکتہ ۷۰۰۰۲۵

۱۷۲ ، ممبئی مراٹھی گرنتھ سنگھرالیہ مارگ ، دادر ، بمبئی ۴۰۰۰۱۴

گنا بلڈنگ ، دوسری منزل - ۳۰۴ - ۳۰۵ ، اناسلائی ، تینام پیٹھ - مدراس ۶۰۰۰۱۸

اے ڈی اے رنگ مندر ۱۰۹ جے سی روڈ - بنگلور ۵۶۰۰۰۲

ISBN 81-7201-810-X

قیمت : ایک سو اسّی روپے (۱۸۰)

طباعت : وِمل آفسیٹ ۱/۱۱۸۰۴ پنجشیل گارڈن ، نوین شاہدرہ دہلی ۱۱۰۰۳۲

سانپ اور رسّی

میں برہمن ہوں جنم سے۔ یعنی سچ اور ایسے ہی اوصاف کا پجاری۔ " برہمن وہ ہے جو برہم کا گیان رکھتا ہے" وغیرہ وغیرہ۔ اپنشدوں کے عہد کے داستانی اور عظیم یاگیہ ولکیہ سے لے کر اب تک میرے آبا و اجداد میں سے صرف رشی مادھو ہی سچ یعنی حق کا واقعتاً علم رکھتے تھے۔ انھوں نے ایک سلطنت کی بنیاد رکھی بلکہ ایک سلطنت کو استوار کرنے میں معاون ثابت ہوئے اور شری شنکر کے بعد ویدانت پر اہم ترین کتابیں لکھیں۔ لوگ کہتے ہیں کچھ دوسرے لوگ بھی ہیں جو اپنی گھر گرہستی اور ندی کنارے کے کھیتوں کھلیانوں کو چھوڑ کر دور پربتوں اور آشرموں کی جانب نکل گئے تاکہ "وہ پرماتما کے روبرو کھڑے ہو کر پرماتما کے درشن کر سکیں"۔ ان میں سے کچھ خوش نصیبوں کو پرماتما کے درشن بھی ہوئے۔ انھوں نے مندر تعمیر کروائے۔ لیکن جب وہ مرے — کیونکہ مر تو وہ گئے ہی تھے — تو ان کو بھی کسی تالاب یا پیڑوں کے جھنڈ یا دو ندیوں کے سنگم کے قریب سپردِ آتش کیا گیا ہوگا اور ان کو ضرور یہ پتہ چل گیا ہوگا کہ وہ مرے نہیں ہیں۔ میں اپنے اندر ان کو محسوس کرتا ہوں اور یہ جانتا ہوں کہ وہ مرے نہیں تھے۔ مجھے کون بتاتا ہے وہ مرے نہیں تھے۔ آخر کون؟ میرے سوا دوسرا کوئی نہیں ہے۔

بس میرے اجداد ایک ایک کر کے رخصت ہوتے گئے اور ان کو آگ کے سپرد کر دیا گیا۔ اور ان کے جسموں کی راکھ ندیوں کے پانی میں بہہ گئی۔

میں جب کسی ندی کے پانی میں کھڑا ہوتا ہوں تو مجھے یاد آتا ہے کہ جب میں جوان تھا اور اس دن جب چاند کو ایک عفریت نگل گیا تھا اور دن کو گرہن لگ گیا تھا تو میں نے

تل اور کشا گھاس کا دان دے کر اپنی فرزندانہ فرض شناسی کا ثبوت دیا تھا کیونکہ میں اچھا برہمن تھا۔ میں گرام جاتا تھا اور مجھے برہم سوتروں کا گیان تھا۔ چار برس کی عمر میں ہی میں نے اپنشد پڑھ لیے تھے۔ سات برس کی عمر میں کیونکہ میری ماں کی موت ہو گئی تھی اور میرے باپ نے دوسری شادی کر لی تھی اور چونکہ مجھے ہی ہر برس اپنی ماں کی برسی پر متعلقہ رسمیں ادا کرنا پڑتا تھا اس لیے میں نے یگیوپویت پہن لیا تھا۔ اسی لیے میں خالی پیٹ گیلا انگوچھا لیے، ماتھے پر صندل کا ٹیکہ لگائے اپنی ماں کے چاول کے لڈوؤں کو ڈنڈوت پرنام کرتا تھا اور سسکیاں بھرتا تھا۔ میں جب پیدا ہوا تو اناتھ تھا اور اب تک اناتھ تھا۔ چونکہ میری ماں نہیں تھی اس لیے میں دنیا بھر کے سفر سے گزرتے ہوئے۔ ہوٹلوں کے کمروں میں اور پربتوں کی جانب دیکھتے ہوئے سسکیاں بھرتا رہا ہوں۔ اس وقت میری عمر ۲۱ برس ہو گی۔ میں پائرینیس کے ہوٹل میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں بے اختیار رونے لگا۔ مجھے پتہ تھا اب میں اپنی ماں کو کبھی نہیں دیکھ سکوں گا۔

لوگ کہتے ہیں میری ماں بڑی خوبصورت تھی اور بڑی پوتر تھی۔ میرے دادا کہتا کہتے تھے: "اس کی آواز میرے بیٹے! ایک 'خود ترنم' دنیا کی طرح تھی۔ وہ وینا جسے شام کے پوجا گیت کے بعد مندر کے ستون کے سہارے رکھ دیا جاتا ہے۔ اس کی آواز رامیشورم مندر کے موسیقی بھرے ستونوں سے بھی ملتی تھی۔ وہ گہرائیوں سے ابھرتی تھی کسی انجانے خلا سے اور ایسا لگتا تھا اس پوجا سے دیو مکھ شفاف اور منوّر ہو گیا ہے۔ اس کو دیکھ کر مجھے چندرما نام کی خواہش کی یاد آجاتی تھی۔ اس کی آواز بھی ایسی ہی تھی۔ بات ختم کرتے ہوئے دادا کہا کرتے تھے: "یہ ہمارے دَور سے بہت پہلے کی بات ہے۔ اس وقت میں میسور میں تھا اور پچھلے پچاس برس سے میں میسور نہیں گیا!"

دادا کہتا عالی مرتبہ تھے اور سورما تھے ہم سب کے بیچ! ناممکن کے ساتھ میرا فطری جلد ضرور انہی کی دین ہے۔ میرے ذہن میں یہ خیال آسکتا ہے کہ ایک عمارت اُڑنے لگے گی یا پھر سٹالن سنت بن جائے گا۔ یا سب کے سب جاپانی بدھ کے راہب بن گئے ہیں یا پھر مہاتما گاندھی اس وقت میرے ساتھ چل رہے ہیں۔ بعض اوقات مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں ریل

کی پٹڑی کو سیدھا کھڑا کر سکتا ہوں۔ ہتھنی اپنے بچّے کو ۲۴ دن میں پیدا کر سکتی ہے میں ایک جہاز کو پربت کے اوپر سے تیرتے ہوئے دیکھ سکتا ہوں۔ چوٹی پر احتیاط سے حفاظت سے بیٹھ سکتا ہوں اور فتح پور سیکری جا کر شہنشاہ اکبر سے براہ راست گفتگو کر سکتا ہوں۔ یہ نہ سوچنا میرے لیے مشکل ہے کہ ورسیلز میں رہتے ہوئے بھی میں رویا سلئی کی کھردری بھدّی آواز سن سکتا ہوں یا پھر ہندوستانیوں کی طرح کس طرح موٗ میں بوسوئے ہتھیلی پر نسوار سلتا ہے اور ایک چٹکی مجھے بھی پیش کرتا ہے۔ نسوار کی چٹکی سے مجھے چھینک بھی آ سکتی ہے اور مجھے بوسوئے کی ایک اور تعزیتی تقریر بھی سنائی دے سکتی ہے۔ بوسوئے اور رویا سلئی کا اعتقاد تھا کہ وہ کبھی نہیں مریں گے۔ میں پوچھتا ہوں اگر ان کی موت واقع ہو چکی ہے تو پھر آخر وہ کہاں گئے؟

دادا کتنا ایک اور انداز سے بھی سورما تھے۔ وہ بڑے سے بڑے منہ زور گھوڑے کو اس کی مرضی نہ ہوتے ہوئے بھی جہاں چاہیں لے جا سکتے تھے۔ میں یہ کہانی سنتے سنتے بڑا ہوا کہ ایک شام کو کس طرح دادا اپنے گوڑے کو جس کا نام سندر تھا زبردستی چندر پور کے جنگل میں لے گئے۔ گھوڑا بڑے غصّے میں تھا۔ اور پھر وہ شیر جو انھیں جنگل میں ملا۔ اور وہ چھلانگ جو سندر نے شیر بادشاہ کے اوپر سے لگائی اور ایسی اونچی چھلانگ لگانے سے پیڑ پر لگے شریفے اس کی بیٹھ پر آگرے اور پیشتر اس کے دادا کو پتہ چلتا کہ وہ کہاں ہیں گھوڑا اپنے پٹکے اور مراٹھی زین سمیت صحن کے وسط میں کھڑا تھا۔ شام ڈھل رہی تھی۔ گھر میں چراغ روشن کیے جا رہے تھے جونہی سائس چودھیا نے گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سنی وہ بھاگا ہوا آیا اور گھوڑے کو پانی چھینٹا دینے کے لیے تالاب پر لے گیا۔ دادا کو شام کے وقت گرم پانی سے غسل کرنا اچھا لگتا تھا وہ نہانے کے لیے چلے گئے۔ پچی تیما بھر بھر کر گرم پانی کی بالٹیاں دیئے جاتی تھی اور انھوں نے جسم کو خوب رگڑ رگڑ کر ایسا صاف ستھرا کر دیا کہ وہ کیلے کے نوخیز پیڑ کی طرح چمکنے لگا۔ نہانے کے بعد وہ پوجا ارچنا کے لیے بیٹھ گئے جب اُٹھے تو انھوں نے کہا کہ سندر کا جسم خراشوں سے بھر گیا ہے تو انھوں نے شیر اور گھوڑے کی چھلانگ کی پوری بات کہہ سنائی۔ ان کا خیال تھا کہ گھوڑا اگر آسمان میں پرواز کرتا ہوا ورندابن میں بھی اتر جاتا تو انھیں ذرا بھی حیرانی نہ ہوتی۔ کتنا دادا ایسے ہی تھے۔ اگلے تین برس تک انھوں نے سندر

پر سواری کی۔ اس کے بعد سُندر کی موت ہو گئی ایک قسم کی پیچش سے۔ آخر گھوڑے بھی مر ہی جاتے ہیں۔ ہم نے سندر کو پوری رسم کے ساتھ کبوتر پہاڑی پر دفن کر دیا۔ ہم آج بھی ہر برس اس کے مزار پر جاتے ہیں اور مسلمانوں کی طرح مزار پر گلابی ململ کی چادر چڑھاتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ گھوڑوں کا اصل وطن عرب ہے، اس لیے ان کا کفن دفن بھی اسلامی طریقے سے ہونا چاہیے۔ اب سندر کہاں ہے؟ جی ہاں کہاں؟

دادا کے لیے ناممکن بھی ممکن تھا۔ برہمن ہوتے ہوئے بھی انھیں نہ تو بندوق سے خوف آتا تھا اور نہ ہی تلوار سے لیکن ان کی پرارتھنا ارچنا میں کیا گہرائی اور وشواس تھا۔ جب وہ پوجا سے فارغ ہو کر نکلتے تھے۔ چچی ستیما کہا کرتی تھی ان کے چہرے پر دھرم راج جیسا جلال ہوتا تھا۔

دوسری طرف مجھے بندوق تلوار سے اس قدر خوف آتا ہے کہ ذرا سے تشدّد سے بھی خوف زدہ ہو کر میں میلوں بھاگ کھڑا ہوتا ہوں۔ لیکن جتنی دُور جتنی تیزی سے میں فرار اختیار کرتا ہوں اس سے کہیں زیادہ تیزی سے لوٹ آتا ہوں۔ مجھے خوف سے خوف تو نہیں آتا ہے۔ صرف میرے اندر خوف ہے۔

مجھے ندیاں اور جھیلیں بے حد پسند ہیں اور بہ آسانی کسی ندی کے کنارے بسیرا کر سکتا ہوں۔ مجھے ان کی مخصوص گونج کے کارن کچھ جگہیں اچھی لگتی ہیں۔ وہاں جا کر احساس ہوتا ہے کہ ان جگہوں نے اداسی کے سوا کچھ نہیں دیکھا ہے۔ جگہوں کو دیکھ کر مجھے ایسی معمر قابل تعظیم خواتین کی یاد آتی ہے جن کو کبھی موت نہیں آتی جو لافانی ہوتی ہیں۔ وہ دوسروں کا اس قدر خیال رکھتی ہیں کہ خاندان کے بدقسمت یتیموں کو بڑھی بوڑھی چچیاں ملتی رہتی ہیں۔ یتیم بدلتے رہتے ہیں اور وہ ہمیشہ جوان رہتی ہیں۔ ان میں سے ایسی ہی چچی لکشما تھی۔ انھوں نے ایک برہمن سے شادی کی تھی اور وہ سات یا آٹھ برس کی ہوں گی جب ان کے شوہر کی وفات ہو گئی۔ اور پھر میرے ماموؤں، چچوں ان کی بیٹیوں، میری ماں کے ماموں زاد، چچا زاد بھائیوں اور ان کے پوتوں پوتیوں، نواسوں نواسیوں کی دیکھ بھال کے لیے لکشما ہمیشہ موجود تھیں کیونکہ کسی کھرے اچھے خاندان میں کوئی بھی کبھی یتیم نہیں ہوتا۔ لکشما نے اپنے اٹھارھویں صدی کے لوہے اور شیشم کے ٹرنک میں۔ جو ہمیشہ گھر کے بڑے مرکزی کمرے میں رکھا رہتا تھا —— بچوں

کے تمام کپڑے جمع کر رکھے تھے ان کپڑوں کو تبھی باہر نکالا جاتا جب گھر میں کسی کی موت واقع ہو جاتی۔ لوگ کہتے تھے ان میں سے کچھ کپڑے پچاس برس پرانے تھے۔ پچھلے دنوں — یہ سات آٹھ برس پہلے کی بات ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ لکشمّا جو دادا سے عمر میں بہت بڑی تھیں واقعی وفات پا گئی تھیں۔ مجھے یقین نہیں آیا۔ میرا خیال تھا وہ تین سو برس تک زندہ رہیں گی۔ لکشمّا نے نہ کبھی سرد آہ بھری نہ کبھی کوئی شکوہ کیا۔ نہ ہی انھوں نے کبھی آنسو بہائے۔ جب ان کی وفات ہوئی تو ہم بھی نہیں روئے۔ میں تو جانتا ہی نہیں ہوں کہ موت کیا ہے۔

میرے پتاجی بلاشبہ مجھ سے پیار کرتے تھے۔ مجھے انھوں نے لکشمّا سے دُور رکھا۔ وہ کہتے تھے: "لکشمّا سے بُو آتی ہے۔ میں چاہتا ہوں میرے بیٹے تم ایک سورما بنو، ایک راجکمار بنو" میری ماں نے اپنی وفات سے کچھ دیر پہلے — ایسا لگتا تھا — ایک عجیب و غریب سپنا دیکھا تھا۔ میرے پچھلے تین جنموں کی زندگی کا منظر ان کے تصور میں اُبھرا اور ہر جنم میں ان کا بلوٹھی کا بیٹا تھا۔ بانکا ترچھا، اونچے قد والا بارعب آواز والا، عزت کرنے والا اور وجیہہ ایک جنم میں شہزادہ تھا میں! اسی وجہ سے مجھے ہمیشہ ہیرے جواہرات سے سجایا جاتا۔ پیشانی پر، گلے میں اور کانوں میں ہیرے جواہرات پہنائے جاتے۔ سُنا ہے انھوں نے یہ پتہ کرنے کے لیے کسی کو سُنار کے پاس بھیجا کہ کیا میرے بالوں کو سجانے کے لیے زیور تیار ہو گیا کہ نہیں۔ قاصد ابھی لوٹا بھی نہیں تھا کہ ماں نے پران تیاگ دیئے۔ جب ان کا انتقال ہو گیا تو ان کی میت کو سفید پھولوں — کامبٹور کے چنبیلی کے پھولوں اور چمنڈی کے چمپک کے پھولوں — سے ڈھانپ دیا گیا اور ان کے جسم پر بہت سارا تُم تُم، مل کر لوگ انھیں شمشان لے گئے۔ میرا سر پوری طرح مونڈ دیا گیا اور مجھے کھانے کے لیے بنگالی چنا دیا گیا اور کچھ مٹھائی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ یہ سب کیا ہوا۔ اب بھی یہ سب میری سمجھ سے باہر ہے۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ میری ماں گوری ابھی مری نہیں ہیں اور میں پھر بھی یتیم ہوں۔ کیا میں ہمیشہ یتیم رہوں گا؟

جب میری سوتیلی ماں — سروجا شنکماری اور سب سے بڑی لڑکی کیلا کو چھوڑ کر بھگوان کو پیاری ہو گئیں تو میرے پتاجی نے تیسری شادی کر لی۔ لیکن یہ ایک الگ داستان ہے۔ میری نئی سوتیلی ماں مجھے جی جان سے پیار کرتی تھیں اور میں ان کی روشن مسکراہٹ اور

تانبے کے برتنوں کی طرح جگمگاتے ہوئے گیت کے بغیر اپنے گھر کا سرے سے تصوّر ہی نہیں کر سکتا تھا۔ جب وہ مسکراتی تھیں تو ان کی مسکراہٹ پھیل کر کانوں کو چھونے لگتی۔ میری ہر ضرورت کو وہ پورا کرتیں اگرچہ میں اپنی ماں کو یاد کر کے رویا کرتا تھا۔ پھر میرے پتا جی پرلوک سدھار گئے۔ وہ دوسرے چندر ماس کی تیسری کو مرے جب تھوڑی تھوڑی برسات شروع ہو گئی تھی۔ اپنے پتا کی موت کے بارے میں بتانے کے لیے میرے پاس کچھ ہے ہی نہیں سوائے اس بات کے کہ میں ان سے پیار نہیں کرتا تھا اور یہ بھی کہ ان کے مرنے کے بعد جب ان کا جسم صاف شفاف راکھ جیسا ہو گیا تھا۔ اب بھی وہ میرے خوابوں میں آتے ہیں اور مجھ سے کہتے ہیں " بیٹے، تم تو میرے سب سے بڑے بیٹے تھے، تم نے مجھ سے پیار کیوں نہیں کیا؟" میں پچھتاوا نہیں کر سکتا کیونکہ مجھے علم ہی نہیں کہ پچھتاوا کیا ہوتا ہے۔ سب سے پہلے تو سب مجھے موت کے وجود کو تسلیم کرنا چاہیے۔ یہی مرکزی حقیقت ہے۔ میں چونکہ موت کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا اس لیے پچھتاؤں کس کے لیے۔

بے شک اب میں اپنے پتا جی سے پیار کرتا ہوں۔ کون اس شخص سے پیار نہیں کرے گا جو تحفظ اور رحمدلی کا پیکر تھا حالانکہ یہ بات اُن کی سمجھ میں کبھی نہیں آئی کہ میری ماں چاہتی تھی کہ میں راجکمار بنوں۔ میں چونکہ شہزادہ نہیں بن سکتا تھا اس لیے برہمن پیدا ہوا اور اسی لیے راجہ نہیں بن سکتا تھا۔ میری ساری عمر آوارگی کی نذر ہو گئی اور میں ایک پاکباز آوارہ گردبن گیا۔ اگر میرے پتا جی جنگل میں باگھ کے اوپر سے کود سکتے تھے تو میں بھی کچھ کم نہیں تھا۔ میں بھی انسانوں کے جنگل کے کئی باگھوں کے اوپر سے کود گیا۔ ہوائی جہاز اور کار کے کئی حادثوں سے ثابت و سالم بچ کر نکل گیا۔ میرے اور ان لوگوں کے بیچ کتنی غلط فہمیاں اور نفرتوں کی کھائیاں پیدا ہو گئیں جو پہلے مجھ سے پیار کرتے تھے اور پھر مجھ سے نفرت کرنے لگے۔ اپنے آپ پر چھوڑ دیے جانے پر میں اکیلا ہو گیا اور محبتوں سے بھر گیا۔ جب انسان اکیلا ہوتا ہے تو ہمیشہ پیار کرتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جب کوئی پیار کرتا ہے اور اکیلا ہو جاتا ہے تو وہ کبھی نہیں مرتا۔

ایک بار میں بنارس گیا تھا۔ مارچ کا مہینہ تھا اور ہوا میں ابھی کچھ خنکی باقی تھی۔ میرے پتا جی کی حال ہی میں وفات ہوئی تھی۔ میرے ساتھ میری دوسری سوتیلی ماں وشالاکشی تھی اور چھوٹا

سوتیلا بھائی سری دھر جس کی عمر اس وقت صرف گیارہ مہینے تھی۔ میں تب بائیس برس کا تھا اور یورپ ہو آیا تھا۔ پتاجی جب بیمار پڑے تو وہاں سے لوٹ آیا تھا۔ میری چھوٹی ماں کو مجھ پر بڑا فخر تھا۔ وہ کہتی تھیں: "اس میں نوخیز پیپل جیسی آن بان ہے۔ قد کا لمبا اور مقدس ہے۔ اس کے اردگرد سرپ منیوں کا ہالہ ہے۔ ہمیں پوتّر ہونے کے لیے اس کی پردکشنا کرنی چاہیے۔" لیکن بنارس کے پاکباز برہمنوں کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ انھوں نے ایک نہیں سنی وہ میرے دادا اور اس کے دادا پڑدادا کو سات پیڑھیوں سے جانتے تھے۔ راما کرشنیا اور رنگنّا، مادھوسوامی اور سوم سندریا، منجاّ اور گنگادھریا۔ اور ہر ایک کے بیٹوں، پوتوں کو جانتے تھے۔ (بیٹیوں کو بے شک نہیں جانتے تھے)۔ اس لیے وہ اپنے حقوق پر قائم رہے۔ انھوں نے میری چھوٹی ماں سے کہا "ہمارا بیٹا یورپ ہو آیا ہے اور اس کے پگیو پویت بھی نہیں ہے بتاؤ ماں! اس کے آباؤ اجداد کی روحیں کس طرح خوش ہوں گی؟" اس طرح میری ماں نے ہار مان لی اور چاندی کے پچاس روپوں نے سب کچھ پوتر کر دیا۔ کچھ میت بردار برہمنوں نے جو ڈینگ مارتے تھے کہ "ہم چار کندھوں والے مرد ہیں" اپنے دھیمے اور بلند آواز منتروں سے میرے چھوٹے بھائی کو "کریا پتر" بنا دیا۔ جو بھی ہوا جلدی ہو گیا اور اچھا ہوا۔ کیونکہ بنارس میں بہت سی میتیں ہوں گی اور بیگ ٹیگ کے مرے ہوئے لوگ۔ آباؤ اجداد کی پیڑھیوں پر پیڑھیاں آسمان میں جمع ہو گئی ہوں گی۔ چاند گرہن کی رات کو آپ انھیں نہ در نہ دیکھ سکتے تھے۔ گورے، پیلے، لمبے، سوکھے مارے پتا، دادا، پڑدادا، ماں، بہنیں، بھائی، بھتیجے، دوست، راجہ، یوگی، ماموں وغیرہ سب بنارس کی فضا میں جمع ہو گئے ہیں اور آپ انھیں دیکھ سکتے ہیں۔ خلا میں گھورتی ہوئی ان کی بیاآنکھیں بجھی بجھی سی ہیں۔ وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے منت سماجت کر رہے ہیں اور تمہارے سفید چاول کے لڈّو اور تِل انہیں مطلوبہ سکون عطا کر رہے ہیں۔ پاکباز برہمن بھی خوش ہو گیا ہے۔ اس کو اس کے پچاس روپے مل چکے ہیں۔ صرف میرا چھوٹا بھائی جو صرف گیارہ مہینے کا ہے کچھ نہیں سمجھتا۔ جب اس کی ماں رو رہی ہے۔ کیونکہ موت کو قبول کرنے میں بڑا وقت لگتا ہے ۔۔۔ میرا بھائی اس کے ساڑھی کے پلّو کو کھینچے چلے جا رہا ہے۔ میں سپاٹ، بڑے دریا کو دیکھ رہا ہوں جو بگوں بگوں سے میری ماں کی طرح جوان اور پوتّر ہے۔

مندروں کی گھنٹیاں بج رہی ہیں اور کوّے چاول کے لڈوؤں پر ٹوٹ پڑے ہیں۔" آباؤ اجداد کی روحیں لوٹ آئی ہیں، دیکھیے" برہمن کہتے ہیں۔ میرا بھائی گھٹنوں کے بل چلتا ہوا ان کے کے قریب پہنچ جاتا ہے اور کہتا ہے۔ "کائیں کائیں"، لیکن جونہی وہ مندروں کو دیکھتا ہے وہ لپک کر چھوٹی ماں کی گود میں سمٹ جاتا ہے وہ کیسا کومل اور سندر ہے۔ چھوٹی ماں اسے گود میں لے لیتی ہیں، اپنی چولی کھولتی ہیں اور اسے دودھ پلانے لگتی ہیں۔

برہمن اب بھی کچھ بڑبڑا رہے ہیں۔ ان میں سے دو یا تین پہلے ہی ندی کے پانی سے اپنے پاؤں دھو چکے ہیں اور اپنی ناف اور اپنی سونے کی سندر کی انگوٹھیوں کو دیکھتے ہوئے ادھر آ رہے ہیں۔ وہ یہ جاننے کے لیے بے تاب ہوں گے کہ ہم دکشنا کے روپ میں کتنے روپے بھینٹ کریں گے۔ ہم دور سے آئے ہیں اور وہ سب جانتے ہیں کہ بڑے دادا سے شروع ہو کر آج تک سب نے کیا کیا دیا ہے مغلئی اشرفیاں، ایسٹ انڈیا کمپنی کے روپئے۔ ادھر حال کے برسوں میں بھاری بھرکم لیکن چھوٹے چہرے والی برطانوی ملکہ کے چاندی کے گول بڑے روپے۔ میں تو وہ روپئے برہمنوں کو دینے کے بجائے گداگر بندروں کے آگے پھینک دیتا۔ لیکن کیا کرتا چھوٹی ماں جو ماں تھیں! میں نے اپنے بھائی کو گود میں اٹھا لیا اور ایک ایک کر کے چاندی کے سکّے اس کو دے دیئے۔ اور سنجیدگی سے جیسے اسے معلوم ہو وہ کیا کر رہا ہے۔ اس نے سارے سکّے بیٹھے ہوئے برہمنوں کو دے دیئے۔ اب وہ بھی جان گیا تھا کہ پتاجی کی موت ہو چکی ہے۔ تبھی اچانک اس نے ایک چیخ ماری جیسے اس نے ہمارے پاس پتاجی کو دیکھ لیا ہو۔ جیسے وہ تھے۔ اس روپ میں نہیں بلکہ جیسے وہ بن چکے تھے۔ نیلے غیر جسمی ماورائی۔ چھوٹی ماں کا ہمیشہ سے پکا یقین ہے کہ ہم لوگوں کے مقابلے میں بچے مردہ روحوں کو زیادہ واضح انداز میں دیکھ سکتے ہیں۔ چھوٹی ماں ٹھیک ہی ہوں گی۔ بہر حال اس سے ان کے آنسو تھم گئے۔ اب چونکہ بادل گھر آئے تھے ہم ہریش چندر گھاٹ کی سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئے۔ کشتی لی اور ندی کے بہاؤ کی سمت میں رواں ہو گئے۔

میں نے چھوٹی ماں کو بتایا کہ کیسے تلسی داس نے ریوا محل کے پڑوس میں رامائن کی رچنا کی تھی اور کس طرح سنت رامانند مسلمان جولاہے کے سر کے ساتھ ٹھوکر لگنے سے لڑکھڑا کر گر پڑے تھے۔ ان کے منہ سے بے اختیار 'رام رام' کے شبد نکلے۔ کبیر اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور بولے "میرے پربھو،

آپ میرے گرو بن جایئے، میں آپ کا چیلا۔ اس طرح جولاہا اتنا بڑا بھگت اور شاعر بن گیا۔ یہاں سے کچھ دور خود مہاتما بدھ چل کر نیچے اترے تھے اور اپنا کشکول دھویا تھا اور پھر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گئے تھے اور دھرم چکر کا زبان کیا تھا۔ بدھ نے کہا تھا کہ خواہش اور خواہش کا نہ ہونا، خوشی اور غم راگ بیراگ کی ترغیب دیتے ہیں۔ انسان کو چاہیے اس کی تلاش کرے جسے پانے کے بعد لوٹنا نہیں ہوتا۔ چھوٹی ماں یہ سب سنتی تھیں اور ایسا لگتا تھا وہ قائل ہو گئی ہیں۔ وہ میرے بھائی کی پھول کی پتیوں جیسی نرم و نازک انگلیوں سے کھیلتی رہیں۔ جونہی انھوں نے آکاش میں ایک طوطا دیکھا تو کہنے لگیں۔ "دیکھو، دیکھو ننھے! وہ رام کا طوطا ہے!" اور وہ گانے لگیں

'او طوطے! میرے رام کے طوطے!'

اور میرا ننھا منا بھائی گہری نیند سو گیا۔

میرے پتاجی واقعی مر چکے تھے لیکن چھوٹی ماں مسکرائیں۔ بنارس میں آدمی جان جاتا ہے کہ موت صرف ایک دھوکا ہے مایا ہے۔ صبح سویرے کی دھند کی طرح! گنگا سدا وہاں ہے اور جب سورج چمکتا ہے تو گرمی کس قدر تیز ہو سکتی ہے!

میں نے یورپ کے اپنے دوستوں کو خط لکھے۔ میں نے انہیں لکھا میں بنارس آیا تھا کیونکہ میرے پتاجی کی موت ہو گئی تھی۔ میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ یہ مقدس راجدھانی واقعتاً سرریلسٹ شہر ہے۔ یہاں یہ پتہ نہیں چلتا کہ کہاں حقیقت کا آغاز ہوتا ہے اور کہاں مایا کا انت۔ کیا بنارس کے برہمن چاول کے لڈو مانگنے والے کوؤں کی طرح ہیں یا دھونی کے آگے سمادھی میں بیٹھے ہوئے سادھوؤں جیسے جو پُرجبال کشادہ دلی میں اس طرح کھوئے ہوئے ہیں جیسے پیار وہ شئے ہو جو دوسروں کو نہ دی جا سکتی ہو۔ صرف اپنے آپ کی نذر کی جا سکتی ہو۔ ان کے آگے گرا ہوا ترشول کھلے دھرم گرنتھ۔ پیڑ کی کسی ننگی ٹہنی یا کسی ٹوٹی پھوٹی دیوار پر۔ کہیں بھی سوکھتے ہوئے گیروے کپڑے۔ کبھی کبھی اوپر لگی چھتریاں اور سامنے جلتی مدھم آگ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے آگ سادھو سنتوں کی دیکھ بھال کرتی ہے نہ کہ مقدس شہر بنارس کے بے رحم ظالم لوگ! آسن جمائے بیٹھا ہر ایک سادھو ایک بت ہے۔ پھر جب آپ اوپر دیکھتے ہیں تو آپ کو کسی دیشیا کی خوبصورت

مسکراہٹ دکھائی پڑتی ہے۔ اس کی گول چھاتیوں اور چنچل سڈول بازوؤں سے تیر کراُترتی ہوئی۔ کسی پرار تھنا کے لیے یا کسی گاہک کے لیے۔ کہتے ہیں کہ بنارس کی دیشیائیں دنیا بھر کی ویشیاؤں سے زیادہ خوبصورت ہیں۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ شو کی پتنی پاروتی کی پوجا کرتی ہیں تاکہ جوبن رس ان کے انگ انگ میں بھرا رہے۔ اسی لیے دامودر گپت نے اپنا فحش نامہ، ان الفاظ کے ساتھ بنارس سے شروع کیا۔ "اے پوتر گنگا۔ اے گنگا میا تم ساکشات پوتر تا ہو۔ جو شو کی جٹاؤں سے نکل کر بہتی ہوئی آتی ہے۔" جب آپ گنگا کے گھاٹوں پر اتنے سارے انگ کسمساتے اور پھوٹ پڑتے دیکھتے ہیں تو جسم کا مطلب ہی کیا رہ جاتا ہے۔ موت ہوس کو خوبصورت بنا دیتی ہے۔ موت ویشیا کو ناگزیر بنا دیتی ہے۔ مجھے دادا کی یہ بات پھر یاد آ گئی "تمہاری ماں کی آواز کیسی خوبصورت آواز تھی۔ اس کی آواز دیشیا چندر تا جیسی تھی۔ یہ میسور کی بات ہے۔ پچاس سال پہلے کی۔"

میں میڈلین کو نہیں بھول سکا۔ بھولتا بھی کیسے؟ میڈلین ڈور تھی اور ایکس آں پروونس میں۔ پی آر کی موت کے بعد میڈلین کبھی پوری طرح صحتیاب نہیں ہو سکی۔ سات مہینے کا ہونے تک وہ اسے کرشن ہی کہتی تھی۔ پھر جب اسے کھانسی کے دورے پڑنے لگے جنھیں میڈلین جانتی تھی کیونکہ مائیں ہمیشہ جان جاتی ہیں کہ ان کے بچوں کے لیے کیا خطرناک ہے۔ اس سنیچر وار کو سویرے کالج سے لوٹتے ہی میڈلین جان گئی کہ یہ بھیانک بیماری بچے کو اس سے چار، تین، دو یا ایک ہفتے میں چھین لے گی۔ ہم نے اس کے جنم سے ہی ہر بات کا پورا خیال رکھا تھا۔ ہم نے ایسا انتظام کیا تھا کہ اس کی پیدائش باندل کے قریب واقع ایک چھوٹے سے خوبصورت میٹرنٹی ہوم میں ہو۔ وہ اکثر اپنی ان امیدوں اور اپنے ان خوابوں کا ذکر کرتی تھی جو اس نے اس کے ساتھ وابستہ کر رکھے تھے۔ وہ لمبے قد کا ہوگا اور جب ۲۴ برس کا ہو جائے گا تو کسی انجینئرنگ انسٹی ٹیوٹ میں تعلیم حاصل کرے گا اور پھر بڑا ہو کر ہندوستان کے لیے پل تعمیر کرے گا۔ سبھی مزاجاً افسردہ خاطر لوگوں کی طرح میڈلین کو بھی پلوں سے بڑا پیار تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سچائی ہمیشہ اس پار ہوتی ہے اس لیے میں بعض اوقات اس کو کہتا تھا کہ اگلے جنم میں اسے ہڈسن میں پیدا ہونا چاہیے۔ میں اس کے لیے پروونس یا سارے دنیا کے بارے میں کتابیں لاکر دیا کرتا تھا جہاں رومن لوگوں کے بنائے ہوئے عشق پیچاں

کی بیلوں سے ڈھکے پُل تھے۔ایک دن اس نے کہا "چلیے ہم 'سیاں، جاں، پیے، دیے، پر' کا پُل دیکھنے چلیں"۔ اس پُل کے بارے میں اس کو پتہ چلے اسی باسک سے متعلق ایک کتابچے چلاتھا۔ہم گاڑی میں آردیش محراب میں سے نکلے اور کا اور میں سے گزرتے ہوئے میں نے اسے پن۔دیے۔والیاں دکھایا۔لیکن اس نے کوئی خاص دلچسپی نہیں لی۔کہنے لگی " یہ تو سالز برگ جیسا منظر ہے "۔جب ہم 'سیاں۔جاں۔پیے۔دیے۔پر' کے پُل پر پہنچے تو وہ بولی" اسے دیکھ کر مجھ پر کیکپی طاری ہو جاتی ہے"۔ اسپین کی خانہ جنگی کے وقت وہ ابھی عمر میں چھوٹی تھی۔اس لیے ہم لوگ اسپین کبھی نہیں جاسکے۔پھر یہ ہوا کہ ہم کسی خوبصورت پہاڑی قصبے میں گئے۔شاید وہ پَو تھا کیونکہ میں ابھی بھی اس بڑی گڑھی کا تصور کرسکتا ہوں جسے ہنری چہارم نے بنوایا تھا۔ ہوسکتا ہے اسی رات میڈلین کو راحت دینے کی کوشش میں کرسٹن اس کی کوکھ میں آگیا ہو۔اس نے کہا تھا کہ میرا بچہ پیدا کرنے میں اس کو خوشی ہوگی اور ہماری شادی ہوئے سات مہینے ہوچکے تھے۔

اس وقت میڈلین کی عمر ۲۶ برس تھی اور میری ۲۱ برس۔ہم پہلی بار'کاں' یونیورسٹی میں ملے تھے۔میڈلین کے ایک انکل تھے۔اس کے والدین مرچکے تھے اور اس کے لیے کافی زمین جائداد چھوڑ گئے تھے۔اس لیے اس جائداد کی دیکھ بھال میڈلین کے انکل کررہے تھے۔وہ نارمنڈی کے رہنے والے تھے اور آپ جانتے ہیں کہ اس کا کیا مطلب ہوتا ہے۔

سنہرے بالوں والی میڈلین بڑی پیاری لگتی تھی۔اپنی ماں کی طرف سے وہ سے وائے کی تھی۔اس کے انگ انگ میں ایک پاک غیر ارضی کیفیت تھی۔میڈلین سراسر غیر حقیقی تھی۔میرا خیال ہے اسی وجہ سے اس نے اب تک کسی کسی سے شادی نہیں کی تھی۔اس نے کسی کو چھُوا تک نہیں تھا۔اس نے بتایا ۱۹۴۳ء کے اواخر میں جرمن قبضے کے دوران ایک جرمن افسر نے اس کے بالوں کو چھونے کی کوشش کی تھی۔اس کے بال جادوئی اور مکمل طور پر نارڈک بال لگتے تھے۔اس نے بتایا کہ وہ اپنے ہاتھ اس کے چہرے کے قریب لے آیا تھا۔اس کو صرف مسکرانا تھا اور وہ کچھ نہیں کرسکا۔اس نے سر جھکا کر سلام کیا اور چلا گیا۔

اس نے کہا تھا کہ اس نے میرے اندر چھپے ہوئے برہمن کو پہچان لیا تھا جس کے نزدیک لمس، ہر لمس کی بڑی اہمیت تھی اور اسی لیے مجھے اپنے آپ کو چھونے کی اجازت دے دی

تھی۔ اس کے بال سنہری تھے اور اس کی جلد کان سے نکلے اسے سنگ مرمر کی طرح تھی جس سے ہم اپنے موسم سرما کے محل بناتے ہیں۔ ٹھنڈے، چاروں طرف جھیل سے گھرے اور جہاں نیچے باغ میں مور اٹھلاتے ہیں۔ سنگیت کا سمے ہوگیا اور سارا محل جگمگا اُٹھا۔ ہم ہمیشہ خود شناسی کی تلاش میں رہتے ہیں۔ مہارشی شنکر نے کہا تھا کہ سنسار درپن میں دیکھے گئے نگر کی طرح ہے۔ میڈلین چاندنی میں دیکھے گئے امبر محل جیسی تھی۔ کیسی روشن پُر اسرار کیفیت ہے۔ ہم جس قدر گہرائی میں اُترتے ہیں اتنا ہی زیادہ اپنے آپ کو پہچان لیتے ہیں۔ اس طرح کرشن کا جنم ہوا۔

وہ پُل کبھی پار نہیں ہوا۔ میڈلین کو پُل پار کرنے سے بے پناہ خوف آتا تھا۔ اگر وہ ہندوستان میں پیدا ہوئی ہوتی تو اس کو پتہ چلتا کہ مالابار میں جب لوگ کسی پُل کو پار کرتے ہیں تو بھوت پریت کو ڈرانے کے لیے گولی چلاتے ہیں۔ گولی چلی یا نہیں لیکن کرشن کبھی جیون کا پُل پار نہیں کر سکا۔ اسی لیے کسی پرانے اندھ وشواس کے کارن میڈلین نے اس کے بیمار ہو جانے کے دوسرے دن ہی سے اس کا نام بدل کر اسے پی آر کہہ کر بلانے لگی۔ وہ فرانسیسی عورت ہندوستانی عورت کی طرح شرمیلی تھی اور عام طور پر مجھے میرا نام لے کر ہی پکارتی تھی وہ کہتی تھی "میرے پیارے، میرے پریتم۔ ہندوستانی دیوی دیوتا ناراض ہوں گے کہ تم نے برہمن ہوتے ہوئے مجھ غیر برہمن سے شادی کر لی۔ وہ مجھے اپنے بچّے کا نام کرشن نہیں رکھنے دیں گے۔ یہ نام تو بڑا مقدس ہے۔" اس ننھّے منّے کو پتہ نہیں تھا کہ پی آر کے نام سے پکارے جانے پر اسے کیا کرنا ہے۔ اس کے توہمات کا احترام کرتے ہوئے میں بھی بچّے کو پی آر کے نام سے پکارنے لگا۔ کیونکہ ہم جو کرتے ہیں، وہ واقعتاً توہمات کے زیر اثر ہی ہوتا ہے۔ کیا میں سچ مچ راما سوامی کہلاتا تھا یا میڈلین۔ میڈلین کہلاتی تھی۔

بیماری چلتی رہی۔ ڈاکٹر پی آر مارموسون بڑے بھلے آدمی تھے۔ بچّوں کے علاج کے ماہر تھے۔ امریکہ سے خصوصی تربیت حاصل کر کے آئے تھے۔ انھوں نے بچّے کی ہر طرح سے دیکھ بھال کی۔ لیکن برونکو نمونیہ تو برونکو نمونیہ ہی ہے۔ خاص طور پر چھوٹی چیچک کے شدید حملے کے بعد میڈلین کو ڈاکٹر سے زیادہ میری قوت شفا پر بھروسہ تھا۔ اس لیے دراصل بچّہ جب میری گود میں پُر سکون ہوگیا۔ اور جھٹکے سے ٹانگیں سیدھی کر کے چپ چاپ لیٹ گیا تو میڈلین کو یقین نہیں آیا کہ پی آر مرگیا ہے

بچّہ رویا تک نہیں تھا۔
پرلیفے۔ دے۔ لَیش۔ دِیُو۔ رون نے ولاسیانت آن کے عقب میں زیتون کے پیڑوں کے درمیان اس کا انتم سنسکار کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ یہ بہت بڑا بنگلہ تھا۔ اور اس دن شمال مغربی ٹھنڈی ہوا۔ مسترال۔ چل رہی تھی۔ ہم نے اس دن مون سیانت وکٹویر کو اس طرح دیکھا جس طرح سزانے نے اسے ہر روز دیکھا ہوگا۔ اتنا صاف کہ آپ اس سے بات کر سکتے تھے۔ مسترال چل رہی تھی اور اس قدر تیز چل رہی تھی کہ کوئی بھی پینٹ، واسکٹ اور اسکارف کی طرح اپنے اڑتے ہوئے جسم کو دیکھ سکتا تھا اور مون سیانت وکٹویر کی چوٹی پر بیٹھی چمکتی ہوئی روح کو دیکھ سکتا تھا۔ ایکس میں لوگ کہتے ہیں کہ مردہ روحیں گرجا گھر کے ٹاور میں رہتی ہیں۔ بچّے اور کنواری لڑکیاں۔ جی ہاں! اس کے بارے میں ایک لوک گیت بھی ہے اس لیے میڈلین رسم عشائے ربّانی میں بھی شامل ہوئی اور شام کی عبادت میں بھی۔ اس نے شکروار کو برت رکھا۔ مذہب میں اعتقاد نہ ہونے کے باوجود وہ مریم کے آگے موم بتّیاں روشن کرنے لگی۔ اور اپنی ملائمت سے مجھے بے بس کر کے رکھ دیا۔ وہ اتنی دُور لگتی تھی کہ قرب بھی ہر خوشبو یا لمس سے پرے تھا

جب میرے پتاجی نے لکھا کہ وہ بہت بیمار ہیں اور خواہش ظاہر کی کہ میں آؤں تو میڈلین نے کہا "جاؤ اور کسی بات کی فکر مت کرو۔ میں اپنی دیکھ بھال خود کر لوں گی۔" میرے لیے سمجھداری کی بات تھی کہ میں چلا جاؤں۔ میڈلین پڑھانے کا کام جاری رکھے گی اور میں گھر کے معاملات نمٹا لوں گا۔ کارندے سندریا نے ماں کی زمین جائداد کے انتظام میں نااہلیت دکھائی تھی۔ لگان کا بھگتان بھی نہیں ہوا تھا۔ دستاویز بھی ٹھیک سے نہیں تھے۔ میں نے سوچا میں جا کر یونیورسٹی کے احکام سے بھی مل لوں گا کیونکہ وہاں میری جگہ اب بھی خالی تھی۔ اب تک حکومت بڑی مہربان تھی اور میرا وظیفہ بھی جاری تھا۔ ایک بار میری ڈاکٹریٹ پوری ہو جائے تو میں میڈلین کو اپنے دیس لے جاؤں گا اور وہ میرے ساتھ تو بس جائے گی۔ میں ہمیشہ ایسے گھر کا تصور کرتا تھا جو سفید، ایک منزلہ پہاڑی پر اور جھیل کے کنارے ہو۔ میں ہر روز یونیورسٹی جاتا رہوں اور یورپی تہذیب کی عظمت کے بارے میں لوگوں کو بتاتا رہوں۔ میرا مضمون تاریخ تھا،

اور میرا خاص مضمون آل بجاں سیاں کی بدعت تھا میں بوگوبلت اور دردوز یں تال میل پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس طرح کھوجتا ہوا کیتھاروں کے ہندوستانی پس منظر ---- جین یا بدھ دھرم سے متعلق پس منظر کی جانب لوٹنا چاہتا تھا۔ وہ لوگ جو 'پاک' تھے مجھے عزیز تھے۔ میڈلین بھی ان میں دلچسپی لینے لگی تھی لیکن مختلف وجوہ کی بنا پر، جیساکہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، اس کو لمس ہمیشہ ناپسند رہا۔ اس لیے وہ لمس سے گریز کرنے والے کیتھاروں اور ان کے تجرد یعنی کنوارے پن کو پسند کرنے لگی۔ اس نے میری منت کی کہ میں بھی اپنے آباواجداد کے زاہدانہ برہمچریہ پر عمل کروں اور میں بھی سر اٹھا کر چلنے والا برہمن تھا اپنی ہار کیسے مان سکتا تھا۔ بہرحال ایک پل وہاں موجود تھا اور اسے پار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں اسپین نہیں جا سکوں گا۔

ہندوستان میرے لیے انتہائی حیرت انگیز اور اہم تھا۔ وہ ایسے رس کی طرح تھا جیسے کسی سلطنت پر فتح حاصل کرنے کے لیے یا اَمر ہونے کے لیے پیا جاتا ہے۔ کمیاب چنبیلی یا سنہری ہلیلہ کا ایسا رس جسے کوئی ہیرا یا پھر کوئی سانولی جل پری پاتال لوک سے لے کر آئی ہو۔ اس نے مجھے شیرینی عطا کی اور دوام کی مسرت! میں جانتا تھا میں مر نہیں سکتا اور دنیا مجھے کس قدر مکمل دکھائی دیتی تھی اور موت بھی جبکہ وہ میرے پتاجی کی موت کی طرح تھی! اتنی سادہ کہ جب وہ آئی تو بولے "میں جاتا ہوں"؛ اور اپنی بائیں آنکھ میں صرف ایک آنسو بھر کر ہم سب کو دیکھا، پھر انگڑائی لی اور چل بسے

ہندوستان کی خوشبو میں مٹھاس تھی۔ لیکن میڈلین بہت دور تھی۔ چھوٹی ماں نے جب میڈلین اور بچے کی تصویر دیکھی تو کچھ نہیں بولیں لیکن اپنی راماین پر پھول چڑھانے اندر پوجا گھر میں چلی گئیں۔ انھوں نے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا لیکن جب بھی مجھے اداس دیکھا وہ بولیں: "جنم اور موت ---- انا تم کی مایا ہے" وہ اچانک خوش دکھائی دینے لگیں جیسے میرے دکھ کے سامنے ان کا اپنا دکھ معمولی اور چھوٹا تھا۔ وہ سارا سارا دن گیت گانے لگیں۔ انھوں نے اپنے صندوق سے وینا بھی نکال لی جسے تین سال سے انھوں نے چھوا بھی نہیں تھا۔ اور گانا بجانا شروع کر دیا۔ میرے پتاجی جو اس وقت زندہ تھے، کہنے لگے "تم گھر کے

سب سے بڑے کو اپنا سنگیت کا گیان جتانا چاہتی ہو۔" پھر انھوں نے اپنی کتاب الگ رکھ دی جو وہ بہت کم موقعوں پر کرتے تھے اور سنگیت سننے لگے۔

میرے دادا کہا کرتے تھے کہ میرے پتاجی جب جوان تھے تو ان کی آواز حیرت انگیز تھی۔ عورت کی آواز کی طرح بعد میں ریاضی کا علم ان پر حاوی ہو گیا۔ ہندسے خاکی روحوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کے چہرے پیچھے کی جانب مڑے ہوئے ہوتے ہیں اور وہ ورغلا کر انسانوں کو انجانی دنیاؤں کی جانب لے جاتے ہیں۔ ریاضی کی طرف راغب ہونے کے بعد تمہارے پتا نے ایک بار بھی کیرتن نہیں کیا۔ تم انھیں پورندر داس کی رچنائیں گاتے ہوئے سنتے۔" آواز گانگوں جیسی گمبھیر اور نرم رو تھی۔ ریاضی سے وہ اس قدر وابستہ ہو گئے تھے کہ اکثر وینا کی بجائے ان کے ہاتھ میں پنسل رہتی تھی۔ ان کی عینک ان کی ناک کے سرے پر ٹکی رہتی تھی۔ (اور ناک اگرچہ خوبصورت تھی لیکن لمبی اور کسی قدر نوکیلی تھی)۔ پتاجی ریاضی کے ماہر تھے اور جب وہ کبھی کسی سوال کو حل کرنے میں ناکام ہو جاتے تو وہ سنسکرت گرامر کی جانب رجوع کرتے عمر بھر پانینی کا مطالعہ ان کا محبوب مشغلہ رہا۔ بعد میں بھرتری ہری کا نام بھی گرامر کے ماہرین میں شامل کر لیا۔ پتاجی فلسفے کو بیکار سمجھتے تھے۔ وہ فلسفے کو جنّت کے لذیذ کھانوں کی ایسی فہرست کے مترادف سمجھتے تھے جسے کوئی کھوسٹ بڑھیا بیان کر رہی ہو۔ ان کے حساب سے ککڑی یا کدو کی ترکاری بنری سے انتڑیوں کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔" اہم بات یہ ہے کہ آپ کھاتے ہیں اور آپ زندہ رہتے ہیں۔"

پتاجی کو سب سے بڑا دکھ یہ تھا کہ میں نے ان کے ریاضی کے مطالعے کو آگے نہیں بڑھایا۔ "جب تک ہم اپنی عقل سے انگریزوں کو شرمندگی کا احساس نہیں کراتے وہ یہاں سے نہیں جائیں گے۔ اور بیٹے! ریاضی سے بڑھ کر دانشوری کہاں ہے؟ وہ یُولر کی پوجا کرتے تھے اور خدا کے الجبرائی ثبوت سے متعلق بڑی تعریف کے ساتھ اس کا مشہور قول پیش کرتے تھے۔ راجر رامانجم کی مماثلتوں اور وارنگ کے مسئلے پر پتاجی کے کام کو دنیا نے تسلیم کیا۔ پتاجی کو اس قبولیت سے مسرت ہوئی کیونکہ ان کے خیال میں اس طرح ہندوستان کی آزادی کو حاصل کرنے کا وہ لمحہ قریب تر آ گیا تھا۔ وہ اس بات سے بہرحال خوش تھے کہ میری تحقیق کا

موضوع 'آل بجیاں سیاں کی بدعت' ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ہمیں ہندوستان کو یورپ کے سامنے زیادہ سچّے روپ میں پیش کرنا چاہیے۔

وہ یورپ کبھی نہیں گئے۔ ایک تو نانا سب سے بڑے داماد کو سمندر پار بھیجنے کے خلاف تھے۔ پھر جب انھوں نے دنیا کی بدلتی ہوئی اقدار سے سمجھوتہ کر لیا تو گھر کی ذمّہ داریاں بڑھ گئیں۔ اور پھر پتاجی کو سفر سے دلچسپی بھی نہیں تھی۔ میں سمجھتا ہوں اپنی پیڑھی کے بہت سے لوگوں کی طرح وہ اپنے نہانے دھونے اور گھر کے برہمن ماحول کو نہیں بھول سکتے تھے۔ ——

—— صبح سویرے نہانا، عورتوں کا بھجن کیرتن کافور کی خوشبو اور پھر جب لڑکی بچّہ جننے گھر آئے تو لہسن اور دھوپ اگر بتّی کی مہک۔ انھیں میرا بیاہ ناپسند تھا۔ میں سمجھتا ہوں حاوی انداز میں اس لیے کہ میری بیوی کیرتن نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن دنیا کے سامنے وہ اپنی دانشور بہو کی ڈینگ مارتے تھے اور میری اور میڈلین کی تصویر انھوں نے اپنی میز پر سجا رکھی تھی

انھوں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ مریں گے۔ اس لیے انھوں نے اپنی آخری رسوم کے بارے میں بھی کبھی غور نہیں کیا۔ نانا نے اس کے بارے میں ضرور سوچ رکھا ہوگا۔ تبھی تو جب میں اُن کی صلاح لینے گیا کہ کہاں اور کیا کرنا ہے تو اُن کے سب جواب تیار تھے۔ سنسکار بنارس میں ہونا ہے اور میرے بھائی کے نام سے ہونا ہے۔" رام۔ ایسا نہیں ہے کہ میں تمہیں پیار نہیں کرتا۔ اپنی بیٹی کے سب سے بیٹے سے میں پیار کیسے نہیں کروں گا۔ لیکن بڑوں نے سب رسوم طے کر رکھی ہیں اور یہی نسل در نسل باپ سے بیٹے تک ہوتا چلا آیا ہے۔ آج اس کو کیوں بدلا جائے۔ غیر اہم چیزوں کو اہمیت کیوں دی جائے۔ پرماتما کسی فارمولے میں نہیں چھپا ہوا اور نہ ہی پیار آخری رسوم تک محدود ہے۔ تم جو ہو وہی رہو۔ تم ویدانت کے سنجیدہ مسئلوں پر جس طرح سوچتے ہو وہ مجھے پسند ہے۔ دھرم کو میرے جیسے بوڑھے دقیانوسی لوگوں پر چھوڑ دو۔" یہ کہہ کر انھوں نے اپنی بات ختم کی اور میں نے کم و بیش ان کے پاؤں چھو لیے۔ وہ بڑے شریف النفس اور منکسر مزاج انسان تھے۔ نانا ایسے ہی تھے۔

میرے چچا، ماما، ایسے نہیں تھے لیکن یہ ایک الگ داستان ہے۔

اس طرح بنارس پہلے سے طے شدہ تھا اور جب میں چھوٹی ماں کے ساتھ جو سری دھر

کو گود میں لیے ہوئے تھیں۔ ندی کے بہاؤ کے ساتھ جا رہا تھا تو واضح طور پر میڈلین کا تصوّر کر سکتا تھا۔ وہ ولا سیانت آن کی بڑی کھڑکی کے پاس بیٹھی میری کسی قمیص کو پیوند لگا رہی ہو گی اور سوچ رہی ہو گی کہ جس طرح سورج ڈوبتا اور نکلتا ہے اسی طرح سردی کا موسم بھی جلدی ہی گزر جائے گا۔ پھر گھر کو تیار کرنا ہوگا اور گھر کے تیار ہونے سے پہلے میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔ واپس ایکس میں۔ ایسا نہیں کہ اس سے اسے کوئی خوشی ہوتی ہو لیکن یہ تو ہونا ہی تھا اور یہ ہوگا ہی! میں ایک دائرۂ عمل کا حصّہ تھا۔ جیسے ہی ۱۴/ جولائی کا دن آئے گا وہ ایک مہینے کے لیے پہاڑ پر جانے سے پہلے ۳۰/ تاریخ تک دو ہفتے کے لیے گھر کو ٹھیک ٹھاک کرنے میں بتائے گی۔ اس کے بعد تین دن کے لیے ہم کنبے کے آداب کے مطابق اس کے چچا سے ملنے جائیں گے۔ پیرس میں ایک ہفتے کے لیے چھٹی منائیں گے اور پھر ستمبر کے تیسرے ہفتے سے پہلے ایکس میں لوٹ آئیں گے۔ یکم اکتوبر کو تعلیمی سال کا آغاز ہوتا ہے اور صبح اٹھنے پر وہ میرا منہ دیکھے گی۔

ذہن کے جغرافیے میں پیار صرف ایک نقطہ ہے۔

میڈلین کے لیے جغرافیہ بالکل حقیقی تھا۔ کم و بیش ٹھوس حقیقت! وہ دھرتی کی چیزوں کو سونگھ لیتی تھی۔ آواز، فارم، لمس، ذائقہ، بو ایسی حقیقتیں تھیں کہ آپ کوشش کرنے کے باوجود ان کے ماورا نہیں جا سکتے۔ اس کی سیوائے یارڈ خاندان کی روایت سے متمیز کے بہت سے عناصر کے ساتھ گھل مل گئی ہو گی اسی لیے تو شارانت سے آئی ہوئی اس لڑکی کے بالوں میں تھائم (اجوائن) اور لونڈر جڑوں تک رچے بسے ہوئے تھے۔ اس نے کہا تھا کہ جب وہ چھوٹی تھی تب سانڈوں کی لڑائی کے بارے میں پڑھنا اسے اچھا لگتا تھا اور اپنے کمرے کی دیوار پر اس نے جو پہلی تصویر لگائی تھی وہ کاس تی یورا۔ یی۔ ابا دینر کی تھی جس نے ۱۹ برس کی عمر میں سانڈ سے پیدل لڑنے والے شخص کے طور پر اعزاز حاصل کر لیا تھا۔ وہ جانوروں کو مارنے سے نفرت کرتی تھی۔ اسے سبزی خور بنانے کے لیے مجھے اسے بہت سمجھانا نہیں پڑا۔ لیکن کبھی کبھی اس کا گرم جنوبی خون کھول اٹھتا جبکہ میرا دقیق برہمن خون کبھی جوش میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔ جب وہ غصّے میں ہوتی — چاہے وہ لی سے دیسے تولیاں کے اساتذہ

کے خلاف کی گئی ناانصافی ہو یا لینس یا سیانت ایتی یان کے کان میں کام کرنے والے مزدوروں کی یونین سے متعلق کوئی قابلِ رحم سازش ۔۔ تو وہ پہلے غصّے سے گرم اور سرد ہو جاتی، اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آتے اور پھر گھنٹہ بھر روتی رہتی۔ اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ جرمن قبضے کے دوران وہ کیتھولک لوگوں اور سوشلسٹوں کے مقابلے میں کمیونسٹوں کے قریب کیوں تھی۔ اگرچہ وہ ہر قسم کے ظلم سے نفرت کرتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ میڈلین کسی بھی انسانی مسئلے سے بے لاگ عقیدت رکھتی تھی اس لیے اس کے میرے ساتھ پیار کرنے کی وجہ جزوی طور پر یہ تھی کہ وہ محسوس کرتی تھی کہ انگریزوں نے ہندوستان کو نقصان پہنچایا ہے اور میرے ساتھ شادی کرکے وہ ایک عظیم قوم سے روشناس ہو سکے گی اور اپنے آپ کو اس سے وابستہ کر سکے گی۔ جب بھی وہ کوئی یونانی کتاب پڑھتی تو اسے افسوس ہوتا کہ وہ ایتھنین ریپبلک کے دور میں کیوں پیدا نہیں ہوئی۔ اس بات سے بھی پال ویلری کے تئیں اس کی بے پناہ پسندیدگی کی وجہ کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے برعکس میری پرورش رومان رولاں کے مطابق ہوئی تھی۔ وویکانند اور رام کرشن پر اس کی کتابیں پڑھنے کے بعد اسے رشی اور سنت کہنے لگا تھا۔ ویلری مجھے ضرورت سے زیادہ نفرت بھرا اور یورپی نظر آتا تھا۔ مجھے آل بجاں بیاں کی انکساری زیادہ پیاری اور فطری طور پر زیادہ ہندوستانی لگتی تھی۔

میڈلین جو کالج میں تاریخ پڑھاتی تھی، ویلری کو پسند کرنے کے کارن پورے قدیم یونان سے اور زیادہ پیار کرنے لگی۔ جب میں نے اس کا تعارف ہندوستانی تاریخ سے کرایا تو اسے اس قدر خوشی ہوئی کہ اس نے مقدس گریل کے نقطۂ نظر پر تحقیق شروع کر دی۔ ایک پرانے نظریے کے مطابق مقدس گریل بدھ دھرم سے وابستہ تصوّر تھا۔ اور عیسیٰ مسیح کا پیالہ بدھ کا ایک تبرک تھا جسے نیس توریوں نے غصب کر لیا تھا اور اسے ایران لے آئے۔ وہاں یہ داستان مانی مذہب کے ساتھ گھل مل گئی اور پھر قرونِ وسطیٰ کے آخر میں مقدس گریل کی عجیب و غریب کہانی کے روپ میں ڈھل گئی۔ مقدس گریل نے میڈلین کی حسِ جغرافیہ کو ایک فطری تحریک عطا کیا۔ اس کو وہ ملک اور وہ دور پسند تھے جو ہمارے اپنے نہیں تھے۔

میں ہندوستان میں پیدا ہوا تھا جہاں ماضی اور حال ہمیشہ کے لیے ایک مکمل تجربے

کے روپ میں جڑے رہتے ہیں۔ گنگا میں اُترتے ہوئے ہر شخص اس بات کا تصور کر سکتا ہے کہ سرجو کے ساتھ ساتھ جاتی ہوئی پگڈنڈی سے کس طرح مہاتما بدھ نیچے آئے ہوں گے اور ندی کے پانی میں اپنا کشکول دھویا ہوگا۔ اسی طرح میرے لیے زمان و مکاں کی اہمیت اضافی نوعیت کی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ کس طرح میں ۱۹۴۶ء میں جب پہلی بار یورپ آیا تھا اور نیپلس میں اترا تھا تو یورپ مجھے نہ تو اتنا دور لگا تھا اور نہ ہی اتنا پرایا ہی۔ اور نہ ہی بعد میں جب میں نے میڈلین کے سنہری بالوں میں چہرہ چھپا کر گھوڑے کی سی قوّتِ شامہ سے اس کی تیز مہک کو سونگھا تھا۔ جنم سے میری راشی 'دھنو' ہے۔ مجھے کچھ بھی غیر مانوس نہیں لگا۔ میں حادی انداز میں برہمن تھا اور کسی بھی چیز سے ناشناسا ہو ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ ذات اور نسل پر فخر ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب میں میڈلین کی بغل میں لیٹا ہوا تھا تب اس نے ہی کہا تھا۔ "اپنی سنہری جلد کے پہلو میں یہ زرد جلد ملاحظہ کرو۔ ایسے ملک میں جنم لینا بڑی خوش قسمتی ہے جہاں کے مردوں کی جلد شاہی ساٹن جیسی ہے۔ صدیوں کی رگڑ سے اس میں کچھ اور ملائمت۔ کچھ اور تابندگی پیدا ہوگئی ہے"۔ میں چونکہ دوسرے لوگوں سے مختلف ہوں اس لیے مجھے واقعتاً کوئی فرق نظر نہیں آیا۔ میرے نزدیک فرق جنم سے تھا۔ جیسے میرا اپنے باپ کا سب سے بڑا بیٹا ہونا یا اپنے دادا کی طرح آٹھ ستونوں والے گھر کا مالک راما کرشنیا ہونا۔ ریاست میسور میں بلکہ مہاراجہ کے سامنے بھی ان کا نام لینے کی دیر تھی کہ آپ کو عزت سے بیٹھنے کی جگہ دی جاتی تھی۔ آپ کی خاطرداری کی جاتی تھی اور وقتِ رخصت آپ کو ناریل اور شال کا نذرانہ پیش کیا جاتا تھا۔ میرا خیال ہے اختلافات خود ساختہ ہیں اس لیے میں نے قبول کر لیا تھا کہ میڈلین مختلف تھی۔ اسی لیے میں اس سے اتنا پیار کرتا تھا۔ اور چھوٹی ماں سے بھی، جو میرے سامنے بیٹھی تھیں۔ حالانکہ وہ میری اپنی ماں سے کتنی مختلف تھیں۔ اختلاف میں ہی ایک حقیقت کی طرح اپنی ذات کی قبولیت مضمر ہے اور پس منظر پیار کو وسعت عطا کرتا ہے۔

اس دن شام جلدی ہی ڈھلنے لگی تھی جیسے کشتی ندی کے بہاؤ کے اُلٹی طرف بڑھ رہی تھی اور مخالف سمت سے تازہ شفّاف ہوا ہماری جانب بہہ رہی تھی۔ میرے ذہن میں خیال آیا کہ کچھ اعتبار سے میڈلین چھوٹی ماں جیسی تھی۔ دونوں میں ایک جیسا شرمیلا پن تھا۔ دونوں

چُپ رہتی تھیں اور سب کچھ یاد رکھتی تھیں۔ دونوں پیار بھی غیر معمولی کرتی تھیں۔ دونوں جنم سے جانتی تھیں کہ زندگی سنگیت نہیں بلکہ حوصلے سے دُکھ برداشت کرنے کا نام ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ ازدواجی خوشی کے کچھ لمحے اور کبھی کبھی پَل کے اُوپر کا سفر نصیب ہو جاتا ہے اور پھر دھرتی کی جانب واپسی اور شاید ہوگی بھی۔

مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے۔ ہماری شادی سے صرف تین روز پہلے کا دن! ہم روپاں ہو آئے تھے صرف اس لیے کہ ہمارے پاس اس سے بہتر کچھ کرنے کو نہیں تھا اور میڈلین بہت اداس تھی۔ کہنے لگی "مجھے ڈر ہے۔ میرے اندر ایک گہرا خوف ہے کہ میں تمہیں مار دوں گی میرے اندر کا کچھ تمہارا قتل کر دے گا اور میں بیوہ ہو جاؤں گی۔ مجھ سے شادی مت کرو میرے پریتم! ہم الگ ہو جائیں۔ ابھی وقت ہے!" وہ ۲۶ برس کی تھی اور میں ۲۱ برس کا۔ مجھے موت کا پروا نہیں تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ "میں کبھی نہیں مروں گا۔ میڈلین! جب تک تم مجھے مرنے کی اجازت نہیں دو گی۔" وہ رک گئی اور مجھے اس طرح دیکھنے لگی جیسے کسی دیوتا کو دیکھ رہی ہو اور پھر مڑ کر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ کیونکہ ہم اس وقت آریت دے برُج کے بت کے پاس بیٹھے تھے جس نے اپنے بیٹے چارلس کے جنم پر۔ جو بعد میں ہسپانوی جنگ کا ہیرو ثابت ہوا۔ اپنا بت نصب کروایا تھا۔ ننھا منا چارلس جس کے گول مٹول سر پر پہلے ہی برگنڈی کا تاج تھا۔ اس کی گود میں لیٹا ہوا تھا۔ بت احمقانہ تھا لیکن بہرحال کسی نہ کسی طرح اس کی نوعیت ایک جراب کی سی لگتی تھی۔ اور جب ہم پیرس لوٹ آئے۔ اور ساتویں آرن دِسما کی میری میں ہماری شادی ہو گئی۔ کیونکہ ان دنوں میں ' روسیا نت دومنق' میں رہتا تھا۔ ہم نے وہیں برُج پر ایک کتاب خریدی جواب تک میرے پاس ہے۔ یہ ان چند چیزوں میں سے ایک ہے جو مصیبت کی گھڑی آنے پر میں اپنے لیے بچا سکا تھا۔

برُج خوبصورت ہی ہوگا۔ اگرچہ میں نہروں۔ کنارِ آب کی جگہوں کو دیکھنے کبھی نہیں گیا۔ لیکن آریت دے برُج کا بھدا، موٹا چہرہ ہمیشہ کسی پُراسرار نامکمل رشتہ ازدواج کا سرپرست درویش سمجھا جائے گا۔

ذہنی طور پر پُرسکون ہوتے ہی ماں نے گھر کے دستور کے مطابق تنکر کے نروان اشٹنک کا پاٹھ کرتا

شروع کر دیا تھا۔ جب سے دادا کتنّا بنارس سے لوٹے تھے اور انھوں نے مجھے یہ سکھایا تھا تبھی سے یہ مجھے اچھا لگتا تھا۔ میں گہری عالمانہ آواز میں "منو بُدھی اہنکار" شروع کر دیتا کیونکہ میں بھی تو آخر سنسکرت پاٹھ شالا میں پڑھا تھا۔ چھوٹی ماں میرے ساتھ ساتھ ایک کے بعد ایک اشلوک گاتی جاتیں "شِودہم۔ شِودہم۔ میں شِو ہوں۔ میں شِو ہوں۔" اب تک بنارس میں سب بتّیاں جل گئی تھیں۔ اور گھاٹوں پر جلتی چتائیں بھی فطرت کے کسی منظر نور کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ بندر پیڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ چکے ہوں گے اور سادھو سنت کھانا کھا رہے ہوں گے۔ ہر مندر میں شام کو ڈھولک بج رہے تھے اور ان کی آوازوں کے درمیان ڈلہوزی پل سے گذرتی ہوئی ریل گاڑی کی دھڑ دھڑ بھی سنائی دے رہی تھی۔ یہ مغل سرائے جانے والی لمبی کلکتہ میل تھی۔

اس پار رام نگر تھا۔ رام کا اصل شہر۔ ابھی تک ہر برس لوگ رام لیلا دیکھنے آتے اور زناری اور ہاتھیوں، گھوڑوں اور باجے گاجے کے ساتھ آتے ہوئے شاہی خاندان کے لوگ رام لیلا کرتے۔ چھوٹی ماں ناخوش تھیں کہ اس برس کے تہوار کے لیے ہمیں بہت دیر ہو گئی تھی میں نے ان سے کہا میں جلدی ہی ہندوستان لوٹ آؤں گا اور انھیں لمبی تیرتھ یاترا پر لے جاؤں گا۔ میں نے ان کے ساتھ بدری ناتھ کیلاش کی یاترا کا بھی وعدہ کیا۔ میں جانتا تھا کہ میرے لیے کوئی ہمالیہ نہیں ہوگا۔ سری دھر جاگ گیا تھا اور جب چھوٹی ماں اسے دودھ پلانے لگیں تو میں نے انھیں کاشی کا پُرادی ناتھ کال بھیرو بھجے، کا پاٹھ سنایا:۔

"میں کال بھیرو کی پوجا کرتا ہوں
جو کاشی نگری کا بھگوان ہے
جو کروڑوں سورجوں کی طرح جگمگاتا ہے
ہمیں اس بھَو ساگر کے پار لگانے والا ہمارا رکشک
نیل کنٹھ، ترنی نیتر سب آرزوئیں پوری کرنے والا
کنول نین جو موت کو بھی موت دے سکتا ہے

لافانی،

ہاتھ میں جس کے
کھوپڑیوں کی مالا ہے اور ترشول!
کاشیکا پرادھی ناتھ کال بھیرو بھجے۔"

بنارس دائمی ہے۔ وہاں مرے ہوئے مرتے نہیں۔ اور نہ ہی جینے والے جیتے ہیں۔ مرے ہوئے لوگ کھیلنے کے لیے گنگا تٹ پر اترتے ہیں اور جینے والے لوگ جو اِدھر اُدھر گھومتے ہیں اجداد کو چاول کے لڈو پیش کرتے ہیں۔ وہ ایک وشال رات اور جگمگاتے ہوئے شہر کے قریب میں رہتے ہیں۔ ایک بار چھوٹی ماں کی فرمائش پر میں نے سری شنکر کا ایک بھجن گایا۔ اس بار یہ سری دکشنا مورتی سروترم تھا۔ یا تو یہ شام کے دھندلکے کے کارن تھا یا پھر میرے اندر مجھ سے بھی زیادہ کسی ایسی گہری کو چھو لیا گیا تھا جس کے وجود سے میں بھی واقف نہ تھا۔ میرے گالوں پر کچھ آنسو ڈھلک آئے۔ پوترتا ہی سکھ ہے۔ سکھ ہی پوترتا ہے۔ اس لیے برہمن کو ہمیشہ خوش رہنا چاہیے۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا اور ہنسنے لگا۔ یہ پاسکل کے اس قول سے کتنا مختلف ہے کہ "آسمان کی لامحدود وسعتوں کی بے پناہ خاموشی مجھے خوفزدہ کر دیتی ہے۔"

لامحدود کی طرف جانے والا راستہ روشن ہے اگر آپ اسے آئینے میں جگمگاتے ہوئے شہر کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ اگر آپ اس میں رہنا چاہتے ہیں تو شیشے کو توڑنا پڑے گا۔ غیر حقیقی اس لیے ممکن ہے کیونکہ حقیقی ممکن ہے۔ لیکن اگر غیر حقیقی سے حقیقی کی طرف جانا چاہتے ہیں تو یہ ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی شخص آئینہ خانہ میں نظر آنے والی راہ گزر میں گھس کر چلنے کی کوشش کر رہا ہو۔ دشاسن کسی اسیرِ حواس شخص کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہے۔

بورژوا لوگوں کے لیے دنیا، بینک اور لوٹری بھی حقیقی ہیں اور شادی کی انگوٹھی بھی۔ ہم نے۔ میں نے اور میڈلین نے۔ اپنی شادی سے ایک دن پہلے شادی کی سونے کی دو ہلکی پتلی انگوٹھیاں خریدنے میں آخری کچھ ہزار فرینک بھی جو ہمارے پاس جمع تھے خرچ کر دیئے تھے۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ کس طرح ہمیں ہر ایک انگوٹھی کے ۲۷۰۰ فرینک چکانے پڑے اور چونکہ ہمارے پاس کل ملا کر ۹۰۰۰ فرینک ہی بچے تھے۔ ہم کھانا کھانے کے لیے۔ بلوارسیاں مشیل میں ہندی چینی ریستوراں ریو ما سیبہ میں گئے۔ ہم نے ڈنر میں چاول کھائے اور میڈلین

خوش ہوگئی۔ ہندوستان کو قبول کرنے کا اس کا یہ انداز تھا۔

اگلے دن ہم دو گواہوں کے ساتھ گیارہ بجے "میری" گئے۔ ان میں ایک کاونٹ آر۔ جو پتاجی کے پرانے عزیز دوست تھے جنھوں نے دیے بردگلی کے ساتھ کام کیا تھا۔ ہنگری میں کمیونسٹ انقلاب آجانے کے باعث وہ وہاں واپس نہیں جا سکے تھے اور پیرس میں ہی بس گئے تھے۔ دوسرا گواہ میڈلین کی طرف سے تھا۔ وہ اس کا خالہ زاد بھائی رولاں تھا جو فرانسیسی بحری فوج میں افسر تھا۔ اس نے دنیا دیکھ رکھی تھی۔ اس لیے ایک ہندوستانی اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ وہ ترچناپلی اور منم ڈرئی کے بارے میں جانتا تھا۔ اور وہ شادی کے موقعہ پر اپنی چمکیلی بھڑکیلی وردی پہن کر آیا تھا۔

میڈلین کے چچا کو بہرحال یہ عجیب و غریب بیاہ پسند نہیں تھا۔ چچا چارلس رویاں میں نوٹری کے روپ میں بس گئے تھے اور وہ اپنی پر سکون قصباتی زندگی میں کوئی خلل نہیں چاہتے تھے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ جب انھوں نے دوسری عورت سے شادی کی جو پہلے سے طلاق شدہ تھی تو انھوں نے اپنی بوڑھی ماں کو بنا بتائے ہی یہ شادی کی تھی کیونکہ یہ سب بتانے سے مادام ترسلیاں کے پریشان ہو جانے کا خدشہ تھا۔ مادام آرا میں رہتی تھیں۔ چچا کا دوسرا بیاہ بڑا دکھ بھرا تھا۔ لیکن انھیں اپنی لائق بیوی پر بڑا فخر تھا۔ اس نے ان کی حیثیت کو تحفظ عطا کیا اور وہ اس سے محبت کرتے تھے۔

میڈلین کو شارانت کے سیانتانج میں ایک غیر شادی شدہ خالہ نے پالا تھا۔ لیکن وہ کبھی کبھی اپنے رشتے کے بھائی بہنوں کے پاس جاتی رہتی تھی اور وہ اس سے خوش تھے۔ وہ اسے چڑاتے تھے کہ بالآخر وہ کانونٹ میں پہنچ جائے گی۔ رولاں نے تو آسٹریلشیائی جزیروں میں ایک پُر اسرار قبیلے کا بھی پتہ لگا لیا تھا جسے میرا خیال ہے "کورُوبوری کہتے ہیں" وہ کہا کرتا تھا وہ اپنی کسی مہم کے دوران میڈلین کو بھی ساتھ لے جائے گا اور اسے اس جزیرے کی جنت میں پہنچا آئے گا۔ وہ اس سے کہتا تھا۔ "میڈ وہاں تمہاری خوبیوں کی قدر ہوگی ذرا سوچو تم عیسائی مذہب کے پیروکاروں میں بیس ہزار (۲۰،۰۰۰) پیروکار اور جوڑ دوگی بیشتر اس کے کہ کوئی گوگاں ان کی کنواریوں کے حسن کو دریافت کرلے اور ان جزیروں کو بہت

سے پیارے پیارے، بچوں سے بھر دے"۔ ایسی باتیں میرے سامنے کبھی نہیں کہی جاتی تھیں۔ جب میڈلین کو پتہ چل گیا کہ میں کس قدر محتاط مزاج کا ہوں تو اس نے یہ کہانی مجھے بڑی تفصیل کے ساتھ سنائی۔ کہنے لگی" ذرا کیتھولک سسٹر کے روپ میں میرا تصور کرو میں جو ینانیوں سے پیار کرتی ہوں۔ رام۔ مجھے بتاؤ۔ میں جو لا مذہب ہوں "۔

دراصل لامذہب میں تھا جو گنگا کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ میں۔ جس کے دل میں اس گمبھیر اور سب کچھ جاننے والی ندی کے لیے بڑا احترام تھا۔ ندی کے بہاؤ کے ساتھ پھول بہہ رہے تھے اور کبھی کبھی ہماری کشتی کسی مچھلی یا لکڑی کے لٹھے کے ساتھ ٹکرا جاتی۔ کبھی کبھی کسی چتا کی جلی ہوئی لکڑی بھی چپّوؤں کے ساتھ ٹکرا جاتی۔ لوگ کہتے ہیں کہ گنگا میں مگرمچھ رہتے ہیں۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ اپنی روانی میں مردہ جسموں کے ٹکڑے۔ ادھ جلے ٹکڑے بھی اکثر اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی رہتی ہے۔ لیکن میں نے یہ سب خود نہیں دیکھا۔ رات، ایک انوکھی نوری رات بنارس کے آکاش کی بے پایاں وسعت پر حکمراں تھی۔ ندی کے انہیں کناروں پر کہیں شاید چار پانچ یا چھ ہزار برس پہلے اپنشدوں کے رشیوں نے انسانی شعور کی جڑوں پر بحث کی ہوگی۔ اور یاگیہ ولکیہ نے میترے یی سے کہا تھا" پتی کس کی خاطر آخر پتنی سے پیار کرتا ہے۔ اپنی پتنی کی خاطر نہیں بلکہ اس کے اندر چھپی ہوئی ذات کی خاطر" کیا چھوٹی ماں میرے پتاجی کے اندر چھپی ہوئی ذات سے پیار کرتی تھیں۔ کیا میڈلین میرے اندر پوشیدہ ذات سے محبت کرتی تھی۔ مجھے معلوم تھا میں ایسا نہیں کرتا تھا۔ میں جانتا تھا میں پیار نہیں کر سکتا تھا۔ میں تو پی ار سے بھی پیار نہیں کرتا تھا۔ میں نے گنگا جل سے اپنی ہتھیلی بھری اور پانی پھر ندی میں گرا دیا۔ میں نے یہ پی آر کے لیے کیا۔

بنارس کے بارے میں اور کچھ بھی یاد نہیں کر پاتا۔ ہم نے دو تین دن اور وہاں گزارے۔ چھوٹی ماں ایک نجی مندر میں کتھا پرائن سننے چلی جاتی تھیں میں پوتر گائے کی طرح اس مقدس شہر کی گلیوں اور مندروں میں گھومتا رہتا تھا۔

مجھے جو چیزیں سب سے زیادہ پسند آئیں، وہ تھیں دکانیں اپنے تانبے کے کام کے ساتھ جس میں لاکھ اور ہاتھی دانت کا کام کیا ہوا تھا۔ چھت سے لٹکتے ہوئے نقلی بالوں کے گچھے۔ رنگ برنگی چوڑیاں۔ نشہ آور مہک والی بھنگ جو چھاچھ اور مسالہ ملا کر دی جاتی تھی۔ بنارسی ریشم کی دکانیں بھی بڑی شاندار تھیں ان میں ایسے ایسے پیچیدہ ڈیزائن کی ساڑھیاں تھیں کہ انھیں دیکھ کر حیرانی ہوتی تھی کہ لوگ ایسی چمتکاری چیزیں بناتے ہیں اور انہیں پیسہ کمانے کے لیے بیچتے ہیں۔ ایک روز میں اکیلا گیا اور میڈلین کے لیے آم کے پستئی ہرے پتّوں والے پلّو والی گلابی رنگ کی ساڑھی خریدی۔ میں نے سوچا پستئی رنگ اس کے سنہرے رنگ پر خوب کھلے گا۔ سروجا کے لیے میں نے لکھنؤ چکن کی سادہ سی سفید ساڑھی خریدی میں چوڑیاں بھی خریدنا چاہتا تھا لیکن ڈرتا تھا وہ ٹوٹ جائیں گی۔ اس کے علاوہ میں نے یہ بھی سوچا کہ جب چھوٹی ماں کو اس دن ہی چوڑیاں توڑنی پڑی ہیں تو انہیں لے جانا نامناسب ہوگا۔

میں مندروں میں بندھی گایوں کے درمیان بھی گھوما۔ ان کے گمبھیر اور گرم چہروں کو چھوا اور انھیں چارہ کھلایا۔ ہمارے پوتر دیس میں کیسے عجیب وغریب جانور ہیں۔ ان کے نین نقش کس قدر مادرانہ اور قدیم انداز لیے ہوئے ہیں۔ یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ ہم ان کی پوجا کیوں کرتے ہیں۔ میں نے ایک دن تھوڑا سا قُم قُم خریدا اور ایک مندر کی کچھ گایوں کے چہروں کو سجا دیا۔ پھر باہر گیا اور بنگالی چنے خرید کر بندروں کو کھلائے۔ شام ڈھل رہی تھی۔ میں واپس ہریش چندر گھاٹ گیا اور وہاں سے چھوٹی ماں کو لیا۔ وہاں وہ اطمینان سے بیٹھی سری دھر سے باتیں کر رہی تھی۔ برہمن بستی کے باہر کہیں سے میں نے ایک

ٹیکا کرائے پر لیا اور چھوٹی ماں کو پوجا کے لیے اَن پورنا مندر میں لے گیا۔ دیوی کتنی سُندر لگ رہی تھی !۔ اپنی کیسریا ساڑھی۔ ہیرے جواہرات سے سجے کالے للاٹ کے ساتھ۔ اس کے وجود سے کیسی گہری قوت اُبھر کر آ رہی تھی اور کیسا گہرا سکون !

تو جس نے اپنے تن پہ زرّیں لباس پہن رکھا ہے
اور اسے طرح طرح کے کئی ہیرے جواہرات سے سجا رکھا ہے
جس کی چھاتیاں جل کلشوں کی طرح گول ہیں
اور موتیوں کی مالاؤں میں جگمگا رہی ہیں
جس کا حسن کشمیری اگرو کی خوشبو سے کچھ اور بھی کھل اُٹھا ہے
اے دیوی، تو جو کاشی نگری پر حکمران ہے
اے! کرپا سندھو میری مدد کر!

میں نے چھوٹی ماں کے ساتھ 'ان پورن سدا پورن' کا پاٹھ کیا۔ جب کافور جلایا گیا تو سری دھر اس قدر اپنے آپ میں کھو سا گیا، خاموش ہو گیا کہ مجھے احساس ہوا کہ میرے خاندان کا یہ سب سے چھوٹا بالک پیڑھیوں کی پوترتا کو اکٹھا کر سکے گا۔ ممکن ہے وہ ایک دن میرے سب سوالوں کا جواب دے گا کیونکہ میرے اپنے بھی کئی سنجیدہ سوال تھے اور میں ان کی شناخت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ زندگی میں کئی چیزوں نے مجھے محروم کر رکھا تھا میرے اندر ایک گہری غیر موجودگی۔ ایک کمی۔ ایک نوخیز پیڑ پہ ناریل کی طرح پروان چڑھتی رہی تھی کہ کوئی بھی پیار یا علم اس کمی کو پورا نہیں کر سکتا تھا۔ کئی بار منہ پہ ہاتھ رکھے میں سوچا کرتا تھا کہ یہ آوارگی مجھے کہاں لے جائے گی میں جانتا ہوں کہ زندگی ایک یاترا ہے لیکن اس یاترا کی منزل کون سی ہے اور اس کا مقصد کیا ہے ؟

ہزاروں برسوں سے ہر ایک —— قدیم حجری دور سے لے کر اب تک —— اربوں۔ اربوں آدمیوں، عورتوں میں سے ہر ایک محسوس کرتا ہے کہ بس کچھ کمی رہ گئی ہے۔ کروڑوں میں سے شاید ایک جانتا ہے کہ وہ کچھ کیا ہے اور بدھ کی طرح اس کی تلاش میں نکل پڑتا ہے۔ جہاں سے لوٹنا ممکن نہیں ہے۔ پھر بھی مسئلے کا حل کیا ہے ؟ سادھو کی رہبانیت یا بھگوان کی پوجا۔ اس

مسئلے کا حل نہیں ہے۔ صرف گنگا ہی اپنے بہاؤ میں معنی لیے ہوئے محسوس ہوتی ہے۔ لیکن میں نہیں سمجھ سکا وہ کیا کہتی ہے۔ وہ چھوٹی ماں کی طرح لگتی ہے۔ اس قدر سنجیدہ اور اندرونی آرزوؤں سے بھرپور!

میں کسی چیز کے بارے میں فکر مند تھا۔ ایک ایسی تشویش سے فکر مند جس کا چونکہ کوئی آغاز نہیں تھا اس لیے اس کا کوئی انجام بھی نہیں تھا۔ برہمن کے جس وسیع مکان میں ہم ٹھہرے ہوئے تھے اس کے پتھر پر لیٹے لیٹے میں دن بھر بجتی ہوئی گھنٹیوں اور سیڑھیوں سے اُترتے تیرتھ یاتریوں کے اپنے آپ سے 'منتر اچارن' کی آوازیں سُن سکتا تھا۔ کبھی کبھی کوئی مچھلی پانی میں کچھ پکڑ لیتی تھی اور اس کی سرسراہٹ اور ڈبکی سے رات کا سناٹا تار تار ہوتا ہوا محسوس ہوتا!

چھوٹی ماں سوگئی۔ سری دھر کے سر پہ ہاتھ رکھ کر ہلکے سے اسے اپنے سینے سے لگا کر چھوٹی ماں سوگئی۔ وہ اس طرح سوتی تھی کہ گنگا کی موجیں نیند کی بنی ہوئی تھیں اور ہم میں سے ہر ایک، ایک موج تھا۔ وہ یکایک اپنی آنکھیں کھول دیتی تھیں اور پوچھتی تھیں: "رام! کیا سچ مچ تجھے ٹھنڈ نہیں لگ رہی؟ مجھے تیرے پھیپھڑوں کی فکر ہے بیٹے!"

حالانکہ نمی میرے جسم کے مسام مسام میں گھس گئی تھی لیکن مچھر اس سے بھی بڑے تھے چھوٹی ماں نے اپنی مچھر دانی مجھے دے دی تھی تاکہ کم سے کم مجھے کچھ آرام مل سکے۔ مچھر دانی میں میں اپنے آپ کو کچھ ایسا الگ، الگ محسوس کرتا کہ مجھے نیند غیر ضروری لگتی۔ شاید نمی کے کارن یا اس لیے کہ میں ڈھنگ سے کھاتا پیتا نہیں تھا۔ مجھے ہلکی ہلکی کھانسی ہونے لگی۔ چھوٹی ماں ڈر گئی۔ اگلے روز بعد دوپہر ہم الٰہ آباد کے لیے روانہ ہو گئے۔ اسٹیشن پر اُترتے ہوئے چھوٹی ماں نے کہا "اب مجھے ہر چیز سے ڈر لگتا ہے۔"

لیکن پلیٹ فارم پر وینکٹ رمن کو دیکھ کر وہ کچھ بہتر محسوس کرنے لگیں۔ وینکٹ رمن حیدر آباد میں میرے پتاجی کے ساتھ کام کرتے تھے۔ وہ اب الٰہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی پڑھاتے تھے اور ہم نے انہیں اپنے الٰہ آباد پہنچنے کے بارے میں تار بھیج رکھا تھا۔ جنوبی ہند کے ایک باسی نے جب ان سے تیلگو میں بات کی اور ہم گھر پہنچ گئے تو چھوٹی ماں کو اطمینان ہوا۔

ہوا۔ ہینگ والی رسم، اور ناریل اور دھنیے کی چٹنی کا تو مزا آ گیا۔ سویرے جب فِلٹر والی کافی کے ساتھ دوسا آیا تو چھوٹی ماں سچ مچ مُسکرا دیں۔ ہمارے خوشی یا غم کے احساس کس قدر جانی پہچانی چیزوں پر منحصر ہیں! اس نو دریافت ماحول میں چھوٹی ماں پھر سے پہلے کی طرح خوش خوش نظر آنے لگیں۔ بنارس انہیں گھناونا لگتا تھا۔ گنگا کو چھوڑ کر پورا شمالی ہندوستان گندگی بھرا اُجاڑ علاقہ تھا۔ لکشّما کا بھی یہی خیال تھا پھر وہ بچوں اور شادی بیاہ کی باتیں کرنے لگیں اور یہ بھی کہ کس نے کس کے بیاہ میں کتنا دیا تھا۔ لکشّما کی ایک بیٹی انڈین فارن سروس کے ایک افسر سے دہلی میں بیاہی ہوئی تھی اور دوسری ریلوے کے کسی عہدے دار سے۔ بیٹا بنارس انجینرنگ کی تعلیم حاصل کر رہا تھا لیکن ان دنوں چھٹیوں میں گھر آیا ہوا تھا۔ اگر چہ ہم لوگ دو مختلف فرقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ایسے اشارے دیئے گئے کہ لکشّما کو سروجا کو اپنی بہو بنانے پر غور کرنے میں اعتراض نہیں ہوگا۔ چھوٹی ماں چپ چاپ سب سنتی رہی اور صرف یہ کہا" افسوس کہ رام کا پہلے ہی بیاہ ہو چکا ہے ورنہ وہ کومدی کے لیے اچھا رہتا۔" کومدی سولہ سال کی تھی اور انٹرمیڈیٹ میں پڑھ رہی تھی۔" ممکن ہے یہ اب بھی ہو جائے۔" لکشّما نے چولہے کی آگ پھونکتے ہوئے کہا۔ میرا اس بات سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔

لیکن جنوبی ہند کے اس ماحول میں بہرحال میں بھی خوش تھا۔ جب سے میں یورپ گیا تھا مجھے کسی دوسرے جنوبی ہندوستانی کُنبے کے ساتھ رہنے کا کبھی موقعہ نہیں ملا تھا۔ دوپہر بعد کومدی، لکشّما، چھوٹی ماں اور میں چوپڑ کھیلنے لگے۔ صبح چھوٹی ماں اور میں مذہبی رسوم کے لیے تروینی گئے۔ بعد میں میں انھیں آنند بھون دکھانے لے گیا۔ ایک روز میں انہیں عجائب گھر (نہرو خاندان گھر) لے گیا۔

ہمارے وہاں پہنچنے کے بعد وہ دوسری یا تیسری شام ہوگی۔ میں ڈرائنگ روم میں بیٹھا ریاضی کی کوئی کتاب پڑھ رہا تھا کیونکہ مجھ میں بھی اپنے پتاجی کی یہ دلچسپی موجود تھی کہ کچھ ایسا ہو گیا جس نے میری زندگی کا پورا پس منظر بدل کر رکھ دیا۔ وینکٹ رمن یونیورسٹی کلب سے گھر لوٹتے ہوئے اپنے ساتھ اپنے ایک پرانے طالب علم پرتاپ سنگھ کو ساتھ لیتے آئے۔ مجھے جلد ہی پتہ چل گیا کہ پرتاپ سنگھ عثمانیہ یونیورسٹی کا انتہائی ذہین طالب علم رہ چکا تھا۔ اس

نے انگریزی میں آنرس کورس پاس کیا تھا اور اتنے اچھے نمبر حاصل کیے تھے کہ وینکٹ رمن نے اس کو آئی۔ سی۔ ایس مقابلے کے لیے خصوصی تربیت دی تھی۔

پرتاپ اپنے پتا کی موت کے بعد پیدا ہوا تھا۔ اس کا خاندان ضلع اورنگ آباد میں تکت پوری کا جاگیردار خاندان تھا۔ افسردہ مزاج ہونے کے باوجود پرتاپ دوسرے لوگوں کو راحت اور روشنی دینا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ اپنی ماں کی تنہا زندگی کو روشن کرنے کے لیے سخت محنت کر رہا تھا۔ وہ مقابلے کے امتحان میں بیٹھا لیکن مقابلہ بڑا سخت تھا۔ اس سال صرف سات ہندوستانیوں کو منتخب کیا گیا اور اس کا نام فہرست میں ۲۶ ویں یا ۲۷ ویں نمبر پر تھا۔ لیکن برٹش ریزیڈنٹ نے فوراً پولیٹیکل سروسز میں اس کی نامزدگی کی سفارش کی۔ وہ ایک طرح سے راجہ صاحب تو تھا ہی۔ اس کے علاوہ خوب ہوشیار لڑکا تھا۔ اور خاندان نے ہمیشہ انگریزوں کے ساتھ وفاداری نباہی تھی۔ اس کو بہرحال منتخب کر لیا گیا اور اسے انگلستان بھیجا گیا۔ وہاں جانے والے سول افسروں کے آخری بیچ کے اراکین میں سے ایک تھا۔ اس کی ماں اس قدر خوش تھی کہ وہ اپنی بیٹی کے ساتھ رہنے پھلی چلی گئی۔

ایک کام کرنا ابھی باقی تھا۔ اگر کسی اچھی لڑکی سے اس کی سگائی ہو سکتی۔ بے شک اس کے لوٹنے پر۔ تو اس کی ماں چاہے اپنے وقت سے پہلے ہی پرلوک سدھار جاتی تو بھی وہ روحانی سکون کے ساتھ پران تیاگ سکتی تھی۔ پرتاپ ایک ایسے قدیم گھرانے سے تعلق رکھتا تھا جو اب مالی طور پر کمزور ہو چکا تھا اور اب صرف چھ یا سات گاؤں کا مالک تھا لیکن وہ نہ صرف اس قدیم گھرانے کا فرد تھا بلکہ اپنی شخصیت میں ایک خاص قسم کی سنجیدگی لیے ہوئے تھا۔ وہ فطری طور پر اچھے کردار کا انسان تھا۔ متوازن اور صادق دل!

سورج پور کے راجہ رگھوویر سنگھ کی بیٹی کا پسند آنا جسے حال ہی میں اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ بھیجا گیا تھا نہ تو عجیب تھا اور نہ ہی ناممکن۔ راجہ صاحب بڑے ظالم آدمی تھے۔ ان کے نزدیک جانے سے ڈرتے تھے۔ پھر بھی ان باتوں سے اس معاملے میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ اگرچہ راجہ صاحب نے اپنے ایک نوکر کو کھمبے سے باندھ کر اس کی اتنی پٹائی کی تھی کہ ہسپتال میں اس کے زخم بھرنے میں ایک مہینہ لگ گیا لیکن بجائے اس کے کہ اس بات سے کوئی فرق پڑتا۔

ہوا یہ ہے کہ اس کے برعکس ایسے سخت گیر باپ کی بیٹی سے شادی اور بھی پرکشش ہو گئی۔ عام خیال ہے کہ ایک سخت گیر باپ کی بیٹی نرم مزاج ہوتی ہے۔ اس کی ماں انتہائی نرم مزاج کی عورت تھی۔ ہمیشہ رامائن اور گیتا میں کھوئی رہتی۔ اس کے برت اور کیرتن ہر جگہ مشہور تھے۔ جب وہ صرف اٹھارہ برس کی تھی۔ اس کا پلوٹھی کا بچہ جو لڑکا تھا مر گیا تھا اور اس سے اس کو ایسا صدمہ پہنچا تھا کہ اس کے بعد کئی سالوں سے نہ تو کسی نے اس کو بلند آواز میں کوئی لفظ بولتے سنا اور نہ ہی جلدی بازی میں کچھ کرتے دیکھا۔ وہ بڑی باوقار تھی۔ اور جابک بردار پان کی پیک تھوکنے والے باپ کے بالکل برعکس جس میں دوسرے اور عام کئی عیب تھے۔ لیکن سنگیت تو جتنا آپ کا ہے اتنا ہی میرا اور اگر ناچنے والیاں اس ہنر میں زیادہ ماہر ہیں یہ ان کا قصور نہیں بلکہ ہماری اپنی عورتوں کا۔

لڑکی کا نام ساوتری تھا اور وہ سب سے بڑی تھی۔ جنگ ختم ہوتے ہی لاٹ صاحب کی نجی سفارش سے اسے انگلستان بھیج دیا گیا تھا۔ اس طرح بالآخر کسی افسر سے اس کا بیاہ ہونا کوئی جنگ کی بات نہیں تھی چاہے وہ نوجوان بہت اچھے خاندان کا نہ بھی ہو۔ پولیٹیکل سروس میں ہونا آخر حکومتِ ہند کی انتہائی خاص اور اہم ملازمت میں ہونا ہی تھا۔ ایسے افسر بالکل انگریز یا مہاراجہ تو نہیں تھے لیکن بہرحال دونوں سے یکساں فاصلے پر تھے اور بعض اوقات پولو کھیلنے کی وجہ سے ان سے بہتر! وہ مہاراجاؤں پر حکومت کرتے تھے جو ہندوستانیوں پر حکمرانی کرتے تھے اور پھر انگریزوں کے کلب کے رکن بھی تھے۔ اس طرح شمالی ہندوستان کے "بیاہ بازار" میں ایک نائب ریزیڈنٹ اب بھی انتہائی عزت دار شخص سمجھا جاتا تھا۔ آخر میں انگریز گورنر کی نزدیکی سے سنگیت سے اور کچھ مہاراجاؤں سے بات بن ہی جاتی تھی اور پھر پنڈت نہرو بھی جب تک چاہیں اس کی چاند کھینچا سکتے تھے۔ کانگریس راج کی جے!

یہ کہانی اس قدر لمبی ہے کہ سنائی ہی نہیں جا سکتی۔ یہی بتانا کافی ہے کہ لڑکی رضامند نہیں ہوئی۔ وہ چھٹی پر گھر آئی اور لڑکے لڑکی نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ساوتری نے سمجھاؤ دیا کہ وہ اس کی چھوٹی بہن پٹیا وتی سے شادی کر لے۔ پھر بھی یہ طے ہوا کہ سگائی پرتاپ اور ساوتری کی ہو گی کیونکہ ساوتری ابھی چھوٹی تھی اور ہو سکتا تھا وہ اپنا ارادہ بدل لے۔ اگر کچھ

برسوں میں اس نے ارادہ نہیں بدلا تو پشپاوتی پرتاپ سے شادی کرنے کے لیے یقیناً تیار ہوگی۔ پشپاوتی کو پڑھائی کی کوئی خاص فکر نہیں تھی اسے چاہیے تھا ایک بڑا گھر اور ایک اچھی ساس۔ اور بس! پرتاپ کی ماں کو دراصل دوسری بیٹی پسند آئی لیکن پرتاپ نے پہلی لڑکی کو چُنا اور ایک مبارک ساعت پر ناریل اور قُم قُم کے ساتھ ساوتری کی پرتاپ سے باقاعدہ سگائی کر دی گئی۔ اس موقعہ پر ڈھول بجے اور خوب گانا بجانا ہوا۔ لکھنؤ، رام پور اور بنارس سے بہترین ناچنے والی آئیں اور سورج پور کے راجہ صاحب نے محل کے گنبد پر خاص روشنی کا اہتمام کیا۔ سگائی کا اعلان ہونے پر توپیں داغی گئیں اور دس سپاہیوں نے دستور کے مطابق مقررہ تعداد میں محل کے سامنے مارچ کیا۔ ہاتھی، گھوڑے سجائے گئے اور امبا دیوی کے مندر کو ہزار دیوں سے روشن کیا گیا۔ مقامی اسکول کے بچوں میں مٹھائیاں بھی بانٹی گئیں۔ کلا ملا کر سب متعلقہ لوگوں کے لیے یہ جشن بڑا شاندار تھا

جب کنبہ اپنے الہ آباد کے گھر میں لوٹا تو لڑکی نے پرتاپ سے ملنے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ یہ صرف رسمی سگائی تھی۔ کوئی وعدہ نہیں کیا گیا اور نہ کبھی کچھ ہوگا ہی۔ اس کے علاوہ اسے ہندوستان میں برطانوی حکومت سے بھی نفرت تھی حالانکہ انگریز ہندوستان چھوڑ رہے تھے، برطانیہ کے مزاج میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ پرتاپ نے خطرناک جنگ کے دوران چونکہ بڑی وفاداری سے انگریزوں کی خدمت کی تھی۔ یہ بات اس کے خلاف جاتی تھی۔ بیاہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس بات کے بعد کئی مہینے بیت گئے۔ پرتاپ کو لڑکی کا کوئی خط نہیں ملا۔ جب وہ کیمبرج سے پھر لوٹ کر آئی تو اس نے تب بھی یہی کہا کہ وہ پرتاپ سے نہیں ملے گی۔ اس مقام پر مجھے کہانی میں داخل ہونا تھا اور گتھی کو سلجھانا تھا۔ وہ اس سے ملنا کیوں نہیں چاہتی تھی۔ آخر کیوں؟

میں چونکہ یورپ میں رہتا تھا۔ اس لیے میرے یورپ میں رہنے اور فرانسیسی بیوی کا شوہر ہونے سے ان کی نظروں میں پیار محبت کو سمجھنے میں مجھے خاص حق حاصل تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ ایسا کچھ نہیں تھا۔ لیکن جب پرتاپ نے اپنے ساتھ مجھے راجہ صاحب کے گھر آنے کی دعوت دی تو میں جو چھوٹے چھوٹے راجاؤں مہاراجاؤں کی گھسی پٹی جھوٹی جدیدیت سے نفرت

کرتا ہوں، تھوڑی تشویش سے وہاں گیا۔ کمار ولا کی صورت حال میں بدذوقی تھی۔ میں چونکہ پہلے سے ہی اس کے لیے تیار تھا اس لیے وہاں پہنچ کر مجھے کوئی حیرانی نہیں ہوئی ۔ جدید ہندوستان کے بارے میں غلط ہونا قریب قریب مشکل ہے۔ اس کی اوپری پرت اتنی سطحی ہے کہ اس کے ہر جگہ ہونے کے باوجود اس کو ہٹایا جا سکتا ہے۔ صرف ببول کے ایک کانٹے سے بھی !

رانی صاحبہ نے ہمارا سواگت اس جدید طرز کے ڈرائنگ روم میں کیا جس میں کچھ پچھلے انگریز گورنروں اور مختلف مہاراجاؤں کی تیل کے رنگوں میں بنی ہوئی تصویریں آویزاں تھیں۔ دیواروں پر روی ورما کے سنگی طباعت کے نمونے بھی تھے جن کے گرد کاغذ کے پھولوں کے حاشیے تھے۔ شیر کی کھال بھی تھی تین جگہ بچھائی ہوئی۔ ان میں ایک شیر لگ بھگ ۹ فٹ کا ہوگا جس کو راجہ صاحب نے کماؤں میں مارا تھا۔ وہاں نوکر چاکر انگریزی بولنے والے تھے۔ ٹی سیٹ مضافاتی قسم کا تھا۔ انگریزی بھی بابوؤں کی سی انگریزی تھی۔ اور پھر ساوتری داخل ہوئی۔ اس کے موٹے چشمے والے لوگ مٹول چہرے سے اس کے عام ہندوستانی اور نچلے درمیانہ طبقہ کا فرد ہونے کے علاوہ کچھ ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ میں جنم سے برہمن تھا اور جنوبی ہند کا رہنے والا تھا اور فرانس ہو آیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس سے مجھے بہ آسانی اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔ اگرچہ پرتاپ مجھ سے چار پانچ سال بڑا تھا لیکن وہ ہر قدم پر بولتے بولتے اٹک جاتا اور میری طرف وضاحت اور تائید کے لیے دیکھتا۔ ایسا لگا میرے پتاجی کی موت چاہے اور کسی کام نہ آئی ہو لیکن پرتاپ اور ساوتری کو قریب لانے میں معاون ثابت ہوئی۔

ساوتری ایک جدید لڑکی کے انداز میں گھبراہٹ اور پھرتی کے ساتھ آئی اور میرے قریب بیٹھ گئی۔ وہ اس بات سے بڑی متاثر ہوئی کہ میں آل بجیاں سیاں پر تحقیق کر رہا ہوں۔ اس نے بھی تاریخ بطور مضمون پڑھائی کے لیے منتخب کیا ہوتا لیکن اس کے پتاجی نے انگریزی کی سفارش کی تھی۔ وہ انگریزی ٹرائی پوز (آنرز) کر رہی تھی۔ اس نے پوچھا کیا میں کیمبرج کے بارے میں جانتا ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ میں جانتا تو نہیں لیکن اگلی بار جب بھی میں لندن گیا تو پہلی فرصت میں وہاں جاؤں گا۔ میں نے اسے ایکس۔آن۔پروانس آنے کی دعوت دی۔ ولاسیانت آں کی ایک تصویر اسے دکھائی اور بڑے جذباتی انداز میں میڈلین کے بارے

میں باتیں کرتا رہا۔ میں نے بچّے کا ذکر نہیں کیا۔ ساوتری کے بارے میں اس دن کی جو عجیب بات مجھے یاد ہے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ وہ یہ ہے کہ ساوتری لڑکی تو بہت ہوشیار ہے لیکن کوئی ایسی بات نہیں کہتی جو واقعی اہم ہو۔ ہم دونوں میں ایک چیز مشترک تھی ہم دونوں سنسکرت جانتے تھے اور اُتّر رام چرتر یا رگھو ونش سے ایک دوسرے کا دل بہلا سکتے تھے۔

اس کی موجودگی نے تو کچھ نہیں کہا لیکن اس کی غیر موجودگی بول اٹھی۔ وہ جب ٹیلی فون پر بات کرنے گئی تو احساس ہوا کہ اس میں بھرپور فطری بانکپن ہے اور جی چاہتا ہے کہ وہ جلدی لوٹ آئے۔ مجھے وہ اچھی نہیں لگی۔ میں نے محسوس کیا۔ اس کے انداز ضرورت سے زیادہ جدید طرز کے تھے۔ وہ ابھی سے سگریٹ پینے لگی تھی۔ اگر مجھے ٹھیک سے یاد ہے تو وہ ٹیلی فون پہ ایک محفل رقص منعقد کرنے کے بارے میں بات کر رہی تھی۔ میں یہ سمجھنے میں قاصر تھا کہ شمالی ہند کے لوگ کس طرح عامیانہ جلد بازی سے پردے کی سخت پابندیوں کو توڑ کر دوسری انتہا پر پہنچ جاتے ہیں۔ ہم جنوب والے مقابلتاً زیادہ متین اور دیر آشنا تھے۔ چاہے یہ شرمناک ہی لگے۔ ہم لوگ روایت کے پابند تھے۔ ہمیں عدالتوں میں شنکرآچاریہ کی مثال دینے یا اپنی بیٹیوں کی پرانے رسم و رواج کے مطابق شادی کرنے میں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ بھلے ہی وہ غیر ممالک میں ہی نہ ہو آئی ہوں۔ بڑے بھائی کی اب بھی عزت کی جاتی تھی۔ میری بہنیں کبھی میرے ساتھ اس انداز میں بات نہیں کریں گی جس انداز سے ساوتری نے اپنے باپ سے کی تھی۔ راجہ صاحب صرف الوداع کہنے کے لیے ابھی ابھی آئے تھے۔ انہیں لگا ان کا ہونے والا داماد اور کنبہ اچھے لوگوں کے ساتھ تھے۔

جب میں گھر پہنچا تو چھوٹی ماں کو کیا بتا سکتا تھا؟ میں نے ان سے کہا میں ایک عجیب و غریب کنبے سے مل کر آیا ہوں اور بات کو وہیں ختم کر دیا۔ ہم دوسری زیادہ اہم چیزوں کے بارے میں بات کرنے لگے۔ میں نے انہیں ہردوار جانے کے بارے میں بتایا اور دہرہ دون اور ہمالیہ کی ترائی کی خوبصورتی کا ذکر کیا۔ جہاں سے گنگا میّا بنی نوع انسان کو پاکیزگی عطا کرنے کے لیے نکلتی ہے۔ آپ کے اندر اتنی ساری سنسکرت موجود ہو اور آپ کچھ محسوس نہ کریں۔ یہ ناممکن ہے۔

دیوی سریشوری بھگوتی گنگے !!
تینوں لوکوں کو بے کل موجوں سے بچانے والی
رتنوں کے سر پر چکر لگانے والا تیرا جل نرمل ہے
میرا من سدا تیرے چرن کملوں پر دھیان مگن رہے!

وینکٹ رمن بیتے دنوں اور میرے پتاجی کی باتیں کرتے رہے۔ انھوں نے بتایا کہ میرے پتا مجھ سے کتنا پیار کرتے تھے اور یورپ سے لکھے میرے کچھ خط انہیں دکھاتے ہوئے کتنا روئے تھے۔ میں نے پرُخلوص بننے کی کوشش کی۔ انہیں بتایا میرے دل میں ان کا بڑا احترام تھا لیکن ماں کی وفات کے بعد کچھ ایسا ہوا کہ وہ میرے جذبۂ محبت کو متاثر نہیں کر سکے۔ وینکٹ رمن کو میرے پرانے جملوں میں سے کچھ زبانی یاد تھے اور میں زبان کی اس سنگ دلی پر رو سکتا سکتا تھا۔ جزوی طور پر میڈلین کی دفاع کے طور پر تھے۔ میرا خیال ہے کہ میڈلین میرے پتاجی سے اس لیے نفرت کرتی تھی کیونکہ وہ مجھے مکمل روپ میں چاہتی تھی۔ وہ ہندوستان سے پیار کرتی تھی کیونکہ ہندوستان پیار کا جواز تھا۔ میرے پتاجی؟ ان سے کوئی پیار کیوں کرتا۔ وہ میری ماں کا احترام کرتی تھی۔ اور اس کی تصویر اس نے اپنے سونے کے کمرے میں آویزاں کر رکھی تھی جس میں ماں کے گھنے کالے بالوں کے بیچ مانگ نکلی ہوئی تھی اور ماتھے پر قمقم کی بڑی سی بندی تھی۔ یہ تصویر اس وقت اُتاری گئی تھی جب روگ اس کو اندر گہرائی تک کھا چکا تھا۔ پھر بھی وہ بڑی خوبصورت تھی۔ جی چاہتا تھا کہ سانس کی سہولت کے لیے ہی سہی اس کی ناک کی بُلاک اُتار لینی چاہیے۔ یہ بُلاک بھاری۔ بے تکی اور پرتصنع سی لگتی تھی۔

ماں کو مرے ہوئے ایک مدّت ہو گئی تھی۔ اور اب پتاجی چل بسے تھے۔ جب لوگ میرے وقار، بڑوں کے لیے میرے احترام اور زندگی کے بارے میں میری گہری سنجیدگی اور ان خوبیوں کے لیے میری تعریف کر رہے تھے جو مجھ میں نہیں تھیں تو چھوٹی ماں نے لکشما سے کہا تھا "صرف ایسی ہی ماں ایسے بیٹے کو جنم دے سکتی تھی۔ آپ لوگوں کو اس کی ماں کو یاد رکھنا چاہیے۔ سری دھر نے میری طرف ایسے دیکھا جیسے اس نے مجھ میں میری ماں کو پہچان لیا ہو۔

میں ہنس پڑا اور یہ بول دہرائے :

"وکپتر جائتا کوچِہ دپی کما تا سنجاو تو"

بُرا بیٹا تو کبھی پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن بُری ماں کبھی پیدا نہیں ہوتی !

جس دن ہمیں ہردوار کے لیے چلنا تھا۔ اس دن صبح مجھے دلی میں واقع نکس کی معرفت میڈلین کا خط ملا جس نے اسے کھولا نہیں میں جانتا تھا کسی واقعہ کے لمحہ وقوع میں ہی کسی واقعہ کی نوعیت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ اپنے ذہن کو ہم اپنا دھیان اس پر مرکوز کرنے دیں معنی درحقیقت معنی کے لیے بامعنی ہوتے ہیں میں نے لفافہ اپنی دائیں جیب میں رکھ لیا جہاں اس کی تمام چِٹھیاں رکھا کرتا تھا۔

اسٹیشن پر وینکٹ رمن اور ان کی بیٹی کومدی ہمیں چھوڑنے کے لیے آئے جب انھیں ہم الوداع کہہ چکے اور چھوٹی ماں نے اپنے آنسو پونچھ لیے تو سری دھر اِدھر اُدھر جھانکنے اور گنگا کے پل کے گارڈر دیکھنے لگا۔ اور پیچھے مڑ کر ماں کی طرف دیکھا یہ پوچھنے کے لیے اس کا مطلب کیا ہے۔ اچانک چھوٹی ماں سسکیاں بھرنے اور کانپنے لگیں وہ اس زور سے سسکیاں بھرنے اور کانپنے لگیں کہ میں اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا۔ پل پر سے گزر چکنے کے بہت بعد مجھے صورت حال کا اندازہ ہوا۔ غالباً پہلی بار ـــ انھوں نے محسوس کیا ـــ چھوٹی ماں نے محسوس کیا کہ پتاجی واقعی مر چکے تھے۔ شاید بچّے کی بڑی بڑی آنکھوں میں کچھ تھا یا شاید مدھر ممتا بھری گنگا میّا سے بچھڑنے کا دکھ تھا۔ کسی نے کہا تھا کہ یہ وہی ہے جو یگوں سے ہماری دُکھ بھری دھرتی۔ ہمارے دیس کا دُکھ سہتی آرہی ہے۔ ہماری اپنی ماؤں کی طرح گنگا ـــ گنگا میّا اپنی پوٹلی کو بغل میں دبائے گھاٹوں پر بیٹھی ہے۔ ہے پربھو! ہم نے اسے کتنی گندگی برداشت کرنے کے لیے مجبور کیا ہے۔

میں نے پھر "گنگا اشٹک" کا پاٹھ کیا۔ مہرشی بھٹ کی پوتی کے روپ میں پرورش پانے کے کارن چھوٹی ماں سنسکرت منتروں کے بارے میں بڑی حسّاس تھیں۔

کاشی کنٹھیترم، شریدم، ترِبھون جنم

اور ندی تٹ پر تمہارا جل، گنگا اور بھولوں سے پٹا ہے

جنہیں سویرے شام رشی وہاں بکھیرتے ہیں

ہماری پرارتھنا ہے

گنگا کی جل راشی ہماری رکشا کرے۔

میں منتروں کا اچارن کرتا رہا۔ تب جاکر میری سمجھ میں آیا۔ چھوٹی ماں کو پتاجی راکھ اور اور استھیاں یاد آگئی ہوں گی جن کو ہم نے بنارس میں گنگا کے پانی کے سپرد کردیا تھا۔ گنگا ہمارے راز جانتی تھی اور ہماری میراث کی محافظ تھی۔ گنگا کو چھوڑتے ہوئے انہیں محسوس ہوا تھا کہ سری دھر یتیم ہے۔

اگلے اسٹیشن کے بعد انھوں نے میری طرف یقین دلانے کے انداز میں دیکھا۔ میں جو وہاں تھا۔ جانشین، محافظ اور ساتھی۔ اب تک ایک مشترک دُکھ نے ہمیں ایک ساتھ باندھ دیا تھا اور غیر متوقع کے روزانہ دباؤ نے جس میں گھرے ہوئے دو انسان ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کے لیے مجبور ہوتے ہیں۔ سری دھر ہمارا ذریعہ تفہیم بن گیا تھا۔ ہم دونوں اس کے ساتھ کھیلتے تھے۔ وہ کتنا پیارا بچہ تھا۔ اور اس مشترک زبان کے ذریعے ہم ایک دوسرے سے گفتگو کرتے تھے۔ چھوٹی ماں بڑی شرمیلی اور خاموش طبیعت کی تھیں۔ میں کہا کرتا تھا وہ اس طرح بات کرتی ہیں جیسے وہ کسی دیوار یا پرندے یا پیڑ سے بات کر رہی ہوں۔ ایسا لگتا تھا وہ سدا اپنے آپ سے بات کر رہی ہوں۔ وہ مجھ سے کبھی کبھی خاموشی کے لمبے وقفوں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بات کرتی تھیں جنہیں وہ کم تعلیم یافتہ ہونے کے باعث بنا نہیں پاتی تھیں۔ لیکن لب و لہجے کے اعتبار سے ان کی آواز لامحدود تھی۔ سنگیت کے کسی پرانے ساز کی طرح جو کچھ ایسا شور وضع کرسکتا تھا جس نے صدیوں صدیوں تک بجتے رہنے کے باعث آواز کا مفہوم سمجھ لیا ہو۔ اور آواز خاموشی سے جنم لیتی ہے۔

چھوٹی ماں کی خاموشی اس قدر گہری اور فطری تھی کہ وہ اکثر آنکھیں موندے الگ تھلگ بے حرکت لیٹی رہتیں۔ اب وہ برتھ پر پھیل کر لیٹ گئی تھیں کیونکہ پورے ڈبے میں ہم اکیلے تھے اور سری دھر کو سینے سے لگائے لیٹی ہوئی وہ کم و بیش نیند میں تھیں جب بچہ ہلتا تھا تب وہ ہاتھ بڑھا کر ساڑھی کے پلّو سے اس کا سر ڈھانپ دیتیں۔ کچھ دیر بعد چھوٹی

ماں سوگئی ہوں گی کیونکہ ایک بار میں نے ان کا خرّاٹا سنا اور پھر وہ کئی گھنٹے تک نہیں جاگیں۔

اس بیچ مانڈو آڈیہہ، بالاپور، ہردت پور، راجہ تالاب، ہنگت پور اسٹیشن نکل گئے۔

چاروں طرف ہریالی سے گھرے، چھوٹے چھوٹے گاؤں، تالاب یا ٹیلے کے کنارے آگے پرانے پیڑوں کے جھنڈ تھے جو نسل کی روایت کی حفاظت کرتے لگتے تھے۔ یاد آتا ہے آریہ لوگ جب اس دیس میں پہلے پہل آئے تھے تب انھوں نے ان پیڑوں کے اجداد کے نیچے اپنا ڈیرا ڈالا تھا اور پاس میں بہتی گنگا ان کے لیے گیہوں کے ہرے بھرے پودے، تِل کی زردی اور گنے کا سونا لائی تھی۔ یہیں کہیں گارگی اور یاگیہ ولکیہ ٹہلتے رہے ہوں گے اور جلتی لکڑیوں کے الاؤ کے پاس یا ندی کی جانب اترتی ہوئی سیڑھیوں پر ہونے والے ان کے مباحث سے ہمارے فلسفے اور ہماری خالص، مکمل، بے مثال سنسکرت کی اعلیٰ، شاہانہ وقار والی وراثت کا جنم ہوا ہوگا۔ جس کے پاس سنسکرت ہے اسی کا اپنے آپ پر حق ہے۔

سگنل، جھنڈی اور گاڑی کی کھڑکھڑاہٹ ہمیں پوتّر، انتہائی مقدس ہمالیہ کی طرف لے گئے۔ جب میدانوں میں کام پورا ہو جاتا تھا اور تکمیل ذات کی ضرورت ہوتی تھی تو میرے آریائی اجداد برف سے عطا ہونے والی تنہائی اور حق کی تلاش میں یہیں اوپر گنگا میّا کے پاس آتے تھے۔ اس کے کہیں اوپر آسمان کو چھوتا ہوا کیلاش پربت ہوگا۔ جہاں نوع انسان کی خوشی کے لیے شِو اور پاروتی لیلا کر رہے ہوں گے۔ شِو کی سواری اور اس کا شاگرد، بے داغ بیل نندی اس وسیع ملک کے دیہات میں وہاں کے لوگوں کے دکھوں، ان کی پُر درد زندگی اور موت، مقدمہ بازی، جھگڑوں، ٹنٹوں اور ان کی کنگال پن کی کہانیاں سنتا اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا ہوگا۔ پاروتی یہ سب جان جاتی ہوگی کیونکہ نندی اپنے مالک کے ساتھ کبھی منہ کھول کر بات کرنے کی ہمت نہیں کر پاتا ہوگا۔ اور پاروتی شِو سے پرارتھنا کرتی ہوگی کہ یتیموں، گداگروں اور بیواؤں کو بھی زندگی کی چمک دمک ملنی چاہیے۔ کیا پتہ کب دروازہ کھل جائے اور سونے کی گٹھری تمہاری دہلیز پر پڑی ہوئی ملے۔

گنگا کا سارا میدانی علاقہ راہبانہ غم و آلام کا نغمہ ہے۔ ایسا لگتا ہے آغاز حق وہیں سے ہوا جہاں غم و آلام کو قبول کر لیا گیا۔ اور ہندوستان کا آغاز وہیں سے ہوا جہاں حق کو

قبول کر لیا گیا۔ لہٰذا دُکھ ہی ہماری ندی ہے، دُکھ ہی ہماری دھرتی ہے۔ لیکن ہمارے پیڑوں کی ہریالی اور پہاڑوں کی سفیدی اس بات کی تصدیق ہیں کہ حق ممکنات میں سے ہے اور جب جنم اور موت کا چکر پورا ہو جاتا ہے تو ہم خود اپنے حق ہونے کا اعلان کر سکتے ہیں۔ ہمالیہ سچ ہے اور گنگا انسانیت ہے۔ اس لیے ہم مرنے والوں کی استھیاں گنگا میں بہا دیتے ہیں۔ گنگا انہیں سمندر کو سونپ دیتی ہے۔ سورج پانی کو اس طرح گرم کر دیتا ہے کہ وہ بادلوں کا روپ لے لیتا ہے اور پھر ہمالیہ کی جانب لوٹ آتا ہے۔ برفوں اور ندیوں کی مانند جینے مرنے کا چکر ازلی و ابدی طور پر جاری و ساری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پوتر بدری ناتھ ہمالیہ کی اونچائیوں پر ہے۔ یہ اعلانِ حق کرتا ہے

مجھے پھر شنکر یاد آیا۔

برفیلے پربتوں پر جنمی دیوی منوّر اور روشن ہے
اس کے سُندر ہاتھ سُرخ پتّے کی طرح ہیں
یہ وہی ہے جس کی پناہ میں شِو کو آنے کی آرزو ہے
وہ اپنی چھاتیوں کے بوجھ سے جُھک گئی ہے
جس کی زبان میں مٹھاس ہے
جو ذہانت اور روحانی مسرت کی نرم و نازک بیل ہے

یہ اشلوک گاتے ہوئے میں ان عجیب و غریب کیفیات میں سے ایک ایسی کیفیت سے دوچار ہوا جو ہمارے وجود کو ہندوستان کی وسعتوں سے سرشار کر دیتی ہیں۔ ہم اپنے آپ کو بڑا اور لامحدود محسوس کرنے لگتے ہیں۔ دردمندی ہمارے دُکھ کو اس طرح چھونے لگتی ہے جیسے پلکیں جلد کو۔ وہ جو سب جانداروں کے عقب میں ہے اور ماورا ابھی ہمیں ایسا لمس، ایسے آنسو اور ایسی مسرت عطا کرتا ہے جو ہماری زندگی کے فطری عمل کو بڑا کومل بنا دیتی ہے۔ اگر ہماری ملکی حدوں کے پار وحشی نہ ہوتے تو ہندو پگھل کر اپنی فطرت میں سما گیا ہوتا۔ زنانہ میں محصور کچھ عورتوں کی طرح سفید پڑ گیا ہوتا اور اسے سب جگہ اپنی شان و شوکت ہی دکھائی دیتی۔ ممکن ہے وہ اپنی مردانگی کھو چکا ہوتا۔ لیکن بہرحال وہ گنگا کے گلزار میں کِھل رہا ہوتا۔

میرے خیالات جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ شدید طور پر ہندوستانی ہیں۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اب چونکہ دھیرے دھیرے شام اتر رہی ہے اس ماحول میں مجھے میڈلین کا خط پڑھنا چاہیے۔

اس نے لکھا تھا۔ "میرے دوست" خط مارچ سنہ ۱۹۵۱ء کی ۲۹ تاریخ کا لکھا ہوا تھا۔

"میرے دوست! اگر میں تمہیں بتاؤں کہ پچھلے سنیچر کو میں بنڈول گئی تھی تو کیا اس سے تمہیں دکھ ہوگا۔ مجھے بہر حال وہاں جانا ہی تھا۔ تم کبھی نہیں سمجھ سکوگے کہ پی ار کا جنم میرے لیے کیا اہمیت رکھتا تھا۔ تم اپنی مردانہ علیحدگی ہیں۔ میں یہ بھی کہہ سکتی ہوں اپنی ہندوستانی خلوت پسندی میں کبھی نہیں سمجھ سکتے کہ ماں کے لیے، اور وہ بھی ایک فرانسیسی ماں کے لیے بچے کو جنم دینا کیا ہوتا ہے۔ وہ تو یگیہ پاتر میں مقدس گریل میں دیوتا کا جنم ہوتا ہے۔ کوئی عیسائی ہو یا نہ ہو وہ اس جنم کو محسوس کرتا ہے اور جو عیسائی نہ بھی ہو اسے بھی اپنے ارد گرد دیکھنے پر اصطبل اور یسوع مسیح کے لیے نذرانے لاتے ہوئے مجوسی دکھائی دینے لگتے ہیں۔

"تمہارے بیٹے کو کیونکہ وہ پیار کی دین تھا میں نے اتنے پیار سے جنم دیا تھا! لیکن ہماری دلچسپی اس کے تمہارا بیٹا ہونے میں زیادہ تھی۔ نہ کہ میرا بیٹا ہونے میں ایک ہندوستانی کے لیے عورت ہمیشہ ذریعہ ہی رہے گی ایک ضمنی مسئلہ۔ لیکن میں اپنے بیٹے کو تجھی سے چاہنے لگی تھی جب سے وہ اندر ہلنے جلنے لگا تھا کیونکہ وہ تمہارا بیٹا تھا تم اس کے مستقبل کے بارے میں سوچتے تھے۔ میں اس کے حال کے بارے میں تم نے مجھے بتایا تھا کہ بچے کو ہیرو، عقل مند ڈاکٹر یا گرامر کا ماہر وغیرہ جیسا بھی بنانا ہو ہندوستان میں الگ الگ منتر مخصوص ہیں اور خوراک بھی! لیکن میں اسے صرف مرد بنانا چاہتی تھی۔ اپنا بیٹا!

"ہمارا غیر شخصی رویہ میرے لیے بڑا عجیب تھا۔ تم خود بھی بڑے غیر شخصی تھے۔ انہیں خصوصیات کے کارن میں تم سے پیار کرتی تھی کیونکہ تمہیں چھونے سے مجھے لگتا تھا کہ میرے وجود میں پہاڑوں کی ہوا، اونچائیوں پر لہلہاتے شہد آگیں صنوبر کے پیڑوں اور دھن چھٹنے پر لوبان کی، خوشبو سرایت کر رہی ہے۔ تمہارا دل ایک پہاڑی ندی کی طرح تھا۔ اور اس کی نرمی اور ملائمت بالکل پوتر تھی۔ مجھے اس میں نہانا اچھا لگتا تھا۔ لیکن یہ بات ایک یورپی کے لیے انتہائی تکلیف دہ، انتہائی اشتعال انگیز ہے۔ تم لوگ نہ نظر آنے والی شے کے لیے

جذباتی ہوجاتے ہو۔ ہم نظر آنے والی شے کے لیے، میرے لیے تم نظر آنے والی ایک ایسی شے کی طرح تھے جیسے ٹھوس، واضح طور پر نظر آنے والی میرے پہلو میں موجود مجسم شے۔ میرے شوہر کا روپ دے دیا گیا ہو۔

'میرے دوست' میرے شوہر۔ تم کبھی نہیں سمجھوگے کہ تمہارے بچے کو اپنے پہلو میں لٹانا میرے لیے کیا اہمیت رکھتا تھا۔ جب وہ میرے سینے سے چمٹا ہوتا تھا میں اس کو ہزاروں لاکھوں ایسی احمقانہ باتیں بتاتی تھی جو تمہیں بتانا چاہتی تھی لیکن بتا نہیں پاتی تھی۔ تم سادہ سی شے کو بہت بڑا بنا دیتے ہو اور ہر انسانی شے تمہارے سامنے مضحکہ خیز لگتی ہے۔ تمہیں یاد ہے ایک دن ہم کتنا ہنسے تھے جب تم نے مجھ سے کہا تھا "میڈلین تم اپنی جلد پر وہ ذلیل سا پاؤڈر۔ کیمیاوی مرکب کیوں چھڑکتی ہو۔ یہ ہماری جلد کو اس سے زیادہ خوبصورت نہیں بنا سکتا جتنی یہ فطری طور پر ہے۔ مجھے اس کیمیادی سفوف کو چھونے سے نفرت ہے۔ مجھے وہی اچھا لگتا ہے جو حقیقی ہے، فطری ہے"۔ تب میں نے تمہارے سامنے عورتوں والا جھوٹ بولا تھا۔ میں نے کہا تھا "ہمارے یہاں کی آب و ہوا میں اس سے جلد محفوظ رہتی ہے"۔ میرے جواب سے تمہیں بڑا اطمینان ہوا تھا۔ تم اتنے ہی ظالم تھے جتنے تم ہندو بیوی کے لیے ہو سکتے تھے۔ لیکن کچھ مہینوں کے بعد جب میں نے تمہیں سچ بات بتادی تو ناراض ہونے کے بجائے تم اپنے آپ پر دیر تک مسلسل ہنستے رہے۔ پیارے رام، تم عورت کو بالکل نہیں سمجھتے۔ تمہیں بے وقوف بنانا کس قدر آسان ہے! میں سمجھتی تھی میں معصوم ہوں لیکن تم تو مجھ سے بھی بڑے احمق نکلے۔ اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں کہ چچا چارلس سمجھتے ہیں کہ میں ایسے ہی شوہر کی مستحق تھی جو میں نے ایسے عجیب و غریب مرد سے شادی کر لی"۔

پالنے میں بچہ۔ پالنا روم ساگر کے سامنے اور روم ساگر ہماری تہذیب کا پالنا۔ رام، میں نرسنگ ہوم میں ایک کے بعد ایک رات سوتی ہوئی پی آر یا تمہارے بارے میں نہیں سوچتی تھی بلکہ دے مے تر اور پوسے دون اور یولی سس کے سفر کے بارے میں سوچتی رہی۔ اصل میں شروع میں میں نے سوچا کہ کرشن کا دوسرا نام یولی سس ہوگا۔ میں نے اپنی زبان میں ان ناموں کا ذائقہ لیا ــــ کرشن۔ یولی سس، راما سوامی لغو۔ لغو۔ بے معنی۔ کسی نے مجھ سے

کہا لیکن میں اکثر انہیں دہراتی رہی۔ یہ سوچ کر کہ مانوس ہونے سے یہ ٹھیک لگنے لگیں گے لیکن نہیں وہ نام بالکل بے تکا سا لگتا تھا۔ پھر مجھے اکیلز کا خیال آیا۔ جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا تھا۔ اکیلز نام کا ایک ملازم تھا کلینک میں۔ لیکن پھر میں نے سوچا برہمن کے بیٹے کے لیے یہ نام کچھ زیادہ بلند آہنگ ہوگا۔ خیر کوئی جلدی نہیں تھی۔ کرشن، کرشن ہی تھا۔ کرشن، کرشن، کرشن میں نے اپنے آپ سے کہا جس طرح کوئی کسی منتر کا جاپ کرتا ہے۔ اور میرا وجود خوشی سے بھر گیا۔ اس کا رنگ تانبے جیسا ہوگا اور تم جیسی۔ اس کے انگ ویسے ہی ہوں گے جیسے تمہارے انگ لیکن تمہارے جیسے موٹے ہونٹ اور تمہارے جیسی ناک نہیں ہوگی۔ اگر اس کی ناک تھوڑی میری ناک جیسی ہوئی تو اس کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ میں نے کسی انجانے دیوتا کے سامنے بار بار پرارتھنا کی کہ ہونے والا بچہ لڑکا ہو۔ میرا یا تمہارا نہیں۔ بس ہمارا بیٹا۔!

ایک رات، اس کے جنم سے پہلے کی رات تیز مسترال سے آسمان صاف ہو گیا تھا اور ہم کورسکا تک کا منظر صاف دیکھ سکتے تھے۔ دور بہت دور جگمگاتی ہوئی کشتیاں افق کے پس منظر میں روم ساگر کے پار جارہی تھیں۔ شاید افریقہ کی جانب یا پھر دور امریکہ کی طرف۔ دنیا چل رہی تھی۔ ہر جگہ مچھلی پکڑنے کے کام آنے والی کشتیاں تھیں کیونکہ مچھلیاں چاندنی رات کو ہی سطح پر آتی ہیں۔ پہاڑی ڈھلوان پر زیتون کے پیڑ تھے۔ اور ہوٹل دولے کے مینار سے لگا سرو کا تنہا درخت تھا۔ میں نے یہ سارا منظر دیکھا اور سوچنے لگی میں کون ہوں؟ اور وہاں کیا کر رہی ہوں؟ تم دور ہوٹل میں تھے۔ بعد میں میں نے اس خواب کے بارے میں بتایا جو میں نے اس رات دیکھا تھا۔ اپنے ہاتھوں میں پھل اور ڈنٹھل اٹھائے ایک نہ نظر آنے والے سمندر میں سے دمے تے آر ایسے ابھری جیسے وہ کسی ٹھوس شے کے بجائے ریشمی دھاگے سے بنی ہوئی ہو۔ ایسے محسوس ہوا جیسے تم اس کے آر پار دیکھ سکتے تھے۔ وہ اپنے آپ میں غائب ہو سکتی تھی۔ جس طرح کچھ پرندے اپنے نرم پروں میں اپنے چہرے چھپا لیتے ہیں۔ کیا تم وہ سندر ہو میرک بھجن جانتے ہو — دمے تے آر کرو تو دو فو۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا — اور وہ تو، یوسے دُوں، کی بیٹی بھی نہیں۔ لیکن سمندر بڑا مبارک تھا اور ساری کائنات۔ عام سی خوشی سے سرشار تھی۔ کوئی غم نہیں تھا۔ کسی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ نہ موت نہ انسان کو کوئی دکھ۔

فصلیں اُگ رہی تھیں۔ دیوتا کھیل میں مگن تھے۔ وادی بنسری کے سنگیت سے لبریز تھی۔ لڑکیاں قربان گاہوں کے سامنے رقص کر رہی تھیں۔ ہر جگہ پھول ہی پھول تھے۔ گلاب، کروکس، وائلٹ اور نرگس کے پھول۔ فطرت کی وسعتیں حُسن سے سرشار تھیں اور میں خوش تھی۔ پیارے رام ایسی خوش جیسی اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔

اگلی صبح پانچ بجے دردِ زہ شروع ہوگیا اور ۱۱ بجے تک بچّہ پیدا ہوگیا۔ اسے دیکھ کر نہ مجھے خوشی ہوئی نہ کوئی افسوس اور جب میں نے تمہارا دمکتا ہوا چہرہ دیکھا تو سوچنے لگی کہ مجھے جس گوشت کے لوتھڑے نے اتنی اذیت پہنچائی اسی نے تمہیں اتنی مسرت کیوں عطا کی؟ کیونکہ یہ صرف بچّہ نہیں تھا، ایک بیٹا، تمہارا اور میرا بیٹا۔ بلکہ یہ تو تمہارا جانشین تھا۔ میرے لیے یہ محض ایک شے تھا کوئی چیز۔ لیکن اچانک جب میں اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا اور اسے اپنے سینے سے لگایا تو پل بھر میں ساری کائنات روشن ہوگئی۔ جنم، میلاد مسیح۔ میں پھر کہتی ہوں۔ میلا اور صرف ایک جنم۔ خوشی کا بڑا افتخار ثبوت۔ جی ہاں پی اُو میرے لیے مجسم مسرت تھا۔ اس نے مجھے سُکھی نہیں بنایا تھا۔ وہ اس بات کا ثبوت تھا کہ انسان ہے۔ وہ سُکھی نہیں ہوسکتا۔ لیکن بذاتِ خود خوشی ہوسکتا ہے۔

سمندر کی جانب اُترتی ہوئی ڈھلوان پر اب بھی زیتون کے پیڑ جلوہ گر ہیں۔ اکیلزاب بھی باندل میں موجود ہے لیکن اب وہ ویٹر بن گیا ہے۔ امیر انگریز فرانس کے جنوب میں بچے پیدا کرنے کے لیے اب نہیں آتے۔ میں بندرگاہ تک گئی۔ گھاٹ اب بھی بنا مرمت پڑا تھا۔ جیسا کہ وہ جرمنی اور اٹلی کے قبضے کے دوران تھا۔ میں نے اسی جگہ سے ٹیز اور ریت کے پھول خریدے جہاں سے تم کہتے تھے تم میرے لیے ہر صبح تازہ ٹیولپ خریدا کرتے تھے۔ میں ایک بار پھر باندل میں جاکر سونا چاہتی تھی اس لیے تمہارے ہوٹل ' دبیش آ ' گئی اور اپنے لیے وہی پرانا کمرہ لیا۔ ویٹرن نے میرا نام نہیں پہچانا۔ شاید اس نے سوچا یہ کوئی روسی نام تھا۔ میں نے ٹیولپ گلدان میں سجا دیئے۔ کار کو گیراج میں رکھا اور گھومنے کے لیے دوبارہ رات کے اندھیرے میں نکل گئی۔ میں دُکھی نہیں تھی۔ میں تو صرف خالی خالی تھی۔ کیا میں دُ دے مے تے آر کو پھر دیکھ سکوں گی؟

چاند اب بھی آسمان میں موجود تھا۔ میں نے اپنے آپ کو کافر محسوس کیا۔ کاش یہاں ایک السں کاں ہوتا جیسے آر ل ین ہے اور میں اپنے مرے ہوئے بیٹے کے لیے ایک خوبصورت کتبہ تحریر کرسکتی۔ وہ کچھ اس طرح ہوتا: وہ سرو کے پیڑ کا بیٹا تھا۔ وہ کسی حرف کے جزو کا بیٹا تھا۔ وہ جو خاموشی کی، مجسم نسوانیت کی مجسم عورت کی اولاد تھا۔ یہ یا ایسا ہی کچھ اور۔ رام وہ تمہارے جیسی خاموشی اور سکون لیے ہوئے تھا اور اس کے بالوں میں اجوائن کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔"

"یونانی دیوتا حسد کرتے ہیں۔ انہیں خوشی سے حسد ہوتا ہے۔ میری منت کے میرے چڑھاوے کا کوئی جواب نہیں ملا۔ کوئی دے مے تے ار چوگان اور پردے کے ساتھ نمودار نہیں ہوئی اور نہ ہی سمندر نے کوئی ٹوٹا ہوا تختہ ابھارا جس پر طفلِ زریں پایا جاسکتا تھا۔ ساحل سمندر پر پینی لوپ کی طرح بیٹھی میں جال بنتی رہی۔ تم کب آؤ گے۔ میرے یولی سیس؟

عجیب بات ہے رام! آج کل میں اکثر چرچ جاتی ہوں۔ مجھے کھنڈر پسند ہیں۔ خاص طور پر کیتھیڈرل یا چیپل کے کھنڈر یہاں راستے میں میں سیاں میکسمیاں کے پاس سے گزری اور ڈومینیکن مونسٹری دیکھی۔ میں چیپل دے خیا کوملی لے تور میں عشائے ربانی کے لیے گئی اور اس سے میں دل کی گہرائیوں تک متاثر ہوئی۔ میں اِدھر اُدھر گھومتی رہی۔ میں حجرے میں بھی گئی اور میری میڈلین کے مقدس تبرک کا بھی دیدار کیا۔ لوبان کی خوشبو جو میرے لیے تکلیف دہ ہوا کرتی تھی مجھے اب کرب آمیز مسرت عطا کرتی ہے۔ مجھے گھٹنوں کے بل جھکنے سے نفرت ہے۔ پھر بھی میں کبھی کبھی گھٹنوں کے بل آدھی جھک جاتی ہوں۔ مجھے یاد آتا ہے میری ماں ہمیشہ کہا کرتی تھی "گھٹنوں کے نیچے روئی رکھے بنا کبھی مت جھکو۔ خدا جانے وہاں کون سی بیماری کے جراثیم ہوں"۔ مجھے اب بھی جراثیم سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ میں ہندوستان کو کیسے برداشت کرسکوں گی۔

"تم کہتے ہو تم اپنی ماں کے ساتھ بنارس جا رہے ہو۔ بنارس کے بارے میں میں صرف اتنا ہی جانتی ہوں کہ وہاں انسانی گوشت کے تیرتے ہوئے لوتھڑے ہیں، مُردوں کی چتائیں ہیں۔ اور یہ کہ گنگاجل کا جب کیمیاوی امتحان کیا جاتا ہے تو اس میں جراثیم کا نام و نشان نہیں ہوتا۔

مجھے سیاں ماکسمیاں جانے سے اگرچہ نفرت ہے۔ میں تمہارے بغیر چرچ نہیں جاسکتی تھی۔ میں سدا تمہیں اپنے ساتھ محسوس کرتی تھی اور اکثر مڑکر دیکھتی تھی کہ اتفاقاً تم کہیں اچانک لوٹ تو نہیں آئے اور مجھے اکیس میں نہ پاکر اپنی شدید کیفیت وجدان میں میرے پیچھے آگئے ہو ان دونوں ہوائی جہازوں کے باعث ہر چیز ممکن ہے۔ رام، اکیلی عورت کس قدر دکھی ہوتی ہے۔ مرد کے بغیر کسی بھی عظیم یا مقدس چیز کو نہیں دیکھ سکتی۔ ہندو صحیح ہیں بھگوان کے پوجا استھان تک مرد ہی کو عورت کو لے کر جانا چاہیے۔

رام، میں تمہیں پیار کرتی ہوں۔ عجیب و غریب دُور کا، پچھتاوے سے آزاد پیار! بھلا یہ میں تمہیں پیار کرتے ہوئے کہتی ہوں۔ میں دراصل تمہیں پیار نہیں کرتی ہوں۔ کاش مجھے پیار کی یقین دہانی ملتی کہ میں تمہاری پاکیزگی۔ تمہاری اندرونی قوت کے باعث تمہیں پیار نہیں کرتی۔ اس دیوار کے، اس پتھر کی دیوار کے باعث جو کبھی نہیں گرے گی۔ جو مجھے دھوکا نہیں دے گی جیسا کہ بلوار سیاں جرمیاں میں ایک جیوتشی نے بتایا تھا۔ میں سوچتی تھی کہ کیا میں واقعی پیار کر سکوں گی؟ کیا کوئی بھی شخص تمہارے جیسے مجرّد صفت انسان سے محبت کر سکتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے تم یہیں ہو اور مجھے اتنی خوشی ہوتی ہے یہ سوچتے ہوئے کہ جب تم مجھے صبح سویرے کافی کا پیالہ دو گے تو میں کم و بیش گاتی ہوئی سی کالج پڑھانے جاؤں گی۔ حالانکہ تم انتہائی اعلیٰ، شریف النفس، اور غیر انسانی قسم کے شوہر ہو لیکن میں سوچتی ہوں کیا ہندوستانی کسی سے پیار کر سکتے ہیں؟

میں کر سکتی ہوں! اس لیے میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ میرے نوجوان پیارے دوست، میرے محبوب! میرے پریتم!" میڈلین۔

پس نوشت: میں دیکھتی ہوں اور حیران رہ جاتی ہوں کہ میں کبھی کبھی کیسے ہندوستانی بن جاتی ہوں۔ ہندوستان انتہائی اثر آفریں پُراسرار اور اثر آفریں ہے۔!"

ہندوستانی ریل گاڑیاں بھی منتروں کا جاپ کرتی ہوئی لگتی ہیں" نمستے، تو ندگے، بھنگے، ہری، ہری، رام، ہری، رام۔ رام ہرے اور پہاڑیوں کی بلندیاں طے کرتے ہوئے ــــ شو، شو، ہر، ہر، شو، شو، ہر۔ اور صبح ہونے تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ رات جلد ہی ختم ہو گئی۔

بچّہ ایک یا دو بار جاگا ہوگا۔ چھوٹی ماں نیند میں کچھ نہ سمجھ میں آنے والے لفظ بڑبڑائیں۔ ایسا لگتا تھا وہ کہہ رہی ہے "سروجا مجھے ایک گلاس صاف پانی لاکر دو۔" پھر خاموشی چھا گئی، اسٹیشنوں کی لمبی خالی خاموشی، خوانچے والوں کی بلند آوازیں۔ یاتریوں کی آوازیں اور پھر پربتوں کی طرف چڑھائی کا سفر۔ ڈبّے میں سردی بڑھ گئی تھی۔ میں چھوٹی ماں کے ننگے پاؤں کو ڈھانپنے کے لیے اُٹھا۔ وہ جاگ رہی تھیں۔ کہنے لگیں "اوہ تمہارا اس طرح کھانسنا سُن کر مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔" کیا میں کھانس رہا تھا؟

جب ریستوراں کار کا بیرا ہمیں جگانے آیا تو سویرے کی دھند کھڑکی کے شیشوں پر چھائی ہوئی تھی۔ کافی گرم تھی لیکن بہت خراب تھی۔ ہمالیہ کے برچ اور دیودار ہمارے سامنے پھیلے ہوئے تھے۔ جنگل میں دُور دُور بنے ہوئے بنگلے بھی نظر آئے۔ کبھی کبھی ریل گاڑی سے خوفزدہ ہوکر ہرنوں کی پوری کی پوری ڈار جنگلی تالابوں کے اوپر سے پھلانگ جاتی۔ طوطوں کی گردنوں پر پتلی سی پیاری زرد دھاریاں تھیں اور اُوپر سادہ، باشعور اور آواز سے گونجتے ہوئے ہمالیہ کے پہاڑ فروزاں تھے۔ ایک چھوٹی سی ندی کے روپ میں گنگا دھیرے دھیرے ہماری مخالف سمت میں بہہ رہی تھی لیکن اس کی تازگی بڑی بھرپور تھی۔ چاہے جوان ہو یا عمر رسیدہ ــ گنگا ہمیشہ سے فہم و دانش سے سرفراز رہی ہے۔ اگر دانش پانی کی صورت اختیار کر سکے تو وہ پانی گنگا کا ہی ہوگا۔ سات سمندروں کی طرف بہتی ہوئی گنگا!

پیڑوں کے پتّوں کے ننھے منے جھروکوں کے درمیان یا ہرنیوں کی چال میں کہیں ہردوار کے پربتوں کی خاموشی میں مجھے ایک نئے علم کا احساس ہوا۔ میں نے غیر موجودگی کو محسوس کیا۔ میں نے سوچا پربت سب کچھ جانتے ہوں گے اس لیے میں نے اُوپر پل اور اس پہاڑی راستے کی طرف دیکھا جو بیرڑھ کے پیڑوں میں سے بیچ در بیچ گذرتا ہوا رشی کیش اور بدری ناتھ کی طرف نکلتا تھا۔ برف کی تہوں کے پار گنگوتری ہے جہاں پوتر ماں نے جنم لیا تھا جہاں سے وہ شروع ہوئی وہیں سے وحشی پن بھی شروع ہوا۔ تبت اس کے پرے ہے جہاں سے ہنا برہم پتر ندی وحشی پن کی پرورش کے لیے ہمالیہ کی گھاٹیوں کو کاٹ کر اپنا راستہ بناتی ہے اور پھر گنگا سے مل کر پوتر ہوجانے کے بعد مشترکہ طور پر سمندر میں جا گرتی ہے۔ دوئی غیر ہندوستانی

ہے۔ وحدت اثباتِ حق ہے۔

میں نے گنگا میں ڈبکی لگائی اور اپنے آپ کو اتنا پوتّر محسوس کیا کہ مجھے حیرانی ہونے لگی کہ کوئی مر بھی سکتا ہے یا لڑائی کے میدان میں جا سکتا ہے یا لوگ رو سکتے ہیں یا ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کا گلا یا اعضائے تناسل کاٹ سکتے ہیں۔ دراصل ہر دوار میں مقیم معصوم شرنارتھی ایک غیر مذہب کی بربریت دیکھ چکے تھے۔ ہمالیہ کے پاس گنگا میں ڈبکی پر ڈبکی لگا کر شاید فراموش اور اغوا شدہ لوگوں کے لیے پچھتاوہ کیا جا سکتا تھا گنگا میں اشنان سے مرے ہوئے لوگوں کے لیے بھی کفّارہ کیا جا سکتا ہے۔ پی ار کبھی نہیں مرا میں اپنی جانگھوں میں اب بھی اسے محسوس کر سکتا تھا۔

اگر آپ کو اپنی 'موجودگی' کا احساس ہے تو دنیا میں کوئی غیر موجودگی نہیں ہے۔ پہاڑ ایک ایسی غیر موجودگی کی گونج عطا کرتے ہیں جو اوّلین نوعیت کی ہے۔ ایک جزوِ حرف، ایک نام کی طرح!

شام کو ہم دہرہ دون چلے گئے۔ اگلی صبح میں چھوٹی ماں کو مسوری لے گیا۔ اور ہیملٹن پوائنٹ سے انہیں برف سے لدی چوٹیاں دکھائیں۔ چوٹیاں، برہنہ گلیشیر اور آسمان کا متکلم خالی پن۔ سب اپنی سادگی میں سفید بے داغ اور خوبصورت تھے۔ سری دھر اپنی ماں کی چھاتی سے یوں چمٹا ہوا تھا جیسے وہ کوئی ایسی بڑی شے دیکھ رہا ہو جو اس کی سمجھ سے باہر ہو۔ اور چھوٹی ماں بس کوئی پرارتھنا کرتی جا رہی تھیں۔ جب وہ کسی چیز سے متاثر ہوتیں تو ہمیشہ کوئی بھجن گا کر ہی اپنے آپ کو سمجھ پاتیں۔

بعید اور پُر ہیبت ہی بالآخر آسمانی ہے۔ یہی جسم اور ذہن کی حدوں کو ختم کرتا ہے۔ بلکہ ذہن اور جسم کی حدوں کو۔! اور ہمارے اس وجود کے پس منظر کا انکشاف کرتا ہے جو ابھی ظہور پذیر نہیں ہوا اور شفّاف بے داغ ہے۔ یہی وجہ ہے شو ہمالیہ میں نواس کرتا ہے۔

اس کے بعد کیا ہوا اس کی مجھے صرف دھندلی سی یاد ہے چھوٹی ماں نے اور میں نے پربتوں اور گنگا کو انتہائی دکھ سے الوداع کہا۔ ہمیں محسوس ہوا جیسے ہم اپنے معزز رشتہ داروں کے مہمان تھے اور اب ہمیں ان سے الگ ہونا پڑ رہا تھا۔ ان کے پیروں کی

خوشبو اب بھی ہمارے نتھنوں میں تھی۔ گنگا میّا نے اپنے پیروں میں پوری طرح ہلدی کا پیلا رنگ رچا رکھا تھا اور ہماری شاموں کے پھول اس کے بالوں میں سجے ہوئے تھے۔ ہمالیہ پربت خود شو کی طرح تھا۔ بعید اور پراسرار لیکن اس کے باوجود اس مقام پر اس قدر جانا پہچانا جہاں انسان کوئی وجود ہی نہیں رکھتا۔ وہ ایک ایسے خلا کی طرح تھا جسے بکلم عطا ہوگیا ہو آپ کے روبرو نہیں بلکہ آپ کے پیچھے۔ یہ آپ کو اچانک جنم لینے والی خاموشیوں میں سے گزرتا ہوا آپ کی ذات کی ان لامحدود گہرائیوں تک لے جاتا تھا جن سے آپ واقف تو تھے لیکن جن کا روحانی طور پر ادراک نہیں کر سکے۔ ہمالیہ کسان اور برہمن کو احساس وسعت عطا کرتا ہے۔ ایسی وسعت کا احساس جس کا تعلق زمینی مقصد یا خواہش سے نہیں ہے بلکہ غیر شخصی مرتبے سے ہے۔ ایک ایسے فرد کے مرتبے اور قد و قامت سے جو اپنی گہری نیند کی نوعیت سے واقف ہے۔ جیسا کہ ہر یاتری جانتا ہے گہری سے گہری نیند میں بھی انسان اپنے روبرو عالم بیداری اور مکمل عالم بیداری میں ہوتا ہے۔ اور ہمالیہ پربت وہ نیند جو عرفان کا مرتبہ اختیار کر گئی تھی۔

ہمارے ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی پُر سکون ندیاں بہہ رہی تھیں۔ ان کے پہلو میں تنگ گھاٹیاں تھیں۔ ان تنگ گھاٹیوں سے اُترتے ہوئے ایک ایسی معصومیت کا احساس ہوتا تھا جو عظیم کہسار کبھی عطا نہیں کرتے۔ آپ واقعی محسوس کرتے ہیں کہ نہ تو چیتا اور نہ نوچ ڈالنے والا ریچھ، نہ اژدہا اور نہ ہی خار پشت سیہہ معمولی سے معمولی چوٹ پہنچا سکتا ہے۔ جیسا کہ رزمیہ نظمیں کہتی ہیں اس مبارک پناہ گاہ میں ہرن اور شیر ایک ہی گھاٹ پر پانی پیتے ہیں اور گیدڑ اور ہاتھی میں دوستی ہے۔ پھر بھی کوئی یہ نہیں بھول سکتا کیونکہ اخبارات ہمیں بھولنے نہیں دیتے کہ دہرہ دون کے پاس ترائی کے علاقے میں آدم خور آزادانہ گھومتے ہیں اور دیہات کے رہنے والوں کو دبوچ کر اس طرح آسانی سے لے جاتے ہیں جس طرح موسم بہار میں کھنجن پکشی کو پکڑ لیتے ہیں۔ اس لیے حکومت کہتی ہے چیتے کو مارو اور پانچ سو روپے لو۔ پھر بھی پیڑوں کے نیچے ہرن کیسے پالتو اور "دانش چشم" لگتے ہیں اور جب مور رقص کرتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ دنیا بنسی کی دھن سے مگن ہوگئی ہے۔

اے کنہیا! تم جو حسنِ سیرت کا منبع ہو، میں کہاں جاؤں، کہاں
جب بانسری کی دُھن سنائی دے رہی ہو اور گائیں تمہارے پاس آ رہی ہوں
میں کہاں جاؤں، کہاں؟

میرآ سراسر شمالی ہندوستان کی ہیں۔ وہ راجپوت شہزادی بھگوان کے تئیں، شری کرشن کے تئیں اپنے کنہیا کے تئیں ایسا رویّہ رکھتی ہیں جو کسی راٹھور راجپوت کے تئیں ہو سکتا ہے۔ وہ اس کے ہودے کے ہیرے جواہرات گن سکتی تھیں۔ اس کی انگوٹھی کی تعریف کر سکتی تھیں کہ جب شاہی سواری نکلے تو رسالا اور تیز چلے اور نقّارہ بجے۔ تالاب اور محراب دار راستے پر ہاتھوں میں تُم تَم، جل، ناریل اور پھول لیے عورتیں اپنے درمیان اس مہان دیوتا، اس عالی مقام کا، اس عظیم موجودگی کا خیر مقدم کریں۔ تالابوں میں اچانک کنول کے پھول کھل اٹھیں، طوطے یکایک گیت گانے لگیں: ہری آ گیا، بہن ہری آ گیا، مور اپنے پر نوچ کر اسے پیش کریں تاکہ وہ ان کے پروں کا تاج بنا کر اپنے سر پر پہن لے سنگیت کی دُھن سُن کر جیسا کہ راجپوت اسکول کی پینٹنگز میں دکھایا گیا ہے۔ کالے ہرن اس کے پاس چلے آئیں۔ ان کے سر اُٹھے ہوئے اور کان پیچھے کی جانب مڑے ہوئے بانسری کی دُھن کو سُنتے ہوئے۔

مراری، میں تمہارے لیے اپنے دل کا مکھن لائی ہوں
جب چتا تیار ہو جائے تو بھگوان تمہیں اسے آگ دینا
میری راکھ تمہارے ماتھے کا ٹیکا بن جائے۔

لوٹتے ہوئے مراد آباد پر گاڑی نے جھٹکے سے مین لائن کو چھوڑ دیا اور ہمیں دہلی لے گئی۔ وہاں سبز اور کنواری جمنا نے ہمارا سواگت کیا۔ گنگا کی بہن میں روپ نہیں بلکہ اس کی بیٹی کالندی نندنی کے روپ میں دہلی میں بڑا دکھ تھا۔ سڑکوں پر شرنارتھی پھیلے ہوئے تھے اور بے پناہ گندگی تھی۔ اور جو کچھ سرحد پر بیتا تھا سُننے کو اس کی باتیں تھیں۔ مائیں اپنی بیٹیاں کھو چکی تھیں۔ اور مرد اپنی بیویاں اور جب دِمنر کمیشن اغوا شدہ عورتوں کو واپس لانے کے لیے گیا۔ ان میں سے کچھ ایک نے مذاق اُڑایا: "تم ہمیں بہنیں کہتے ہو۔ اے عزت دارو!

ہم تمہاری کہاں کی بہنیں ہوگئیں۔ مسلمان ہمیں اٹھا کرلے گئے اور اب ہم ان کے حرم میں ہیں۔ وہ ہمارے ساتھ ان بزدلوں سے بہتر سلوک کرتے ہیں جو اپنی جان بچانے کی خاطر ہمیں چھوڑکر بھاگ گئے۔ میری بیٹی کو بتا دو کہ میں خوش ہوں اور وہ مرد جو میرا شوہر کہلاتا ہے میں اس کے منہ پر تھوکتی ہوں...''

کچھ عورتیں جو واپس لائی گئیں ان کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ انھوں نے کبھی اپنا منہ ہی نہیں کھولا۔ وہ سوت کاتتی تھیں یا شرنارتھی کیمپوں میں ٹوکریاں بناتی تھیں۔ وہ سوچنے کی حدوں سے دور جاچکی تھیں۔ کچھ اپنے باپ پیچھے چھوڑ آئی تھیں، کچھ اپنے شوہر۔ کبھی کبھی کوئی پاکستان سے جان بچاکر آجاتا اور ایسی ایسی باتیں سناتا جنہیں آخر تک سننا ممکن نہیں تھا۔ کچھ ایسے بھی تھے۔ سچّے گاندھی وادی جو ان مظالم کا ذکر کرتے جو ہم نے مسلمانوں پر ڈھائے تھے اور اس مذہبی تعصّب اور تنگ نظری کی باتیں کرتے جس کے باعث اس شخص کو قربانی دینی پڑی جسے ہم پیارسے دلیش پتا کہتے تھے۔

ظاہر ہے چھوٹی ماں راج گھاٹ جانا چاہتی تھیں جہاں مہاتما گاندھی کے جسم خاکی کو سپردِ آتش کیا گیا تھا۔ وہاں جاکر وہ نہ توروئی اور نہ ہی اس نے کوئی پرارتھنا کی۔ وہ جمنا تٹ تک گئی اور اپنا چہرہ اور اپنے پاؤں پانی سے دھوئے۔ موت کیا تھی؟ وہ بس سمجھ ہی نہیں سکی۔ اور موت تھی کہ ہر جگہ موجود تھی۔ ایک متعصّب ایک سنت کو گولی مار دیتا ہے۔ ایک باگھ کھیت میں کام کرتی ہوئی کسان عورت کو اٹھا کرلے جاتا ہے۔ یا مسلمان راوی کے کنارے ہزار، دس ہزار ایک لاکھ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ اپنے خدا کے نام پر جو ان کے خیال میں ہمارے خدا سے، ہمارے بھگوان سے مختلف ہے۔ چھوٹی ماں نے اپنے آپ سے کہا ہوگا کہ جنوب میں رہنا اچھا ہی ہے۔ ہم تک کبھی کوئی وحشی نہیں پہنچ سکے گا۔

ریل گاڑی سیدھی جنوب کی جانب دوڑتی چلی گئی۔ بندھیا چل میں سے ہوتے ہوئے ہمیں براہ راست بمبئی لے آئی۔ اب تک شری دھر نے کافی سفر کرلیا تھا اور اسے ہلکا سا بخار ہوگیا۔ ہم بمبئی میں اپنے دوستوں کے پاس ماٹنگا میں ٹھہرے جو بلاشبہ جنوبی ہند

کے رہنے والے تھے۔ ہمارے ساتھ ان کا سلوک بہت اچھا تھا۔ گھومنے کے لیے ہمارے پاس کار تھی لیکن یہ ظالم وحشی شہر میرے جیسے برہمن کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ یہ شہر ایک ایسی ایسی اجنبی زبان میں بات کرتا تھا اس کی ساخت ایسی نامناسب تھی۔ اس کا مطالبہ اس قدر شدید اور ضمنی تھا کہ وہاں رہنا بیکار تھا۔ بمبئی کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ مارسیلز یقیناً بھیانک تھا اپنی چوڑی کالی کھڑکیوں، اپنی ایک ہی راگ الاپتی ٹرام گاڑیوں اپنے زیرزمین غنڈوں، اپنے بھکاریوں اور اپنے شدید طور پر متعفن فطری عامیانہ پن کے باعث لیکن وہاں کم از کم پرانی بندرگاہ "نات رے دام دے لاگارد" کا حسن تو تھا۔ ایک بار جب آپ ایک سو سترہ (۱۱۷) سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلے جاتے ہیں اور کیتھیڈرل کے پورٹیکو سے سمندر کی شان و شوکت کا نظارہ کرتے ہیں تو آپ کے ذہن میں یونانی فتوحات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے وہاں قریب ہی دائیں طرف "سیانت ماری دے لام" دیکھا جا سکتا ہے جہاں گال میں پہلے عیسائی اترے تھے۔

افسوس! بمبئی میں سوداگروں کے علاوہ کوئی نہیں آترا۔ لیکن سوداگروں اور عامیانہ پن میں کچھ بھی فطری نہیں تھا۔ صرف ہندو علاقوں کو چھوڑ کر جہاں ایسا لگتا تھا ہم بنارس پہنچ گئے ہیں۔ کسی نے سمجھایا کہ ہم بھان گنگا جائیں اور اس خیال سے کہ گنگا ایک ناپاک علاقے میں بہنے لگی ہے ماں کا دل خوش ہو گیا۔ بھان گنگا کے پیچھے کا سمندر دکھاتے ہوئے وہ چلائی: "دیکھو۔ دیکھو یہ بالکل بنارس جیسا ہی ہے۔" اس کے آگے شمشان گھاٹ تھے اور کچھ دور چھوٹی ماں اور میں سمندر کے کنارے بیٹھے گھریلو معاملات پر باتیں کرنے لگے۔ وہ سروجا اور سکماری کے بارے میں فکرمند تھیں۔ ایک سترہ برس کی تھی اور دوسری چودہ کی!

"رام، اگرچہ تمہیں دوسری عورت نے جنم دیا ہے اور ایک پوتر آتمانے لیکن تم میرے اپنے بیٹے جیسے ہو۔ ان کی ماں بھی الگ تھی اور اپنی ماں کے خاندان سے ابھی بھی ان کا گہرا رشتہ ہے۔ آخر میں ہوں بھی کیا؟ ایک غریب پیش کار کی بیٹی۔ میں چھبیس (۲۶) برس کی ہوں اور یہ لڑکیاں مجھ سے قد میں لمبی ہو چکی ہیں۔ وہ اسکول اور کالج جاتی ہیں اور مجھ سے زیادہ جانتی ہیں۔ جب تک وہ زندہ تھے گھر کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی تھا۔ لیکن اب میں

پوچھتی ہوں اور سوچتی ہوں کہ حالات کیا موڑ لیں گے۔ رات رات بھر میں آنکھ نہیں جھپک پاتی۔ اور تمھاری کھانسی سے مجھے اور تشویش ہونے لگتی ہے۔ مرد لوگ عورت کے دُکھی دل کو کیسے سمجھ سکتے ہیں۔

سمندر کی خوشبوؤں کے درمیان اچانک لوبان کی مہک کے جھونکے آجاتے۔ جیسے غیر موجودگی اب غیر موجودگی نہیں رہی تھی بلکہ نہ دکھائی دینے والی غیر مجسم موجودگی تھی۔ چھوٹی ماں نے اپنی ناک صاف کی میں نے کہا: "میں آپ کا بیٹا ہوں۔ آپ کا کام ہے حکم دینا اور میرا کام ہے آپ کا حکم بجالانا۔"

آسمان میں چھوٹا سا چاند صاف نکل آیا تھا۔ اور میں شام کی اس مبارک ساعت کو اب بھی محسوس کر سکتا ہوں۔ ہم نے ابھی ابھی شیو مندر کی گھنٹیاں بجائی تھیں اور مہا دیو کے تری نیتر شیش پر پھول چڑھائے تھے۔ وکلیشور کے مندر میں چندن اور کافور کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں عورتیں پرارتھنا کر رہی تھیں۔ سادھو اپنے مقدس گرنتھوں میں کھوئے ہوئے تھے چھوٹی ماں جانتی تھیں کہ میں نے پوتر سچ بولا تھا۔ میں انہیں اپنی ساڑھی کے پلّو میں منہ چھپا کر دھیرے دھیرے غیر ڈرامائی انداز میں روتے ہوئے سن سکتا تھا۔ انھوں نے سری دھر کے سر پر اس انداز سے ہاتھ رکھ دیا جیسے انہیں یقین ہو گیا ہو کہ وہ اب محفوظ ہیں۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ کس طرح فوراً ان کی کانپتی ہوئی آواز متوازن ہو گئی۔ پھر خاموشی کے لمبے وقفے کے بعد وہ بولیں "رام! میرے ساتھ ایک وعدہ کرو۔"

"میں کیا وعدہ کروں چھوٹی ماں!"

"وعدہ کرو کہ ہم کبھی تمہاری زندگی میں دخل نہیں دیں گے۔ رام تمہارے پتاجی نے ایک بار کہا تھا۔ "یہ بچہ ہمیشہ سے آزاد طبیعت کا ہے۔ یہ اس وقت کسی کی کوئی بات نہیں مانے گا جب تک وہ اس بات کا قائل نہ ہو جائے۔ اسے اپنی زندگی اپنے ڈھنگ سے جینے دو۔" یہی بات انھوں نے ہم سے دوبارہ کہی جب تمہاری شادی کی اطلاع کا خط آیا تھا۔ تمہارے پتاجی جس چیز کا احترام کرتے تھے میں بھی اس کا احترام کروں گی۔ رام!"

جب ہم سمندر سے چل پڑے اور مالا بار ہل جا رہے تھے تو کار میں مَیں نے کہا:
"میں کیسے آپ کے کام آسکوں گا۔ میں جو اس قدر دُور ہوں اور جس کا وجود اس قدر غیر اور اجنبی ہے؟"
"صرف خط لکھ کر۔ اکثر! اور دو تین برس بعد یہاں آکر ملتے رہنے سے تاکہ بچّوں کو پتہ رہے کہ گھر کا کوئی بڑا ہے۔ بڑا بھائی! اور ان کو محسوس ہو کہ وہ محفوظ ہیں اور کوئی ہے جس کے حکم کی تعمیل کرنا ان کا فرض ہے۔"
"ہاں! شادی بیاہ اور آپ نین سنسکاروں اور رسموں کے لیے۔" میں نے کہا اور ہنس پڑا۔
"اور جب سری دھر تمہارے جتنا بڑا ہو جائے تو وہ گھر کا بوجھ سنبھال لے گا۔ سنبھال لوگے نا! چھوٹے ننھّے نادان!" انھوں نے کہا اور وہ بھی ہنس پڑیں۔ سری دھر سو رہا تھا۔
جب ہم گھر پہنچے تو کافی دیر ہو چکی تھی۔ وِکٹوریہ مندر کا پرسادلانا اچھا رہا اور ہم سب نے خوش ہو کر کھایا۔ پھر وینکٹ سُبّیا کی سب سے بڑی لڑکی نے کچھ فلمی گانے سنائے۔
اس شام کے بعد چھوٹی ماں زیادہ بے تکلفی سے میرے ساتھ بات کرنے لگیں۔ وہ کہتیں: "اب مجھے سکماری کے لیے کھجور اور سروجا کے لیے چاکلیٹ لانا چاہیے۔" یا وہ سب سے بڑی لڑکی کیلا کی بات کرتیں جو پتاجی سے جھگڑ پڑی تھی اور دوبارہ آکر گھر کی دہلیز پر قدم نہیں رکھا۔ اس کی شادی چونکہ میسور کے ایک بڑے گھرانے میں ہوئی تھی اور وہ سونے کی تگڑی اور ہیرے کی بالیوں والی بہو بن گئی تھی اس لیے اس کا پورا مزاج ہی بدل گیا تھا۔ وہ بلاشبہ میری بہن تھی لیکن ہم دونوں میں مشترک صرف اتنا ہی تھا جتنا چنبیلی اور املی میں ہوتا ہے۔ میں نے کہا املی کو پھلنے پھولنے دو اور گرام دوار کا پیڑ بننے دو۔
جب ہم پہنچے تو پورا خاندان اسٹیشن پر موجود تھا۔ گھر کے دوسرے لوگ بھی آئے تھے۔ سینا، کِتّا اور چچا سیتا راموبھی! دادا کِٹّنا نے بھی آشیرواد بھیجا تھا۔ میں نے سوچا اگلے روز جاؤں گا اور ان سے ملوں گا۔ ہر شخص مجھے دیکھ کر خوش ہوا اور چھوٹی ماں کے پُر وقار اور پُرسکون انداز سے سب لوگ متاثر ہوئے۔ جب وہ گھر سے گئی تھیں تو

بڑی بے بس اور شکستہ خوردہ عورت! بلکہ کم و بیش ایک لڑکی سی لگتی تھیں۔ جب وہ لوٹ کر آئیں تو فطری وقار کے ساتھ۔ ان کے بات چیت کرنے سے انداز ظاہر ہوتا تھا کہ خلا کوئی غیر حقیقی یا ناقابل اعتبار شے نہیں ہے بلکہ ان کی اپنی دھرتی ہے۔ اپنا گھر ہے اپنے ہی گھر کا پچھواڑہ ہے جس میں امرود کا پیڑ ہے اور کنواں ہے۔

سب سے پہلے سروجا بولی۔ "ارے چھوٹی ماں۔ لگتا ہے آپ تو بہت بدل گئیں۔ آپ کچھ دُبلی بھی ہو گئی ہیں۔ اب آپ ہماری ماں نہیں بلکہ بھیّا رام کی بہن لگ رہی ہیں۔"

"ہاں!" میں نے سروجا سے کہا "اب میں خاندان کا سربراہ بن گیا ہوں۔ اور چونکہ مجھے بہت جلد یورپ واپس جانا ہے اس لیے چھوٹی ماں یہاں میری نمائندگی کریں گی۔ اپنے ڈنڈے اور بینک کھاتے کی طاقت ہے۔"

"ہمیں منظور ہے،" سروجا نے شرما کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس شام چھوٹی ماں اور میرا بستر لگانے میں سب لوگ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر پھرتی دکھانے لگے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پورے گھر نے غم و آلام کو دنیا سے نکال باہر کیا ہو۔ اِدھر کوئی گا رہا تھا، اُدھر کوئی کسی کتاب میں کھویا ہوا تھا۔ سری دھر پہلے ہی چھوٹی ماں کے بستر پر لیٹ گیا تھا۔ جیسے اسے بھی لگ رہا ہو کہ دنیا اچھی اور محفوظ جگہ ہے اور جب وہ بڑا ہو جائے گا تو چھوٹی ماں کو تنکا بھی نہیں توڑنا پڑے گا گھر میں دودھ بہے گا اور گھر کے پشتو گھر کے آنگن کو پوتر تا سے بھر دیں گے۔

چونکہ گرمی بہت ہو چکی تھی، چھوٹی ماں برآمدے میں لیٹ دیر رات تک شمالی ہندوستان کے اپنے سارے تجربوں کے بارے میں بتاتی رہیں۔ میں تو سو ہی چلا تھا لیکن اس نے مجھے جگایا اور کہا۔ "رام! کلکتے کا کھانا یاد ہے۔ سروجا پتہ ہے انھوں نے کیا کیا۔ ہم نے اسٹیشن کے ہندو رستوران کے کوپن خریدے۔ انھوں نے پوچھا "برہمن یا غیر برہمن" "برہمن" ہم نے جواب دیا۔ اور جب میں رستوران کے برہمنوں کے لیے مخصوص حصّے میں گئی تو ساری جگہ کچھ عجیب سی لگی۔ ایسا نہیں ہے کہ اس سے پہلے میں کبھی رستوران میں نہیں گئی تھی۔ میں تو بنگلور کے ہوٹلوں میں بھی کھانا کھا چکی تھی۔ لیکن وہاں تو بات ہی الگ تھی۔ انھوں نے

کھانا پروسنا شروع کیا۔ میں نے جونہی سالن کو ہاتھ لگایا۔ جس چیز کو میں نے چھوا وہ چھونے میں تو بڑی نرم سی لگی لیکن مشکل سے ٹوٹنے میں آئی۔ "ضرور بینگن ہوگا" میں نے کہا اور رام کی طرف دیکھنے لگی۔ رام جو دنیا جہان گھوم آیا تھا وہ بھی احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ سروجا پرماتما کا شکر۔ میں نے لقمہ منہ میں نہیں ڈالا۔ جانتی ہو وہ کیا تھا "مچھلی!" "اپّا" میں چلائی اور جلدی سے اٹھی۔ میں نے اُلٹی کرکے اپنا پورا پیٹ نکال باہر کیا ہوتا۔ وہ لوگ ہنس پڑے اور ہمیں سمجھایا کہ بنگال میں برہمن بلا تکلف مچھلی کھاتے ہیں اور اسے جل توری، کہہ کر پکارتے ہیں" "ائی ائی او باپ رے" چھوٹی ماں کہنے لگیں" اپنی چمڑی سے اس کا لمس دُور کرنے کے لیے میں نے اپنا ہاتھ آگ میں ڈال دیا ہوتا جیسے ہم گندے برتنوں کے ساتھ کرتے ہیں" تھو!" چھوٹی ماں نے تھوک دیا اور سروجا کتنے زوروں سے ہنسی "سروجا تم جو بھی کہو اُتر والوں میں ہم جیسی جینے کی حسیّت ہے ہی نہیں۔ وہاں شادی شدہ عورتیں چہروں پر قُم قُم لگاتی ہیں اور مرد فرش پر تھوک دیتے ہیں۔ اور جہاں تک گندگی کی بات ہے اس کے بارے میں جتنا کم کہا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ سروجا برہمن کے روپ میں جنم لینے میں آخر کچھ تو ہے" چھوٹی ماں نے کہا اور چپ ہوگئیں۔

تاڑ کے چرچراتے ہوئے پیڑوں سے جب تازہ ہوا چلی تو ہمیں نیند آگئی۔ بیچ بیچ میں چمبیلی کی خوشبو بھی ہمارے اوپر لہرا جاتی۔ میں جانتا تھا میں اپنے گھر میں ہوں۔

دراصل یہ سروجا ہی تھی جس نے مجھے محسوس کرایا تھا کہ میں گھر لوٹ آیا ہوں اور اب ہندوستان میں ہوں۔ جب میں اس سے قبل پتاجی کی بیماری کے بعد گھر آیا تھا تو ڈاکٹروں اور آنے جانے والوں کے ساتھ اس قدر مصروف رہا کہ یہ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا کہ میں گھر لوٹ آیا ہوں۔ میں چھوٹی ماں کو شمال کی جانب اس لیے نہیں لے گیا کہ میں خود ہندوستان دیکھنا چاہتا تھا۔ بلکہ میرا مقصد ان کو ہندوستان دکھانا تھا تاکہ وہ اپنے "نامبارک پن" سے متعارف ہو جائیں۔ اب میں یہاں تھا۔ ایک بار پھر وشنو بھون کے برآمدے میں لیٹا ہوا تھا۔ پُر سکون اور اپنی مرضی کا مالک۔ میرے عقب میں تاڑ کے پیڑوں کی آواز تھی اور نصف شب کو چلنے والی نرم ہوا کے ساتھ چمبیلی کی خوشبو میری

طرف بہہ رہی تھی ۔ پھر حکومت بدل جانے اور میونسپل آئین میں تبدیلیوں کے باوجود گلی کا نل بدستور خرخرا رہا تھا اور میرے پتاجی کا ۔ چہیتا کتا ۔ اندھا ٹائیگر اب بھی اپنی پیٹھ پر چپکے پسوؤں کا شکار کر رہا تھا۔

چھوٹی ماں پوچھنے لگیں " اندھا رات اور دن میں کیسے تمیز کرتا ہے !"

ٹائیگر ہمیشہ پسوؤں سے پریشان رہتا تھا۔ چار پانچ سال قبل میں نے فینول کی ایک بوتل خریدی تھی اور اسے ایسے رگڑ رگڑ کر نہلایا تھا کہ کچھ سیال اس کی آنکھوں میں گھس گیا تھا۔ اس کے بعد وہ کچھ بھی نہیں دیکھ پاتا تھا۔ نتیجتاً اس نے اپنی وفاداری منتقل کر دیں ۔ وہ پتاجی کا ہو گیا اور انسانی اہمیت کے اعتبار سے مجھے ثانوی سمجھنے لگا۔ ٹائیگر کے لیے میرا وجود تو بہرحال قائم تھا لیکن محض کنبے کے فرد کے طور پر سب سے بڑا ہونے کے باوجود ! اس کے حق میں ایک بات کا ذکر بہرصورت ضروری ہے۔ پتاجی کی موت سے تین دن پہلے سے ہی اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ پتاجی کی وفات کے روز وہ چاند کی طرف منہ کر کے بلند آواز میں بھونکتا رہا ۔ اگلے روز اس نے سری دھر کو کھلی اجازت دے دی کہ وہ اس کی دُم کو جتنا اور جب تک چاہے کھینچتا رہے۔ ٹائیگر نے میرے ساتھ سمجھوتہ نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ گیٹ کی طرف دیکھتا رہا جیسے ابھی گیٹ کھل جائے گا اور پتاجی اندر آجائیں گے ۔

سروجا عمر کے ساتھ جوان ہو کر بڑی پیاری لگنے لگی تھی ۔ ہے بھگوان سترہ برس کی عمر میں دنیا کس قدر خوبصورت ہو سکتی ہے ۔ وہ لمبی تھی اور گوری تھی ۔ اس کنبے میں جہاں ہم سب گورے تھے ۔ اس کی خاموشی میں ایسا حسن تھا کہ وہ جیتی جاگتی ہرنی لگتی تھی ۔ سروجا کسی سے کوئی اہم بات نہیں کرتی تھی پھر بھی کچھ ایسے فوری بے تکے پن سے وہ ایسی بات کہہ جاتی جس کا نام رکھنے کے آپ منتظر ہوتے ۔ اس میں بڑی گہری اور ارفع دانش مندی تھی ۔ وہ لگاتار باتیں کر سکتی تھی۔ کیسی کیسی کہانیاں سنا سکتی تھی۔ آپ کا ہاتھ دیکھ سکتی تھی۔ اپنی ہم جماعتوں کے بارے میں حکایتیں ایجاد کر سکتی تھی لیکن ایسا وہ ہمیشہ اپنا کچھ چھپانے کے لیے کرتی تھی ۔

سکماری مختلف تھی ۔ وہ کسی چیز سے خوفزدہ تھی اس لیے وہ ہمیشہ جھگڑا کرتی۔ سروجا کے لیے جو شے سُرخ تھی وہ سکماری کے لیے ہمیشہ گلابی اور سفید ہوتی تھی ۔ اور جب بحث ایک بار چھڑ جاتی ہے تو پھر سسکیوں پر ہی ختم ہوتی "یہ کیسی اشبھ باتیں ہیں جو تم لوگ کر رہی ہو اور وہ بھی اس شام میں جب دیئے جلائے جا رہے ہیں"۔ چھوٹی ماں کہتیں اور سروجا ماں کے ساتھ کچن میں چلی جاتی۔ رسم بنانے کے لیے سرسوں تلنے میں ہاتھ بٹانے کے لیے۔

ہر شام کھانے سے پہلے سب بچّے مل کر بھجن گاتے۔ کافور جلنے پر سروجا آرتی گاتی اور میں 'راجادھی۔ راجایہ' کا پاٹھ کرنے لگتا۔ پرد کشنا کے بعد ہم جلدی جلدی کھانا کھا لیتے اور برآمدے میں آجاتے اور ایک بار پھر باتیں کرنے لگتے کہ الہ آباد میں وینکٹ رمن کُنبے کے ساتھ یا دہلی میں وکرم کُنبے کے لوگوں کے ساتھ کیا ہوا۔ وکرم کا ایک بدقسمت چھوٹا بچّہ تھا۔ وکرم نے ۵۵ برس کی عمر میں چوتھی شادی کی تھی ۔ اس کی دُلہن ۱۸ برس کی تھی۔ وہ بچّہ اس قدر بدصورت تھا کہ گاجر دھنیے کا گُچھّا سا لگتا تھا۔ کسی کو اس کی پرواہ نہ تھی۔ وٹھل کے سامنے سری دھر شہزادہ لگتا تھا۔ وٹھل کا نام سُنتے ہی سب ہنس پڑتے۔ چھوٹی ماں نے مجھے لکھا تھا کہ وٹھل کی ہیضے سے موت ہو گئی تھی۔

سروجا میرے لیے عجیب وغریب سنسنی کی طرح تھی۔ ایسا راز جو آج تک میرے مشاہدے میں نہیں آیا تھا۔ عورت کے پیکر میں ڈھلتی ہوئی لڑکی ہزار انداز سے جلوہ گر ہوتی تھی۔ اپنے آپ کو ظاہر کرتی تھی۔ کبھی شرمیلے پن سے، کبھی بول چال سے، کبھی محفوظ منفرد موجودگی سے۔ میں نے اتنی کم عمر میں ہندوستان چھوڑ دیا تھا کہ ایک برہمن لڑکی کی حسیات سے واقف ہی نہیں ہو سکا تھا۔ جب میں گیا تھا تب سروجا تیرہ برس کی تھی اور سکماری صرف ۹ برس کی۔ اب سروجا کی موجودگی کبھی کبھی مجھ پر حاوی ہو جاتی۔ میگنولیا کی خوشبو سے بھری کسی رات کی طرح! جو ہر شباب کا عروج بھرپور اور سرسبز لگتا تھا۔ اس کے اپنے ہی دن رات تھے۔ سروجا چونکہ میری بہن تھی اس لیے اس کی نسوانیت کا علم میرے لیے فطری تھا۔ دیکھنے، مشاہدہ کرنے اور سانس لینے میں بھی فطری! میں اس کے بالوں کے لیے خود پھول توڑ لاتا تھا لمبی سیر

کے لیے اسے باہر لے جاتا اور اس سے یورپ اور میڈلین کے بارے میں باتیں کرتا! وہ بھی یورپ آنا چاہتی تھی اور وہاں رہ کر پڑھنا چاہتی تھی۔ کہتی تھی وہ ڈاکٹر بنے گی اور بعد میں چچا چچی ماں کو بھی تم سب کے ساتھ رہنے کے لیے بلا لے گی۔ سروجا کی موجودگی سے مجھ پر ٹھیک اسی طرح نشہ سا چھا جاتا جس طرح ہرن آبشار کے سامنے اور ہاتھی پہاڑ کے سامنے دم بخود ہو کر رہ جاتا۔ ایک جاندار کے وجود میں ایک قدیم بنیادی تحرّک جنم لے رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ لڑکی بلوغت نئے چاند یا اعتدالِ شب و روز کی طرح ہے۔ اس میں قطبین کی سی وابستگیاں پوشیدہ ہیں۔ کستوری کی مہک کی طرح کچھ ہے اس میں۔ یا پھر صدفے کی خوشبو کی طرح جب برسات شروع ہونے سے پہلے موتی ابھی گہرے سمندر کی خاموشی میں محفوظ ہوتا ہے۔ مندر کی جائے محفوظ کا بھی احساس ہوتا تھا اور اب میں سمجھ سکتا تھا کہ قدیم لوگ کھیتوں میں بہتر فصل کے لیے حیض کا پہلا خون کیوں لیتے تھے۔ اور ہندوستانی اپنی عورتوں کے اس قدر خوبصورت نام کیوں رکھتے تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ مالوِکا کے پانی ڈالنے پر کس طرح اشوک کے پھول آگئے اور شکنتلا نے کس طرح کرن کو سرسبز کر دیا۔ نسوانیت کیسا گہرا اور قابلِ تعظیم معمہ ہے۔ میں سروجا کے سامنے سجدہ ریز ہو سکتا تھا اور اسے ملکہ کہہ سکتا تھا۔

جب میں چلا تو اس نے مجھے میڈلین کے لیے ایک ساڑھی دی میں نے سروجا کے لیے پرارتھنا کی۔ میں اپنی چشم۔ دردنِ چشم میں کہیں اپنے وجود کی گہرائیوں میں جانتا تھا کہ میں نے ایک شے کا نام رکھ دیا۔ جس سے میں اس سے پہلے واقف نہیں تھا۔ ایک ایسی غیر موجودگی بھی دوبارہ موجودگی بن گئی تھی۔ یہ سروجا نہیں تھی جس کو میں محسوس کر رہا تھا یا جس کی خوشبو مجھے سرشار کر رہی تھی بلکہ یہ تو گنگا اور جمنا جیسی کوئی شے تھی جو میرے وجود میں جاگ اٹھی تھی۔ بنارس دراصل اور کہیں نہیں ہے بلکہ فرد کے اپنے اندر ہے: "کاشی کشیترم، شریرم تربھون گیانم" اور مجھے معلوم تھا۔ سبھی دلہنیں بنارس کی ہی پیدائش ہوتی ہیں۔

ایکس کو میری واپسی کا سفر کچھ بدشگونی میں شروع ہوا۔ میرا جہاز پانچ گھنٹے کی اڑان کے بعد اور قاہرہ کا کم و بیش آدھا راستہ طے کرنے کے بعد انجن کی خرابی کے باعث بمبئی ہوائی اڈے پر لوٹ آیا۔ یہاں وہ ٹارمیک پر ہی اس کی مرمت کی کوشش کرنے لگے لیکن آدھی رات کے آس پاس انھوں نے ہمیں دوسرے ہوائی جہاز میں چڑھا دیا اور ہم پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ ہم اگلے روز دوپہر تک قاہرہ نہیں پہنچ پائے اور روم میں نائس کے سفر کے لیے میرا جہاز ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی چھوٹ چکا تھا۔ میں نے فوراً ہی میڈلین کو تار بھیج دیا۔ میں نے التجا کی تھی کہ وہ ایرپورٹ پر نہ آئے کیونکہ میں وہاں پہنچ کر اسے پہلے اس کے اپنے کمرے میں ہی وے نیشین کے آگے دیکھنا چاہتا تھا۔ سبز سوٹ میں اس کی زلفیں کندھوں پر بکھری ہوئی اور اس کی بیٹھ آئینے میں نظر آتی ہوئی۔ میں نے سیدھے جنیوا کے لیے جہاز لیا اور وہاں سے چونکہ مارسیلز جانے کے لیے کچھ نہیں ملا اس لیے میں پیرس چلا گیا۔ وہاں صبح سے پہلے روانہ ہونے والا کوئی جہاز نہیں تھا اس لیے اپنا سامان ہوائی اڈے پر چھوڑ کر میں آدھی رات سے صبح کے پانچ بجے تک سین کے کنارے بے مقصد گھومتا رہا اور پیرس کو اپنے وجود میں جذب کرتا رہا۔

پیرس کسی طرح بھی صرف شہر نہیں ہے۔ یہ اپنے آپ میں ایک علاقہ ہے۔ فرد کے وجود میں ایک 'کنکارڈ'! جہاں دریا آپ کے پاس سے ایسی بے تکلفی سے بہتا ہے جیسے کہہ رہا ہو سماوی حسن دائرہ بصارت میں آنے والے اور بنجری کے فنِ تعمیر میں نہاں نہیں ہے اور نہ ہی 'بون دیہ آرٹس' کی موجودگی میں بلکہ اس مقام پر ہے جہاں درختوں کا سلسلہ ختم ہوتا ہے جب آلو، پیاز، ہنس، سوٴر کی چربی، مادجرین، گائے کے گوشت، سنترون، پرندوں، دکفر، سینٹ جرمین کی قند، کرلیسی کی گاجر، کلیمبرٹ کی مٹر، اجوائن کے گٹھوں۔ اینٹائی وس کی رو مری، چینی، پودینے اور کالی مرچ سے لدے ہوئے ٹرک بھی پیوندکاری سے

طریقے سے بنی ہوئی غیر ہموار رہ گذاروں سے گزر چکتے ہیں تو اپنے وجود کے جزیرے کے حلقے میں مادرِ خدا مقابل ہوتی ہے۔ انسان نے جس کے اعزاز میں جائے محفوظ تعمیر کی ہے پوجا گھر بنایا ہے۔ ایک ایسا اجتماعِ سنگ تخلیق کیا ہے جو فی الواقع اس سے قبل کبھی متکلم انداز میں ظہور میں نہیں آیا تھا۔ کیونکہ یہ قولِ ربّانی تھا اور جو دعا اور روزے لگن اور درد و کرب سے کچھ اس طرح معرضِ حقیقت میں آیا تھا کہ نتیجے کے طور پر اس سے فکر کی شفاف تہ در تہ بے تکلفی کا ظہور ہوا۔ اور جب یہ نقطۂ عروج پر پہنچ گئی اور مجسّم ہو گئی اور وسعتِ آسمان کا مظہر بن گئی تو انسان کا جی چاہا وہ سمٹ جائے اور ٹاور، مینا اور قوس کے توسّط سے درون بینی کرے۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ کنواری مریم نے کس طرح خدا کے بیٹے کو اپنی گود میں بٹھایا تھا۔ اگر میں بنارس میں ہوتا تو ممکن ہے میں گائے کو لے کر عبادت گاہ تک پہنچتا۔

شہر میں صبح ہونے کو تھی۔ ایک پل سے دوسرے پل تک ایسا دکھائی دیتا تھا کہ شعور ذات شدید تر ہو گیا ہے اور جلدی ہی دن اپنے آپ کو ہماری نجی پاکیزگی سے دُور کر کے اپنے آپ کو چھپا لے گا۔ پیرس ایک طرح سے شہر بنارس ہے۔ باہر کی جانب مائل۔ بادلیر ہر لحاظ سے۔ کہاں زیادہ حقیقی، زیادہ قابلِ فہم، زیادہ مکمل ہوگا۔ سوائے بنارس شہر کے!

آکاش میں گنگا بے دھیانی اور شانت مند بھاؤ سے بہتی ہے

اپنے لا محدود پانیوں کے سرمایے کو

شفاف، فروزاں آبی وسعتوں میں اُنڈیلتی ہے

میں ایک بستر میں کامگاروں کے ساتھ بیٹھ کر جلدی جلدی گرما گرم کافی پی کر اُٹھ کھڑا ہوا اور چل پڑا۔ میں کہاں تھا؟ لے بورجے پہنچ کر جہاز میں بیٹھتے ہی میں پھر سے خوش ہو گیا۔ فرانس گاجر اور شلجم اور میدانی درختوں کا ایسا باغ مسلسل لگ رہا تھا جو ندی اور قلعے۔ پہنچنے کے قطر نما ترچھے راستے اور ایسی سفید سڑکیں بناتا تھا جو تینوں سمندروں کی لامحدودیت کو چھو رہی تھیں۔ مجھے یاد آیا کہ فرانس میں سبھی سڑکیں ناترے دیم سے شروع ہوتی ہیں۔

لی یوں کے بعد موسم خراب تھا لیکن ماری آن پہنچ کر ایسا محسوس ہوا میں اپنے کسی

معمول کے سفر سے پیرس سے گھر لوٹ رہا ہوں ٹیکسی ڈرائیور ہنری نے مجھے پہچان لیا اور بولا۔ "جناب آپ کے پاس تو کافی سامان ہے" میں نے اسے بتایا کہ میں اپنے وطن گیا تھا "بے شک آپ کا دیس بڑا خوبصورت ہوگا" اس نے اسی جذبے سے کہا جس جذبے کے تحت ایک بار پہلے کسی ٹرام اسٹیشن پر پھولوں کا گچھا دیکھ کر اس نے کار روک دی تھی اور پندرہ بیس فرینک میں وہ گچھا خرید کر میڈلین کو پیش کرتے ہوئے کہا تھا۔ "یہ آرالے کے پھول مادام کے بھورے بزسوٹ کے ساتھ خوب جچیں گے۔ ہم انہیں ملکہ کے پھول کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آرالے دے۔ یو۔ نے ایک پھول اپنے اوپر اس روز سجایا تھا جس روز وہ گمی گیر جے را سے ملی تھی۔ جنوب میں سب جگہ آپ کو ایسی شائستہ توجہ سے نوازا جاتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کو فطری زندگی کی درویشی کا کس قدر شعور ہے جو سچائی سے جیتے ہیں وہ پاک دل رکھتے ہیں۔

جب کار آل پی کی پہاڑیوں کے ٹیڑھے میڑھے راستوں سے بھاگتی شور مچاتی آگے بڑھ رہی تھی تو میں نے سوچا بڑی عجیب بات ہے مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے میں اپنے گھر زمین کے ایک ایسے مقام کی جانب نہیں جا رہا جسے میں نے اپنے اعضا اور سانس سے پہچانا ہو بلکہ اپنے ہی اندر کے کسی علاقے کی طرف رجوع کر رہا ہوں جو ماہرِ تحلیلِ نفسی کے یہاں اس کے روبرو پہنچ کر پہلے سے معلوم نامانوسیت کے ساتھ ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے میں نے کسی امکانی تشکیل کے تاثرات کہیں اپنی ذات میں محفوظ کر رکھے تھے اور اس انکشاف سے دن نے اپنے ابعاد کو تبدیل کر لیا تھا۔ سورج نے اپنے آپ کو چھپا لیا تھا اور پہاڑیوں پر سایے کو کھیلنے کے لیے کھلا چھوڑ دیا تھا۔ یامترال نے سر کو اتنا جھکا دیا تھا کہ درد کی ایک قوس کسی طرح میرے وجود میں گھس گئی تھی۔ پھر بھی میرے اندر ایک نئے تسلسل کا تصور تھا۔ اب جبکہ میں نے ہندوستان دیکھ لیا تھا اور اسے میڈلین کے بارے میں بتایا تھا۔ اور اب چھوٹی ماں نے الوداعی تحفے کے طور پر اور اپنے آشیرواد کے روپ میں اپنی بہو کے لیے میری اپنی ماں کے دو چھوٹے چھوٹے بچھوے دیتے ہوئے کوئی اشلوک دہرا کر کہا تھا "جس طرح باپ سے بیٹے تک خاندان کا تسلسل جنم لیتا ہے اسی

طرح ماں سے بہو تک بھی یہی سلسلہ قائم رہتا ہے"۔ میں نے محسوس کیا کہ میں میڈلین کو اپنی بنانے جا رہا ہوں۔

زیورات ہیرے جواہرات خاندانی روایات کا حصّہ بن جاتے ہیں۔ آپ جان جاتے ہیں کب سونے اور ہیرے جواہرات کی آمر مالا۔ گلے میں پہنی جاتی ہے۔ کب یاقوت جڑی انگوٹھی انگلی پر پہنادی جائے گی اور کس طرح آپ نسائی موجودگی کے ایک نئے علاقے میں خلل انداز ہو جائیں گے اور کس طرح یاقوت اور چندرکانت ہیرے کی طرح پرانے درباری خواجہ سرا تمہاری محبوبہ کی دیکھ بھال کریں گے۔ اسے ایسے اچھے خیالات دیں گے۔ اپنے آقا کی اطاعت سکھائیں گے۔ شرط یہ ہے اس کی چھاتیوں کے بیچوں بیچ ایک بار صحیح قسم کا جواہر لہرائے، جگمگائے۔ راجہ اپنی اسامیوں کو ہیرے جواہرات دیتا تھا اور اس کی سلطنت اس کی مہرِ سلطنت کی قوّت سے چلتی تھی۔

میں نے سوچا بچھوے چھوٹی ماں کے کس قدر خوبصورت جذبے کی علامت تھے۔ میری ماں کو یہ بچھوے میری دادی سے ملے تھے اور جب میرے پتا جی نے سروجا کی ماں سے شادی کی تھی تو بچھوے اس کو مل گئے۔ ان کو کچھ بڑا کروانا پڑا کیونکہ وہ خوب موٹی تھیں۔ جب چھوٹی ماں کو لایا گیا تو رسم کے مطابق یہ بچھوے اس کو دے دیئے گئے۔ اور اب یہ اس کے پاس چلے جائیں گے جس نے میرے لیے کرشن کو جنم دیا تھا۔ کیا پی ار کو بھی گھنگھرو پسند نہ آتے جو ہر قدم پر بج اٹھتے تھے اور کیا اس کو یہ پتہ نہ چلتا کہ وہ اس کی اپنی اور پرانی باتیں سناتے ہیں۔

میں جانتا تھا کہ یہ سب خیال کسی دوسرے مسئلے کو ٹالنے کا صرف بہانہ ہے۔ میں والا سیانت آں اور اس کے پھیلے ہوتے چیڑھ کے پیڑوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جن کے نیچے دو پُرخلوص شفاف آنکھوں کی طرح میرے اور میڈلین کے دو کمرے کھلتے تھے۔ گھر کے پیچھے چیڑھ کے اونچے پیڑوں کے علاوہ میرا بیلے کا باغیچہ تھا اور اس سے میرے نیلگوں آسمان کے پس منظر میں سیانت وکتوار تھا۔ پربت کی اونچائی کے ساتھ ایک پاکیزگی وابستہ تھی کسی درویش یا شہید کی جائے محفوظ ہونے کے باعث نہیں بلکہ اس لیے کہ نیک دل پیزانے نے اسے بار بار دیکھا تھا اور اس میں ایسی قوّت اور ایسے امکان کا پیغام مضمر

تھا کہ یہ پہاڑ سے لیے کیلاش پربت جیسا بن گیا تھا۔ اکثر سیر کرتے ہوئے جب ہوا بالکل ساکت ہوتی تھی اور پتہ تک نہیں ہلتا تھا اور وادی ایسا محسوس ہوتا تھا عجیب و غریب نغمگی سے بھر گئی ہے میں کہا کرتا تھا ”میڈلین۔ دیکھو۔ پاروتی شو کے لیے گیت گا رہی ہے“ میڈلین قہقہہ لگا کر ہنسنے لگتی جیسے اس کا عدم اعتقاد بذات خود میری سچائی کا ثبوت تھا۔

شروع شروع میں میڈلین کبھی میرے توہمات میں شریک نہیں ہوئی حالانکہ میں اس کے توہمات میں شامل ہوتا رہا۔ ہم چڑھائی چڑھتے ہوئے ادت ایلپس جایا کرتے تھے اور چیڑھ کے پیڑوں کے درمیان دیورانس کے کنارے کہیں لیٹ جاتے تھے۔ ایک روز میں نے چھوٹا سا مندر بنانا شروع کر دیا۔ ترتیب اور سلیقے سے پتھر کے ساتھ پتھر جوڑتا گیا۔ اور جب باہر کی تین دیواریں تیار ہو گئیں اور اندر کی جائے محفوظ تعمیر ہو گئی تو میں نے کہا ”اب مجھے شو کی مورتی۔ ایک شو لنگ تلاش کرنا چاہیے“ میں نے اسے بتایا کہ بیلورنگر میں جب بھگوان کی مورتی ندی میں تیرتی ہوئی آتی ہے تو کیسے سارا شہر، اوم، کی آواز سنتا ہے۔ جیسے شنکھ کی آواز سے اس لفظ کا اعلان کیا گیا ہو اور مرد اور پجاری مُرلی، ڈھولک اور پالکی کے ساتھ ”گربھ گریہہ“ میں لانے کے لیے جاتے ہیں۔ بلا شبہ وہی ہوتا ہے وہاں۔ چناکیشوا۔ سندر بالوں والا بھگوان۔ اسی طرح میں کہتا تھا دیورانس مجھ کو میرا شو لنگ پردان کر دے گا۔ ایک صبح جب ہم اس کے تٹ پر مندر کے لیے سوریہ کانت گومید اور سپھٹک پتھروں کی تلاش میں گھوم رہے تھے۔ وہ وہاں ظاہر ہو گیا۔ ہمارا بیضوی گول شو لنگ۔ ندی کے تل پر۔ میں اسے چندر کانت اور تلسی تو نہیں بھینٹ کر سکا لیکن مارگورت اور دھتورے کے پھول اکٹھے کیے اور اسے مندر میں ستھاپت کر دیا۔ میڈلین شو کے سر پر پوتر جل چڑھا رہی تھی ”یہ رہی تمہاری گنگا“ اس نے کہا ”شو، شو۔ ہرے۔ ہرے“ اور وہ کانپ اٹھی جیسے اس روز ندیاں میں سین کے مقام پر کانپ اٹھی تھی۔ یہ کہتے ہوئے کہ وہ مجھ سے پیار کرتی ہے۔ اس دن شام کو گورج دیوتو کے راستے ندی کے ترنم سے سرشار گھر لوٹتے ہوئے اس نے کہا تھا ”تم مجھے ہندو بنا لو۔ بنا لو گے نا میرے پیارے“ میں کہتی ہوں کہ اگر شادی کا مطلب تمہارے نزدیک ساڑھی پہننا ہی ہوتا تو بھی میں تم سے

ہی شادی کرتی۔" میں نے اسے بتایا کہ دیوتا نہ تو ہندو ہوتے ہیں اور نہ ہی یونانی۔ تمھارے اپنے ذہن کی تخلیق ہونے کے باعث وہ ایسا ہی برتاؤ کرتے تھے جیسا تم نے انھیں بنایا ہو۔ اگر میں شو ہی کو چاہتا ہوں۔ تو شو خود دیورانس میں آجائے گا۔ یونانی دیوتا آخر یونانیوں نے بنائے تھے اور جب رومن اور عیسائی آئے تو انھوں نے انہیں عیسیٰ کے سنتوں درویشوں کا روپ دے دیا۔ دنیا ویسی ہی ہوتی ہے جیسی آپ اسے بناتے ہیں۔ وہ سوچ میں کھو گئی۔ وہ انسان کی مرکزی نوعیت کو نہ سمجھ سکی۔

جب ہم گھر پہنچ گئے تو میں نے کہا: "دیکھو یہ ہمارے دروازے پر شو کا نندی" میں نے اسے وہ بھاری بھرکم چپٹا پتھر دکھایا جو ہمارے باغ کے کنارے پر سمٹ کر شو کے بیٹھے ہوئے نندی کی طرح پڑا تھا۔

"واقعی یہ تو بیل جیسا ہے! تم نے شو کے بارے میں سوچا اور رہا نندی!" اس نے ایسے یقین کے ساتھ کہا جس میں اس کے قائل ہونے کا شائبہ تک نہیں تھا۔ اس نے تھوڑی سی گھاس اکھاڑ کر یہ کہتے ہوئے اس کی طرف بڑھائی "لو کھاؤ اسے!"

اس دن کے بعد میڈلین باغیچے کے دروازے کے پاس سے جب بھی گزری وہ یا تو بیل کے بھاری بھرکم کوہان کو پیار سے چھو کر گذری یا اسے پیار سے تھپتھپا کر یہ کہتے ہوئے نکلی۔ "یہ لو۔ یہ آج کے لیے تمہارا چارہ ہے۔" کبھی کبھی وہ بازار سے لوٹتی تو اس کے سر پر دو ایک پھول رکھ دیتی اور کہتی۔ "خوش رہو اے بیل خوش رہو۔" میں جب کھڑکی سے یہ سب دیکھتا تو میرے اندر کا ہندو خوش ہو جاتا۔

اور پھر پہاڑی کی چوٹی پر ہاتھی بھی تھا۔ بھاری بھرکم صفائی سے تراشیدہ ایک چٹان زمین پر کم و بیش چپٹی پڑی تھی۔ اگر آپ کسی شام کو اس پر بیٹھ جائیں۔ خاموشی سے تو اس میں حرکت سی سنائی دیتی تھی۔ آپ واقعی اسے ہلتے ہوئے اور کروٹ بدلتے ہوئے محسوس کر سکتے تھے۔ پہلے ایک پاؤں اور پھر دوسرا۔ جب میڈلین اور میرے سامنے کچھ ایسے سوال ہوتے جنہیں ہم حل نہیں کر سکتے تھے اور میڈلین چاہتی تھی کہ اسے غصہ نہ آئے اور جھنجھلاہٹ نہ ہو تو وہ کہا کرتی تھی۔ "میں جاتی ہوں ہاتھی سے مشورہ کرنے۔" آدھ گھنٹے

بعد ایسا ہوتا اس کا چہرہ اس تحیّر آمیز تصور سے جگمگا اٹھتا کہ مرد اور عورت کے میل جول سے رہ سکتے ہیں۔ کبھی کبھی پھولے ہوئے سانس کے ساتھ جب میں چڑھائی چڑھ رہا ہوتا تو وہ بلند آواز میں کہتی "رام رام" جیسے شام ڈھلے جب گھروں میں چراغ روشن ہونے کو ہوں کوئی گائے اپنے بچھڑے کو پکار رہی ہو۔ کوئی بھی ایسا سوال نہیں تھا جس کا ہاتھی نے جواب نہ دیا ہو۔ شاذونادر جب کبھی ہم جمعرات یا اتوار کو اسکول کے کسی طالب علم کو اپنے ہاتھی پر بیٹھے ہوئے یا کسی سپاہی کو اپنی بیرک تک پہنچنے سے پہلے وہاں آرام کرتے ہوئے دیکھ لیتے تو ہمیں بہت بڑا لگتا۔ ایسے موقعوں پر ہم اسے گھاس یا اناس کے بجائے صرف پھول ہی دیتے۔ مجھے سنسکرت کی گونج کبھی اتنی شائستہ محسوس نہیں ہوئی جیسی اس کی پیٹھ پر بیٹھ کر محسوس ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا گنگا ہمارے قدموں میں بہہ رہی ہے اور کرشن کا جنم ہونے ہی والا ہے۔

کم و بیش ایک سال بعد ایک روز جونہی ہم ہاتھی سے اتر کر نیچے آئے تھے۔ تار والا پگڈنڈی پر دوڑتا ہوا آیا اور وہ تار ہمارے ہاتھ میں تھما دیا جس میں کہا گیا تھا کہ پتا جی کے دماغ کی رگ پھٹ گئی ہے اور مجھے فوراً گھر پہنچنا چاہیئے۔ اس شام میڈلین نے میرے ساتھ بڑی ہمدردی کا اظہار کیا۔ حالانکہ مجھے پتا جی سے کوئی گہرا لگاؤ نہیں تھا۔ آنسوؤں سے میرا گلا رندھ گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میری حیاتیاتی" موجودگی کے ابتدائی نشانات اس دھرتی سے ایک ایک کر کے مٹنے والے ہیں۔ میں نے یہ سب اس لیے محسوس نہیں کیا کہ وہ میرے پتا جی تھے بلکہ جس طرح انگور کے باغیچے میں بہار آنے پر شمپین کے تہ خانوں میں کیمیاوی خمیر اثر دکھانے لگتا ہے اور خزاں میں یہ بے اثر ہو جاتا ہے اور سیّال میں اٹھنے والے بلبلے بھی خاموش ہو جاتے ہیں۔ ویسے ہی میرے اندر کا رس، میرے اندر کا تسلسل بحران میں سے گزر رہا تھا ٹوٹ رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا میں ایک بار پھر یتیم ہو جاؤں گا۔

اس شام میڈلین مجھے اپنی ماں جیسی لگی۔ اس نے کہا اگر تمہاری ماں آج زندہ ہوتی تو میں بھی ہوائی جہاز سے تمہارے ساتھ چلتی اور اس کے دکھ میں اس کا ساتھ دینے کے لیے اس کے پاس پہنچ جاتی۔ موت اور جنم کا مفہوم دنیا کے لوگوں

کے لیے الگ الگ ہوتا ہے۔ میرے لیے وہاں میڈلین کی موجودگی کا یہ مطلب ہوتا کہ بہو اپنے گھر آگئی ہے۔ خاندان کی ذمہ داریوں میں حصّہ بٹانے کے لیے۔ دراصل اس کا آنا " دہلیز پار کرنے " کے مترادف تھا۔ مجھے کچھ ایسا لگا کہ اس کے آنے سے پتاجی نہیں مر سکتے۔ نہیں مریں گے جب پہلی بہو گھر آئے گی تو پتاجی کیسے مر سکتے ہیں۔

تم تم، ناریل، چولی، کلائی میں چوڑیاں، کالے منکوں کی مالا کے ساتھ زندگی مبارک ہے، بہت مبارک ہے۔

ایک بار میں پھر خیالوں کی رَو میں بہہ گیا تھا۔ "یہ لو برگن آگیا" ہنری نے کہا اور میں یکایک پیدا ہو کر اس حقیقت کے مقابل آگیا کہ ایکس سچ مچ نیچے وادی میں موجود تھا۔ کیتھیڈرل وہاں تھا۔ وہ اعلان نہیں کر رہا تھا کہ یسوع مسیح خدا کا بیٹا تھا بلکہ یہ کہ فرانس کا بادشاہ یسوع کا بیٹا تھا۔

یہ پرانا شاہی شہر۔ اپنے پھیلے ہوئے چھوٹے موٹے پیڑوں، تنگ لیکن سجے دھجے دروازوں والے انتہا کھی ہوٹلوں والا شہر۔ پھولوں اور سنگیت والا شہر۔ صاف دل اور برملا نہیں تھا بلکہ لگتا تھا کہ کسی دن زولا کا سان کیولو اس کے 'پلیس پبلک' پر حملہ کر دے گا اور اس کی بیگمات کو سڑکوں پر گھسیٹ لائے گا۔ انہیں گولی تو نہیں مارے گا بلکہ سڑکوں پر نچائے گا جیسے وہ ۱۴ر جولائی کا دن ہو۔ انہیں بڑی شائستگی سے مخاطب کرتا ہوا یہ کہتا ہوا "معاف کرنا مادام لاکن نیس ہم پہاڑوں پر رہنے والے گڈریے ہیں ہم نے میگین بادشاہوں کو دیکھا ہے اور ہم وادیوں میں اس لیے اتر کر آئے ہیں کہ تاجپوشی کی رسموں کے مطابق یسوع بادشاہ کو تاج پہنائیں" گاؤں کے رہنے والوں کے لیے یہ خوشی کا تیوہار ہے اور وہ ستاروں کے ساتھ جیتے ہیں۔

میڈلین گھر پر نہیں تھی۔ گھر اچھی طرح بند تھا۔ پردے کھنچے ہوئے تھے۔ کیسا پریشان دکھائی دے رہا تھا یہ گھر۔ میں بیل کی بیٹھ سے گری ہوئی گھاس کو دیکھ کر اندازہ کر رہا تھا کہ میڈلین ایک روز پہلے وہاں سے گئی ہوگی۔ گھاس کا رنگ دھوپ سے پیلا پڑ گیا تھا۔ گھر نے بھی کسی غلطی کا امکان باقی نہیں رہنے دیا۔ اس نے بھی وہی اطلاع مجھ تک پہنچائی۔

جب میں گراج میں گیا تو معاون ہیکر نے کہا "جناب آپ کی کار کل شام کے بعد یہاں لوٹ کر نہیں آئی۔ شاید مادام کہیں گئی ہیں۔"

پوسٹ مین نے مجھے دو خط دیئے۔ ایک انکل چارلس کا خط تھا اور دوسرا لندن سے ایک ہندوستانی دوست نے بھیجا تھا۔ میں نے ہنری سے آتیل دیو دویا جاں میں سے چلنے کو کہا۔ جب مادام پاتاں سیے نے مجھے دیکھا تو وہ کھل اٹھیں۔

میں نے کہا "مادام مجھ سے ملنے نائس گئی ہوں گی لیکن روم میں میرا ہوائی جہاز چھوٹ گیا تھا۔"

مادام پاتاں سیے ہمیں اس دن سے جانتی تھیں جب ہم پہلے پہل ایکس آئے تھے۔ ولا ڈھونڈ پانے سے پہلے ہم اسی کے یہاں ٹھہرے تھے۔ وہ میری سب ضرورتیں جانتی تھیں۔ چلا کر حکم دیا کہ میرے غسل کا انتظام کیا جائے اور ژاں کو ہدایت دی کہ سبزیوں کا ناشتہ کرایا جائے۔ انھوں نے بڑے فخر سے کہا "جناب گوشت نہیں کھاتے، کبھی نہیں!" ژاں نے کچھ نہیں کہا جواب میں صرف سر ہلا دیا جیسے مادام لا پاتروں اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھی۔

غسل کے بعد بستر ہی میں دوپہر کا کھانا کھا چکنے کے بعد میں نے اس مانوس جگہ کو اِدھر اُدھر گھوم پھر کر دیکھا۔ وہاں کے کسی مکین کی طرح نہیں بلکہ اس شخص کی طرح جو وہاں رہنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ دنیا میں اس بات سے بڑا فرق پڑتا ہے کہ آپ کی رفیقۂ حیات آپ کے ساتھ ہے یا نہیں۔ صرف وہی آپ کو اس دنیا میں رہنے کے قابل بناتی جو مانوس ہے اور مکمل ہے۔ اگر وہ عورت اس کی بیوی نہ ہو تو ایک ہندوستانی کے لیے میسور میں رہنے والی اس کی بہن ہو گی یا بنارس میں رہنے والی اس کی ماں!

پیار چیزوں کو دیکھنے کا ایک ڈھنگ ہے۔ اگر آپ پیار کرتے ہیں تو آپ اپنے آپ کو بھول جائیں گے اور مرکزِ محبت کو اس طرح نہیں دیکھیں جیسے آپ اسے دیکھتے ہیں بلکہ جیسے وہ دکھائی دیتا ہے۔ عورت اس لیے بھگوان کی پجارن ہے۔

میڈلین نے رابطہ پیدا کرنے کا کوئی راستہ نہیں تھا نائس میں میں اسے کہاں تلاش

کروں گا۔ وہاں ہم کسی کو نہیں جانتے تھے۔ اس کے علاوہ جب تک میں کسی سے ملنا نہ چاہوں میڈلین بھی کسی سے ملنا پسند نہیں کرتی تھی۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ وِلا سیانت آں اور ہاتھی کے بیچ کی جگہ 'جائے مسرت' تھی۔ اس سے پرے صرف بربریت۔

لیکن میں فکرمند تھا۔ میں جانتا تھا وہ اگلی ہوائی اڑان کا انتظار کرے گی اور پھر لوٹ آئے گی۔ امید نہ ہونے کے باوجود امید کرتے ہوئے میں پھر وہیں پیدل لوٹ آیا۔ گھر اب بھی اسی طرح بند تھا۔ بیل کی پیٹھ پر اُگی ہوئی گھاس کچھ اور بھی سوکھ گئی تھی۔ میں نے اسے کچھ اور تازہ گھاس پیش کی۔ اس امید کے ساتھ کہ اگر اس وقت میڈلین آگئی جب میں ہاتھی کی جانب گیا ہوں گا تو وہ دیکھ کر سمجھ جائے گی کہ میں لوٹ آیا ہوں۔ میں جانتا تھا کہ پہلے وہ ناخوش ہوگی اور پھر ناراض! یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہندوستانی ناقابلِ اعتبار ہوتے ہیں۔ اگر کوئی یورپی کہتا ہے کہ وہ فلاں جہاز سے آئے گا تو وہ بلاشبہہ آجاتا ہے۔ اور اگر اس کا جہاز چھوٹ جائے تو وہ ہوٹل میں رُک جاتا ہے اور اگلے جہاز سے آجاتا ہے۔ لیکن ہندوستانی بے ترتیبی ــ جیسے غسل خانے میں ہر جگہ بکھرے ہوئے تولیے۔ میڈلین کو پریشان کر دیتے تھے۔

میں نے گیٹ میں سے ہاتھ ڈالا اور بڑی مشکل سے پوسٹ بکس کھولا۔ ہوا اور بارش کے کارن اس کی مضبوطی جاتی رہی تھی اور وہ تھوڑا زور لگانے سے کھل جاتا تھا۔ اس کے اندر جرنل دے جے نیم تھا اور میرے لیے ایک ٹیلی گرام۔ میں نے جہاں تک ہاتھ پہنچنا ممکن تھا کونا کونا کھوج ڈالا۔ لیکن میرے لیے کوئی پیغام نہیں تھا۔ اس لیے میں فکرمند قدموں سے پگڈنڈی پر ہولیا اور چیڑھ کے پیڑوں کے درمیان کے موڑوں میں سے ہوتا ہوا پہاڑی پر ایسادہ ہاتھی تک پہنچ گیا۔

اس احساس سے مجھے راحت ملی کہ 'میرابیل' کے باغیچے اور زیتون کی ڈھلوان کے پرے وادی ہے اور ساحل سمندر تک میدان پھیلا ہوا ہے۔ کشادگی غم کشا ہے اور بحرِ روم کی موجودگی ایسی گہرائی اور وسعت عطا کرتی ہے جس کا کوئی دوسرا سمندر کفیل نہیں ہو سکتا۔ جہازی غلاموں کی طرف کسی کا دھیان نہیں جاتا بلکہ خیال آتا ہے تو سینٹ لوئی کے سمندری

جہازوں کا جو سورماؤں اور پادریوں کے ساتھ ارض مقدّس کو فتح کرنے کے لیے نکلتے تھے!
دیلورانس ندی خاموشی سے پہاڑوں سے لایا ہوا پانی سمندر میں انڈیلتی جاتی ہے۔

اس دن شام کو خاصی دیر ہو چکی تھی۔ دن تو ختم ہو چکا تھا لیکن ابھی رات شروع نہیں ہوئی تھی۔ میں نے میڈلین کے بھاری متوازن قدموں کی چاپ سنی۔ میں بیل کی بیٹھ پر بیٹھا چیڑھ کے پیڑوں کے نیچے چھوٹی ندی تک دیکھ رہا تھا جو وادی کے آخر تک جاتی تھی۔ میڈلین اپنی خریداری کے بوجھ سے لدی ہوئی تھی۔ وہ گھر کے لیے دو نئے جھاڑو، ایک برتن، تولیے، بوٹ پالش اور میرے لیے موسم گرما میں پہننے کے لیے ایک ہیٹ گالیری لالیوئی۔ بیت سے لے کر آئی تھی۔

اس نے لگ بھگ ڈر کر کہا "تم" اور وہاں بے سہارا سی ساکت کھڑی ہو گئی۔ جیسے وہ جان گئی ہو کہ وہ مجھے کھو چکی ہے۔ ایسے موقعوں پر میرا سانس ہمیشہ تیز اور بھاری ہو جاتا ہے اور میں کھانسنے لگتا ہے۔ میری بانہوں سے چپٹی ہوئی وہ بولی "میرے پریتم، میرے پیارے" پھر بیل پر بیٹھ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میرے پاس اس کے لیے الفاظ نہیں تھے۔ جب میں نے آہستہ سے اس کے بیگ میں سے چابی نکالی، لیٹ کھولا اور اسے ولا سیانت آن کی سیڑھی تک لے آیا تو وہ بولی "میں نہیں جانتی کیوں لیکن میں گھر کے اندر داخل نہیں ہونا چاہتی" میں نے بتی جلائی اور جب اس نے مجھے اب دیکھا تو حیرانی کے ساتھ کہنے لگی "مجھے کبھی یاد نہیں آیا کہ تم اتنے کالے ہو۔ یہ ہندوستان کی تیز دھوپ کا اثر ہو گا" اور اس نے پہلی بار میرا بوسہ لیا۔

جب میں اسے اس کے کمرے تک لے گیا تو میں نے دیکھا کہ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے زیادہ ہوا کے لیے اور اپنی مایوسی کو بتانے کے لیے کار کا ہڈ کھول دیا تھا۔ مرد عورت کو کیسے مایوس کر سکتا ہے۔ کیسے نظرے یا کسی غیر موجودگی سے عورت کے شگفتہ انتظار کو جڑ سے ختم کر سکتا ہے۔

اس نے میری طرف مدد کے لیے دیکھا۔ میں نے کہا "چلو ہم اپنا سامان لے آئیں" وہ بولی "رام! تم جا کر اپنا سامان لے آؤ تب تک میں تمہارے لیے کچھ پکاتی ہوں"

میڈلین اب چونکہ ایسے موڑ میں تھی جہاں وہ اس عورت کی طرح کھڑی تھی جس کی منطق ناکامیاب ہو گئی تھی اور حالات کو جوڑنے کے لیے اس کے پاس کوئی منطق باقی نہیں رہی تھی اس لیے میں نے سوچا میرے لیے بہترین راستہ یہی ہوگا کہ میں اسے اکیلا چھوڑ دوں۔ میں نے اس سے کار کی چابی بھی نہیں مانگی۔ میں موسم بہار کی معطر ہوا میں چلتا گیا۔ پھولوں، پتوں، پودوں اور جڑی بوٹیوں کے پاس سے گزرتے ہوئے انسانی جسموں کی خوشبو کو سانسوں میں اتارتا گیا اور اپنے آپ میں کھو گیا۔ پہلی بار میں نے فرانس میں اپنے آپ کو اجنبی محسوس کیا۔

اپنا سامان باہر نکال لینے کے بعد میں ٹیکسی منگوانے سے پہلے کافی دیر اور ہر قسم کی ہندوستانی چیزوں کی گہری تفصیل میں گیا جیسے مادام پاتاں ییے کے لیے میرے ملک کی ہر شے کے بارے میں جاننا ضروری تھا۔ اگرچہ وہ آتیل دیلو رویایاں کی نگران تھی لیکن وہ لگتی ایسی تھی جیسے اعتراف کرنے جا رہی ہو۔ نہ ختم ہونے والے ہندوستانی سفر، میلوں کے سفر۔ دو ہزار میلوں پر پھیلی ہوئی گنگا ندی اور دنیا کے سب سے اونچے پربت ہمالیہ پربت کے بارے میں باتیں کر کے میں نے ذہنی طور پر خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا۔

"کیا ہمالیہ پربت ایلپس اور مون بلانک سے بھی اونچا ہے" اس نے یہ سوال پوچھا! اس کی آواز میں وہی تحیّر شامل تھا جو آج سے دو برس قبل تھا جب میں نے اسے بتایا تھا کہ میں گوشت نہیں کھاتا۔

"وہ ان سے بھی اونچا ہے"

"لیکن تمہارے یہاں تو برف نہیں ہوتی تو پہاڑوں کی چوٹیوں پر کیا پیدا ہوتا ہے؟"

میں نے اسے فخر سے بتایا کہ ہمالیہ کا مطلب ہے برف گھر اس کے جنوبی فرانس کی مخصوص باتیں سننے کے عادی کانوں کو یہ بات صحیح بھی لگی اور خوبصورت بھی۔

مادام پاتاں ییے کو اس بات کا یقین دلا کر کہ ہمالیہ پر برف ہوتی ہے، میں نے اپنے آپ کو یقین دلایا کہ دنیا میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔ اب دروازے پر تیار ٹیکسی میں بیٹھ کر میں وِلاسیانت آں کی طرف اس خیال سے روانہ ہوا کہ میں نامبارک تھوک کو لانگھنے کے

بعد کفارے کے طور پر تین بار واپس لانگھ چکا ہوں اور اب سڑک سیدھی بنارس کی طرف جا رہی تھی۔ کیونکہ اس سے مقدس اور کیا ہو سکتا ہے کہ انسان اپنے بارے میں یقین حاصل کر لے۔ اس کے اندر خود اعتمادی پیدا ہو جائے۔ کچھ بھی مقدس نہیں سوائے لفظ 'میں' کے جو بطور علامت ابھر کر سامنے آتا ہے۔

میں زندگی بھر اس شام کو نہیں بھول سکتا۔ کاریڈور میں میرا سامان اور کچن سے آتی ہوئی اجوائن اور راجموڑے کی خوشبو۔ یہ محسوس کرنے کے لیے کہ کچھ بھی نہیں بدلا میڈلین نے کچن سے پکارا۔

"میں نے تمہارے لیے رسوٹو اور سیب والا دلیا بنایا ہے اور یہ رہی تمہاری بیوی!" اس نے گرمیوں کا ہلکا مہین لباس پہن رکھا تھا جس پر لگ بھگ آم کی شکل کا ڈیزائن بنا ہوا تھا اور جسے ہم نے پچھلی گرمیوں میں پیرس میں خریدا تھا۔

"اور اب مجھے سونگھ کر دیکھو" وہ بولی۔ اس کے جسم سے یوڈی کولون کی خوشبو آ رہی تھی۔ یہ اس کے جسم سے اٹھنے والی وہ پہلی خوشبو تھی جو میں نے رویاں میں سونگھی تھی۔

میں نے بڑے بے ڈھب طریقے سے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا: "یہ نئے تولیے لو جو میں نے آج خریدے ہیں۔ میں نے ایک درجن خریدے ہیں تاکہ تمہارا تازہ کردہ اور پکا برہمن پن اپنی مرضی کے مطابق جب چاہے غسل کر سکے۔ اس بیچ تمہاری برہمن بیوی تمہارے لیے چاول پکا دے گی۔

نہیں! حالات بہت اچھے نہیں چل رہے تھے۔ ہمارے پاس ایک دوسرے کو کہنے کے لیے کوئی ایسی بات نہیں تھی جو ریلوے اسٹیشن پر ایک دوسرے کو الوداع کہنے جیسی نہ لگے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کیسے میرا بڑا سفید اور چھوٹا نیلا سوٹ کیس ایک دوسرے کے اوپر پڑے تھے۔ میڈلین انہیں کھولنے لگی۔ اس کی یہی عادت تھی۔ اور میرے کپڑے نکال کر ٹانگنے کی کوشش کرنے لگی لیکن وہ نیلی دھاریوں والے میرے سوٹ سے آگے نہیں بڑھی۔

"رسوٹو جل جائے گا" وہ بولی۔ "رام تمہارا خاندان ہمارے گھر پہنچنے کی رات کو میرا تمہیں جلے ہوئے چاول کھانا ناپسند نہیں کرے گا۔" پھر گرمجوشی سے بات جاری رکھتے ہوئے

کہنے لگی" جانتے ہو اب میں بہت اچھا کھانا بنانے لگی ہوں۔ میں نے ایلین برس شوں سے بہت سے نئے پکوان تیار کرنا سیکھ لیا ہے۔

ایلین کالج دیے گارکاں کے تواریخ کے ایک پروفیسر کی بیوی تھی اور چونکہ آدھی انگریزی تھی ماں کی طرف سے اس لیے انگریزی میں گفتگو کرنے کی غرض سے ہمارے یہاں آنا اسے اچھا لگتا تھا۔

وہ کہتی ہے" اس کا باپ یا شاید نانا ہندوستانی فوج میں کرنل تھا۔ اس لیے اب میں تمھارے لیے صحیح اور مزیدار سالن بناؤں گی"

اگر آواز کا جنم۔ گفتگو کا جنم ہوا ہوگا تو یقیناً عورت کے ہونٹوں پہ ہوا ہوگا۔ اسی طرح اگر بال اُگے ہوں گے تو عورت کی شرمگاہ پر اُگے ہوں گے۔ اس کی شرم و حیا پر پردہ ڈالنے کے لیے۔ عورتیں نہ کہے جانے والی بات کو چھپانے میں بڑی ماہر ہوتی ہیں۔ ان کی گپ شپ ان کا معکوس درد و غم ہوتا ہے۔

میں اپنے سوٹ کیسوں تک گیا لیکن باہر کچھ نہیں نکال سکا۔ کتابیں، نہ دھوتی، نہ ہی وہ ساڑھی جو سروجا نے اچھی طرح تہ کر کے چاندی کی قُم قُم کی ڈبیا، پوترناریل اور پان کے پتوں سمیت ایک کونے میں رکھ دی تھی یہ دیکھنے کے لیے کہ مشرقی ہونے کے تعلق سے افیون تو نہیں چھپا کرلے جا رہا تھا۔ کسٹم آفیسر نے قُم قُم کی ڈبیا کا ڈھکنا اُٹھا کر دیکھا تھا۔ اور کچھ قُم قُم پاوڈر ساڑھی پر کچھ اس طرح گر گیا تھا جیسے شادی کے موقعے پر یا سات مہینے کے حمل کی پرستش کے موقعہ پر۔ ساڑھی مبارک دکھائی دے رہی تھی اس لیے سب سے پہلے اسے باہر نکالنا میں نے مناسب سمجھا۔" تمہارے لیے ایک تحفہ لایا ہوں" میں نے کہا۔

وہ رسوئی گھر سے چلائی۔" مجھے دکھاؤ"

" یہ ساڑھی سروجا نے بطور تحفہ بھیجی ہے"

اسے مایوسی ہوئی۔ وہ چاہتی تھی کہ یہ تحفہ میری طرف سے ہوتا لیکن چونکہ سروجا کی بھجوائی ہوئی ساڑھی سب سے اوپر تھی اور یہ وہ ساڑھی تھی جس پر قُم قُم لگا ہوا تھا۔ اس لیے میں نے اسے ہی نکالا۔" آؤ میں تمہیں یہ ساڑھی پہناؤں" میں نے کہا۔

جب اس نے کپڑے اتارے میں اس کے خوبصورت جسم کی روپ ریکھا دیکھ سکتا تھا، اتنا سادہ، اتنا سیدھا اور پُر اسرار۔ میں نے اسے ساڑھی پہنانے کی کوشش کی۔ اس نے مجھے اجازت دی کیونکہ وہ چاہتی تھی کہ میں اسے چھوؤں اسے باہوں میں لے لوں۔ اس انکشاف سے واقف ہو سکوں جو جاننے اور سمجھنے کے عمل کو ایک واحد موجودگی کے قالب میں ڈھال ڈھال دیتا ہے۔ لیکن میں تو بہت دُور تھا۔ میرے ہاتھ پھسل پھسل جاتے اور مجھے بار بار جھنجھٹ بنانا پڑا۔ آخر کار جب میں نے ساڑھی اس کی کمر پر کس کر باندھ دی تو میں نے کہا "اب میں جاتا ہوں۔ نہا لیتا ہوں۔" اس نے جواب دیا "جلدی آنا نہیں تو کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

جب غسل کے دوران پانی بہہ رہا تھا مجھے پتہ ہی نہیں تھا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں کیا کر رہا ہوں۔ شور کسی نہ کسی طرح آرام کا احساس دیتا ہے۔ ایسا شور جو متوازن ہو اور مانوس ہو۔ میں غسل خانے کی کھڑکی تک گیا اور دیکھا کہ خراب زیتون ہٹا دیئے گئے ہیں۔ جو ہیکٹر کی اطلاع کے مطابق رومن دور میں لگائے گئے تھے۔ کھلی زمین پر جگنوؤں کی افزائش پہلے ہی شروع ہو چکی تھی۔ انھوں نے یہاں وہاں چمکنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے سوچا جلد ہی ان کا ناچ دیکھنے کو ملے گا جیسے ہم گرمیوں میں ہر برس زیتون کے پیڑوں کی تاریکی میں دیکھا کرتے تھے۔ میں نہانے کے ٹب میں گھس گیا اور اپنے جسم کو بڑے انہماک سے رگڑنے لگا۔ یہ سوچ کر مجھے اس طرح مزید حوصلہ عطا ہوگا۔ صاف ستھرا جسم دانش سے معمور محسوس ہوتا ہے۔

پچھواڑے میں ابھی جگنوؤں نے ناچنا نہیں شروع کیا تھا۔ لیکن مسٹر تبو کی زیتون باڑی میں انھوں نے حُسن کا ایسا خوبصورت خاکہ تیار کر دیا تھا کہ میں چلّا اٹھا: "میڈلین میڈلین!" کوئی جواب نہیں ملا۔ میں پاجامہ پہن کر میڈلین کے کمرے میں گیا۔ جہاں ہم عام طور پر کھانا کھانے کے لیے میز لگا لیا کرتے تھے۔ میڈلین صوفے پر لیٹی ہوئی تھی۔ خاموش۔ وہ ضرور رو چکی ہوگی۔ لیکن اس کے چہرے پر بہرحال رونق تھی۔ میڈلین شاذ و نادر ہی آبدیدہ ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا اس کے اندر اپنے آنسو روک رکھنے کے لیے بڑی طاقت ہے۔

کھانا کھائیں ہم؟"

"ہاں سب کچھ تیار ہے۔ مجھے صرف سلاد کے لیے مسالہ تیار کرنا ہے۔"

"میرے لیے لہسن قطعی نہیں" میں چلّایا ۔ کچھ کہنے کے لیے۔

مجھے یہ بات کچھ اس طرح یاد ہے جیسے کل کی ہی ہو ۔ ہم نے کھانے کا آغاز بہ آسانی کیا۔ میں نے میڈلین کو چھوٹی ماں کے بارے میں بتایا ۔ اور اس کے بمبئی کے سمندر کے ساحل پر کیے گئے شاندار وعدے کے بارے میں بھی "ہندوستانیوں کے یہاں شاندار اندازواطوار خوب ہوتے ہیں" اس نے بنا کسی تلخی کے لیکن ایک مخصوص معروضیت کے ساتھ کہا۔

"ہم لوگ بڑے جذباتی ہیں" میں نے کہا: "ہر چیز کے لیے آنسو بہانے لگتے ہیں"

"وہ بھی اس قدر کہ اکیلے رابندر ناتھ ٹیگور کے ناولوں سے ہی تم لوگ پوری گنگا بہا سکتے ہو۔"

"میڈلین میرے ملک میں بڑا دکھ ہے لیکن مرد اور مرد کے درمیان بڑا خوبصورت رشتہ ہے۔ مرد اور عورت کے درمیان بھی!" میں نے اپنی بات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"جب تم وہاں تھے تو کیا تم یورپی لوگوں سے نفرت کرتے تھے" وہ پوچھنے لگی۔

"نفرت؟ تمہیں پتہ ہے ہندوستان میں انگریزوں کو کسی بھی غیر ملکی کے مقابلے میں زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ ہم برائی کو آسانی سے بھول جاتے ہیں۔ ہمیں فطرتاً نیکی سے پیار ہے۔"

"تاکہ اچھوتوں کے لیے الگ کنویں ہوں اور عورت مرد کی غلامی کرے۔"

یہ غیر متوقع تھی۔ یہ نئی تلخی۔ اس نے اپنی بات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا جیسے اپنے خیالات کو چھپانا چاہتی ہو۔

جارجز مجھ سے ہندوستان کے بارے میں بہت کچھ پوچھتا رہا ہے۔ تم جانتے ہو رام! وہ بڑا بھلا آدمی ہے۔ اگرچہ کچھ کچھ کٹرپن کا شکار ہے۔ کٹر ہونے کے ناطے اس کا کیتھولک دھرم اسے ہندوستان کو سمجھنے میں مدد کرتا ہے۔ میں تو لامذہب ہوں۔ اس کا بس چلے تو وہ پورے ہندوستان کو رومن چرچ کا پیروکار بنا دے گا اور اسے پوپ کے قدموں میں ایک پر وقار تحفے کے طور پر پیش کر دے گا۔ اس کے نزدیک اس کے علاوہ نجات کا کوئی دوسرا راستہ نہیں۔

لیکن دیکھو اس نے راما کرشن اور دویکانند کو بھی پڑھ رکھا ہے اور ویدانت کو بھی۔ یہ سب اس سے کہیں بڑھ کر ہے جو میں کیا ہے۔ وہ تم سے ملنے کے لیے بڑا خواہش مند ہے۔ ہم اسے اپنے گھر کب بلائیں گے ؟"

"جب بھی چاہو" میں نے کہا اور خود شناسانہ انداز میں اضافہ کیا۔ "تم جانتی ہو سب سے پہلے میں نے ہی اسے دریافت کیا تھا۔"

جارجز ان سفید فام روسی دانشوروں میں سے تھا جن کی نشوونما بہترین یورپی اور قدیم روایات کے مطابق ہوئی تھی۔ اس کا باپ ایک نامور نقاد تھا اور بیاردیاف کے حلقے سے تعلق رکھتا تھا۔ جارجز 'ماکی' میں شامل ہو گیا تھا اور ریاردوی لڑائی میں اس کا ایک بازو اُڑ گیا۔ وہ کسی صوفی کے بھونڈے اعتماد کے ساتھ چلتا تھا۔ کالج دے گارکاں میں لاطینی پڑھاتا تھا۔ وہ بہ آسانی بہت سی یورپی زبانیں پڑھ سکتا تھا اور حال ہی میں اس نے چینی اور سنسکرت کا مطالعہ بھی شروع کر دیا تھا۔ وہ ایکس میں نامبارک سیگاں روایت کے زیرِ اثر آگیا لیکن 'ماکی' اور بعد کے اُلجھاؤ کے باعث وہ اکثر سیاں میکسیماں میں ڈومینکیوں کے یہاں جانے لگا تھا۔

'ماکی' سے وابستہ ہونے سے پہلے قبضے کے دوران وہ خانقاہ کی زیارت کے لیے گیا۔ آسٹریا کے نوجوان پادری فادر زے نو بیاس جو آسے گھماتے پھراتے رہے۔ فرانسیسی زبان کچھ رُک رُک کر بولتے تھے۔ جونہی وہ کسی لفظ کے لیے رُک جاتے جارجز فوراً مطلوبہ لفظ کے ساتھ مدد کے لیے تیار رہتا۔ وہ آسٹرین جو جنوبی علاقے میں کچھ پریشان تھا ایسے شخص سے مل کر بہت خوش ہوا جو اس کے ساتھ جرمن زبان میں گفتگو کر سکتا تھا۔

اتفاقاً استوار ہوئی یہ دوستی وقت گزرنے کے ساتھ پروان چڑھتی گئی اور جب ماکی سارڈوں نے اپنا گولا بارود اس علاقے میں چھپانا چاہا تو ڈومینیکی راہبوں نے بڑی مدد کی۔ تین نے تو اپنی جان تک نچھاور کر دی۔ اس طرح جارجز کیتھولک مذہب میں بڑی دلچسپی لینے لگا۔ اس کا باپ پہلے ہی کیتھولک مذہب اختیار کر چکا تھا اور یونیورسٹی کے روسی انسٹی ٹیوٹ میں کام کرنے کے علاوہ میوڈن کے دینی مکتب میں بھی کام کرتا تھا۔ لیکن جارجز ہجرت میں ہی پل کر بڑا ہونے

کے باعث اپنے قدیم عقیدے کے ساتھ ہی وابستہ رہا۔ کیونکہ اسے احساس ہوا کہ اپنے چرچ سے پیار کر کے وہ اپنی مادرِ وطن سے بہتر وفاداری کا ثبوت فراہم کر رہا تھا۔ اس کے نزدیک ماؤنٹ ایتھوس روس کا ہی حصہ تھا۔ سالووں کو تب تک ایسا ہی لگتا رہے گا جب تک وہ محسوس کرتے رہیں گے کہ ان کا مذہب لا مذہب یونانیوں کے پہاڑوں پر ظہور میں آیا تھا۔

جارجز اپنے باپ سے پیار کرتا تھا اس لیے کہ چھوٹی عمر میں ہی اس کی ماں مر گئی تھی۔ دراصل روس میں اور جلاوطنی سے پہلے اس کے قدامت پسندوں کے ساتھ چمٹے رہنے کے باوجود باپ، بیٹے کے تعلقات میں کوئی مشکل پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ ایک دوسرے سے دل کی گہرائی سے پیار کرتے تھے اور والد بزرگوار بیٹے کو طویل اور دانش بھرے خط لکھا کرتے تھے۔ باپ کے تئیں وفاداری کے جذبے نے ہی جارجز کے دل میں کیتھولک مذہب کے لیے ہمدردانہ جذبات پیدا کر دیئے تھے۔ جیسے ہی جرمنوں نے پورے ملک پر قبضہ کر لیا، جارجز سیاں میکسمیاں میں گیا اور بتسمہ لے لیا۔ وہاں اس نے تین ہفتے دُعا کرنے اور دھیان میں گزارے۔ وہ اس دنیا کا نہیں لگتا تھا۔

اس نے لاطینی میں فیلوشپ کا امتحان پاس کیا کیونکہ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا تھا کہ وہ کیا پڑھتا ہے۔ وہ تواریخ اور لسانیات میں فیلوشپ حاصل کر سکتا تھا۔ کوئی چیز جتنی زیادہ مشکل ہوتی اسے اتنی ہی زیادہ پسند آتی۔ اس سے اس کی چینی زبان سیکھنے کی وجہ بھی واضح ہو جاتی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس نے سچ مچ ہندوستانی فلسفے کو سمجھنے کے لیے سنسکرت سیکھنا شروع کیا تھا۔

جارجز اور میں یونیورسٹی لائبریری میں ایک دوسرے سے ملے تھے۔ ہم نے ایک دوسرے کے بارے میں سن رکھا تھا۔ یا یوں کہیے اس نے میرے بارے میں سن رکھا تھا۔ ہندوستانی ہونے کے کارن اور لڑکیوں کے کالج کی اس کی ایک رفیق سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے باعث میں زیادہ آسانی سے جانا پہچانا جا سکتا تھا۔ وہ ہمارے ساتھ سالووں کی اس مخصوص بے تکلفی سے ملا جو روسیوں کے ساتھ رابطے کو کس قدر فعّال اور بھرپور بنا دیتی ہے

"جی ہاں! جارجز سے مل کر مجھے خوشی ہوئی۔" میں نے کہا۔

"تمہیں پتہ ہے سب سے پہلے وہی مجھے سیاں میکسمیاں لے کر گیا تھا۔ میں فادر زے نوبیاس سے مل چکی ہوں" اس نے کچھ ڈرتے ڈرتے کہا۔

میں نے جواب دیا۔ "مجھے خوشی ہے کہ بہرحال مذہب تمہارے لیے ایک خوفناک عفریت کی طرح نہیں ہے۔"

"لیکن میں ہمیشہ راہبیت کی مخالف رہی گی" اس نے زور دے کر کہا۔

"میڈلین تم نے یہ کیوں سوچا کہ میں پوپ کی حمایت کروں گا۔"

"مشترکہ خاندان سے سماج اور سماج سے چرچ تک بہت بڑا فاصلہ نہیں ہے۔ کیا ایسا ہے؟ میں اپنے ہونٹوں پر ایو ماریا چسپاں کرنے کے بجائے تمہارے سر پر 'ٹوپ' زیادہ پسند کروں گی۔ سکا گو میرے نزدیک قابل تعریف ہیں" اس نے اپنے اعتقاد کو مستحکم کرنے کے انداز میں کہا ـــ "دراصل میرا خیال ہے میں تمام مذاہب سے نفرت کرتی ہوں۔ میں خدا سے دعا کرتی ہوں کہ انسان صرف عقل اور سمجھداری سے جیے۔"

"میں سمجھتا ہوں، ذہانت تمہیں اشتراکیت اور ایسی ہی چیزوں تک ضرور لے جائے گی۔ یا پھر تمہیں ایڈہ یار ایرت کی طرح موٹا اور مسخرا یا دالیدیے کی طرح دھوبی کا گدھا بنا کر رکھ دے گی۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور خاموش رہی۔

"یا پھر مورس تھوریز کی طرح کیوں نہیں۔" میں نے اصرار کیا۔

"وہ میرے لیے ضرورت سے زیادہ غیر شائستہ ہے۔" اس نے کہا اور رسوٹو لانے کے لیے رسوئی میں چلی گئی۔

آج بھی مجھے یاد ہے واضح طور پر۔ ہماری پلیٹوں میں رسوٹو تھا۔ تھائم اور لونڈر رہنا کر ایک طرف رکھ دیا گیا تھا۔ ایک دم بیچ میں ٹماٹر۔ گودے کے بغیر، جیٹیا۔ اور جب میڈلین نے چمچ بھر کر اپنے منہ میں ڈالا تو میرا ہاتھ بے حرکت رہا۔ ہر ایک کے گرد چاروں طرف منور خلا سا وسیع علاقہ تھا جیسے کوئی طلسماتی دائرہ کھینچ دیا گیا ہو۔ دنیا کے اوپر رات بھاری پڑ رہی تھی۔ میں نے دم گھٹ جانے کے احساس کے ساتھ کہا۔

"مادو، کچھ ہوگیا ہے؟"

وہ جو اس وقت اپنا آدھا چمچ چاول سے بھر چکی تھی رُک گئی اور پھر بولی" واقعی! کچھ ہوگیا ہے؟"

میں خاموش تھا۔ پھر وہ آہستہ سے بولی "کیسے"

"ہر شے کو کچھ ہوگیا ہے" میں نے جواب دیا اور اپنا چمچ نیچے رکھ دیا۔

میں جانتا ہی نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں اور میرا مفہوم کیا ہے۔ میڈلین نے اپنا چمچ بھی پلیٹ میں رکھ دیا اور دھیرے سے میرے قریب آگئی اپنے آپ کو میری آغوش میں دھکیلتے ہوئے۔ یہ جانتے ہوئے کہ میں اس کے لمس کو کس قدر پسند کرتا ہوں۔ وہ اپنی انگلیاں میرے بالوں میں پھیرنے کی کوشش کرنے لگی اور اپنا چہرہ میری جلد کے ساتھ چپٹا دیا۔ اس میں جلے سیب کی سی شادانیتز مہک تھی۔ جو میری ناک سے گزرتی گئی۔ کم و بیش کسی خمار انگیز شے کی طرح! اس کے اعضاء تمتما اُٹھے اور عالم کرب میں اس نے اپنا سینہ میرے چہرے کے ساتھ لگا دیا۔ میرا چہرہ جوالیشور کی آواز ہے بھگوان! اس کا سانس کس تیزی سے اوپر نیچے چل رہا تھا۔ اس کا سینہ شدّت جذبات سے چھلک رہا تھا جیسا کہ ہم اپنے دیس میں کہتے ہیں۔ درد میں کچھ کم و بیش جسمانی ہوتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جسم بیدار ہوگیا ہے اور غیر متکلم کو اظہار میں ڈھال رہا ہے۔ "یہ وہ تقرر ہے وہ متکلم ہے جو ہر تقرر اور متکلم سے ماورا ہے۔ وہ علم ہے جو ہر علم سے ماورا ہے"۔ اس لمحے میں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میڈلین کو ایکبا رگی عورت پن کا فطری بے اختیارانہ ادراک ہوا ہے۔ جیسے بال گھنے ہوگئے۔ سانس لینے کے عمل میں پیٹ اُوپر اُٹھ گیا ہے۔ باہری موڑ واپس اندر سرک گیا ہے اور اس نے اپنے آپ کو عورت کے روپ میں دیکھا ہے۔ نسائیت کی آنکھیں ہوتی ہیں اور وہ اپنے آپ کو ایسے عالم شان و شوکت میں دیکھتی ہے جس کا مرد کو کبھی ادراک نہیں ہوسکتا کیونکہ مرد کی دریافت خارجی ہوتی جبکہ عورت کی باطنی جو وسیع تر ہوتی ہوئی کائنات میں ڈھل جاتی ہے۔ بچّے کی پیدائش صرف جسم کی تخلیق نہیں ہے۔ عورت کے لیے یہ عمل جیسا کہ میڈلین نے کہا تھا۔ تخلیقِ کائنات ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتی ہے اپنی کوکھ میں محفوظ کر لیتی ہے۔ جس طرح شہنشاہ پینگوئن انڈوں کو اپنے

پاؤں ہیں۔ وقت آنے پر وہ بیٹا یا وارث پیش نہیں کرتی بلکہ اپنی مکمل کائنات تخلیق پیش کر دیتی ہے۔

اس وقت وہ مجھے اپنے اندر سمو سکتی تھی۔ جیسا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا لیکن اس علم کی مدد سے نہیں کہ وہ مجھے جانتی تھی بلکہ اس یقین کی مدد سے کہ وہ فوراً انہدام میں مجھے خود کو سمجھنے کا موقعہ دے گی۔ لیکن میں برہمن ہوں اور میرے نزدیک لمس اور علم سپردگی کے تقدس کے ہم سفر ہیں۔ عورت مجھے وہاں لے کر نہیں جائے گی بلکہ میں اس پر وہ سب منکشف کروں گا۔ درد پیار کا نہیں ہوتا۔ درد کی تجسیم کبھی نہیں ہو سکتی اگر ہو سکتی ہے تو صرف پیار کی رازداری میں منافقت میں۔ گم شدہ عاشق ہی ٹوٹ کر پیار کرنے والا عاشق ہوتا ہے۔ سچا مرد عورت کو اپنی خاموشی میں سمیٹ لیتا ہے اور اس کے اعتراف کے لیے اس کے اندر رہتا ہے۔

اب آنسو بہانے کی میری باری تھی۔ یہ نذرانۂ حسن میرے لیے بہت زیادہ تھا کیونکہ مرد کو وہ سب نہیں کرنا چاہیے جو عورت کرتی ہے۔

اس نے کہا "میرے محبوب، میرے پریتم، میرے پیارے"

اور میں بولا "میری دوست، میری رفیق"

اپنے آپ کو کچھ دور ہٹاتے ہوئے اس نے پوچھا "کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں!" میں نے جواب دیا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ 'یہ کچھ نہیں' ہی سب کچھ تھا۔

"میں نے تمہارے دیوتاؤں کو مایوس کر دیا ہے" وہ بولی۔

"نہیں" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اور پھر کسی ناقابلِ فہم جواز کے تحت یہ اضافہ کیا۔ "تم نے مجھے مایوس کیا ہے"

وہ اپنے پورے قد و قامت کے ساتھ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ شام کے پس منظر میں اس کی ساڑھی کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔ اچانک ہنستے ہوئے کہنے لگی "میں ابھی کپڑے بدل کر آتی ہوں۔ ہم چلتے ہیں اپنے ہاتھی کو ہیلو کہنے کے لیے"

میں اپنی مکمل سچائی کے باوجود اس سے یہ نہیں کہہ سکا کہ میں پہلے ہی بیدار ہو چکا ہوں۔

اس کا خیال تھا کہ اگر اور کچھ کارآمد ثابت نہ ہوا تو ہمارے تو ہمّات کام آجائیں گے۔

ہم رات کے اندھیرے میں دو بھوتوں کی طرح جا رہے تھے جنھوں نے اپنی زندگی کوئی جنت حاصل کرنے کے لیے (چاہے وہ کتنی ہی مختصر تھی) نہیں فروخت کر دی تھی بلکہ جیسے اپنے آپ سے کہہ رہے ہوں کہ ہم سورگ کی طرف جا رہے ہیں۔ ایک سرخ گرم ستارے نے ہمارے راستے الگ الگ کر دیئے تھے۔ لیکن ہم غلط موڑوں اور ٹیڑھے میڑھے راستوں سے گزر کر اس مقام پر پہنچ گئے تھے جہاں صرف گوشت ہی جسم ہی حقیقت بن کر رہ جاتا ہے۔ لیکن مرد۔ تمام مرد کسی ایسی شے کے ساتھ سفر کرتے ہیں جو گوشت سے جسم سے کچھ بڑھ کر ہے۔ یہ سفر اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کوئی سرکا ہیے کی طرح نہ بن جائے۔ ماسکو کے سامنے دم توڑ دے اور اس کے مزار پر یہ کتبہ نصب کر دیا جائے: "یہ شخص اپنے اجداد کی دھرتی کے لیے شہید ہوا۔" ہمیشہ وہی لوگ سچی موت مرتے ہیں جو میدان کارزار میں کام آتے ہیں۔ ایسے لوگ کسی آدرش، کسی نصب العین کے لیے مرتے ہیں۔ اور اس لیے وہ ایک مستقل کتبے ایک مستقل صلیب کے حقدار ہیں۔

اوپر جاتے ہوئے راستے میں میڈلین بولی "تمہیں پتہ ہے تمہارا 'ہولی گریل' اتنا پُراسرار معاملہ نہیں ہے۔ میں جیسے جیسے فادرز کو جتنا پڑھتی ہوں ــــ اور اس میں جارجز نے میری بڑی مدد کی ہے ــــ اتنا ہی زیادہ میری سمجھ میں آتا جاتا ہے کہ ان کی سوچ کا آغاز نیسٹورین بدعت سے ہوا ہے جو تمہاری آل بجا سیاں کی مماثل ہے۔ کچھ وہ ماہرین شرقیات جن کو میں نے پڑھا، میری اس مجبوری کی تصدیق کرتے ہیں کہ فارس کے راستے بدھ کا ایک تبرّک عیسائی دنیا میں پہنچا تھا اور یہ کہ کاسہ، بھکشوؤں کا اوندھا کشکول یعنی بھکشا پاتر ہی تھا۔

"سچ مچ بڑی شاعرانہ بات ہے"

"کیوں نہیں؟ بتاؤ تو"

"تو تاریخ کو شاعرانہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ شاعری تو واقعات کے بغیر شاعری ہے۔"

"پھر تاریخ کیا جاتا ہے؟"

"حقائق - اپنی جگہ پر سچائی خالص شاعری ہے۔ ٹھیک تمہارے جھاڑو اور ان تولیوں کی طرح جو تم گالیری لافایا ای بیت سے لائی ہو۔ آؤ تمہارے ہولی گریل کی بات کریں!"

"دیکھو۔ ایک اور زیادہ معقول مفروضہ بھی ہے یعنی یہ وہ پیالہ تھا جس میں مادرِ رحمت نے بوند بوند گرتے ہوئے یسوع مسیح کے لہو کو اکٹھا کیا تھا۔ جب مسلمان آئے تب ممکن ہے اسے چھپا کر کسی جہاز میں گال لے جانا پڑا۔ پھر بھی کہا جاتا ہے کہ وہ کاسۂ مقدّس "خدائی مہتاب" کی طرح چمک رہا تھا اور اس نے ہواؤں کو مسحور کر کے مقدس نوعیتوں سے ہمکنار کر دیا۔ یہ خیال کہ وہ فارس سے آیا۔ چرچ کی ایک چال تھی سارا سان کو مات دینے کے لیے۔ کچھ دوسرے لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ وہی سونے کا پیالہ تھا جس کو کیلیڈیائی نخورتنا کے مندر میں لے گئے تھے اور ان کے ہاتھوں کسی وجیہہ اور خوبصورت سیمی رامی غلام کے قتل کے بعد "دھرتی کی رانی" زرخیزی کی ماں، اس پیالے سے پیے گی اور اپنے ہیرو کو پلائے گی اور اسے یہ پیالہ کستوری اور سماق پتھر کے ساتھ پیش کرے گی تاکہ ان کی افزائشِ نسل میں دنیا نور فراوانی دیکھ سکے۔ میں نے حال ہی میں پڑھا ہے کہ کچھ قدیم قبیلوں میں عورت کے پہلے حیض کا خون پہلی بارش کے ساتھ پھیلا دیا جاتا ہے تاکہ فصل سونے کی طرح زرّیں پیدا ہو اور ہر گھر میں چولھا جلتا رہے!"

"ہندوستان کے کچھ علاقوں میں ہم آج بھی ایسا کرتے ہیں۔ دراصل میں پچھلے دنوں اسی بات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ لیکن ایک مشترک اعتقاد کے لیے ایک ملک کا دوسرے ملک کے ساتھ تعلق ضروری نہیں ہے ورنہ میکسیکو کے مایاؤں نے جو دنیا میں ہندوؤں کے علاوہ واحد ایسے لوگ ہیں جنھیں 'صفر' کا علم تھا۔ یہ علم صرف ہندوؤں سے ہی حاصل کر سکتے تھے۔ یہ بکواس ہے ایک دم!" میں نے کہا "اس کا مطلب ہے ہر اچھی چیز ہندوستان ہی سے آتی ہے!" اور میں ہنس پڑا۔

"جہاں تک میرا تعلق ہے میرے لیے ہر اچھی چیز ہندوستان ہی سے آتی ہے!" اس نے کچھ ایسے انکسار کے ساتھ کہا جو عورت کے حصّے میں آیا ہے جس سے ظالم مرد کا دل بھی پسیج جاتا ہے۔

"اور برائی"، میں نے کہا۔" میرے لیے اچھا ہوا کہ مجھے اتنی زور کی کھانسی شروع ہوئی کہ مجھے راستے کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھنا پڑا۔ اور میڈلین کو اپنی پیٹھ سہلانے دی۔ اس سے ہم دونوں کو فائدہ ہوا۔ کھانسی کی وجہ سے میری لاچاری نے اس کی صورت حال کو زیادہ اہم بنا دیا وہ بیوی تھی۔ گھر بریوار کی محافظ۔ اس سے مجھے اپنی شادی کے کچھ مہینے بعد کے ایک دن کے واقعہ کی یاد آگئی جب میں کسی وجہ سے ناراض تھا۔ اور اس نے گرم پانی کی بوتل بستر میں رکھنے کے لیے دی تھی۔ وہ میرے کمبل پر کچھ اس طرح لیٹ گئی کہ ہم ہنستے ہنستے بستر پر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ اس بات سے خوش ہو کر کہ اتنی چھوٹی سی چیز ہمیں جوڑنے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ اس روز سے ہم اسے پوتر "گرم پانی کی بوتل" کہنے لگے۔

پہاڑوں پر دھندلا سا چاند نکل آیا تھا لیکن ہمارے ایک دم اوپر ستارے چمک رہے تھے۔ ہم ہاری ہوئی لڑائی کے بعد صلح کر لینے کے بچّوں کے انداز سے ایک دوسرے سے مل کر خوب ہنسے۔ اوپر چڑھتے چڑھتے میں نے محض سونگھنے کے لیے کچھ تھائم اکھاڑ لی۔ میں جنوبی ہندوستان کا برہمن جو ہوں! میڈلین نے چٹانوں سے سنبل کے پھول اکھٹے کیے اور میرے سر پر ڈال دیئے۔ ہم ایک بار پھر خوش تھے۔ یہ ممکن تھا۔

ہم ہاتھی پر بیٹھ گئے اور میں نے میڈلین کو بیکار کی ساری باتیں سنا ڈالیں۔ وینکٹ رمن کی بیٹی کو مدی کے بارے میں جو اس بات پر حیران تھی کہ ہم گھر میں تائی، چاچی یا ساس کے بنا کیسے رہ سکتے ہیں یا بنارس کے اس برہمن کے بارے میں جس نے پوچھا تھا کہ یورپ میں برہمن کس قسم کے منتر پڑھتے جاتے ہیں۔

" اس نے یہ نہیں پوچھا کہ آخری رسومات کی ادائیگی کے لیے اسے کیا دکشنا ملتی ہے۔ نہ ہی میں یہ سب جانتا تھا!"

"آخری رسومات پر بڑا خرچ آتا ہے۔ میڈلین نے جان بوجھ کر کہا" میں خوش ہوں کہ میں ہندوستان میں مروں گی۔ تم میرا داہ سنسکار کرو گے، مجھے آگ کے سپرد کر دو گے رام؟ لیکن گنگا کے کنارے میرا داہ سنسکار نہ کرنا مجھے اس خیال سے نفرت ہے کہ میت کے پوری طرح جلنے سے پہلے ہی کتّے اسے نگلنے کے انتظار میں رہتے ہیں!"

"میں تمہارا داہ سنسکار ہم وتی پر کروں گا جیسا کہ میں نے اپنے دادا کیا تھا۔ میں چندن کی لکڑی سے چتا بناؤں گا اور تمہارے لیے خاص منتر پڑھوں گا۔ جس کا نام ہوگا "سنہری جلد والی دیوی کے نام منتر"۔ میں اس ہاتھی کی بیٹھ سے کچھ جھاڑیاں اور بھاتم سے جاؤں گا اور ندی کو کچھ اس طرح خوشبو عطا کر دوں گا کہ مچھلیاں اور ہرن دیکھنے آئیں گے کہ کیا ہو رہا ہے۔ تمہارے سفید راکھ میں بدل جانے پر ندی چڑھ جائے گی اور تمہیں بہا کر لے جائے گی جیسے وہ میرے دادا کو بہا کر لے گئی تھی۔ اس طرح آخر کار تم برہمن بن جاؤ گی۔"

لیکن میڈلین دور تھی۔ اس کی سوچ بہت دور چلی گئی تھی اور ہم ایک عام سی بعید خاموشی میں اُتر گئے تھے۔ ایسا لگتا تھا ہاتھی کو کچھ بھی معلوم نہیں۔ نہ ہی وہ کچھ کہتا ہوا محسوس ہوا ستارے مکمل تھے۔ اور اس قدر خوبصورت کہ سکون دل کے لیے انہیں گننے کو جی چاہتا تھا۔ انسان نقطۂ تکمیل سے اس قدر دور ہے۔ یہ وہ شئے جو فاصلے پر ہے اسے حیرت ناک چکا چوند لیے ہوئے محسوس ہوتی ہے۔

ہم دھیرے دھیرے نیچے اُتر آئے اور جیسے ہی ہم نے دروازہ کھولا میرا ادھ کھلا بکس ابھی بھی وہیں پڑا ملا۔ اپنا وہی سوال لیے جس کا جواب دینا ابھی باقی تھا۔ ہم لوگوں سے تو جھوٹ بول سکتے تھے لیکن ہم جانوروں اور چیزوں سے جھوٹ نہیں بول سکتے تھے۔ جب ہم سونے لگے تو اتنے تھکے ہوئے تھے کہ میں صرف یہی کہہ سکا۔ "تو میڈلین کل پروفیسر کے لیے کافی کا پیالہ پیش کرے گا!"

وہ بولی "احمق مت بنو، تم بہت تھکے ہوئے ہو گے۔ اب تو بہت جلد چھٹیاں ہونے والی ہیں اور میرے پاس کچھ کام بھی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ کل شکروار ہے اور میری کلاسیں دس بجے شروع ہوتی ہیں۔"

اگلی صبح جب میڈلین کالج چلی گئی تو میں نے اپنا بکس بند کیا اور کاریڈور کے دوسرے سرے پر رکھ دیا۔ ہم میں سے کسی نے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ اور جب مادام ژان گھر کے کام کے لیے آئی تو اس نے اس کو جھاڑ پونچھ کر الماری میں رکھ دیا۔

دوپہر بعد جارجز ہمارے ساتھ چائے پر آیا۔ ہمیں ایک دوسرے کو بہت سی دلچسپ باتیں بتانا تھا۔ چینی زبان وہ پہلے سے بہتر جان گیا تھا اور کچھ چینی مابعد الطبعیاتی باتوں کے صحیح

مترادف الفاظ جاننے کے لیے وہ بلجیم کے کچھ یسوعی پادریوں سے رابطہ قائم کیے ہوئے تھا۔ جارجز کو ماہرین مشرقیات سے تمام غیر مذہبی قلم کاروں سے پیدائشی نفرت تھی۔ اسی لیے اسے ژید سے نفرت تھی۔ اور کلادیل کو وہ پسند کرتا تھا۔ لیکن روماں رولاں کو وہ اس لیے پڑھتا تھا کیونکہ وہ ہندوستان کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کی بڑی خواہش تھی کہ رام کرشن، وویکانند، اربندو گھوش اور دیانند جیسے ہندوستان کے سنتوں کے بارے میں کسی بہتر معلومات اور متوازن طریق کار والے شخص نے لکھا ہوتا!

کچھ دیر کے بعد لیزو بھی ہمارے ساتھ آملا۔ لیزو ایک نوجوان باسق مہاجر تھا جو کم وبیش اٹھارہ زبانیں جانتا تھا۔ وہ باسق اکادمی کا سب سے کم عمر منتخب صدر تھا لیکن جب اس نے مادری زبان میں پڑھانے کی ضرورت پر اپنا پہلا افتتاحی لیکچر دیا اور اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے چرچ کے پادریوں کے حوالے پیش کیے۔ اس وقت وہاں اس کو سننے کے لیے فرینکو بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ تین مہینے کی قید کے بعد کچھ قانونی پابندیوں کی شرط پر اسے رہا کر دیا گیا۔ لیکن وہ فرار ہو گیا اور اب وہ ایکس یونیورسٹی میں لسانیات کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس کا باپ خفیہ طور پر اس کو کچھ پیسہ بھیجتا تھا اور جو کمی رہ جاتی تھی اسے وہ خود مختلف زبانیں پڑھا کر پورا کر لیتا تھا۔ اسی نے جارجز کو سنسکرت سکھائی تھی۔

لیزو کو بدھ مت میں گہری دلچسپی تھی۔ وہ سنسکرت پڑھنے کے لیے ہائیڈل برگ گیا تھا اور وہاں وہ بادانس پے جے سے بہت متاثر ہوا تھا جو بدھ مت کو دنیا کے تمام دوسرے مذاہب پر ترجیح دیتا تھا۔ جنگ میں بادانس پے جے جنگی قیدی رہا تھا۔ پہلے شنگھائی میں اور بعد میں لنکا میں۔ وہ ہین یان کو بہتر سمجھتا تھا اور لیزو بھی ویدانت کے بارے میں لیزو شنکر اچاریہ کا نام بھی جانتا تھا۔

سنسکرت زبان میں گمبھیرتا ہے ایک وقار ہے جس کی جڑیں بنیادی آوازیں ہیں۔ میں گھنٹوں اشلوک پڑھتا تھا۔ خاص طور پر بھرتری ہری، کالی داس یا شنکر کے جس سے ایک فرد کے ارد گرد خلا کا ہالہ تیار ہو جاتا ہے اور وہ کسی خطہ کو یوں دیکھتا ہے جیسے وہ بہ نفس نفیس خود اس کا اپنا ہو۔ جارجز بھی جو عیسائیت ماسس اور دوسروں پر ہندوستانی جارحیت کے

واقعات پر سخت ناراض ہوتا تھا۔ نئی کیتھریت یعنی طہاریت سے خوف زدہ ہوجاتا تھا۔ عموماً قدیم اوّلین آہنگ میں وہ کھویا بیٹھا بھی رہتا تھا۔ اپنے دوست کو اشتعال دلانے کے لیے اس نے ایک بار کہا "تم سن سکتے ہو کہ کس طرح ہماری چرچ سے وابستہ رسومات اسی آہنگ اسی لَے سے نکلی ہیں۔ جب سکندریہ میں تھیبیڈ درویشوں کی عیسائی رہبانیت کا آغاز ہوا اسی زمانے میں بدھ مت کا پرچار ہو رہا تھا۔" این ٹی اوکس بڑا نیک بادشاہ تھا۔ اس کے عہد سے لے کر بلکہ این ٹی اوکس سے پہلے کے دوسرے بادشاہوں بطلیموس این ٹی گونس، ے جن اور سکندریہ کے یونانیوں تک کے یہاں۔ سب جگہ بدھ مت کے بنیادی اصول اور اس کو بنانے والے اس اصول کے دوست بدھ یعنی ساکیہ منی کی پیروی کرتے ہیں؛ یہ سلسلہ جاری رہا۔ وہ دقیق اور اکثر مہمل حوالے دیا کرتا تھا۔ وہ بیک وقت اس قدر پڑھا لکھا اور اس قدر نابالغانہ انداز لیے ہوئے تھا کہ کوئی بھی انہیں سنجیدگی سے نہیں لیتا تھا یا انہیں قطعی طور پر کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا۔ جب کوئی پہلوی کے کسی گمنام نیسٹورین متن کا حوالہ دیتا ہے اور اس کا رشتہ خراشتھی کی کسی قدیم تختی سے جوڑتا ہے اور جب وہ یونانیوں سے ہوتا ہوا سکندریہ کے مکتبِ فکر اور تیانا کے اپولونیس تک کی بات کرتا ہے جو ہندوستان کے برہمنوں سے ملنے گیا اور لوٹتے ہوئے ویدانت کے علم سے اپنا پیٹ بھر لایا اور جب وہ یہ کہہ کر بات ختم کرتا ہے کہ ملان کے سنت ایم بروز (۳۹۷ - ۳۳۳) نے 'پلاڈی اس' نام کے کسی یونانی کو مخاطب کر کے ایک باضابطہ مقالا لکھا تھا تو آپ یقین کر لیتے ہیں کہ اگر یہ سب سچ ہے تو اسے ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ دوسری طرف صورت حال یہ تھی کہ ایسا ہونے کا امکان تھا کہ جارجز عمودی انداز میں اوپر جانا بہتر سمجھے گا کیونکہ وہ خدا کا بھوکا تھا اور اسے وہ اپنے رفیق کی تواریخی اور سہ ابعادی سیاحتوں پر ترجیح دیتا تھا۔ یہ ویدانت ہی تھا جس سے جارجز واقعی متاثر ہوا تھا جسے وہ "نیتی۔ نیتی" "یہ بھی نہیں" کہہ کر پکارتا تھا۔ فرانس کے بارے میں میرے تجربات میں سے اعصابی، خود میں کھوئے ہوئے نیلی بھوری آنکھوں والے جارجز کے سامنے گھنٹوں بیٹھے رہنا ایک ایسا تجربہ ہے جسے میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ اس کا دایاں ہاتھ کپکپاتا رہتا تھا۔ جیسے اس نے

ایک مجاہد کی تلوار تھام رکھی ہو اور اس کا یہ کہنا: "لیکن بھگوان! لیکن بھگوان کہاں ہے۔ کہاں ہے وہ جب شنکر کہتا ہے: شودہم۔شودہم۔ میں شو ہوں۔ میں شو ہوں؟"

"اس وقت کوئی کچھ نہیں کہتا"۔ لیزو ہنسا۔ اگرچہ لیزو سے اس انداز سے ملنے والا یہ واحد جواب تھا لیکن اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا تھا جیسے وہ کسی مصنّف کا حوالہ دے رہا ہو۔ اور بلاشبہہ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ یہ سچ ہے وہ وشو بندھو یا ناگ ارجن کے بدھ مت سے متعلق کسی قول کا اس طرح حوالہ دیتا جیسے یہ خود شری شنکر کے اپنے ویدانت کا دیا ہوا جواب تھا۔ لیزو کے ساتھ مشکل یہ تھی کہ وہ جانتا تو بہت کچھ تھا لیکن سمجھتا بہت کم تھا۔

میرا خیال ہے ان مباحث سے جس فرد نے سب سے زیادہ سیکھا وہ میڈلین تھی۔

کیونکہ میڈلین جانتی تھی کہ ایک اہم فیصلے کی گھڑی آپہنچی ہے۔ جنگل سے نکلنے کے بہت سے راستے تھے۔ وہ کون سا راستہ تھا جو اسے سب سے آسان طریقے سے وہاں لے جاتا تھا جہاں اس کو ہونا چاہیے۔ جنگ نے اسے یہ احساس دیا تھا کہ تغیر انسان کے لیے ناگزیر ہے۔ آپ چاہیں ایک راستہ اختیار کریں یا دوسرا، جرمن چاہے اس پہاڑی کے عقب میں ہوں یا اس بستی کے پیچھے ٹوٹے ہوئے پل یا بہت نیچے ندی کے پاس لیٹے ہوئے ہوں۔ وہ راستہ جسے لوگ صاف سیدھا راستہ سمجھتے ہیں۔ کسی پہلے سے طے شدہ منطق پر منحصر نہیں ہے بلکہ لمحے کی فوری منطق پر منحصر ہوتا ہے ایک خالص استدلالی قوت جو آپ کو جواب مہیا کرتی ہے اور آپ کے قدموں کو سمت عطا کرتی ہے۔ اس کے لیے واحد ضرورت ہوتی ہے۔ کچھ دیر کے لیے رُکنے کی اور اپنے پیڑوں کے درمیان کے صاف میدان کی جانب چل پڑنے کی۔

اس لیے یہ سنسکرت پاٹھ اپنی ہی خاموشی کو سننے کے مترادف تھا۔ میڈلین کم بولتی تھی۔ کچھ تو شرمیلے پن کے کارن کچھ خودداری۔ کے احساس کے باعث۔ وہ جو کچھ بھی کہتی تھی ہمیشہ غیر متوقع ہوتا تھا۔ اس لحاظ سے وہ لیزو جیسی تھی کیونکہ دونوں منطق کے بے قاعدہ ادراک کے تحت بات کرتے تھے۔ جو علم کی غلطی نہیں ہوتی تھی بلکہ فیصلے کی غلطی ہوتی تھی۔

آنے والے مہینوں میں (کیونکہ لیزو اور جارجز ہمارے ساتھ گیس کنی ہیں ملیالے میں آئے تھے جہاں گرمیوں میں ہم جلد ہی چلے گئے تھے) میرا یہ تاثر برقرار رہا کہ تذبذب کے باعث

ان کی شخصیت کے اہم اور نمایاں عناصر عیاں ہو گئے تھے، اُبھر کر سامنے آگئے تھے۔ لیزو بہت سی غیر معمولی باتیں بے ساختہ طور پر کہہ جاتا تھا۔ جیسے ''بدھ مت کے پیروکار سرریلسٹ تھے۔ یا پھر یہ کہیے کہ 'دادا اِسٹ' تھے۔ یہ سنتے ہی جارجز کو مقدس قسم کا غصّہ آجاتا۔ ایسی غیر سنجیدگی قابل معافی تھی کیونکہ علم پر منحصر ہونے کے علاوہ یہ ایسی لغو بھی نہیں تھی۔ لیکن جھلاہٹ میں جارجز کچھ اس انداز میں بولنے لگتا۔ ''تمہیں لسانیات کا صحافی ہونا چاہیے تھا یا پھر لفظوں کا بیوپاری''۔ لیزو کی لاچاری سے متاثر ہو کر کیونکہ لیزو بچّے کی طرح معصوم تھا۔ میڈلین رسوئی گھر میں چلی جاتی اور کافی تیار کرنے لگتی ہے۔

لیکن جب جارجز بولتا تھا تب میڈلین آلتی پالتی مار کر بیٹھے ہونے کے باوجود آگے جھک کر اپنے دونوں پاؤں جوڑ لیتی تھی اور باتیں ایسے سنتی تھی جیسے کسی ہیرو یا سنت کی باتیں سن رہی ہو۔ جارجز کسی صاحب اعتقاد کے پُروقار کرب کے ساتھ بات کرتا تھا اگر خدا کا وجود حقیقت نہیں ہے تو اسے بہرحال حقیقت ہونا چاہیے اور اگر خدا کو حقیقت بنانا ممکن نہ ہو تو بے دین انسان کو دوزخ کی آگ سے گزرنے پر مجبور کر دیا جائے تاکہ خدا کا وجود حقیقت بن سکے اور وہ شکل اختیار کرے جو جارجز نے وجودِ اعلیٰ کو دے رکھی تھی۔ شے ٹوت کی طرح جارجز بھی اعلان کر سکتا تھا: ''مجھے خدا میں بہرحال اعتقاد رکھنا چاہیے۔ بہرحال!''

اس کا خلوص بڑا متاثر کرتا تھا۔ یہ محسوس ہونے لگتا تھا وہ انسانیت کی بھاری بھرکم تواریخ اپنی خمیدہ پشت پر اُٹھائے ہوئے ہے۔ وہ ہمارے دُکھ درد اور ہماری حماقتیں اُٹھائے ہوئے تھا۔ جیسے ہی وہ سڑک سے گزرتا ہم اس کی پیٹھ پر چیتھڑے پھینک دیتے۔ ہم جتنے زیادہ چیتھڑے پھینکتے وہ اتنی ہی دعائیں دیتا۔ کیونکہ مٹی میں اگھرے کیچڑ میں، گوبر میں رینگتے کیڑوں میں، کُتّے کے زخموں میں، تھوک میں، کوڑے دان میں پڑی ہڈی میں، بل کھاتی گلابی ولیشیا کے چہرے میں جارجز کو خدا کے وجود کا ثبوت دکھائی دیتا تھا۔ اس کے نزدیک ہونے کا مفہوم تھا بدی کے وجود کا ادراک! گناہ کے اعتراف کا مطلب تھا کہ ہم پہلے ہی تقدس کے زینے تک پہنچ گئے ہیں۔ وہ بار بار کہا کرتا تھا کہ خدا ہی برائی ہے میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ جارجز قرونِ وسطیٰ کے کسی میونسپل

خاکروب کی طرح ہے جو کوڑے کچرے کو اپنی پیٹھ پر اٹھا کر پُشتے کے دوسری طرف لے جاکر جلا دے گا۔ اور پھر آگ تاپ کر مدّور خلا میں جھانکے گا۔ اپنی چھاتی پر صلیب کا نشان بنائے گا اور نورِ خدا دیکھے گا۔ جارجز نے نورِ خدا دیکھا ہوا تھا۔ اس بات کا اندازہ آپ اس کے چہرے کے مکمل پن سے لگا سکتے تھے!

میڈلین اپنے سارے چیتھڑے جارجز پر پھینکتی رہتی تھی۔ جیسے وہ کسی کو معمول پر آنے میں اس کی مدد کر رہی ہو۔ ایسا کر کے وہ اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرتی تھی۔ وہ اس کے اس قدر غیر اثر پذیر ہونے سے نفرت کرتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جارجز کی دلچسپیاں صرف مابعد الطبیعاتی نوعیت کی ہیں۔ مینپالے میں جب ہم سیر کرنے جاتے تھے۔ لیزو میرے ساتھ ساتھ رہتا تھا کیونکہ وہ ہندوستان کے بارے میں مزید جاننا چاہتا تھا۔ سنسکرت کے بارے میں بدھ مت، جین مت، لنگایتوں کے بارے میں۔ ٹوڈاؤں کے مذہب اور زبان کے بارے میں۔ وہ ہندوستان کے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتا تھا۔ جارجز اور میڈلین کسی پُرسکون پہاڑی پگڈنڈی پر چل دیتے تھے۔ قدم بہ قدم جیسے جارجز کا نہ صرف ایک بازو تھا بلکہ ٹانگ بھی ایک ہی۔ کبھی کبھی جب وہ راستے میں کسی پتھّر کے سامنے کھڑا ہو جاتا تھا اپنی ہی کسی بات میں کھویا ہوا تو میڈلین اس کی مدد کرتی جیسے وہ اپنے باپ کی مدد کر رہی ہو۔ حالانکہ جارجز کی عمر صرف ۳۱ برس تھی۔ دوسری جانب لانگھنے کے لیے اسے ہاتھ کا سہارا دیتی۔!

وہ اس کی موجودگی کا بڑا دھیان رکھتی تھی ہاں میڈلین بڑا دھیان رکھتی تھی۔ وہ اس کی جس طرح تعظیم کرتی تھی وہ اس کے برہمن شوہر کے لیے برداشت کرنا بالکل باعث مسرت نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جارجز ایسا شخص تھا جو کسی شے کا خفیہ علم رکھتا تھا۔ کوئی ایسا جادو جانتا تھا جو پہاڑوں کو ہلا سکتا ہے اور سمندر کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ جارجز اس قدر مکمل اور بعید تھا کہ میڈلین کے لیے انتہائی برادرانہ جذبات رکھنے کے علاوہ کوئی دوسرا خیال سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے دل میں میڈلین کے لیے کم و بیش ایک باپ کی سی شفقت تھی۔ اس کے علاوہ اسے میڈلین کے قریب رہنا اچھا لگتا تھا۔ وہ

جانتا تھا کہ میڈلین کی بت شکنی بچگانہ ہے کیونکہ اس کی شخصیت میں بے پناہ معصومیت تھی۔ سچی بات تو یہ تھی کہ جونہی میڈلین اپنی معصومیت کا اعتراف کرے گی۔ نورِ خدا اس کی روح میں جگمگا اُٹھے گا۔ وہ وہاں پہلے ہی موجود تھا۔ اس کو چڑانے کے لیے جارجز کہتا
"تم سنت نہیں ہو۔ تم لا مذہب کافر بھی نہیں ہو۔ تم لڑکی ہو!"
لیکن جب جارجز مسیحیات کے کسی دقیق مردہ عقیدے کی تھیوری یا سچی وحدتِ فطرت کی بے تنہ جنم کی کسی تھیوری کی بات لے بیٹھتا تو وہ اس کی پیچیدہ لفظی بحث و تکرار کا خوب مزا لیتی ہے جیسے اسے فاضل وقت مل گیا ہو اور کسی بے نام دشمن کے خلاف کوئی بڑی دلیل!!

منیالے ایک چھوٹی سی گڑھی تھی ایک نوکیلی چھوٹی پہاڑی پر جیسے کہ فرانس میں کہتے ہیں۔ ایک اکیلا گیارہویں صدی کا گڑھ، کٹی پھٹی ہوئی آنکھوں، ہاتھوں اور پاؤں والا۔ سب سے پہلے سارساں کے ہاتھوں ٹکڑے ٹکڑے کیا ہوا جن کی مخالفت میں اس کی تعمیر کی گئی تھی۔ کنت دے منیالے بچیرے بھائی تھے اور ڈیوک دے من سے گور، کے جاگیردار تھے جب کیتھار بدعت آئی تو کنت اپنے ہی فرمانروا کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوا اور ڈومینیکیوں سے مل گیا۔ اس دوران میں اس نے ازوبیل دے ناوار سے شادی کر لی تھی۔ اس نے ایسی گھمسان کی لڑائی کی کہ اس علاقے میں آج بھی لوگ کہتے ہیں۔"سے لوئی دے منیالے جیسا حوصلہ مند" یعنی گدھے کی طرح ہٹھیلا!

مذہبی جنگوں کے دوران اس گڑھی کی دوبارہ قلعہ بندی کی گئی۔ کنت، دے منیالے ہنری چہارم کے ساتھ مل گیا تھا۔ اور جب فراخدل شہزادہ پیرس گیا اور وہاں اس کی تاجپوشی ہوئی تب ان دنوں میں موں سے نیور ہنری کنت دے منیالے وہاں پہلے شاہی رسالے میں ایڈجوٹنٹ جنرل تھا اور بعد میں بحری بیڑے کا وزیر بن گیا۔ ہسپانوی لوگوں کو لوٹ کر اس نے اپنے آپ کو مالامال کر لیا تھا۔ لیکن چونکہ اس کی شخصیت میں ظلم و تشدد اور اذیت کی ایک عجیب وغریب رَو موجزن تھی اس لئے اس کی بیوی اسے چھوڑ کر بھاگ گئی تھی۔ بعد میں اس نے اپنے آپ کو مینار کی دوسری منزل میں بند کر لیا جہاں لوگ کہتے ہیں وہ ابھی گرینیڈیر کی پوشاک میں چکر کاٹتا رہتا ہے۔

ایسا لگتا تھا۔ ازوبیل دے ناوار کے علاوہ گڑھی کی عورتیں کبھی بھی خاص دلچسپ نہیں تھیں۔ سوائے ازوبیل نام کی ایک دوسری عورت کے جو لوئی دے منیالے کی بیٹی تھی۔ ازوبیل اگرچہ اسپین کے قرب میں رہتی تھی لیکن مونتین سے ملنے وہ اس کے کنٹری ہاؤس، میں ہی جاتی تھی۔ وہ اطالوی طرز کے شعر بھی کہتی تھی اور یہ مشہور تھا کہ وہ گھوڑے

پر بیٹھ کر میدانِ جنگ میں گئی تھی۔ منپالے کے نواح میں کی جانے والی شاعری کا موضوع اس کے عاشق ہیں۔ اور جب کوئی لڑکی خوبصورت ہوتی ہے تو لوگ اس کو ازوبیل میری کہہ کر پکارتے ہیں۔ اس کے نام کے ساتھ کنواری مریم کا اضافہ کرکے وہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ باکباز بنی رہے گی۔ اس نے گڑھی کے لیے بس اتنا ہی کیا کہ اس کے لیے اطالوی طرز کا اندر جانے کا راستہ تعمیر کروا دیا۔ لیکن جب انقلاب ہوا تو لوگ کسی بھی غیر ملکی چیز کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے لہٰذا سیڑھیوں کی مشہور اطالوی دوہری توس کا کچھ بھی نہیں بچ سکا۔ سوائے پتھر کے ایک ٹکڑے کے جو بڑے ہال کی مرکزی بالکونی کے ایک دم نیچے کی دوسری منزل سے باہر نکلا ہوا تھا۔

اب آپ گڑھی کے اندر رسوئی گھر کے راستے سے داخل ہوتے ہیں کیونکہ انقلاب کے بعد قلعے کا بہت کم حصّہ بچا رہ گیا تھا۔ یہ جائداد کو ندوم کے کسی بورژوا نے خرید لی تھی اور خاندان کے لوگ سکھ کی زندگی گزارنے کے لیے نسل در نسل انواع و اقسام کی ہیبت ناک چیزیں جمع کرتے گئے۔ اچھا ہوا جب ایک روز ایک ننھی بیٹی نے کھیل کھیل میں باہر پڑے بھوسے کو آگ لگا دی۔ لوگ کہتے ہیں یہ آگ لگاتار کئی روز تک جلتی رہی اور منپالے آگ کا منڈپ بن گیا۔ آج بھی ہم پچھواڑے کی جلی ہوئی سیڑھیاں اور جلے ہوئے شہتیر دیکھ سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا جو کوئی چاہے اس جگہ کو لے لے۔ لاردمیو کے کچھ امیر کسانوں نے اس پہاڑی اور زمین کو کوڑیوں کے مول خرید لیا۔ عمارتیں بھوسہ، گیہوں اور آرم نیاک (فرانسیسی شراب) رکھنے کے کام آنے لگیں۔ لیکن جرمن قبضے کے دوران دوسری گڑھیوں کی طرح اس گڑھی میں نئے سرے سے زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ اسے لاادن کے کچھ شمالی مہاجروں نے خرید لیا اور اس میں دروازے، کھڑکیاں، جنگلے وغیرہ لگوا کر آرام دہ بنا دیا۔ وہ بلا شبہہ بڑا اچھا ذوق رکھتے ہوں گے۔ ورنہ یہ تصوّر کرنا مشکل تھا کہ یہ وہی عمارت تھی جو چالیس برس قبل پوری کی پوری نذرِ آتش ہو گئی تھی۔

جنگ کے خاتمے کے بعد ایک انگریز مصوّر رابرٹ فرن نے اسے خرید لیا۔ پکاسو کے ماحول میں رہنے کے لیے نہیں بلکہ فرانس کی چمکیلی دھوپ سے لطف اندوز ہونے کے لیے۔ اس نے

عمارت میں جدید طرز کی تمام ضروری سہولیات کا انتظام کروایا اور اس میں آرام کے تصوّر کی انگریزی حسیت سے پورا پورا کام لیا۔ وہ وہاں بہت کم وقت کے لیے ٹھہرتا تھا۔ عام طور پر صرف سردیوں میں۔ گرمیوں میں وہ بحرہ روم میں 'یاٹنگ' کے لیے جایا کرتا تھا۔ رابرٹ سے ہم سینٹ ریمی میں ملے تھے۔ کمیونسٹ مصوّروں کے درمیان! مادام فارول کو ہندوستان سے اتنا پیار تھا کہ وہ اکثر ہمیں دعوت دیا کرتی تھی۔ جب گرمیوں میں ہمارا کہیں جانے کا ارادہ ہوتا تو وہ ہمیں منیالے جانے کی صلاح دیتی۔ اور رابرٹ فرن اچھے لوگوں کو جگہ کرائے پر دے کر خوش ہوتا۔ وہ معمولی سے کرائے کا مطالبہ کرتا جو ہم بہ آسانی ادا کر سکتے تھے۔ ہمارے لیے وہ اپنے ملازم، گھوڑے اپنی گائیں اور ہمارے دیکھنے اور دیکھ کر مخلوظ ہونے اور ان کی تعریف کرنے کے لیے اپنی تصویریں بھی چھوڑ جاتا۔ کیوبزم میری سمجھ کے دائرے میں پوری طرح نہیں آتا۔ لیکن میڈلین اور جارجز ٹب میں بیٹھی ہوئی عورت کی تصویر کے سامنے گھنٹوں کھڑے رہتے جس میں اپنے بارے میں کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ سوائے ان مربعوں، مستطیلوں اور مخمسوں کے جو عجیب وغریب رنگین جھمیلے کی طرح تھیں۔ لیکن رابرٹ بڑھیا آدمی تھا۔ اتنا مہذب اور شائستہ کہ پورا قلعہ اسے اور اس کی شفاف موجودگی کو محسوس کرتا تھا۔

میں پوجا گھر میں سوتا تھا۔ جائے محفوظ میں آب پاک کے طاق کے علاوہ کچھ نہیں بچا تھا۔ میرے دروازے کے اوپر ایک خوبصورت صلیب تھی۔ چونکہ صلیب میں یہاں وہاں کچھ ٹیڑھی ترچھی لکیریں اور کھرونچیں تھیں جن کی وجہ سے وہ سواستک جیسا لگتا تھا۔ اس لیے لیزو نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ کیتھروں نے ضرور اس عبادت گاہ کو خفیہ طور پر استعمال کیا ہوگا۔ آریاؤں کا نشان۔ سواستک۔ نیسٹورین لوگومل اور کیتھار وسط ایشیا سے لائے تھے۔ ہٹلر کو اس نشان کا علم ہونے سے پہلے ہی سبھی باسک اور کئی بیار گھروں کی باہری دیوار پر یہ نشان موجود تھے۔

بدعتی روّایوں کا مخالف ہونے کے باوجود ہنری دے منیالے ضرور کافی حد تک خود بھی مسلّم عقیدوں کا مخالف رہا ہوگا۔ ایک وقت اس علاقے کے سبھی لوگوں اور بیشتر شرفا کی

طرح! جو لڑائی ہار جانے کے بعد اپنے آپ کو بچانے کی تہ کو زندہ جلائے جانے پر ترجیح دیتے تھے۔ ہنری دی منپالے بھی سوچ بچار کے بعد اُسی وجہ سے آتش کے بشپ سے جاملا ہوگا۔ جہاں تک اس کی بہادری کا سوال ہے اپنے جیسے کئی لوگوں کی طرح وہ عقیدے سے نہیں بلکہ اعتقاد کی کمی کے باعث اس کے اندر پیدا ہوئی ہوگی — وینی، کرے آتم سپر تیوس۔

لیزو ناقابلِ علاج سنکی تھا۔ اس کے نزدیک انسانی تاریخ، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ نوعِ انسان گرامر اور کیلنڈر کی تاریخوں کا محض ایک سوال تھا۔ جہاں تک باقی باتوں کا تعلق تھا وہ بیشتر ہسپانیوں کی طرح اس بات میں یقین رکھتا تھا کہ انسان صرف ایک نفیس جانور رہے۔ زندگی کو لطف و انبساط اور خدا کے خالقوں میں رکھنے کے رویّے میں عرب روایت کا بھی کچھ اثر تھا۔

لیزو شمال کے بڑے کمرے میں رہتا تھا جس کا استعمال ہنری دے منپالے خود کیا کرتا تھا۔ وہاں اسے ہمیشہ عجیب و غریب خواب آتے تھے۔ چونکہ بیشتر لاطینیوں کی طرح وہ کسی کہانی سے صرف کہانی کی طرح لطف اندوز ہونے کی اہمیت رکھتا تھا اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کی بات میں اس کی اپنی اختراع کے عناصر کس حد تک شامل تھے یا سچائی کتنی تھی! کبھی کبھی وہ ملازمہ میری کو اندر بلالیتا تھا گواہی دینے کے لیے۔ میری بڑی تفصیل سے اور زور دے کر بیان کرتی تھی کہ کس طرح اس نے بھی کنت کے بارے میں ویسا ہی خواب دیکھا تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہے اور گھوڑے کو بے تحاشہ دوڑتا ہوا میدانِ جنگ میں آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ پھر وہ یکایک رک جاتا ہے اور چلا کر پکارتا ہے "بزرگو مجھے پانی کا ایک گلاس دو"۔ بلاشبہ پانی سے مراد موت ہی ہوگی کیونکہ شراب کا مطلب تھا زندگی!

جارجز اصطبل کے قریب کونے کے چھوٹے کمرے میں رہتا تھا۔ وہ جانوروں کے قریب رہنا پسند کرتا تھا۔ اس کے مطابق اس کا یہ رویّہ سبھی جانوروں کے تئیں روسیوں کے رویّے کی دین تھا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ایسے تمام لوگوں کی طرح جو توجہ ایک نکتے پر مرکوز کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں جارجز کو بھی ایسی علیحدگی مرغوب تھی جس میں فرد اپنی موجودگی کی قربت کو محسوس کرتا ہے۔ جب آپ کسی بڑی جگہ ہوتے ہیں تو آپ کھیتوں اور آسمان سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ اور آپ کی آنکھیں پہاڑوں کی رفعتیں تلاش کرنے لگتی ہیں۔

پائی رینیز وہاں سے صرف سو کلومیٹر دور تھا اور گرمیوں میں کسی دن جب آسمان صاف ہوتا تھا تو سپانیے ایسے دکھائی دیتا تھا کہ آپ اگر گھوڑے پر سوار ہو کر آگے بڑھتے جائیں تو سفید پہاڑ کی دیوار اور بھاری بھرکم سار ساں تک پہنچ سکتے تھے۔

مینار کے برجوں والے کمرے سے جہاں میڈلین سوتی تھی آپ کہار کے علیحدگی پسند تکبّر سا تصوّر کر سکتے تھے۔ وہاں سے پہاڑ کسی فرانسیسی قلعے سے زیادہ ایک ہسپانوی گڑھ کی طرح دکھائی دیتا تھا۔

باہر کھیتوں میں انتہائی خوبصورت نیلی اور سبز ــــ انگور کی بیلیں پھیلی ہوئی تھیں۔ اور پیچھے باغ میں آبر جین اُگی ہوئی تھی۔ بعض اوقات جیسا کہ ہندوستان میں ہوتا تھا جب گرمی بڑھ جاتی تھی تو آپ گھاس کی تیکھی بو سونگھ سکتے تھے۔ اکثر جب میری کھانسی مجھے کچھ کم ستاتی تو میں جلدی اُٹھ جاتا تھا اور اپنی گھوڑی بلانش پر ایک ہی جست میں سوار ہو کر کودتا پھاندتا نیچے ندی تک نکل جاتا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا بلانش مجھ سے وہ سب کچھ کہہ سکتی تھی جو کوئی انسان نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ میرا مسئلہ تو نہیں سمجھتی تھی۔ لیکن مجھ سے اس سفید چھوٹی ندی گیو د توپ کا تصوّر کرنے کے لیے بہر حال کہہ سکتی تھی جو زردی مائل دیہی زمینوں پر خاموشی سے بل کھاتی ہوئی اپنے سفر پر گامزن تھی۔

آخر مسئلہ کیا تھا؟ یہ ٹھیک سے شروع کہاں سے ہوتا تھا۔ میڈلین کا انداز اس سے پہلے اس قدر شیریں کبھی نہیں تھا۔ میری ہر ضرورت کو وہ پہلے سے جانتی تھی اور اسے وہ پورا کر دیتی تھی۔ دوپہر کو کھانے کے بعد میری دوا۔ میرا رومال جب میں سیر کے لیے نکلتا تھا۔ میری پنسل خوب اچھی طرح بنائی ہوئی اور میری نوٹ بک پر سلیقے سے رکھی ہوئی۔ آل بی جاسیاں پر میرا کام ابھی جاری تھا۔ پھر بھی وہ خود وہاں نہیں تھی۔ وہ کہیں بھی نہیں تھی۔ بعض اوقات جب جارجز بات کرتا تو وہ ایک نظر میں ایک سیکنڈ کی مسکراہٹ میں مجسم روپ اختیار کر لیتی۔

لیکن لیزو سے وہ نفرت کرنے لگی تھی اور بھگوان سے وہ پرارتھنا کرتی تھی وہ وہاں آیا ہی نہ ہوتا۔ اگرچہ لیزو ہسپانوی کہلانے سے نفرت کرتا تھا اور اصرار کرتا تھا کہ وہ باسک ہے لیکن وہ بھی ہسپانیوں کی طرح میڈلین یا کبھی کبھی صحت مند دکھائی دینے والی نوکرانی

میرئ سے بھی چھچھورا پن کیے بنا نہیں رہ سکتا تھا۔ میرئ کا نوجوان دوست صرف ایتوار کی دوپہر کے بعد آتا تھا اور اس بیچ لیزو کو معصوم انداز کی لطف اندوزی کے لمحے میسر آتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی سیر کرتے ہوئے جب وہ کسی نوجوان لڑکی کو نل کے پیچھے پانی بھرنے کا برتن رکھے ہوئے دیکھتا تو گنگنانے لگتا: "او! پیار کے آکاش!" پھر اچانک میڈلین کو آنکھ مارتا۔ جیسے کہہ رہا ہو "کیا واقعی یہ لڑکی خوبصورت نہیں ہے؟" لیزو جس قدر الگ تھلگ پڑتا جاتا اس کا عامیانہ پن مزید نمایاں ہوتا جاتا لیکن وہ ہرگز احمق نہیں تھا۔ ایک شام کھانے کے بعد کافی پیتے ہوئے جب اس نے ایک نازیبا بات کی تو میڈلین اُٹھ کر سیدھے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ وہ سمجھ گیا اور کچھ دن کے اندر ایک فضول سا بہانہ بنا کر وہاں سے چلا گیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ ہسپانوی سرحد کے بہت قریب تھا اور فرانسیسی پولیس کب کیا کرے گی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ہم لوگ بہرحال جانتے تھے کہ فرانکو کے پٹھوؤں کے پاس کرنے کے لیے اس سے بہتر بہت سے کام ہیں۔ انہیں تو بڑی مچھلیوں کو پھانسنا ہے۔ نہ کہ بیچارے زبان دان لیزو کو۔!

حالانکہ لیزو کی روانگی ناگزیر لگتی تھی لیکن اس کے جانے سے مکمل طور پر ایک نئی صورت پیدا ہو گئی۔ میں نے منیالے میں اپنے لیے اپنے بارے میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ان دنوں کے اپنی ڈائری کے اوراق جب میں دوبارہ پڑھتا ہوں تو سفید کاغذ کے پسِ منظر میں سیاہ تحریر میں اپنے آپ کو دیکھ کر مجھے ذہنی سکون ملتا ہے۔ یہ میرا خیال ہے۔ یہ تحریر مجھے میرے سامنے زیادہ معروضی انداز میں کھڑا کر دیتی۔ اس ڈائری کو پڑھ کر کئی حیران کن باتوں سے میرا سامنا ہوا ہے۔

۱۱ اگست: بدی کے مقابلے میں نیکی کو قبول کرنا زیادہ مشکل ہے۔ بدی کا ایک انداز ہے کہنے کا۔ "میں حاضر ہوں مجھے قبول کر لو اور باقی سب بھول جاؤ۔" دوسری طرف نیکی اس طرح گویا ہوتی ہے "میں روبرو کھڑی ہوں، تم مجھے قبول بھی نہیں کر سکتے اور مجھے فراموش نہیں کر سکتے!" نیکی اپنے آپ کو شکست دیتی ہوئی لگتی ہے جبکہ بدی فتحیاب ہو جاتی ہے۔

"یہ مکمل طور پر سچ نہیں ہے۔ روانگی سے قبل لیزو اس قدر بے تکلف، اپنا قریبی اور

فراخدل لگنے لگا تھا کہ آپ اگر فرمائش کرتے تو وہ اپنا بڑا کوٹ آپ کی نذر کر دیتا اور آپ کے سامنے عقیدت سے سجدہ ریز ہو جاتا۔ لیکن میڈلین میرے لیے پھانس کی طرح تھی جو میرے سانس میں حائل ہو جاتی تھی۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے میں جتنا کم کھانسوں میرے لیے بہتر ہو گا۔ لیکن جب میں کسی روز کچھ کم کھانستا ہوں تو پھر کسی دن کھانسی اس شدت سے اٹھتی ہے کہ میرا سارا بستر خون سے لت پت ہو جاتا ہے۔ تب میڈلین اپنے درویشانہ ہم نام کی طرح مجھے سہارا دے کر بٹھا دیتی ہے اور پیار بھری خوبصورت آنکھوں سے میری طرف دیکھتی ہے اور میرے چہرے سے خون پونچھ دیتی ہے اور پھر چلمچی کو ایسے اُٹھا کر لے جاتی ہے جیسے کسی شہید کا خون لے جا رہی ہو۔ عورت یا مرد کے لیے میں سمجھتا ہوں 'درویشی فطری' ہے۔ نہ کہ نیکی۔

"کل جب مجھے واپس بستر میں لٹا کر میڈلین یہ طے کرنے کے لیے رُکی رہی کہ میرا سانس ٹھیک ہو گیا ہے اور معمول پر آ گیا ہے اور پھر مرکزی ہال میں چلی گئی تو میں اسے ساری رات جارجز سے کھسر پھسر کرتے ہوئے سنتا رہا۔ وہ گہری تشویش سے میری بیماری کے بارے میں بحث کر رہے تھے کیونکہ پچھلے تین سال سے اتنا زیادہ خون کبھی نہیں نکلا تھا۔ جارجز کی آواز اس قدر سنجیدہ اور گہری ہے خاص طور پر رات کے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آدمی سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ دیواریں کوئی پیشن گوئی کر رہی ہیں۔

میڈلین اب پہلے سے زیادہ خوبصورت لگتی ہے۔ اس کی نیک سیرت اس کو خصوصیت عطا کرتی ہے۔ وہ سینٹ جان آف دی کراس میں سے اور بدھ مت کے بارے میں بہت کچھ پڑھتی ہے۔ بدھ مت میں اسے خوشی ملتی ہے لیکن جارجز کے ساتھ وہ کسی عیسائی کے بارے میں پڑھنے کو ترجیح دیتی ہے۔ اب میں اسے سنسکرت پڑھاتا ہوں۔ وہ کہتی ہے وہ لیزو کے کارن سنسکرت سے نفرت کرنے لگی تھی۔ لیکن جارجز کی رائے مختلف ہے۔ اس کا خیال ہے کہ میں سنسکرت کو محسوس، تو کرتا ہوں لیکن سنسکرت جانتا نہیں ہوں۔ دوسری طرف لیزو زبان جانتا تھا لیکن اسے اس بات کی پرواہ نہیں تھی کہ وہ زبان آئس لینڈ کی تھی یا ہیبرلیو۔ کلاسیکی ذہن میں ایک وقار ہوتا ہے جو مجھے کبھی حاصل نہیں ہو گا۔ میں اتنا کمزور ہوں کہ لوگ جہاں سیارے دیکھتے ہیں مجھے وہاں صرف ستارے دکھائی دیتے ہیں۔

۱۷ اگست : یہ ہفتہ ایک شاندار وقفہ تھا۔ جارجز میرے بہت قریب آگیا ہے۔ اس کی شائستہ، متحرک، بے اعتنا موجودگی میں ہم اپنے آپ کو خود غرض اور غیر شائستہ محسوس کرتے ہیں۔ عیسائی انکسار میں کیسا حسن ہے۔ یہاں تک کہ کچھ خوبصورت عورتیں ماتمی لباس پہن لیتی ہیں کہ یہ لباس پہن کر وہ اور بھی خوبصورت لگتی ہیں۔ برہمن میں، وید انتی میں بڑا گھمنڈ ہوتا ہے۔ وہ اشٹ وکر ہی تھا جس نے کہا تھا "میں عظیم ہوں، میں عظیم ہوں۔" حالانکہ اس میں آٹھ قباحتیں تھیں۔ ہاں انسان واقعی عظیم ہوتا ہے جب فرد — فرد نہیں ہوتا لیکن ایک وسیع تر 'میں' میں ڈھل جاتا ہے۔

" عجیب بات ہے جوں جوں میں بدھ مت سے دور ہوتا جا رہا ہوں۔ یہ میڈلین ہے جو اس کی گہرائیوں میں اترتی جا رہی ہے۔ وہ بدھ دھرم کے جذبۂ ہمدردی اور اور اس کی شاعری سے بہت متاثر ہے اور یہ انکساری، حماقت اور اندھ وشواس سے آزاد ہے۔ اس میں شاعری ہے جو زمین دوز قبروں کی مخصوص باس سے آلودہ نہیں ہے۔ عیسائی تبرکات 'باقیات سے کس حد تک وابستہ ہیں! ایک عیسائی کو یہ جسم زندگی کی بجائے موت کے بعد زیادہ قابلِ احترام محسوس ہوتا ہے۔ میڈلین کہتی ہے وہ لوگ جن کے سر پر چھت نہیں ہوتی وہ بھی خاندانی قبرستان کے لیے زمین خریدتے ہیں۔ وہ جانتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ وہ کیا کر رہی ہے کیونکہ سیاں مدارد کے مشہور خاندانی قبرستان کے بارے میں کنبے میں کافی بات چیت ہوتی رہتی ہے۔ میڈلین کہتی ہے :" قبر کے لیے قبر! میں تو چاہوں گی کہ میری ہڈیاں جنوبی سورج کی گرمی محسوس کریں۔ بجائے اس کے کہ مٹی میں سے ہو کر آنے والی دُھند میرے غیر موجود جسم پر پسینے کی بوندوں کو ترتیب دینے لگے۔ اوہ!'

میڈلین کے لیے عیسائی مذہب سے متعلق خواہشات سے بھرنے کے لیے ایک علاقہ۔ وہ علاقہ بہر حال میں نہیں ہوں۔ لیکن وہ اس بات کا اعتراف نہیں کرے گی۔ وہ سوچتی ہے کہ سینٹ جان آف دی کراس کی تعریف کرنا مجھے دھوکا دینے کے مترادف ہوگا۔ لیکن بعض اوقات جب وہ صحن میں دھوپ میں بیٹھے ہوتے ہیں اور جارجز اور وہ ہسپانوی صوفی کی باتیں کر رہے ہوتے ہیں تو وہ اس قدر نرم مزاج اور سمجھ بوجھ والی لگتی ہے کہ ایسا محسوس

ہوتا ہے۔ یہ وہ ہے جو جارجز کو کچھ سکھا سکتی ہے۔ وسیع المشربی آزاد خیالی اس کی فطرت ہے۔ جارجز کا سارا مذہبی جوش اسے وہ جبلی فطری انداز نہیں دے سکتا۔ حالانکہ مذہب کی بھی ایک جبلّی نوعیت ہے جو کسی جملے یا حوالے کو منوّر کر دیتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جب وہ بدھ مت کے بارے میں بات کرتی ہے تو مجھے محسوس ہوتا کہ لفظ 'دکھ'، کم و بیش انتڑیوں کے ساتھ میرے ہاتھوں میں گر رہا ہے جبکہ اس کے نزدیک محض 'غم' ہے۔ دکھ تخلیق کا المیہ ہے۔ رنج و غم ــــ رنج و غم کا رنج و غم ہی ہے۔

۲۳ اگست۔ میڈلین آج آئی اور میرے بستر پر میرے پاس بیٹھ گئی۔ باہر دن بڑا سہانا تھا۔ میں طوطوں کی چیخیں سن سکتا تھا یا بندروں کی پیپل کی ایک شاخ سے دوسری شاخ تک کود پھاند کرتے ہوئے اس نے دیکھا میں کس قدر خوش تھا۔ لیکن یہ اس خوشی کی کیفیت تھی جو اس حقیقت کا ادراک رکھتی ہے کہ زندگی ٹھیک اس طرح شعور سے شعور کا سفر ہے جیسے سیدھی لکیر ایک نکتے سے دوسرے نکتے تک ہوتی ہے۔ درمیان میں زندگی کے تسلسل کا ادراک ہے۔ رنج و غم جملہ لمحات کا پس منظر ہے۔ لمحے کا مطلب ہے عارضی، ناپائیدار، اور جو کچھ بھی عارضی یا پائیدار ہوتا ہے ہمیشہ غم والم لیے ہوئے ہوتا ہے۔ مجھے رلکے یاد آگیا۔

"وہ خود بھی بہت خوش تھی۔ اس نے میرے ہونٹوں کو چوما جو وہ پہلے کبھی نہیں چومتی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو مکمل طور پر میرے سپرد کر دیا جیسے وہ ایک تحفہ تھا تاکہ میری جان بچ جائے۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ میں اتنا زیادہ بیمار نہیں تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ جب ماں بیمار ہوئی تھی تو اس کے پاس ہمیشہ چلمچی اور تولیے کی ضرورت رہتی تھی۔ مجھے تو بس دوبارہ ہلکی سی تکلیف ہو گئی تھی۔ تشویش کی کوئی بات نہیں تھی۔

"میڈلین مجھ سے محبت نہیں کرتی۔ وہ چاہتی ہے کہ میں بڑا اور سچا بنوں تاکہ وہ اپنا پیار مجھ پر نچھاور کر سکے۔ جیسے کوئی بھگوان کی بھگت چاہتی ہو کہ اس کا شو یا کرشن عظیم اور بڑا ہو تاکہ وہ شاندار طریقے سے دودھ، شہد اور گنگا جل سے اس کا 'ابھیشیک' کر سکے، اس کی پوجا کر سکے۔ عشق کی بنیاد ہے کسی دوسرے کی پرستش کرنے میں اپنے آپ کو اوپر اٹھانے میں۔ ہم پرائے بن کر ہی خود وجود میں آتے ہیں۔

۲۴ر اگست۔ جارجز تین چار روز میں جا رہا ہے۔ اس سے مجھے دکھ ہو رہا ہے۔ اس میں پتھر کی ٹھوس دیوار سا کچھ تھا جس کا میڈلین مجھ سے پیار کرنے کے لیے سہارا لیتی تھی۔ اس نے اپنے خدا سے خوب التجا کی ہوگی۔ دعا کی ہوگی۔ لیکن میڈلین خوش تھی۔ الجھاد سے اسے نفرت ہے۔ وہ سمجھتی ہے جارجز کا خدا یا بھگوان۔ کچھ کچھ خدائے جشنِ عشرت ہے جس کے لمبے لمبے دانت ہیں اور دیکھنے میں بڑا بھیانک ہے۔ وہ کہتی ہے قرونِ وسطیٰ میں جارجز اس مشہور پادری جیسا ہوتا جس نے تسبیح کے دانوں پر وظیفہ اس لیے زور زور سے پڑھنا شروع کر دیا تھا کہ بدعتی کو مناسب ایذا پہنچائی جا سکے۔ اذیت دینے والوں کو مخاطب کرتے ہوئے اس عظیم پادری نے یہ کہا تھا "اس شخص کو اس وقت تک اذیت دی جائے جب تک میں اس کی چیخیں نہ سن لوں"۔ اس لیے بشپ اپنے راہب اعلیٰ سے چلّا کر کہتا رہا کہ چرچ کے گناہ معاف کر دیئے جائیں۔

"مذہبی تعصب میں بڑی طاقت ہے یہ آپ کو رفعتوں پر لے جاتا ہے اور آپ کے اندر بہادری کا ناممکن کا احساس پیدا کر دیتا ہے۔ آج کے متعصب لوگ پہاڑوں پر چڑھنے والے بن رہے ہیں۔ یہ ایک قسم کا روحانی تکبّر ہے

"سچ سادہ، فطری اور شیریں ہونا چاہیے۔"

۲۶ر اگست۔ جارجز سنیچر کے روز میرے پاس آیا۔ جب میڈلین گھر کا سامان لینے نیچے اتر گئی ہوئی تھی۔ وہ آرام سے بڑے ادب سے ایسے بیٹھ گیا جیسے خدا سے طویل سلسلۂ ترسیل میں رہا ہو۔ کہنے لگا "رام میری تم سے آخری درخواست ہے۔ تم جانتے ہو یہ بات میں اپنے گناہ گار دل کی گہرائیوں سے کہہ رہا ہوں۔ میں روسی ہوں، تم ہندوستانی ہو۔ ہم دونوں میں نسل کا مسیحی پاگل پن ہے۔ ہمارے لیے صرف حقیقتِ اعلیٰ ہی کی اہمیت ہے۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ تمہارے ساتھ رہتے ہوئے، جیسا کہ میں ان دنوں کر رہا ہوں۔ تمہاری برہمنیت مجھے اچھا عیسائی بننے میں مدد کر رہی ہے۔ ہم جو کچھ بڑی کوشش سے، نیکی کی تمنا سے کرتے ہیں تم بے ساختہ انداز سے کرتے ہو۔ میں جن باتوں کے لیے تمہاری تعریف کرتا ہوں۔ وہ تمہاری کم کھانے کی عادت اور ہر شے کے لیے، ہر شخص کے لیے تمہارا فراخدلانہ کھلاپن ہے جس سے تم ہر شے، ہر شخص سے گھل مل جاتے ہو۔ سب سے بڑی بات

جو ایک عیسائی کے لیے پرکشش ہے وہ ہے میڈلین سے تمہارا رشتہ۔ میں نے کسی یورپی شادی شدہ جوڑے کو ایسی معصومیت کے ساتھ کام کرتے اور ایک دوسرے کے ساتھ پیش آتے نہیں دیکھا۔ ...شہرت پرستی کا گناہ...' اس کے بعد میرے ذہن پر اندھیرا چھا گیا۔ میں کبھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ برس ۱۹۵۱ء میں بھی کوئی سمجھ دار آدمی اس طرح کے غیر شائستہ الفاظ کا استعمال کر سکتا ہے۔ اس سے اس کی کہی ہوئی بات سے زیادہ اس کے ذہن کا پتہ چلتا ہے۔ مجھے آج بھی یاد ہے وہ کہہ رہا تھا: "شہوت پرستی کا گناہ"۔ میں نے باہر آکاش کی جانب نگاہ اٹھائی اور پرندوں کو گولروں پر چونچیں مارتے ہوئے دیکھا۔ مجھے کچھ ایسے محسوس ہوا کہ مجھے اٹھا کر انہیں پتھر مارنا چاہیے۔

لمبی خاموشی کا وقفہ آیا۔ پھر جارجز بولا:

"نروان صرف اس کے لیے ہے جس کا بپتسمہ ہو چکا ہو۔ تمہیں پتہ ہے کہ پے گئی کو میری ٹین کیسے چرچ میں واپس لایا۔ میں تمہیں جانتا ہوں رام! نروان کہیں نہیں ہے۔ بالکل نہیں۔ اگر کہیں مل سکتا ہے تو صرف مسیح کے چرچ میں!"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور اس کا چہرہ ویسے ہی چمکنے لگا جیسے ایل یوشہ کراما زوو کا جب سٹارٹسز زوسیما اپنے مردہ جسم سے اٹھ کر اس کے سامنے ہالۂ نور میں ظاہر ہوا۔

میں ہمیشہ تمہارے لیے دعا کروں گا۔ فادر زے نوبیاس پہلے ہی تمہارے لیے دعا کرتے ہیں۔ کرائسٹ کے چرچ کے علاوہ کہیں کوئی امید نہیں ہے۔

۲۹ر اگست: حیرانی کی بات ہے کہ اس سے مجھ پر اتنی گہری چھاپ پڑی۔ کئی کئی راتوں کو میں نے کھلی آنکھوں سے کھڑکی کے باہر جھانک کر رات کے پرندوں کو پیڑوں کی شاخوں میں حرکت کرتے دیکھا ہے۔ بہت دور کوئی روشنی چمکتی ہے جو باٹرے نیز سے بھی ہو سکتی ہے اور میں خدا کے تئیں اشتیاق و آرزو سے معمور ہو جاتا ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے میں گھٹنے ٹیک کر سجدہ ریز ہو جاؤں اور کسی ایسی چیز کی پرستش کروں جس میں موجودگی کا قرب ہو۔ بے تکلفی ہو۔ تواریخی اعتبار ہو۔

"اب میں مسلمان کے ذہن کو سمجھ سکتا ہوں کیونکہ محمد تاریخی اعتبار سے خدا کا آخری پیغمبر تھا۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ جب ابن آدم دھرتی پر اترتا ہے تو ہمیں کچھ اس طرح خدا کے وجود کا

ثبوت دیتا ہے کہ کافروں کا کوئی مذہب کبھی ایسا نہیں کر سکا۔ چاہے وہ مذہب ہندوؤں کا ہو یا یونانیوں کا۔ شِو اور وشنو کیلاش یا بیکنٹھ میں نواس کرتے ہیں۔ تم انہیں دیکھ بھی سکتے ہو اور نہیں بھی اور ایک بار ظاہر ہونے کے بعد وہ غائب بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن پیغمبر والا مذہب خدا کو وقت میں ایک مقام عطا کر دیتا ہے۔ اسے ماں اور باپ دے دیتا ہے۔ بھلے ہی وہ کنواری مریم ماں کی کوکھ سے پیدا ہوا ہو۔ اسے دوست اور دشمن بھی دیتا ہے۔ سینٹ جان سے زیادہ یہودہ نے مسیح کو مقدس بنایا ہے۔ تم سینٹ جان کو اسی طرح جانتے ہو جیسے کچھ خاندانوں میں لوگ کہتے ہیں۔ "اوہ! سینٹ لوئی کی دادی راش فوکو تھیں" اور فوراً ہی یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ سینٹ لوئی سچ مچ رہا ہوگا اور تم خود جہاد میں شامل رہے ہو گے اور یروشلم کا مقدس علم واپس جیت لیا ہوگا۔ تاریخیت انسانی یقین کا حصہ ہے۔ یہ انسان کو حقیقی بناتی ہے۔ اگر مسیح یا محمد تاریخی نہ ہوتے تو خدا ممکن نہیں تھا۔

۳۰ر اگست: میں آل بی جاسیاں سے متعلق اپنا کام کرنے آیا تھا۔ انجانے ہی میرا ذہن بھٹک جاتا ہے اور میں اپنے آپ سے اپنے بارے میں بات کرنے لگتا ہوں۔ تاریخ مجھے ثابت کرنے کے لیے 'چکر ویوہ' بناتی ہے۔ یا خدا کوئی اپنے آپ سے باہر کیسے نکل سکتا ہے!

میں کہہ رہا تھا کہ مسیح اور محمد کی تواریخی موجودگی خدا کے ہونے کی جانب نتیجہ خیز انداز سے اشارہ کرتی ہے۔ مسیحی بدعت کی صحیح تشریح اگر کبھی ہو سکتی تھی تو وہ یہ ہے۔ کیتھاروں سے جب پوچھا جاتا تھا کہ وہ مسیح میں سچ مچ اعتقاد رکھتے ہیں تو وہ ہمیشہ مکمل وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ لیکن جب ان سے یہ پوچھا جاتا کہ کیا وہ "ہولی گھوسٹ" روح القدس میں رکھتے ہیں تو وہ یقین سے جواب دے سکتے تھے۔ جو کچھ بھی غیر یقینی ہے۔ وہ لوگوں کا دشمن ہے۔ یہ ایک قسم کا روحانی ڈارونزم ہے۔ عیسائیت، اسلام اور یہودیوں کا مذہب۔ اسی دھرتی کے مذہب ہیں۔ لیکن تاؤازم، بدھ مت، ویدانت زمانۂ حال کی افراتفری میں بستے ہیں۔ زمانۂ حال کی صورت میں دیکھا گیا لمحہ موجود کبھی نظام ابتری نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ہندوستانیوں نے کوئی تاریخ نہیں لکھی اس لیے بدھ مت بھی کچھ زیادہ تاریخی ہونے کے کارن ہندوستان کے لیے آسی تناسب نفسیاتی نوعیت اختیار کر گیا۔ ویدانت مہایان بدھ دھرم کی طرح فتحیاب ہوا کیونکہ مہایان ویدانت کے قریب تھا۔ اسی طرح تاؤازم، کنفیوشنزم پر سبقت لے گیا

کیتھارلوگ۔ کیا وہ ویدانتی تھے؟ وہ موت سے نہیں ڈرتے تھے۔ وہ پاکیزگی اور تقدّس میں اعتقاد رکھتے تھے۔ وہ سچّائی میں یقین رکھتے تھے۔ چرچ کا خدا میں اعتقاد تھا۔

"ان کچھ دنوں میں میں چرچ کے زیر سایہ کس قدر خوش ہوں۔ میں اپنے آپ کو بڑا محفوظ محسوس کرتا ہوں۔ میں اپنی انسانیت میں مستحکم محسوس کرتا ہوں۔ واقعتاً میں خوش ہوں۔

جارجز نے مجھے دوستوسکی پر بریڈلیف کی لکھی ہوئی کتاب پڑھنے کو دی ہے۔ اور آج رات میری نظروں کے سامنے کتاب کا یہ اقتباس ہے:

"خدا کا قتل انسان کے قتل کے مترادف ہے۔ خدا انسان کو نہیں نگلتا۔ نہ ہی انسان خدا میں مدغم ہوتا ہے۔ آخر تک وہ صحت مند رہتا ہے" دوستوسکی صحیح معنوں میں یہیں اپنے آپ کو عیسائی ثابت کرتا ہے۔

"میرا بڑا جی چاہتا ہے کہ کاش میں میڈلین کو بتا سکتا۔ میں اس کے خدا کی پرستش کرنے لگا ہوں"

۳۱ راگست: کل جب شام ڈھل رہی تھی تو میڈلین مجھے گھر لے کر آئی اور لمبی سیر کے لیے دوبارہ باہر چلی گئی۔ میں اپنے کمرے میں لوٹ آیا ہوں۔ مجھے یاد آیا کہ یہ پرانا چیپل تھا۔ میں کھڑکی کی طرف منہ کر کے گھٹنے ٹیک کر دعا کرنے لگا۔ اِدھر اُدھر کی بے معنی باتیں کرنے لگا۔ (دعا کے لیے میری لاطینی زبان کی واقفیت بڑی محدود ہے اور سچے عیسائی کا احساس صرف لاطینی میں ہی ہو سکتا ہے) میڈلین کے ذہن میں کوئی خیال آیا ہوگا کیونکہ وہ غیر متوقع طور پر واپس لوٹ آئی۔ کہنے لگی وہ اپنی چھڑی بھول گئی تھی وہ نہیں چاہتی تھی کہ مسٹر رابرٹ کے کتے اسے کاٹیں لیکن جب وہ آئی تو جانتی تھی۔ کہ وہ مجھے جانتی ہے۔ یہی وہ مشترکہ علاقہ تھا جس میں ہم ایک دوسرے کے ساتھ تھے اور پہلی بار مجھے لگا کہ وہ مجھے کچھ روٹی دے گی اور کہے گی "رام۔ یہاں بہت سے جراثیم ہیں۔ دھیان رکھنا" پھر وہ بھی میرے پہلو میں گھٹنے ٹیک دے گی۔ وہ میری دلہن! کل میں نے اس کے ساتھ اپنے رشتہ ازدواج کی تمازت محسوس کی ایسی پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کل رات میرے پاس کیوں آئی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ جانتی

تھی کہ جارجز چلا گیا ہے اور معصوم نوکروں کے علاوہ اور کوئی نہیں سوچے گا کہ مسٹر اور مادام بستر میں ایک ساتھ ہیں۔ میڈیلین محسوس کرتی تھی کہ کسی دوسرے کی نظر سے کہیں زیادہ برا اس کا خیال ہے۔ پچھلے کچھ دنوں سے وہ جارجز کو کچھ پسند کرنے لگی تھی۔ سینٹ جان آف دی کراس کا ذکر کرتے ہوئے وہ ترغیب کے پہلو پر خاص زور دیتا۔ کچھ دنوں سے اس کے اندر نسائیت نمایاں ہو رہی تھی۔ زور مار رہی تھی۔ پچھلی رات وہ ہمیشہ کی طرح ایک ہی حرکت میں اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور منیپالے کے چیپل میں جب رات انسان کے شعور ذات کی طرح شفاف تھی وہ دوبارہ میری بیوی، میری دلہن بن گئی اور میں نے اسے کئی پیارے پیارے ناموں سے پکارا۔ میں نے اسے اپنی اذو بیل بھی کہا۔ اور اس نے اس طرح قہقہہ لگایا کہ کہسار موجِ برق کے نظارے سے سرشار ہو گئے ہوں گے۔

آج میں بالکل مختلف انسان ہوں کیونکہ عورت سے بیاہ کرنے کے لیے اس کے بھگوان سے، خدا سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونا ضروری ہے۔

جب ہم منیپالے میں تھے۔ چچا چارلس اپنے سالانہ سفر پر آئے تھے جسے وہ برہمنوں سے ملاقات کرنے کی 'یاترا' کہا کرتے تھے۔ یہ اور بھی بے تکا لگتا تھا کیونکہ ہم سیاں جیک دے کمپوس تیل کو جانے والے بڑے راستے پر جا رہے تھے اور نیچے وال دے براں میں ان یاتریوں کی بہت سی کالی صلیبیں دیکھی جا سکتی تھیں جو دلدلوں کی وجہ سے ہونے والے بخار یا بھوک کی نذر ہو گئے ہوں گے۔ یا بھیڑیے ان پر ٹوٹ پڑے ہوں گے اور انہیں کسی پروہت کے الفاظ میں شکروار کے دوپہر کے کھانے کے طور پر کھا گئے ہوں گے۔ پورا ضلع چھوٹے چھوٹے چیپلوں سے بھرا پڑا تھا جو سال بھر میں ایک بار تب کھلتے تھے جب بروہت یگیہ پاتر، کاسہ اور صلیب لے کر آتا تھا اور سیانت ایلز یا سیانت روزالی کو ایک اور برس کے لیے نیا لباس پہنا دیتا تھا۔ دیہات کے بوڑھے کسان جالی کی ٹوپیوں اور اپنے ڈاڑھی والے چہروں کے ساتھ اپنے کھیتوں کی محافظ دیوی کی شان میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے آئے تھے۔ ان کے ساتھ ۹۷ برس کی ایک عورت بھی تھی۔ آسمان کی اس محراب تلے جو دھرتی کے پیلے پن اور پہاڑوں کی چوٹیوں کی برف پر پھیلی ہوئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے سلسلے تھے۔ پیڑوں اور ندی نالوں کے پاس بکریاں بھی چرتی

رہتی تھیں اور دعائیں بھی جاری رہتی تھیں۔ ہم سیانت روزالی کے لیے تازہ کٹی گھاس اور بنفشے کے کچھ پھول لے جا رہے تھے۔ چچا چارلس کو بھی دیہاتیوں کے اس تیوہار میں شامل ہونے کے لیے ہمارے ساتھ چلنا تھا۔

اس نے لکھا تھا: ”ہم بلیس سینٹ نکولس سے صبح سویرے نو بجے چل پڑیں گے۔“ اور گھر اس بار کیتھرین کی نگرانی میں رہے گا۔ اسے اگلے برس اپنے امتحانات ختم کرنے ہیں۔ وہ پہلے ہی ۲۳ برس کی ہو چکی ہے اور اپنی پڑھائی کو مزید جاری نہیں رکھ سکتی۔ وہ نہ تو کبھی کسی مرد کی طرف دیکھتی ہے نہ کبھی کسی چیز کی طرف۔ اس کے لیے ہر شے قانون کے علم تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ اسے میرے کام کی دیکھ بھال کرنا اچھا لگتا ہے۔ اس لیے وہ میری غیر موجودگی میں دفتر کا سب کام دیکھ لے گی۔ اسے اس بات کی خوشی ہے کہ میڈلین ہمارے ساتھ واپس یہاں آئے گی۔ اگرچہ میڈلین کیتھرین سے بس پانچ ہی برس بڑی ہے لیکن کیتھرین اس سے اس طرح بات کرتی ہے جیسے وہ اس کی ماں ہو۔

”میری انوکھی، حسّاس بچّی —! یہ بات کہ وہ میری بچّی ہے...“

”خیر جہاں تک ہمارے پہنچنے اور چلنے کی بات ہے جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں ہم بلیس سینٹ نکولس سے صبح نو بجے نکل پڑیں گے۔ زوبی شاید تھوڑی دیر کر دے۔ تم جانتے ہو وہ کیسی ہے۔ بہر حال ایک بجے تک ہمیں انگولیم پہنچ جانا چاہیے اور چار ساڑھے چار بجے تک ہم تمہارے ’فرشتہ تجدید حیات‘ کو اپنی شنگو آکار پہاڑی پر چڑھتے ہوئے دیکھیں گے۔ میں یہ سوچ کر خوش ہو رہا ہوں کہ میں شفاف تازہ دھوپ میں لوٹ رہا ہوں۔ جہاں ہمارے چاروں طرف پہاڑوں کی خوشبو ہوگی۔ میڈلین کو کہہ دو کہ اگر وہ اس بار پہلے سے زیادہ خوبصورت نہ دکھائی دی تو چچا چارلس باغ میں اس کی آنکھوں کے سامنے بچھڑے کو ذبح کرکے اس کی کلیجی اسے کھلائیں گے۔

او! برہمن! زوبی اور میں تم دونوں کو چوم کر اپنا پیار دیتے ہیں۔ - چارلس۔

بچا چارلس اپنے آپ میں مکمل ہیں وہ جو بھی کرتے ہیں اپنے مکمل پن سے کرتے ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ انھوں نے سنگیت پر زیادہ دھیان نہیں دیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ آج بھی جب کبھی آرگن بجانے والا بیمار ہوتا ہے تو وہ کیتھڈرل میں جا بیٹھتے ہیں اور آرگن بجاتے ہیں۔ وہ ہمیشہ خوش

لباس رہتے ہیں۔ اور جہاں تک ان کی عمر کا تعلق ہے وہ اگرچہ ۷۵ برس کے ہیں لیکن پھر بھی وہ ۱۵ برس چھوٹے دکھائی دیتے ہیں۔ زو بی خوب موٹی تازی تھیں۔ انہیں زبیدہ کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ کیونکہ اس کے والد جو ریوے میں ملازم تھے ہنی مون منانے پیرس گئے تھے۔ یہ پچھلی صدی کی آخری عجیب و غریب دہائی کی بات ہے۔ وہاں اتفاقاً وہ زبیدہ یا فرانس کا ایک غلام نام کا اوپرا دیکھنے چلے گئے جو زبیدہ نام کی ایک لڑکی کے بارے میں تھا جو ایک روز شہزادہ سلیمان سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ اور لطف کی بات یہ تھی کہ وہ کامیاب بھی ہو گئی۔

زو بی بڑی عظیم خاتون تھیں۔ ان کی ایک بار طلاق ہو چکی تھی۔ کیونکہ ان کا شوہر کسی بہت ہی کم عمر کی لڑکی کے ساتھ بھاگ گیا تھا۔ چارلس کی عمر زو بی سے سات برس کم تھی۔ چچا چارلس دبّو قسم کے رنڈوے تھے۔ انھوں نے زو بی کے ساتھ پانچ چھ برس تک سلسلۂ عشق جاری رکھا تب جا کر کہیں ان کی التجائیں قبول ہوئیں اور زو بی نے چارلس سے شادی کر لی۔ وہ ہمیشہ ڈرتے تھے کہ آرا میں بیٹھی ان کی بوڑھی کھوسٹ ماں کیا کہے گی۔

”وہ اسے کبھی نہیں سمجھے گی۔ کبھی نہیں۔ آخر وہ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہے۔ اسے سکون سے مرنے دو۔“

یہ بات جزوی طور پر صحیح تھی۔ میڈلین نے ایک بار مجھ سے کہا۔ ”تم ہم فرانسیسیوں کو کبھی نہیں سمجھ سکو گے۔ ان میں پارسائی بھی ہے اور ہمدردی کا جذبہ بھی ہے لیکن یا خدا ان میں خوب جوڑ توڑ کا رویّہ بھی ہے۔ یاد رکھو یہی فرانس کی بورژوا اقتصادیات کا حصّہ ہے۔“

چچا چارلس اچھی طرح جانتے ہیں۔ یہ ان کا کام بھی ہے کہ بوڑھی عورتیں موت کا خوف آ جانے پر اپنی جائداد، مال و اسباب چرچ کے نام کر دیتی ہیں۔ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ موت کے بعد نہ صرف جنت کا دروازہ ان کا منتظر ہے بلکہ ان کے جنازے پر ایک بڑھیا ماتمی تقریر ہوگی اور بعد میں ہمیشہ ان کے نام سے نو روزہ دعا اور پرستش کا اہتمام کیا جائے گا۔ یہ صحیح تھا یا نہیں لیکن چچا چارلس بہر حال اپنی ماں کو کسی قسم کی ٹھیس پہنچانے سے خوف زدہ تھے۔ کچھ بھی ہو اور وہ جہاں بھی ہوں ۲۵ ستمبر کو چچا چارلس کا آرا میں پہنچ کر ماں کی قدم بوسی کرنا اور ایک ہفتہ ماں کے ساتھ گزارنا ضروری تھا۔ اس ہفتے میں وہ کبھی اپنی بہو کا ذکر زبان پر نہیں

لاتی تھی چچا چارلس کے نام زبیدہ کی تمام چٹھیوں پر یہ لکھنا ضروری تھا کہ بہ حد مطالبہ ان کو ڈاکخانہ میں محفوظ رکھا جائے۔ حالانکہ چچا چارلس اُوت نارمنڈی میں بڑے اہم عہدے پر تھے لیکن عجیب بات یہ تھی کہ وہ اپنی ماں سے گفتگو کرتے وقت کانپنے لگتے۔ میں سوچتا تھا دادا کتنا کتنے مختلف تھے۔

اس سے پہلے کہ میڈلین کپڑے پہن کر تیار ہو پاتی "احیائے حیات کا سیاہ فرشتہ"۔ بھاری بھرکم مادہ سٹروں کونسر چارلس گاتی ہوئی پہاڑی پر چڑھ گئی۔ میڈلین واقعی بہت خوبصورت ہوگئی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کے چہرے سے متاعِ بے پایاں چھینی جا سکتی تھی۔ اگر میں توہم پرست ہوتا تو اسے شام کے وقت باہر لے جانے میں مجھے خوف محسوس ہوتا۔ اس میں ایسی بچّوں کی سی معصومیت تھی کہ جونہی اس نے باہر کار کی آواز سنی وہ بھاگ کر کھڑکی کی طرف گئی۔ بالوں میں لگانے کی سوئیاں ہاتھ میں لیے اور اس کے سنہرے بال واقعتاً کھڑکی سے انگوروں کے گچھے کی طرح لہرا گئے۔ ایک ہندوستانی کو یہ بال ہمیشہ غیر ارضی، طلسماتی۔ چاند کی کرنوں اور کالی چاندی کے بنے ہوئے محسوس ہوتے۔

کچن چونکہ گراؤنڈ فلور پر تھا اس لیے گرمیوں میں سب سے ٹھنڈا کمرہ تھا۔ کچن ٹیبل پر جب سبزیاں، شہد اور نارمنڈی کا مکھن ــ سب چیزیں رکھ دی گئیں اور جب میری سامان اوپر لے جانے میں مصروف تھی تو چچا چارلس ہمیں خانگی معاملات کے بارے میں بتلانے لگے۔

میری طرف دیکھتے ہوئے انھوں نے کہا: "مادد! ماں سمجھتی ہے تم نے کسی مہاراجہ سے شادی کی ہے۔ نہیں تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ تم ہندوستان سے آئے ہوئے ایک آدمی سے شادی کرتیں"۔ "ایک لکھنے والے نے کہا ہے"، وہ کہتی اور پھر مجھے مختلف ذات کے لوگوں راجاؤں وشنو برہما اور رشو کے بارے میں وہ سب بتانے لگتی جو کچھ اس نے پچھلی صدی کی چھٹی دہائی میں کانونٹ میں اسکول کی کتابوں میں پڑھا تھا۔ لیکن اسے اس بات کا یقین نہیں ہے کہ ہندوستان اب برطانوی ہندوستان نہیں ہے اور یہ بھی کہ حبشی کی طرح کالے رام! ـــ تم میڈلین کو اپنی داشتہ نہیں بناؤ گے کیونکہ تمہارا تو اپنا ایک محل ہوگا۔ اور پھر جب تم مر جاؤ گے تو چتا میں اسے اپنے مردہ جسم کے ساتھ جلنے پر مجبور نہیں کرو گے۔ وہ شادی کے بارے میں اس قدر فکر مند نہیں ہے

ہے جس حد تک وہ تدفین اور قبر سے دوبارہ زندہ ہونے کے بارے میں فکر مند ہے۔ بیچاری! وہ جیسی ہے ویسی ہی رہنے دیں اُسے!

چچا چارلس بے ربط باتیں کرنے والے آدمی نہیں تھے۔ وہ قاعدے قانون کا اس قدر احترام کرتے تھے کہ زبان پر آئی پہلی بات بھی کہنے سے گریز کرتے تھے۔ ان کے ذہن کی بہت سی باتوں کے بارے میں میڈلین کم و بیش فوراً ہی اندازہ لگانے لگی تھی۔

دوپہر بعد جب سورج بائی رے نیز کی طرف جھک گیا تھا۔ ہم نے اپنے ہیٹ اور اپنی دیہاتی چھڑیاں لیں اور پہاڑی کے نیچے ندی کی ٹھنڈک تک پیدل اُتر گئے۔ میرے آگے آگے میڈلین کے ساتھ چلتے ہوئے چچا چارلس بہت سے موضوعات پر باتیں کرتے رہے۔ انہیں میڈلین کے مستقبل کے بارے میں تشویش تھی۔ وہ فرانس میں رہے گی یا ہندوستان میں۔ اب چونکہ میرے پتاجی مر چکے تھے انہیں میڈلین کا میرے ساتھ ہندوستان چلے جانا ناگزیر محسوس ہوتا تھا۔ ہوائی جہازوں کے کارن بلاشبہ فاصلے بھی ختم ہو گئے تھے۔ "لیکن دل تو پھر دل ہی ہے۔ اور آرا میں دادی ماں بھی ہیں! وہ عجیب و غریب سوال بھی پوچھتی رہتی ہیں۔ اپنی آتما کی شانتی کے لیے بہت سی باتیں پوچھتی ہیں۔ اور میڈلین وہ ہم سب کو تحفے دینا چاہتی ہیں۔ شہر کے پھیلاؤ کے بارے میں پادری ہمیں بہت ہی فکر مند کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے سیاں مدار دو کا قبرستان چونکہ شہر کے بہت نزدیک ہے اس لیے حکومت نئی قسم کی پابندیاں عائد کرتی جا رہی ہے۔ پیشتر اس کے کہ میونسپلٹی نئے قوانین لاگو کر دے، ہمیں زمین خرید لینی چاہیے۔ تم جانتے ہو سیاں مداردو میں وہ کمبخت اشتراکی ہیں۔ میونسپلٹی سٹّے بازی کر رہی ہے۔ قیمتیں بڑھ رہی ہیں۔ ابھی تک قبرستان میں صرف سات جگہیں ہیں۔" چچا چارلس نے کہا اور اچانک اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہنے لگے۔ "ابا بیلوں کی طرف دیکھو۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی ایسے خوبصورت بیلے نہیں دیکھے۔"

طویل خاموشی کے بعد وہ بولے۔ "مادو دادی اماں بہت بوڑھی ہیں۔ انہیں دکھ پہنچانا خدا کو دکھ پہنچانا۔"

میڈلین نے جواب دیا۔ "اسے اس سلسلے میں کچھ نہیں کہنا ہے۔"

شام کے وقت وہ ہاتھ منہ دھونے کے لیے جانے سے پہلے جب کمرے میں آئی تو میں نے کہا کہ مجھے بھی کچھ نہیں کہنا ہے۔ ہمیشہ کے لیے عیسائی دھرتی کی عیسائی مٹی کا ہو جانا بلاشبہ خوش بختی ہے اور امتیاز کی علامت! لیکن کسی وجہ سے اس نے اپنا چہرہ میرے گال کے ساتھ لگا دیا اور اس کی آنکھ سے ٹپکا ہوا ایک آنسو میرے چہرے پر آ گرا۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اس کی جانب سے منہ کہہ دوں۔ اس لیے میں نے صرف یہ کہا۔ "چچا چارلس سے کہہ دو کہ ہم جلدی ہندوستان واپس جا رہے ہیں۔" اس نے جواب دیا "نہیں، یہ سچ نہیں ہے۔"

"ہاں! یہ سچ ہے۔ میرے لیے ہندوستان کا مطلب ہے آزادی۔"

"اور میرے لیے" میڈلین بولی "ہندوستان سورگ ہے۔"

گھر میں چچا چارلس بڑے بھائی کی طرح تھے اور تانت روبی ہماری اس طرح دیکھ بھال کرتی تھیں جیسے ہم زندگی کے جھمیلوں۔ جیسے دھلائی، خریداری اور گھر کی صفائی وغیرہ کے لیے ابھی کم سن اور ناتجربہ کار تھے۔

"میری! دیکھو وہاں اس سیڑھی پر سگریٹ کا ایک ٹکڑا ہے جو شاید ہنری دی پلین ٹے جینٹ کے زمانے کا ہوگا" وہ کہتی۔ میری نے کبھی ایسی چستی پھرتی نہیں دکھائی ہوگی۔

لیزو کے جانے کے بعد میری کچھ اداس ہو گئی تھی کیونکہ اس نے میری کے ساتھ بہت سے سنہرے پُر امید وعدے کیے ہوں گے۔ وہ کاہل اور کسی حد تک چڑ چڑی ہو گئی تھی لیکن روبی کی خوش مزاجی کے کارن وہ ایک غلام کی طرح خوشی خوشی سب کام کرتی تھی۔ اس کے علاوہ تانت روبی اتنے بڑھیا کیسولے اور اتنا بڑھیا گائے کا گوشت بناتی تھی کہ وہاں ہمارے جیسے گھاس کھانے والوں ۔۔۔ جیسا کہ ہمارے بارے میں کہتی تھی ۔۔۔ اور گوشت کھانے والوں میں کوئی میل نہیں دکھائی دیتا تھا۔ ملازم اسی کی بات ماننا پسند کرتے ہیں جو جانتے ہیں کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط ہے۔ میں تو پنکھا کھینچنے والے لڑکے سے بھی حکم کی تعمیل نہیں کرا سکتا کیونکہ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کوئی شخص کسی دوسرے شخص کا حکم آخر کیوں بجا لائے۔ انہیں اپنا فرض پورا کرنا چاہیے۔ اپنا دھرم نبھانا چاہیے۔ یہی سچی فرمانبرداری ہے۔

چچا چارلس شام کو بلانش پر سواری کرنا پسند کرتے تھے اور گھوڑی بھی انہیں دیکھتے ہی

ہنہنانے لگتی تھی۔ کبھی کبھی شام کو جب ہم تینوں تساہل کے کارن ندی تک نہیں جاپاتے تھے اور اجوائن اور ماجورم (بھروآں) کے درمیان بیٹھ کر باتیں کرنے کے لیے گھر کے پچھواڑے میں کھلے میدان تک چلے جاتے تو تانت زبیدہ ہمیں اپنے اور اپنے پہلے شوہر کے سفرناموں کے حیرت ناک قصّے سنانے لگتیں۔ وہ پروفیسر تھے۔ جنہیں پہلی یعنی ۱۹۱۴ء کی جنگ نے پروفیسر سے ایک چھوٹا موٹا سفیر بنا دیا تھا۔ اور ہم جرمنوں کے طمطراق' پولینڈ کے رہنے والوں اور روتھینیوں کی کند ذہنی اور انگریزوں کی پس ماندگی پر ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ وہ بولی — "وہ اپنی قمیص آگے سے ہی دھوتے ہیں۔ پیچھے سے کبھی نہیں۔ اس لیے آپ لے کنت دے سیاں سموں کی بو سونگھنا چاہتے ہیں تو آپ کو کسی انگریز ڈپلومیٹ کی بغل میں بٹھانا ہوگا،" وغیرہ وغیرہ۔ جب ہم گھر لوٹتے اور میری لیمپ لا کر گھر کی بنی ہوئی بڑھیا آرار کی جن ہمیں پیش کرتی تو عین اس وقت چچا چارلس پہاڑی پر چڑھتے ہوئے دکھائی دیتے اور ان کے بھاری بھرکم جسم میں چاندنی کی ملائمت سے کچھ نرمی آجاتی۔ نہیں چچا چارلس سولسٹر یعنی وکیل کے علاوہ اور کچھ لگ ہی نہیں سکتے تھے۔ ان سے صرف بھوسے، ہنی سکل اور فرانسیسی تمباکو کی تیکھی بو آسکتی تھی۔ انھوں نے گھوڑی کو خوب اچھی طرح نہلایا تھا اور اس سے وہ خوب چست نظر آرہی تھی۔ وہ چپ چپ ہم سے کچھ اونچائی پر کھڑی تھی۔ چچا چارلس بھی وہاں تھے۔ وہ پرندوں کا مشاہدہ کرنا پسند کرتے تھے انھوں نے ان پیڑوں کی باتیں سنائیں جن پر ابابیلوں اور کبوتروں کے گھونسلے دیکھنے کے لیے وہ چڑھ چکے تھے۔

کسان لڑکا۔ پی ار گھوڑی کو لے جانے کے لیے آیا اور چچا چارلس میں اچانک پدرانہ تیور پیدا ہو گئے۔ وہ میری کھانسی کی وجہ سے فکرمند تھے اور خوش تھے کہ میں تین ہفتوں کے لیے پو جا رہا ہوں۔ کمزور پھیپھڑوں کے لیے پو سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں۔

وہ کہنے لگے۔ "ہم سب کہیں نہ کہیں سے کمزور ہوتے ہی ہیں۔ میرا ہر جگر کمزور ہے اسی لیے میں تین سال میں ایک بار 'وچی' جاتا ہوں۔ تم دیکھ سکتے ہو کہ میں ان کا پورا اکھڑا کھا سکتا ہوں اور گھوڑے بیچ کر سوتا ہوں۔"

میری خوشی کا کیا کارن تھا۔ میرے لیے کچھ کہنا مشکل ہے۔ کیا یہ خوشی میڈلین کی خوشی

تھی۔ یا میری! لیکن کبھی جب میں غسل خانے میں اکیلا ہوتا اور ڈاڑھی بناتے ہوئے جب میں اپنی آنکھوں کو دیکھتا تو ان میں کچھ مخملیں کچھ دائرہ نما سا دکھائی دیتا جیسے میرے وجود کی گہرائی میں دکھ تھا۔ اُداسی تھی!

ہندوستان سے آنے والی چٹھیوں سے بھی مجھے کوئی راحت نہیں ملتی تھی۔ سروجا گھر میں بہت خوش نہیں تھی۔ اب جبکہ پتاجی نہیں رہے تھے اور چھوٹی ماں سروجا سے واقعتاً عمر میں کچھ ایسی بڑی نہیں تھیں، سروجا محسوس کرتی تھی کہ وہ بھی گھر کی مالکن تھی۔ چھوٹی ماں نے اس سلسلے میں مجھ سے کبھی کچھ نہیں کہا لیکن سروجا کے غصّے کا پتہ مجھے اس کی چٹھیوں سے چلتا تھا۔ "گھر کے ماحول میں جو قوتیں سرگرم عمل ہیں ان کا گھر کے سکون اور گھر کی شانتی سے کوئی تعلق نہیں۔ میں اس دن کا انتظار کر رہی ہوں جب میں پتاجی سے جا ملوں گی"۔ دوسری طرف سکماری میں بھرپور زندگی موجزن تھی۔ وہ اپنے اسکول کی ڈبی بیٹنگ سوسائٹی کی سکریٹری منتخب ہو گئی تھی اور دوسری سرہیتی پنڈت بننا چاہتی تھی۔ اس دوران میں اس نے مجھے مارکسزم پر کتابیں بھجوانے کے لیے لکھا تھا "ہماری ماترِی بھومی کی غریبی صرف ہر قسم کے امتیاز اور ذات پات کو ترک کرنے سے ہی ختم ہو سکتی ہے۔ میں نے مارکس کی کچھ تحریریں پڑھی ہیں۔ لیکن میرے بھائی تم جو اتنا کچھ ہر بات کے بارے میں جانتے ہو مجھے بتاؤ میں کیا کروں"؛ میرے لیے یہ بڑی عجیب بات تھی کہ میری بہن کارل مارکس پڑھ رہی تھی۔

لیکن زندگی اس سے کہیں بڑھ کر ذہین ہے جتنا ہم اسے سمجھتے ہیں۔ مارکسزم، ہندوازم، عیسائیت، اسلام، ہٹلرازم، برطانوی کامن ویلتھ، امریکی جمہوریہ — یہ سب کسی انجانے اصول کے بہت سے نام ہیں۔ جنہیں ہم محسوس کرتے ہیں لیکن جن کو ہم کوئی صحیح نام نہیں دے سکتے۔ کیونکہ تمام راہیں جیسا کہ گیتا میں کہا گیا ہے ایک ہی "کل"، ایک ہی اکائی تک پہنچتی ہیں

میرا خیال ہے میں بھی اپنے عیسائی ہو جانے پر دُکھی تھا۔

ہمارے وجود کی گہرائیوں میں بہت سے اَن جانے علاقے ہیں۔ نہ نظر آنے والے موجودات کے مرغزار۔ جن میں ہم جانے پہچانے لوگ، خاندان کے بیٹے اپنے مویشی ہانکتے پھرتے ہیں۔ دھرتی ہمیں پہچانتی ہے لیکن سرحدوں کی وجہ سے نہیں بلکہ فی الواقع کسی جھاڑی کسی

چٹان اور پیڑ کے تعلق سے۔ نتیجہ پرندے بھی جانتے ہیں کہ انہیں کہاں بسیرا کرنا ہے اور کس رجسٹر میں ان کے گھونسلوں اور ان کے بچّوں کی پیدائش کے تعلق سے ان کے نام لکھے جاتے ہیں۔ تہذیب اور کچھ نہیں صرف۔ صرف وہ قربت ہے وہ بے تکلف پہچان ہے جس کے طفیل ہم اس املاکِ دردوں میں داخل ہوتے ہیں جو عہد بہ عہد نشو و نما پاتی ہے، پروان چڑھتی ہے۔ ندیاں سیلابی مٹی بہاکر اس کے پاس لائی ہیں۔ بارشیں برسی ہیں اور پھر سمندر میں جا گری ہیں اور پھر اسی دھرتی کی خوشبو واپس لے آئی ہیں۔ اس لیے جب آم پک کر گرتے ہیں اور ہم انہیں کھاتے ہیں تو ہم جانتے ہیں کہ یہ ہزاروں برسوں کی پیداوار ہیں۔ جنگیں بھی ہوئی ہوں گی، قحط بھی پڑا ہوگا۔ پہلے مسلمانوں نے ہم پر فتح حاصل کی ہوگی۔ اس کے بعد انگریزوں نے لیکن ایک ایسا مشترکہ علاقہ بھی ہے اور تسلیم شدہ مصدقہ قطعۂ ارض جو ہمیشہ سے ہمارا ہے۔ اس لیے جب کٹائی کے بعد ہم اپنی فصل گاؤں کے مندر میں لے جاتے ہیں تو کنچما خود جانتی ہے کہ ہم خود اسے ہی اس کے پاس لائے ہیں۔ وہ خود بے شمار شکلوں میں رونما ہوتی ہے۔ ہمارے اندر نواس کرنے والے دیوتا بڑی پرانی تخلیق ہیں۔ جوں جوں ہم بڑے ہوتے گئے۔ ہمارے اجداد کے طویل تجربۂ وصال کے طفیل ہر دیوتا کا کچھ عنصر ہمارے اندر پیدا ہوگیا۔ فرانس میں جب کوئی کہتا ہے۔ "میں ایک مونٹ مورین سی ہوں" تو آپ فوراً سینٹ لوئی اور مالٹا کے ٹمپلرز کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں کوئی دوسری سلطنت چاہے وہ کتنی ہی افضل کیوں نہ ہو، اس کی سرحدیں ناپنے کے بجائے اپنی سلطنت کو جاننے اور سمجھنے میں وقت بچتا ہے اور تعلیم و تربیت کے لیے کم محنت کرنا پڑتی ہے۔ ایک نئے دیوتا کو لے آنا دیودار لے ایک نئے پیڑ کو اگانے کے برابر ہے۔ کئی مگوں کے قلم لگا دینے سے بھی ایلپس کا دیودار حاصل نہیں ہو سکتا۔ میں نے اپنے آپ کو برہمن کہا اور خود سے اپنی قربت کی یقین دہانی کے لیے میں نے سری شنکر کے اس منتر کا اچارن کیا۔

'منو بدھی آہنکار چتّانی ناہم'۔

'من نہیں۔ بدھی نہیں یعنی عقل نہیں۔ میرا پن نہیں۔ اصل چیز نہیں۔

میں رو ہی تو پڑا۔

شاید میں کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ میری بھوک مرگئی تھی۔ اور موٹا ہونے کی میری خواہش کا کوئی واضح نتیجہ نہیں نکل رہا تھا۔ میں سترہ برس سے زیادہ کا نہیں تھا۔ جب ڈاکٹر نے جیسا کہ وہ سمجھتا تھا۔ انڈے اور پورٹ (ایک قسم کی شراب) کے استعمال اور سویرے کی لمبی سیر کرداکر میری بیماری کو شروع میں ہی ختم کر دیا تھا۔ میں مناسب وقت میں فتحیاب ہوگیا تھا اور ایکس رے سے پتہ چلتا تھا کہ خطرے کا کوئی بات نہیں ہے۔ بھوک بھی نارمل ہوگیا تھا لیکن اب میں سات برس بڑا ہوگیا تھا۔ اور شاید خاندان کا بوجھ بھی مجھ پر تھا۔ پی ار کی موت شاید ایسا زخم تھا جسے کوئی پیار نہیں بھر سکتا تھا۔ یا شاید میں محض تھک گیا تھا۔ چچا چارلس بڑے نفیس آدمی تھے لیکن ان کے اندر قوّتِ حیات کچھ زیادہ ہی تھی۔

میڈلین کو خوش دیکھ کر مجھے مسرت ہوتی تھی۔ خود میڈلین نے مجھ میں کوئی فرق نہیں پایا تھا۔ وہ محسوس کرتی تھی کہ وہ بہت قریب ہے۔ جب ہم ایک دوسرے کے پہلو میں لیٹے بارش کے ساتھ پیدا ہو جانے والے مینڈکوں کے ٹرانے کی آوازیں سنا کرتے تھے۔ یا جب جھینگر رات بھر شور کرتے گاتے تو وہ سوچتی تھی کہ کیا ہندوستان میں بھی ایسا ہی تھا۔ گرم اور ناقابل شمار آوازوں سے بھرپور۔ اس نے پہلی بار کہا کہ میرے ساتھ اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرتی ہے۔ "تانت زوبی نے کہا کہ اس نے کوئی بیاہتا جوڑا اتنا خوش نہیں دیکھا۔" میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ آدمی اتنا خوش بھی ہو سکتا ہے۔ "ارے! برہمن لڑکے تم اس شاہ رانت کو خوشی دینے کے لیے آئے ہو۔" اور وہ مجھے اپنے بھاری بھرکم سینے سے لگالیتی۔ تانت زوبی بڑے رومانی مزاج کی تھی۔ اور وہ کچھ اٹ پٹے اور شائستہ طریقے سے میڈلین سے وہ سب تفصیلات جاننا چاہتی تھی جو کوئی بھی عورت خود نہیں بتا سکتی۔ "خوش رہو میری بچّی۔ خوش رہو۔ بڑی قسمت والی ہولڑکی! رام کو دیکھ کر مجھے زرا فہ یاد آجاتا ہے جس کی گردن صدیوں کے ارتقا سے لمبی ہوگئی ہے اور وہ باغِ عدن کے کسی پیڑ سے پیٹ بھرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہمارے گھر بیٹی پیدا ہوگی، کیا نام رکھو گے اس کا تم؟" تانت زوبی پوچھنے لگی۔

"الیس کلارمنڈ" میڈلین نے جواب دیا۔

"بڑا خوبصورت نام ہے۔"

"کیوں تانت زوبی۔ یہ انہی علاقوں کا نام ہے۔ الیس کلار مند دے بیرے لا آل بی جاسیاں تاریخ کی ایک نامور ہستی ہے۔ یہ وہی تھی جس نے گربل کی اس وقت حفاظت کی تھی جب رومن فوج مونٹ سے گر پر چڑھائی کر رہی تھی۔"

"اچھا تم اپنے اگلے بچے کو کیا کہہ کر پکارو گی؟"

"ابھی سے اس کی بات کیوں کریں تانت زوبی۔"

"تمہیں پتہ ہے۔ ہم کیا کہتے ہیں۔ عشق میں وقت چاند کی رفتار سے بھی تیز چلتا ہے۔"

"اچھا۔ ہم اسے ازوبیل کہیں گے۔ ازوبیل ضیالے کی کاؤنٹس تھی۔"

میڈلین کہنے لگی کہ تانت زوبی نے بات کو اور آگے نہیں بڑھایا۔ وہ ہمارے پیار کی محافظ درویش بننا چاہتی تھی۔ اور ممکن ہے وہ سوچتی ہو کہ اپنا نام امر کرنے کا اس کا حق ہے لیکن میرا دھیان کہیں اور تھا اور میڈلین مجھے اتنی اچھی طرح جانتی تھی کہ اسے اندازہ نہیں لگانا پڑا کہ میں کہاں ہوں۔

"ہم اس کا نام رنجیت رکھیں گے۔" اس نے میرے بال پیچھے ہٹاتے ہوئے اور اپنے ہاتھ میری جیب میں نیچے تک ڈالتے ہوئے کہا۔ "کیونکہ وہ ہمارے جیسا ہوگا۔ حالانکہ میں جانتی ہوں کہ رنجیت برہمنوں جیسا نام نہیں ہے لیکن وہ اگر ہیرو، سورما — ایک راجپوت بنتا ہے تو اسے بننے دو۔ تم جانتے ہو رام، لڑکیوں کے نام ماں کے خاندان پر ہوتے ہیں اور بیٹوں کے باپ کے خاندان سے۔ شادی بیاہ میں اس سے ہر کام آسانی سے ہو جاتا ہے۔" اور پھر وہ ہنسنے لگی۔

میں میڈلین کے ساتھ خوش تھا۔ میرے بارے میں اس کا جو علم تھا۔ میری خاموشیوں کا علم۔ میری ذہنی سلطنت کے پرزور شدید تغیرات کا علم — اس کے آگے میں سپر ڈال سکتا تھا۔ لیکن مزید نیچے جہاں ذہن زندگی کی گہری جڑوں میں کھو جاتا ہے۔ وہ ایک ہندوستانی ملازم کی طرح دروازے پر کھڑی میرے باہر نکلنے کا انتظار کرتی تھی۔ بتائی ہوئی بات تب اس کی سمجھ میں آتی۔

اگلا دن اتوار تھا۔ میں پورے کنبے کو گیارہ بجے کے ماس کے لیے آئش لے گیا۔ آئش کا کیتھیڈرل سیاہ اور بلند آہنگ گاتھک اسلوب کا ایسا احمقانہ امتزاج ہے کہ وہ اب بے تکا

غیر تسلیم شدہ لگتا ہے جیسے لوگوں نے اسے قحط، نیند اور پلیگ کی وبا کے دوران زندگی کے سست خرام کابوس میں تعمیر کیا ہو۔ دوسری طرف مارکیٹ کے سامنے والی خوبصورت عمارت کیسی مہذب دکھائی دیتی تھی۔ بلاشبہ یہ اٹھارھویں صدی کی عمارت تھی۔ مثلثوں کے باوقار خطوط اور چار اطالوی کھڑکیوں والی عمارت۔ کل ملا کر جس میں ہلکی سی درشتی بھی تھی۔ اس کے بارے میں ایک بچی بات سے میری صبح روشن اور شاداں ہو گئی۔ میڈلین نے مجھے بتایا "تمھیں پتہ ہے، مہینوں بعد میں نے پہلی بار سجدہ کیا ہے۔ گھٹنے ٹیک کر مجھے روئی یا جراثیم کا خیال تک نہیں آیا۔ کہیں میں کچھ سدھری ہوں؟ نہیں کیا!؟"

تانت زوبی بولی۔ محض اپنے شوہر کو چڑانے کے لیے "میں تمہارے 'پروفائل' کی تعریف کر رہی تھی۔ سبز ہیٹ میں تم کتنی خوبصورت لگ رہی تھیں۔ تمہیں کیتھرین کو پہننا اوڑھنا سکھانا چاہیے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ سولسٹر کی کلرک مادام افیوسن کی طرح کپڑے پہنتی ہے اور اگر کبھی اس نے شادی کر لی تو اس کے ہاں بیٹا ہونا چاہیے جس کا نام ٹائی لش لیوی ٹاس، ماہر قانون رکھا جانا چاہیے۔"

آپ تانت زوبی کی زبان کا کیا کر سکتے تھے۔ ایسی ہی تھی وہ ایک ہندوستانی کہاوت کا حوالہ دیتے ہوئے میں نے ایک بار میڈلین سے کہا تھا "اے تم بورے سینے والے سُوئے سے بھی نہیں رہ سکتے۔" "تم اسے نارِ جہنم سے بھی نہیں رہ سکتے۔" اس نے جواب دیا "میرا خیال ہے دراصل آنٹی دوزخ میں بھی آنند منائے گی۔"

لیکن وہ تھی بڑی پیاری! صبح سویرے وہ کسی قدر جلدی اُٹھ جاتی تھی۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ میری بڑھیا ٹوسٹ تیار کرتی ہے کہ نہیں جبکہ وہ خود ہم بچوں کے لیے کافی بناتی تھی جب وہ ہمارے ساتھ تھی تو اس نے کئی طرح کے مربّے بنائے تھے۔ انجیر کا مربا بھی۔ اس نے آدھا حصّہ میری کار میں رکھ دیا تھا اور آدھا 'پنر جیون کے فرشتے' میں۔ میں نے اپنے آپ سے کہا بیس دن میں مربّے کے ۱۶ مرتبان کھانے کے لیے کسی ہیرو سے بھی بڑے سورما کی ضرورت تھی۔ جو کچھ بچ جائے اسے ایکس لے جانا۔ مجھے یقین ہے کہ میڈلین اسے کھا کر بہت خوش ہوگی۔ اور بچّو! تم اپنی چچی کو یاد کرو گے۔ کرو گے نا! الوداع۔ رام! الوداع۔"

"پیٹر چیون کا فرشتہ" پہلے رخصت ہوا۔ میڈلین کس قدر خوش تھی۔ اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ سب لوگ آگے بیٹھے ہوئے تھے۔ اور میڈلین اپنے چچا اور چچی کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی۔ "اپنا خیال رکھنا"۔ چچا چارلس نے کہا "ہم میڈلین کا خیال رکھیں گے اور اسے خوب صحت مند اور موٹی تازی کر کے بھیجیں گے۔ ہم اسے گائے کا بہت سا گوشت کھلائیں گے۔"

"او انکل آپ یہ سب اس وقت کہہ رہے ہیں جب میں رام سے جدا ہو رہی ہوں"۔ میڈلین نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ اس نے عام سے انداز میں مجھے چوما۔ وہ اپنے سیاہ لباس میں بڑی حسین لگ رہی تھی۔ کہروا نیکلیس اس کی چھاتیوں کے درمیان جھول رہا تھا اور بالوں کو اس نے سر کے پچھلے حصے میں ایک شاندار جوڑے کی صورت میں باندھ رکھا تھا۔ وہ سچی اور کھری لگ رہی تھی۔

میں گھر میں تھوڑی دیر گھوما۔ چیپل میں گیا اور سچے دل سے اس سے وداع لی۔ ایک بار کھڑکی سے جھانک کر گول کے پیڑ اور بلانش کو دیکھا جو کھیتوں میں چر رہی تھی۔ بلانش نے سر اُٹھا کر میری جانب دیکھا۔ دُکھ کی بات یہ تھی کہ نہ تو میں اس کا جسم سوکھی گھاس سے رگڑ سکتا تھا اور نہ ہی پانی پلانے کے لیے ندی تک لے جا سکتا تھا۔ میرتی نے تھرموس کو دودھ اور کافی سے بھر دیا۔ میرا جی چاہا کاش میں اس کو تشفی دے سکتا۔ "جب تمہارا شادی کرنے کو جی چاہے مجھے بتانا" میں نے کہا "مادام اور میں تمہارا جہیز پورا کرنے میں تمہاری مدد کریں گے۔"

میرتی بولی "او! مسٹر آپ کس قدر مہربان ہیں۔ لیکن ایک لمبے عرصے تک یہ ممکن نہیں ہوگا۔ ہم یہاں کیا کرتے ہیں۔ انگوروں کا باغ خریدنے کے لیے یا شادی کی انگوٹھی پہنانے کے لیے سینٹ کیتھرین کی صلیب سے کہیں زیادہ سونا چاہیے۔" اور بات کو جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ "جو کچھ تمہارا ہے اسے تم کبھی نہیں کھو سکتے۔ اور جو کچھ تمہارا نہیں ہے وہ تم سے، تمہارا نیک خدا بھی نہیں چھین سکتا۔"

دن بڑا صاف اور روشن تھا۔ اور ہوا چل رہی تھی۔ میرتی وہ کنگھی اور رومال لے کر آئی جو میڈلین بستر میں بھول آئی تھی۔ میڈلین کے بال ایسے لمبے تھے کہ وہ جہاں بھی جاتی تھی اُسے کنگھی کی ضرورت ہوتی تھی، واقعی! میں نے دونوں چیزیں اپنی جیب میں رکھ لیں۔ میرتی

طرف سے دیئے گئے تحفے کے طور پر۔ پیڑوں، کھیتوں اور جانوروں کے ساتھ رہنے والے سادہ اور سچے لوگ کیسے دل سے عقیدت رکھتے ہیں۔

"اگلے برس سر! میں مسٹر رابرٹ کو بتادوں گی کہ گھر کیسی اچھی طرح رکھا گیا ہے۔ کاش ان کے سبھی دوست ایسے ہی محتاط اور سمجھدار ہوتے!"

"میری، الوداع! پی ار کو میری طرف سے بتانا کہ جس طرح بلانش لگاتار اپنی دم دیوار کے ساتھ رگڑتی ہے اور جس طرح پانی کو چھوتے ہی چھینکنے لگتی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے پیٹ میں کیڑے ہیں۔ اسے کہنا کہ وہ اسے سلوتری کے پاس ضرور لے جائے۔ الوداع"

"الوداع، سر!"

سنپالے میرے پیچھے تھا اور بیرن کا چکر لگانے والی سڑک کی اونچائی سے میں دوبارہ اسے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک برس کا وقفہ بہت لمبا تھا۔ اس بیچ دھرتی اپنے طور پر کتنے چکر لگا چکی ہوگی اور اس وقت تک کتنے سارے پرندے کیس کنی سے افریقہ اور آرکٹک تک جاکر پھر گھونسلے بنانے کے لیے لوٹ کر یہاں آچکے ہوں گے۔ کوریا کی لڑائی بھی جاری تھی۔ اور کون جانتا تھا کہ یہ پاگل دنیا کیا کرے گی۔ فرانس امن اور انکساری خوش خلقی کا گہوارہ تھا۔ فرانس جو ادھر اتنی جنگیں دیکھ چکا تھا جونہی کوریا کی مصیبت شروع ہوئی۔ اس کے دیہاتوں میں لوگ چینی، پیرافین، آلو شراب اور موٹر کار کے ٹائر جمع کرنے لگے تھے۔ جب میں کار میں دیہات سے گزرا تو گھر کے دروازے پورے کھلے ہوئے نہیں تھے۔ نہ ہی لوگ بڑوں کو گیند کھیلتے دیکھ کر اتنے غیر فکر مند تھے۔ لیکن جب ہم ہسپانوی سرحد کے قریب پہنچے تو لوگوں کی زندگی میں زیادہ خوشحالی اور خوشی نظر آئی کیونکہ وہ دو سرحدوں کے درمیان رہتے تھے اور پرُ وقار پائی رے نیز انہیں برابر یہ یقین دلاتا رہتا تھا کہ جنگ وہاں تک کبھی نہیں پہنچے گی۔ وہ کام جو نپولین نہ کر سکا، نہ ہٹلر کر سکا اس کام کو روسی کبھی نہیں کر سکتے تھے۔ تو سے پائی رے نیز کو دیکھ کر آپ جان سکتے تھے کہ طاقتور بننے کے لیے برف کی طرح صاف شفاف ہونا ضروری ہے۔ اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میڈلین مجھے چھوڑ کر گئی ہی نہیں۔

میں اوبیل دان لے تیار میں ٹھہرا۔ وہ شمال کی طرف کھلتا تھا اور میرے کمرے سے یک دیو ہیکل چھلانگ بھر دور لگتا تھا۔ گنگناتا۔ متواتر پُر کشش سلسلہ۔ سویرے سے ہی دھند اُبھر کر سورج کے اردگرد تیرتی رہتی تھی۔ پھر ایک سانپ کی طرح خود کو چھپا لیتی تھی اور بعد دوپہر تک بادلوں کے دُھندلے آسمان کو رنگ دے دیتے تھے۔ شامیں بڑی اچھی لگتی تھیں اور چونکہ ستمبر کے مہینے میں موسم سرد تھا اس لیے ’پریم ناد پی رے نے‘ پر زیادہ لوگ نہیں تھے۔ زندگی کچھ ایسے محسوس ہوتی تھی گویا حقیقت نے اپنے آپ کو ایک ہوا سے بھری ہوئی قوس کی شکل میں پھیلا دیا ہو اور ہم اور کہسار کی انجانے شعور میں نقطوں کی طرح ہوں۔ سورج جب غروب ہوتا تھا تو اس میں کچھ ایسا اپنا پن محسوس ہوتا جس کا مشاہدہ نہ تو مجھے کبھی ہمالیہ کے پہاڑوں میں ہوا اور نہ ایلپس میں۔ یہاں سورج کچھ ایسا تھا جیسے وہ کوئی نجی سیارہ ہو جو ہمارے حکم کی تعمیل میں ہمارے فائدے کے لیے اور ہماری پوری جانکاری کے مطابق گردش کرتا ہو۔ آپ سورج کو جانتے تھے اور سورج آپ کو۔ اور جب وہ غروب ہوتا تھا تو اس انداز سے جیسے آپ کا باپ یا دوست آپ سے جُدا ہو رہا ہے۔ یہ کہہ کر کہ صرف پیغام بھجوانے کی دیر ہے وہ لوٹ آئے گا۔ اس میں کوئی حیرانی کی بات نہیں، ہے کہ ایسے جانے پہچانے سورج تلے ڈان کوک ہوٹ نے سوچا ہو کہ پَون چکیاں نائٹ ہیں یا داں آرت نن فرانس کا بہادر نائٹ تھا۔

دن میں میرے پھیپھڑے سورج کی رحمت سے بھر جاتے تھے لیکن جب رات ہوتی اور وادی کی تاریکی اُبھر کر فضا معمور کر دیتی تو ایک بے پناہ وسعت کا احساس ہوتا ایک ایسی سچائی کا جو چھپی ہوئی تھی لیکن بہت طویل تھی۔ یوں لگتا جیسے سورج نے واقعی ہمیں فریب دیا ہو ہمیں کو مودیا دے لاتر کے کردار بنا کر رکھ دیا ہو۔ رات وہ خلا تھا جسے کوئی سورج پُر نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی وادی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ یہ ایسا غیاب تھا جو جانا پہچانا لگتا تھا۔ معلوم جسے دیکھا جا سکتا تھا لیکن آنکھوں سے نہیں۔ ایک ایسا علم جسے سمجھا جا سکتا تھا لیکن ذہن سے

نہیں، تازہ اور ایک اکیلا اعلیٰ و افضل نغمہ۔ ہنری چہارم کی گرھی غالباً نشاۃ ثانیہ کے ابتدائی دور کی تھی۔ لیکن یہ میں ایک راجپوتی تاثر تھا۔ کچھ چتوڑ جیسا اور ایسی ملکہ کا جو کسی راٹھور کے گیت گاتی تھی۔ مجھے خواب بھی آتے تھے۔ شاندار ململ کی طرح نازک مہین خواب خالص شفاف سفید روئی کی بنی ہوئی ململ۔ جس کے نیچے فاختاؤں کے نرم ملائم پروں جیسی چھاتیاں جگمگاتی تھیں۔ میں سنگیت بھری پوری رات کو سن سکتا تھا۔ کبھی کبھی میں ہاتھوں سے تال دیتے ہوئے اٹھ جاتا تھا اور ہندوستان کے ابھرتے ہوئے سورج کی گرمی کو محسوس کرنے لگتا۔

کھیلت نند کم

....

وہ کھیلتا ہے۔ جی ہاں، نند کا لال

برندا بن میں.....

ایسے لمحوں میں میڈلین کتنی دور لگتی۔ درحقیقت اس نے مجھ سے کہہ رکھا تھا کہ اگر اکیس سے تسلی بخش نہ ہوا اور ڈاکٹروں نے تھوڑا سا بھی ڈر ظاہر کیا کہ معاملہ گمبھیر ہے تو مجھے بس اس کو تار بھیجنا ہے اور فوراً چلی آئے گی۔ ورنہ چچا چارلس اسے کار میں بٹھا کر پیرس لے جائیں گے کیونکہ اب کیتھرین کو شادی کرنے کے بارے میں سوچنا تھا۔ اسے کپڑے پہننا، یہاں تک کہ لپ اسٹک لگانا، میک اپ کرنا سکھانا تھا۔ میڈلین سے امید کی جاتی تھی کہ وہ اسے صحیح ملبوسات خرید دے گی۔ اس کو صحیح ہیر ڈریسر کے پاس لے جائے گی اور اس کے لیے صحیح ہینڈ بیگ اور بالیاں بھی خرید دے گی۔ اوتیل دے مل میں ایک ناچ کا اہتمام کیا جا رہا تھا اور چچا چارلس چاہتے تھے کہ کیتھرین اس وقت خوبصورت دکھائی دے۔ چچا چارلس نے اپنے لیے بھی ایک نیا سوٹ بنوایا تھا۔ دنیا کی کسی بھی چیز کے بدلے میں نہیں چاہتا تھا کہ کیتھرین اپنے جشنِ رقص سے محروم رہ جائے یا وہ زیادہ خوبصورت نہ لگے کیونکہ وہ بڑی حسین لڑکی تھی۔ اس کی شادی صرف اس لیے ٹل جائے کہ میرے جسم کا ایک انگ اور اس کا بھی بہت چھوٹا سا حصہ۔ میمنے کے سر جیسا گول ۔۔ ٹھیک طرح خون کو ہضم نہ کر سکے۔ اس لیے جب ڈاکٹر ڈرینگر نے جب

مجھے ایکس رے رپورٹ دی تو میں اس قدر خوش ہوا، کم و بیش سورج کے سامنے بل کر گنگنا اُٹھا۔ میڈلین کو تار بھجوایا کہ رپورٹ میں تشویش کی کوئی بات نہیں اور کیتھرین کے 'بال' یعنی جشنِ رقص کے لیے میری نیک آرزوئیں اور خوش بختی کی دعائیں۔

دو روز بعد مجھے کیتھرین کا ایک خوبصورت خط ملا۔ پہلے کچھ روز اسے خوفناک خواب آئے۔ سانپوں کے، ہاتھیوں کے اور ہندوستان کے ــــ وہ مجھے کہہ رہی تھی ــــ "مجھے یہاں سے لے جاؤ۔ دور۔ دادی اماں کے پاس۔" اور جب وہ آ راگئی تو وہ پہلے والا گھر نہیں تھا اور نہ ہی وہاں دادی ماں تھیں بلکہ اس کے پتاجی ہندوستانی فوجی کے لباس میں کھڑے تھے۔ یہ سب کچھ بڑا خوفناک تھا کہیں کسی کو شمشان میں آگ کے سپرد کیا گیا تھا۔ اور میڈلین بھی سنوری ہندوستانی دُلہن کے روپ میں کیتھیڈرل سے نکلی تھی۔ اس کے ماتھے پر قُم قُم تھا اور اس کے کانوں سے جھولتے ہوئے جھمکے اس کے جبڑوں کو چھو رہے تھے لیکن میرے تار سے اس کی پریشانی ختم ہو گئی تھی۔ وہ فوراً ہی 'بال' یعنی شادی کے جشنِ رقص کے بارے میں سوچنے لگی۔ وہ اور کیتھرین چچا چارلس کی کار میں نکل پڑیں اور دادی ماں سے ملنے آ را آ گئیں۔

دادی ماں میڈلین سے ایسی ملیں جیسے وہ کبھی روہاں چھوڑ کر گئی ہی نہ ہو اور جیسے اس کا کبھی بیاہ ہی نہ ہوا ہو۔ اس نے پوچھا تھا۔ "تم پیرس کب واپس جا رہی ہو؟" وہ وشواس کرنا چاہتی تھی کہ کچھ نہیں بدلا ہے۔ اس نے میڈلین کو ایک چین (ہار) دی جو اس کے باپ نے اپنی سگائی کے موقعے پر بنوائی تھی اور جو میڈلین کو اس کی سگائی پر دی جانے والی تھی۔ "اسے لے لو۔ میری بچّی اور خوش رہو۔ میں بوڑھی ہوں اور کوئی نہیں جانتا کہ ستاسی (۸۷) سال کی بڑھیا کو کب کیا ہو جائے گا۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے کہا تھا۔ "اور جب تمہاری شادی ہو جائے تو اس موقعے کے لیے ہیرے کا یہ جڑاؤ بروچ ہے جو تمہارا باپ ترکی میں ریل کی تعمیر کا کام مکمل کرنے کے بعد لوٹتے ہوئے وہاں سے لایا تھا۔ یہ عربی ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ پہننے والے کے لیے یہ خوشیاں لاتا ہے۔"

"دادی ماں نے یہ زیور مجھے دکھایا۔" میڈلین نے بات جاری رکھتے ہوئے لکھا تھا۔ "رام یہ بڑا خوبصورت ہے۔ اس کے نیچے کالے منکے ہیں اور اوپر آدھے چاند جیسا ہیرا اور نیلم جڑا

ہوا تھا۔ میرا بڑا جی چاہا میں اسے فوراً تمہارے لیے پہن سکتی! ایک روز میں ضرور پہنوں گی۔ میرے محبوب تمہارے بنا دن بہت لمبے لگتے ہیں اور راتوں کو کسی وجہ سے میں چیخنا چلانا چاہتی ہوں۔ شاید یہ محض گھبراہٹ سے۔ تمہاری صحت کے بارے میں ایک عورت کی گھبراہٹ! کل رات بہرحال مجھے بڑی اچھی نیند آئی۔ پوری شام میں تاتت زدبی اور کیتھرین کے ساتھ تمہاری باتیں کرتی رہی۔ میں نے خاص طور پر اس عزت اور احترام کا ذکر کیا جو تم مجھے دیتے ہو ——— عورت تمہارے لیے ابھی بھی پرائی ہے۔ انوکھی۔ ایک معجزہ! یورپی لوگ اپنی بیویوں کے ساتھ جس بے تکلفی سے پیش آتے ہیں۔ وہ تم کبھی نہیں کر سکتے۔ اگر تم عورت کو اذیت بھی پہنچاتے ہو تب بھی اس کی پوجا کرتے ہو لیکن مجھے ستایا جانا پسند ہے اور تمہاری داسی بن کر رہنا!"

نہیں، بلاشبہ مجھے داسی نہیں چاہیے تھی۔ میں تو عورت کو تیرتھ پر جانے والے مسافر کی ہم سفر کے روپ میں چاہتا تھا کیونکہ جب آپ پہاڑ کی جانب دیکھتے ہیں جہاں ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں کے ایک کے بعد ایک موڑ سے گزرنے کے بعد گھنٹیوں کی آواز سنائی دیتی ہے اور پوجا کی سندھیا آ جاتی ہے تو آپ بھگوان کے چرنوں میں ایک ساتھ شرن لینا چاہتے ہیں۔ تنہا نہیں! او، ایشور کے پاس جانا اور وہ بھی اکیلے ... !"

دن میں میں اکثر اپنے 'آل بی جا سیاں' پر کام کرتا تھا۔ عجیب بات ہے کہ ہندوستانی لاثنویت کے تواریخ کے مختلف ادوار میں مختلف ممالک میں گزرنے کے بعد لوگ اس کے بالکل برعکس کو قبول کرنے لگے۔ ادویت واد میں جہاں ثنویت اور تضاد ختم ہو جاتے ہیں لوگ اس بات کو ماننے لگے کہ پاکیزگی جسم یعنی ہاڈ مانس کی نہیں ہوتی اس لیے وہ ایسکلار موند دے پے رے لا کی طرح آگ میں کود جاتے ہیں کیونکہ گوشت کی نفی کر کے آپ اس کے وجود کی تصدیق کرتے ہیں۔ جس طرح خیال کے ماورا نہیں جایا جا سکتا بلکہ خیال کے پس منظر میں اسے جذب کرنا پڑتا ہے اس لیے صرف بدی کا جوہر، بدی کی جڑ زندگی کا سرچشمہ ہو سکتی ہے۔ دوستو سکی کا کہنا تھا کہ دو اور دو کو چار کے برابر ثابت کرنے کا جبر بے پناہ ہے۔ غور کیجیے کیا انسان کا اس سے مفر ممکن ہے! لیکن اگر دوستو سکی نے اعداد کی تھیوری کا مطالعہ کیا ہوتا تو اس کو پتہ ہوتا کہ تمام ہندسے اسی صفر میں مدغم ہو جاتے ہیں جہاں سے وہ نکلے تھے۔ صفر کا جبر ممکن ہی نہیں۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ مہملیت فرار۔ حقیقتِ اشیا تک پہنچنے کی خواہش کے عمل تک پہنچنے کا فرار۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ خوش بھی رہ سکیں اور انسان بھی ہو۔ آپ بیک وقت مجسم مسرت اور مجسم انسان نہیں ہو سکتے یا آپ مجسم خوشی ہو سکتے ہیں یا انسان۔ کیونکہ انسان اور مسرت دونوں یکسر ایک ہی ممکن ہے دنیا میں پوتر ہونا آدمی ہوتے ہوئے بھی انسان بننے کی طرح ہے۔ اسی طرح ہے جیسے جب ہندوستان انگریزی حکومت کے تحت تھا اور ہندوستانی برٹش پاسپورٹ رکھتے تھے تو جیسا کہ مجھے بتایا گیا تو ہر یورپی سرحد پر انہیں اپنے آپ کو ”برٹش“ کہنا پڑتا تھا۔ کبھی کبھی کوئی جاہل پولیس والا روک کر کہتا تھا: ”لیکن تم برٹش ہو ہی نہیں سکتے“۔ اور اس بیان کا مفہوم قوانین کی کتاب میں ڈھونڈنے کی کوشش کرتا تھا۔ جب اسے وہاں کچھ نہیں ملتا تھا تو وہ دہراتا ”تم برطانوی ہو ہی نہیں سکتے“۔ اور اس کے باوجود آپ کو جانے کی اجازت دے دیتا کیونکہ اس کے قوانین اس کی رہنمائی کرنے سے قاصر تھے کہ وہ کیا کرے۔ وہ بات جو منطق سے ماورا ہے ضرور سچ ہو گی۔ سرحدی سپاہی کی طرح دوستوسکی بھی یہی سوچتا تھا لیکن سچائی ممکن ہے بالکل سادہ ہو۔ تم پوتر کیتھار نہیں ہو سکتے۔ تمہیں پوتر یعنی تقدّس ہی ہونا ہے۔ جہاں پوتر تا ہے وہاں کوئی ”تم“ نہیں ہے۔ یہ قولِ محال ہے اور نہ ہی عیسائیت اور نہ ہی اسلام اس کے ماورا جا سکے ہیں۔

کیتھاروں نے حضرت عیسیٰ کے جسم کے مادی کے بجائے نوری ہونے کا عقیدہ بدھ مت سے وابستہ نفسیات اور زرتشتی آتش پرستوں کی ثنویت کے امتزاج سے حاصل کیا۔ مانی واد (آغاز ہندوستانی فکر سے نہیں ہوا بلکہ اس وقت جب یہ دوبارہ ارض فارس سے گزرا۔ ذاتی کارمانی پیدائش سے ایرانی تھا۔ وہ ہندستان گیا تھا اور ہندستانی فکر کا گہرا اثر لیا تھا)۔ دراصل جدلیات کا منبع ممکن ہے اہور مزدہ ہی ہو۔ افلاطون کے لیے بدی لگ بھگ اتنی ہی حقیقی ہے جیسی آج کسی ہندوستانی کے لیے ہے۔ جس کا کفارہ فاختہ اور ناریل سے کیا جا سکتا ہے۔ لیکن روشنی اور تاریکی ایک دوسرے کے مقابل آ کر کھیلتی ہیں تو ہیرو اور درویش پیدا ہوتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ نطشے کو زرتشت کا سہارا لینا پڑا جس سے ہٹلر واد کا جنم ہوا۔

پارسی کئی بار زوبی ہندوستانیوں کی یاد دلاتے ہیں۔ یہ قبائلی سماج بہترین ہے اور

اخلاقیات کا بھی سب سے زیادہ پابند ہے۔ اس میں نیکی اور بدی کا تصور واضح ہے۔ رات اور دن، سورج اور چاند، برسات اور گرمی جیسے فطری اعمال کے زمروں کی طرح۔ لوگ کہتے ہیں پچھلے ایک سو سال سے پارسیوں میں نہ تو کسی کو قتل کے لیے گرفتار کیا گیا اور نہ ہی کسی ایسے شخص کا پتہ ہے جو کسی ہندوستنت کے عظیم مرتبے تک پہنچا ہو۔ پارسیوں کی دیانت داری انہیں بینکاری کی جانب لے گئی۔ ٹھیک اسی طرح جیسے کویکروں کی دیانت داری انہیں چاکلیٹ بنانے کے کام کی طرف لے گئی تھی۔ اگر کیتھار باقی رہ جاتے تو فولاد کا شہر تعمیر کرتے جس میں نیکی اور بدی کا امتحان برقی مقناطیسی اوسلوگراف سے کیا جاتا۔ اور اندر آپ اچھی طرح گرم کی ہوئی غلام گردشوں میں خوبصورت آدمیوں اور عورتوں کو چلتے ہوئے دیکھتے کم وبیش برہنہ۔ یہ لوگ کٹھالیوں میں بچے پیدا کرتے اور کیمیاوی امتحان سے ایسے بچے پیدا کرتے جن میں نہ تو کوئی بدی ہوتی نہ جراثیم۔ اگر کوئی کیتھار باہر نکلتا۔ دیوار آہن کو پار کر جاتا تو اس کو سزا لگ جاتی اور اسے کسی طوائف کو فروخت کر دیا جاتا۔ کیتھاروں نے مغربی دنیا کی اعلیٰ ترین کمیونسٹ سوسائٹی پیدا کی۔

میری اس دلیل میں اس لیے حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ ابتدائی بدھ مت' ہندوازم کے خلاف نبرد آزما ہوا تھا لیکن ہندوازم نے بالآخر بدھ مت کو اخلاقی طور پر شکست دے دی اور بدھ مت کو اپنے اندر سمو لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج کوئی بھی نہیں جانتا کہ مہایان ویدانت سے کن معنوں میں مختلف ہے۔ کیتھولزم جو اپنی مردانہ روایت کے ساتھ نہ صرف چرچ سے شروع ہوا بلکہ بہت حد تک کافروں سے بھی ایسی سچائی لیے ہوئے تھا کہ اگر کیتھرزم کو تباہ نہ کر دیا جاتا ہے تو ممکن ہے یورپی برادری تباہ ہو جاتی۔ جنگ عیسائیت اور کیتھاروں کے درمیان نہیں تھی بلکہ یورپ کے لوگوں کے ہومر کے عہد سے عہد حاضر تک جاری و ساری زندہ اصول اور زندگی کی شکست خوردگی کے درمیان قوت برداشت اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کے درمیان! ڈاروِن ازم ممکن ہے محض حیاتیاتی اصول نہ ہو بلکہ یہ ایک روحانی اصول بھی ہو۔ گاندھی جی چاہے جو بھی اس کی تشریح کریں۔ بھگوت گیتا سچائی کی تصدیق کرتی ہے۔ نہ کہ اچھائی کی۔ حق جانبدارانہ نہیں ہوتا۔ یہ دونوں فریقین میں ہوتا ہے۔

کرشن جنگ کا ہیرو ہے لیکن بظاہر بھیشم اس سے بڑا ہیرو ہے۔ پھر بھی بھیشم کا حوصلہ کرشن کی دین تھا۔ کرشن کا یدھ خود اپنے خلاف تھا۔ اپنے ذریعے اور اپنے اندر جو قائم و دائم رہا ہے وہ بذاتِ خود خود وہ ہے۔ مجسم سچائی۔ مجسم حق!

کیتھار تیرھویں صدی کے برہم وِدیا وادی تھے۔ اگر میں ان کا ہم عصر ہوتا تو میں سمون دے ماں فورٹ سے جا ملا ہوتا۔ پیسے یا شان و شوکت کے لیے نہیں۔ نہ ہی دلجوئی کے لیے بلکہ میں کیتھاروں کے خلاف لڑنے کی بجائے دلجوئیوں ناز برداریوں کے خلاف لڑتا۔ سچائی کی اس شفاف ندی کے لیے لڑتا جو رومن کیتھولزم کی فکر کا حصہ ہے۔ ہر جنگ میں ایک کرن ہے اور ایک اترا ہے۔ چاہے ان کے نام بدل کر انوسنٹ سوم یا ہیودے توئے، بشپ آف آگ سیار، جنگ باز لالچی۔ مذہبی سربراہ کی کمی پورا کرنے والا" ہی کیوں نہ رکھ دیئے جائیں۔ پاسکل اور عیسائی پادریوں کے درمیان بھی یہی لڑائی تھی۔

اپنی صاف ہوا اور اپنے آپ سے قربت عطا کرنے کے وصف کے کارن پو نے عیسائی مذہب کو سمجھنے میں مجھے، چاہے یہ بات عجیب لگے وہ بصیرت عطا کی جواب تک کسی نے نہیں دی تھی کیونکہ کوئی آکاش کو دیکھ بھی سکتا ہے اور اس میں شامل بھی ہو سکتا ہے۔ یہیں سے وہ عالی مقام شہزادہ ہنری چہارم پروٹسٹنٹ نظریے کو تیاگ کر کیتھولک نظریے کی جانب چلا گیا تھا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ فرانسیسی محض بینکر یعنی ساہوکار بن کر نہ رہ جائیں۔ وہ انہیں درویش اور جرأت مندانہ خیالات والے بہادر انسان بنانا چاہتا تھا۔ ہٹلر کا دشمن صرف چرچل نہیں تھا بلکہ دراصل سینٹ لوئی اور ہنری چہارم بھی تھے۔ وہ عجیب وغریب متعصب روسی جارجز ٹھیک ہی کہتا تھا کہ فرانس کو ایک دن شاہی حکومت کی سلطنت بننا ہے اگر آپ فرانس کو جانتے ہوں اور اس سے پیار کرتے ہوں تو آپ صرف شاہ پرست ہی ہو سکتے ہیں۔ بھلے ہی بوربونوں نے انسانیت سوز جرائم کیے ہوں اور مسٹر وینسنٹ آریل نے کچھ بھی نہ کیا ہو پوپ اِنّو سنیٹ سوم کے اور پھر فاشسٹوں سے گٹھ جوڑ کرنے والے پائس بارھویں کے سبھی گناہوں کے باوجود یہ نظام پاپائی ہی تھا جس نے یورپ کو بچایا نہ کہ برٹش ہاؤس آف کامنز نے جیسا کہ لوگ سمجھتے ہیں۔ نشاۃ ثانیہ نے ایسی روحانی فضا پیدا کر دی جس نے وجودیت پسندوں

کی خفیہ کیتھولکوں کی تجریدی تحقیق ممکن تھی۔ مزاحمت کی ترغیب دینے والا کوئی رُوسو نہیں تھا بلکہ وہ پیگی اور جان آف آرک تھے۔ وغیرہ، وغیرہ۔

صرف فرانس کی تاریخ ہی آفاقی نوعیت کی ہے۔ فرانس کی یہ لڑائی انسانیت کے لیے لڑی جانے والی لڑائی ہے۔ ہندوستان آج اگر آزاد ہے تو جیریمی بینتھم کے باعث نہیں بلکہ نپولین کی وجہ سے۔ جیساکہ تاریخ دان سمجھتے ہیں۔ نپولین انسائیکلوپیڈیا پرستوں کی اولاد نہیں تھا بلکہ ماقبلوں کے توہم پرست کیتھولکوں کا بچّہ تھا۔ خدا کے فضل سے وہ شہنشاہ بن گیا۔ اور سینٹ پیٹر کے چرچ نے اسے وقار اور مرتبہ عطا کیا۔

ہندوستان کی کوئی تاریخ نہیں ہے کیونکہ سچ کی تاریخ ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر فرانس کی یہ لڑائی انسانیت کی خاطر لڑی گئی ہے تو یہ دیانت دارانہ اعتراف ہوگا کہ ہندوستان میں کبھی بھی کوئی لڑائی انسانیت کے لیے نہیں کی گئی۔ اور اگر لڑی بھی گئی تھی تو جلدی بھلا دی گئی تھی۔ کرشن بھشم کو حوصلہ عطا کرنے کے بعد اس سے لڑا۔ مہاتما گاندھی مسلمانوں کے حق میں لڑ کر مسلمانوں کے خلاف لڑے۔ وہ ایک ہندوستانی مقصد کے لیے ایک ہندو شہید کی موت مرے۔ انھوں نے راہ حق میں اپنی جان دے دی۔

پو میں لیزو برابر میرا ساتھی رہا۔ وہ اپنے دوستوں سے ملنے بیارٹز گیا تھا۔ اور اس نے سنا میں پو میں ہوں۔ غالباً میں نے ہی اسے بتایا ہوگا میں نے اسے پرومی نادے پی رے نے پر جاتے ہوئے دیکھا۔ جھک کر ظالمانہ انداز میں چلتے ہوئے اور جونہی اس کی نظر مجھ پر پڑی وہ میری طرف اس طرح دوڑا جیسے ایک اسکول کا طالب علم اپنے استاد کی طرف دوڑتا ہے۔ اس کے بعد وہ مجھے اپنے بہت سے ان کیتھارمہاجر دوستوں کے پاس ملوانے کے لیے لے گیا جو کلیسا کے نئے محتسب کے باعث ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

لیزو اور میں بدھ مت کے بارے میں خوب بحث کرتے تھے۔ اس کا علم خوفناک حد تک وسیع تھا۔ وہ چینی، جاپانی اور ہندوستانی کتابوں سے ایسی آسانی سے حوالے دے سکتا تھا کہ مجھے حیرانی ہوتی تھی۔ وہ صرف حوالے ہی نہیں دیتا تھا بلکہ ایسا لگتا تھا وہ سب کچھ سمجھتا بھی ہے۔ وہ جدید ہندوستان اور مہاتما گاندھی کے بارے میں بھی جانتا تھا۔ وہ اپنے باسق

دوستوں سے میرا تعارف یہ کہہ کر کراتا تھا۔ "گاندھی کے ملک کے آنے والا یہ شخص!" ایک روز لیز و نے مجھے بتایا "جانتے ہو جب میں جرمنی میں بطور طالب علم مقیم تھا تو میں ایک مدت کے لیے آزمائشی طور پر سبزی خور بن گیا تھا۔ ایکس پہنچنے کے بعد میں ایک بار پھر کوشش کروں گا۔ ایک بدھ بھکشو کی طرح میں ایک بار ہندوستان جانا چاہتا ہوں۔"

میڈلین کے بارے میں ہم نے کبھی بات نہیں کی۔ اس نے صرف ایک بار یہ پوچھنے کے لیے اس کا ذکر کیا کہ کیا جلدی وہ ایکس لوٹ رہی ہے۔ میں نے اثبات میں جواب دیا "ہاں دو ہفتے میں۔"

میں نے لیز و سے کبھی نہیں کہا اگرچہ یہ دلچسپ رہتا کہ وہ میرے ساتھ چلے کیتھاروں کے پوجا گھروں کو دیکھنے کے لیے جہاں میں کسانوں سے باتیں کرنے اور خانقاہوں کے سربراہوں سے ملنے ہر روز جایا کرتا تھا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ آل بی جاں سیاں روایات ہر جگہ اب بھی زندہ ہیں۔ لوگ ایک پُراسرار غاز کا بھی ذکر کرتے تھے جہاں کیتھاروں نے اپنے خزانے چھپا رکھے تھے۔ کچھ راتوں کو اورلولک نام کی ایک مخصوص پہاڑی پر چمکتا ہوا ایک ستارہ بھی دیکھا جا سکتا تھا۔ ایسے نیلے رنگ کا جو زرد کے بجائے سُرخ رنگ کی زیادہ جھلک دیتا تھا۔ چرواہے آج بھی اسے اپنی پہاڑیوں سے دیکھتے تھے۔ اور آپ جونہی اسے دیکھتے تھے تو بے ساختہ آپ کے منہ سے یہ الفاظ نکلتے تھے: "پاتر نوستر"۔ کیونکہ یہ کوئی روح ہوگی ربستی سے آنے والی کسی بدعتی کی جو بالآخر جنت کی طرف جا رہی تھی۔ میں جو تاریخی مقامات میں موجود دکھیوں کو محسوس کرتا ہوں مجھے ایک مقدس پاکباز کیتھار کو دیکھنا اچھا لگنا فطری تھا۔ مجھے یقین ہے میں اس سے اتنا ہی پیار کرتا جتنا میں بدھ مت کے پیروکاروں سے کرتا ہوں۔ لیکن لیز و میری حسیات کے لیے ضرورت سے زیادہ غیر شائستہ تھا۔ میں صرف ایک تھیسس نہیں لکھنا چاہتا تھا، بلکہ ایسا تھیسس لکھنا چاہتا تھا جس کی فلسفہ تاریخ سے متعلق ایک ہندوستانی کوشش کی نوعیت ہوتی۔ میں جاننے سے زیادہ اپنے اندر زیادہ جذب کرنا چاہتا تھا۔

میں بڑا اچھا محسوس کر رہا تھا۔ میرا وزن اس تیزی سے بڑھ گیا تھا کہ ڈاکٹر ڈریگر ہنس پڑے اور مجھے لے مالاد اماجن یار ایک خیالی مرض کا مریض کہنے لگے۔ بلاشبہ وہ اسے صحیح

نہیں مانتے تھے لیکن مجھے خوش کرنے کے لیے انھوں نے یہ کہہ دیا تھا۔ انھوں نے مجھے نئے ایکس رے فوٹو دیئے اور ہر تین مہینے کے بعد مجھے اپنی جانچ کروانے کی ہدایت دی۔

کہنے لگے: ''جدید طب کی وجہ سے تپ دق ایک ایسا ہی بھرم رہ گیا ہے جیسے انتڑیوں کی سوزش فولک ایسڈ کی دریافت سے پہلے تھی۔ آپ جانتے ہیں فولک ایسڈ حال ہی میں دریافت ہوا تھا۔ جنگ کے آغاز میں واقعتاً یہ تمہارا ہی ایک ہم وطن۔ ایک ہندوستانی تھا جس نے اسے دریافت کیا'' انھوں نے یہ بات اس انداز سے کہی جیسے یہ کہنا بھر ہی یہ جاننے کے لیے کافی تھا کہ کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہے اور میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔

لاں دک کا سفر کرنے کا منصوبہ ایک پرانا وعدہ تھا جو میں نے اپنے آپ سے کیا تھا۔ اور میڈلین چاہتی تھی کہ میں اپنا تھیسس لکھنا شروع کرنے سے قبل اس کو پورا کر لوں۔ دو سال پہلے باسق علاقے کے اپنے پہلے سفر میں ہم کو نتر سے گزرے تھے لیکن وہ اس قدر ناخوش تھی کہ ہم کہیں نہیں رکے اور نہ ہی کوئی چیز دیکھی۔ لیکن اس بار میں بے زے سے کا وہ اُجڑا ہوا چرچ دیکھوں گا جس میں سات ہزار آدمیوں، عورتوں اور بچوں کو جلا دیا گیا تھا۔ میں آس پاس کی خانقاہیں دیکھنے کے لیے ناربون بھی جاؤں گا۔ بلا شبہ میں کارکاسن بھی جاؤں گا اور وہ رجسٹر بھی دیکھوں گا جس میں بدعتیوں کے نام درج ہیں اور وہ دن بھی جب وہ دکھائی گئی چتا پر نذرِ آتش ہو گئے۔ امکان یہ تھا کہ یہ سفر واقعی دلچسپ ثابت ہوگا۔

جس دن میں پو سے روانہ ہوا وہ کوئی روشن چمکیلا دن نہیں تھا بلکہ موسم خزاں میں یہ محسوس ہوتا تھا کہ سردیوں کا موسم جلد شروع ہو جائے گا۔ لیکن لاں دک خوبصورت تھا سرو کے پیڑوں، جھاڑیوں اور خاردار کے ساتھ اور گرگیگ اس قدر شدید طور پر خوبصورت تھا کہ وہ حسن کسی نرم آہنگ آمیز علاقے میں نہیں مل سکتا۔ میں سیت بھی گیا کیونکہ میڈلین سمی تیاز ماریاں کو بہت پسند کرتی تھی۔ میں پال ویلیری کی سوانح عمری کا وہ خوبصورت حصّہ کبھی نہیں بھول سکتا جہاں وہ اپنے آبائی شہر کے بارے میں لکھتا ہے:

''میرا جنم ایک اوسط درجے کی بندرگاہ میں ہوا تھا جو خلیج کے پرلے سرے پر پہاڑی کی تلہٹی میں واقع تھی۔ پہاڑی سے گرنے والی چٹانیں ساحل کی لکیر کے ساتھ ساتھ جڑی ہوئی تھیں۔

اپنی جائے پیدائش کے بارے میں میرا سیدھا سادہ خیال یہ ہے کہ میرا جنم ایسی جگہ ہوا تھا جہاں جنم لینا مجھے پسند ہوتا۔

مونپے اس اے اپنے آرک دے تریمف اور پے رو کے منظرنامے کے ساتھ ہمیشہ کی طرح خوبصورت تھا۔ لیکن مجھے گھر پہنچنے کی فکر تھی۔ شاید میں لگاتار گاڑی چلا کر اسی رات پہنچ سکتا تھا اور میڈلین کے لیے ولاسیاں آں کھلا رکھ سکتا تھا۔ وہ کتنی خوش ہوگی۔ میں قریب قریب شام کو نائمز میں سے گزرا۔ یوں دیوگارڈ میں اتنا اندھیرا تھا کہ میں صرف ندی کے بہنے کی ہی سن سکتا تھا۔ میں اپنی چابیاں نہ لانے کے کارن فکرمند تھا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ مادام یاں کے پاس ہمیشہ چابیوں کا ایک جوڑا رہتا ہے۔ نو بجے تک میں اکیس میں تھا۔ مادام یاں پہلے ہی شب خوابی کے لیے اپنے بستر میں لیٹ چکی تھی لیکن وہ ولا یانت آں میں ہو آئی تھی اور مادام کے لیے ہر چیز کو جھاڑ پونچھ کر صاف کر آئی تھی۔ مجھے چابیاں دیتے ہوئے اس نے بتایا "میں نے ڈاک آپ کی میز پر رکھ چھوڑی ہے"۔ میں لوٹ آنے پر خوش تھا۔ مجھے امید تھی میں دوبارہ خوش و خرم رہ سکوں گا۔

جب میں اوپر چڑھا تو بیل نتھنے پھلا کر لگ بھگ گرج رہا تھا۔ میں نے اسے گھاس دی اور جانکاری کے لیے اندر گیا۔ ولاسیاں۔ آں۔ کس قدر جانا پہچانا تھا۔ جب میں نے ہاتھ منہ دھونے کے لیے کپڑے اتارے تو میں نے دیکھا میرے سوٹ کیس ابھی کونے میں ہی پڑے تھے۔ میں نے انہیں اپنی الماری میں بند کر دیا۔ ماضی ماضی ہے۔ اور ماضی تاریخ ہے۔ ہاں! میں میڈلین کے ساتھ خوش رہوں گا۔ میں چٹھیاں دیکھنے کے لیے اپنے کمرے میں گیا۔ پانچ ہندوستان سے تھیں اور ایک پیرس سے۔ میں نے اپنے لیے گرم چاکلیٹ کا پیالہ بنایا، گرم پانی کی ایک بوتل تیار کی اور آہستگی سے بستر میں گھس گیا۔ میں آرام سے تھا۔

ہندوستان سے آئی ہوئی چٹھیوں نے مجھے حیرت زدہ کر دیا۔ چھوٹی ماں پُر امید تھیں۔ ان کو حال ہی میں پتہ چلا تھا کہ یونیورسٹی گرمیوں میں میرے ہندوستان لوٹ آنے کی توقع رکھتی ہے۔ خالی جگہ کے بارے میں ایک رسمی قرارداد منظور کر لی گئی تھی کہ اسے میرے لوٹنے تک خالی رکھا جائے گا۔ ظاہر ہے سینیٹ میں میرے اچھے دوست تھے۔ چھوٹی ماں میڈلین کے ہندوستان

آنے پر اس کا خیر مقدم کر کے خوش ہو گی۔ بلاشبہ ہمیں کچھ زیادہ ہی "یورپی قسم کے گھر میں بٹلروں اور کوڈ وغیرہ کے ساتھ" رہنا ہو گا۔ اس کا خیال تھا کہ سروجا میڈلین کی اچھی سہیلی ثابت ہو گی۔ سروجا ہمیشہ اُداس اور تنہا سی لگتی تھی۔ دوسری طرف سکماری زندگی سے بھرپور تھی۔ وہ عنقریب ہی میٹریکولیشن کا امتحان پاس کر لے گی۔ بلاشبہ فرسٹ ڈویژن میں اور پھر یونیورسٹی میں داخلہ لے لی گی۔ مجھے یقین ہے چھوٹی ماں نے پہلے ہی سوچ رکھا تھا کہ میں یونیورسٹی میں پروفیسر رہوں گا اور سکماری میری طالب علم۔ میں گھر جاتے ہوئے چھوٹی ماں کو ساتھ لے جایا کروں گا اور وہ آکر میڈلین کے ساتھ اپنی بچگانہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بات کیا کرے گی جو اس نے اس وقت تک سیکھ لی ہو گی کیونکہ اس نے بہت جلد انگریزی سیکھنے کی تجویز کا ذکر کیا تھا۔ سکماری کو اس کی استانی بننا تھا۔ اس نے امید ظاہر کی تھی کہ بچھوئے ٹھیک ناپ کے رہے ہوں گے۔ وہ یورپی پاؤں کے بارے میں تو جانتی نہیں تھی ورنہ وہ انہیں سنار کے پاس لے جاتی اور میڈلین کے ناپ کے بنوا لیتی۔ خط اس نے اپنے دستخط کے ساتھ یوں ختم کیا تھا۔

'اپنے بیٹے رام کے لیے پیار بھرے آشیرواد کے ساتھ۔

وشالاکشی

سروجا کا خط مایوسی بھرا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ یورپ ضرور آئے گی اور اپنی تعلیم وہاں جاری رکھے گی۔ وہ گھر میں ایک برس اور نہیں رہ سکے گی۔ پتاجی کی وفات کے بعد گھر آنسوؤں کی ندی بن گیا تھا اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ اب تو دادا کیٹنا بھی مر چکے تھے۔ گھر میں کوئی بڑا باقی نہیں رہا۔ اور میں یہاں سے بہت دور تھا۔ مجھے صرف اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کرنا تھا اور باقی سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ مجھ پر بوجھ نہیں بنے گی اور میڈلین کے لیے بڑی اچھی نند ثابت ہو گی۔ وہ جانتی تھی کہ موں پی اے کا مکتبِ طب دنیا کے بہترین طبی اسکولوں میں سے ایک ہے اور شاید میں اسے وہاں وظیفہ دلوا سکوں گا۔ سروجا اور سکماری ہمیشہ سوچتی تھیں کہ ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو ان کا بھائی نہ کرا سکے۔

میری ایک جبلّی خصوصیت ہے۔ شاید اپنے تحفظ کی جبلّت۔ کوئی پراسرار جہت جس کو

کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ میں اس خیال سے خوش تھا کہ سروجا وِلا بیاں آن میں رہے گی اور مجھے ایک بہن کی حیثیت کا توازن کچھ اس طرح حاصل ہوگا کہ مجھے ایک ایسا مرکز مل جائے گا جہاں سے میں ضوافگن ہو سکوں گا۔ ہم سب اپنے لیے ایک ایسا ہی خارجی نقطہ ڈھونڈتے ہیں۔ کوئی پارٹی، کوئی استاد، باپ، وہ شخص جس کے سامنے ہم اعتراف کر سکیں لیکن ہندوستان میں مشترک خاندان کی روایت کے باعث مختلف شکلوں کی مثلثوں کا ایک مخروط بن گیا ہے اور ہم ایک دوسرے کی بے راہ روی اپنے توازن سے برابر کر دیتے ہیں۔ خاص طور پر ایک بہن جو اندر سے عورت ہونے کے باوجود عورت کے مطالبات سے آزاد ہے اور جس کے اندر کا خاندانی افتخار اور وابستگی تمہیں دیوتا بنا دیتے ہیں۔ وہ ناقابلِ فہم کو جانا پہچانا بنا دیتی ہے۔ پُراسرار کو سادہ اور قابلِ تعظیم۔ علاوہ ازیں سروجا میں ایک خوشبو تھی جو میرے شب و روز کو بھر دے گی ۔ جسم کی خوشبو جو نسائیت کے سادہ سے اصول میں زبردستی داخل ہو جاتی ہے۔

میں اس خیال سے خوش تھا۔ بہت خوش! حالانکہ میں جانتا تھا وہ کبھی نہیں آئے گی۔ ہم کسی بھی طرح متعلقہ اخراجات کے کفیل ہی نہیں تھے۔ پھر بھی میں اسے کم و بیش تصور کی آنکھ سے دیکھتا تھا۔ سفید ساڑھی میں ماتھے پر قُم قُم کی بندیا لگائے ہوئے۔ اس کے ابرو اس کی ناک کے اوپر کے حصّے میں ایک دوسرے کو چھوتے ہوئے اور اس کی ہرنی کی سی چال! میرے سر پر اس کا ہاتھ مجھے صحتیاب کر دے گا اور میرے پھیپھڑوں سے بدی کو نکال باہر پھینکے گا۔

اگلا خط پرتاپ کا تھا۔ اس نے میری اس قوت کے بارے میں بے پناہ اعتماد کا اظہار کیا تھا جو اس کی منگیتر کے دل کو بدل سکتی تھی۔ اس نے بتایا تھا اس کے کانوں تک پہنچنے والی رپورٹوں کے مطابق میری مختصر سی ملاقات بڑی امید افزا ثابت ہوئی تھی۔ ہندوستانی اقدار کے سلسلے میں میرے اثبات نے اس نوجوان لڑکی کو متاثر کیا تھا وہ جو پرارتھنا کے لیے نیچے اتر کر مندر میں کبھی نہیں آئی تھی۔ اب بھجن اور پوجا میں ڈوبی رہتی تھی۔ اس کی ماں حیران تھی۔ سوچتی تھی کہ میں پھر آ سکتا ہوں۔ لیکن میں پہلے ہی ہردوار جا چکا تھا۔

"کچھ اور سچائی بھی ہے جو میں آپ کو الٰہ آباد میں نہیں بتا سکا۔ لگتا ہے لندن میں مقیم ایک مسلمان نوجوان لڑکے میں ساوتری کو دلچسپی ہو گئی ہے۔ اس بات سے چونک جانا

۱۹۵۱ء میں ممکن ہے بے تکا، بے معنی لگے۔ لیکن ماں انتہائی دقیانوسی ہیں اور بلا شبہ شادی کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ باپ کمزور شخص ہے۔ وہ وہی کرتا ہے جو اس کے کنبے کے لوگ کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ساوتری جو بھی کرنا چاہے وہ انکار نہیں کر سکتا۔ یہ یقین کرنے کے لیے میرے پاس جواز ہے کہ وہ بڈھا کھوسٹ میری کامیابیوں سے خاص متاثر نہیں ہے۔ ایک حکراں شہزادہ (اگرچہ ایک چھوٹی سی ریاست کا راجہ) ایک معمولی سے جاگیردار سے کیسے مطمئن ہو سکتا ہے چاہے اس کے امکانات کچھ بھی ہوں۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا اسے سمجھنا میرے جیسے لاچار آدمی کے لیے بڑا معاون ثابت ہوگا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔

"میں نے اس کی ماں کو بتایا ہے بلکہ اپنی ماں سے کہلوایا ہے کہ اگر ساوتری کو سمجھایا جا سکے کہ وہ آپ سے کچھ زیادہ ملے تو ممکن ہے بات بن جائے۔ وہ صرف ۱۹ برس کی ہے۔ اور فرانس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ اگر آپ اسے فرانس آنے کی دعوت دیں تو اچھا ہوگا۔ اگر آپ کو اس سے کوئی زحمت نہ ہو تو میں آپ کا بہت ممنون رہوں گا۔ آپ میرے لیے بھائی کی طرح ہیں۔ مجھے معاف کر دیں۔

محبت کے ساتھ

آپ کا

پرتاپ

اگلا خط بھی اسی کا تھا۔ جلدی سے لکھا ہوا یہ مختصر خط یہ اطلاع دینے کے لیے لکھا گیا تھا کہ اس بار ساوتری بحری جہاز سے آ رہی ہے کیونکہ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ اس کا دل ہوائی سفر کے تقاضوں کی حد تک صحت مند نہیں تھا۔ ایس۔ ایس طوجا ۳ر اکتوبر کو مارسیلز پہنچے گا۔ کیا میں وہاں اس سے مل سکتا ہوں۔ شاید وہ ایک دو دن میرے اور میری بیوی کے ساتھ گزار سکے۔ شکریہ کے ساتھ وغیرہ۔ وغیرہ

آخری خط وہ تھا جو خود ساوتری نے لکھا تھا۔ یہ خط پورٹ سعید سے پوسٹ کیا گیا تھا۔ اس میں صرف یہ اطلاع تھی کہ اس کی ماں نے اسے میرا پتہ دیا ہے اور اگر میں کچھ وقت نکال سکوں اور مارسیلز آ جاؤں تو اسے مجھ سے مل کر خوشی ہوگی۔ اس نے اس کے بارے میں کچھ نہیں لکھا کہ وہ ہمارے یہاں رہ سکے گی یا نہیں۔

"اپنے گھر میں آپ سے ملاقات بڑی اچھی رہی۔ گرد و نواح کے عامیانہ پن نے مجھے یقین ہے کہ آپ کی حسیات کو مجروح نہیں کیا ہوگا۔ ہم شمال والے تہذیب کے تعلق سے نوآموز ہیں۔ میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔ کیا میں آسکتی ہوں۔ میں فرانس کو جاننا سمجھنا چاہتی ہوں۔ میں ہندوستان کو جاننا سمجھنا چاہتی ہوں۔

خلوص کے ساتھ

سادترمی

یہ خط آج تک میرے پاس محفوظ ہے۔ وہ ایک سفید موٹے 'پی اینڈ او' نوٹ پیپر پر لکھا گیا تھا۔ جس کی بائیں جانب ایک جھنڈا تھا اور لکھنے کے لیے کہیں اور کچھ زیادہ جگہ نہیں تھی۔ میں نے محسوس کیا یہ اچھا خط تھا۔ یہ خط میرے لیے خبریں لے کر آیا تھا۔

مجھے کچھ ایسا لگا کہ خود سرو جا آرہی ہے۔

میری ڈاک میں آخری خط میں چچا چارلس کا تھا۔ وہ میڈلین اور کیتھرین دونوں کو گاڑی میں پیرس سے لائے تھے۔

"تم دونوں کی جوڑی کیسی سندر ہے"! انھوں نے آگے لکھا تھا "میرا اور زوبی کا دل اس احساسِ تشکر سے معمور ہے کہ ہماری بیٹی — میڈلین میری اپنی بیٹی کی طرح ہی تو ہے — کو تمہارے دیئے گھر کی صورت میں سکھ شانتی۔ عزت و رفعت کا گہوارہ ملا ہے۔ اگر تمہارے نزدیک عیسائی دعاؤں کی کوئی اہمیت ہے تو میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ تمہیں کامیابی اور کامرانی سے سرفراز کرے اور تمہاری نیک صلاحیت اور کارکردگی تمہارے عظیم اور قدیم ملک میں مناسب طور پر کارآمد ثابت ہوں۔ بین الاقوامی معاملات میں ہندوستان پہلے ہی بڑا اہم رول ادا کر رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے مرتبے کا شخص — میں کم و بیش یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایک ایسے اونچے خاندان کا فرد — ایسے عہدوں کے لائق سمجھا جائے گا جو اہم بھی ہوں گے اور ملک کی خدمت کے مواقع بھی فراہم کریں گے۔ میڈلین کا شکریہ کیتھرین کو اچھا شوہر مل جائے گا۔ پہلے ہی میرے ذہن میں دو تین نوجوان ہیں۔ لیکن کیتھرین بڑی سخت قسم کی لڑکی ہے۔ میڈلین کی طرح اس کو مردوں سے ڈر لگتا ہے۔ دراصل ہمیں قصبے میں ایک راماسوامی کی ضرورت ہے۔

پیار کے ساتھ

چچا چارلس

ایسے شخص کو جو بیمار رہا ہو۔ شفقت یہ سیلاب بڑا دلاسا دے سکتا تھا۔ اس سے بھی زیادہ دلاسا دینے والی بات یہ تھی کہ میں صبح کو میڈلین سے دوبارہ مل رہا تھا جونہی گاڑی گاردسیاں شارل میں آئے گی میں اس کا جوان حسین روشن چہرہ دیکھوں گا۔ میں اس کے لیے ازے لیا کا گلدستہ خریدوں گا۔ جیسا کہ ڈرائیور رہنری خریدا کرتا تھا اور اسے نئی دلہن کی طرح گھر لے کر آؤں گا۔

مجھے لگا یکایک میری پوری زندگی میڈلین میں مرکوز ہو گئی ہے۔ زمین پر یا فضا میں کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جو اس کی موجودگی کے بغیر تھی اور جو وقت سے آزاد ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میری نہ ہونے والی ہو۔ میں ایس کلارمند کے بارے میں نہیں بھولا تھا لیکن مستقبل کے بارے میں کون جان سکا ہے۔ جیوتشی جانتے تھے اور انھوں نے کئی بچّے ہونے کی بات کی تھی۔ میرے پھیپھڑے میں درد تھا لیکن میں اس درد کو بھول گیا۔ میں میڈلین کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ رات بہت جلد ختم ہو جائے گی اور سویرا ہو جائے گا۔

اس کو گاڑی پر لینے کے لیے مجھے چار بجے اُٹھنا پڑا۔ جب میں مارسیلز کے لیے تیزی سے نکلا تو مرغ ابھی گرمجوشی سے اذان دینے میں منہمک تھے اور دن انار کی طرح تازہ تھا۔ ساری دھرتی سے گلابوں کی خوشبو آرہی تھی۔

اگلی صبح میں میڈلین کے لیے کافی کا پیالہ بنا کر لایا۔ کالج اس دن سے شروع ہو رہا تھا۔ ایک برس کو بھرنے کے لیے اتنا کچھ آگے تھا اور زندگی کو بھرنے کے لیے بھی!

چار جز بعد دوپہر آ گیا۔ وہ اپنے معمول کا کچھواڑہ فادر زے نوبیاس کے ساتھ گزار رہا تھا۔ اس کے حرکت کرتے ہوئے ہاتھوں، چمکتی ہوئی آنکھوں اور بار بار اپنے سر کو پیچھے جھٹکنے کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ وہ ایک ایسے اچھے گھوڑے کی طرح تھا جو سواری اور اچھل کود کے لیے بے قراری سی اپنے جبڑے چلا رہا تھا۔ وہ چرچ میں بدی کے نظریے پر بات چیت کر رہا تھا اور اسے افسوس تھا کہ ان شاندار مباحثوں کے دوران میں خانقاہ میں موجود نہیں تھا۔

وہ کہنے لگا: ”راما سوامی جانتے ہو شامیں کس طرح روشنی اور خاموشی سے معمور تھیں فادر زے نوبیاس اور میں نے کئی کئی گھنٹے ایک دوسرے کی صحبت میں گزارے۔ وہ اپنے

لمبے کنند کدال سے اپنی قبر کھودتے رہے اور میں صحن میں ایستادہ دیوقامت شاہ بلوط کے نیچے کھڑا۔ عیسائیت کے مذہبی اصولوں کے بارے میں باتیں کرتا رہا کسی شخص کی شخصیت کا حسن اکثر اس وقت نظر نہیں آتا جب وہ شان و شوکت کے ساتھ زندگی گزارنے کے ذرائع کا مالک ہوتا ہے۔ بلکہ اس کی خوبیاں اس وقت دکھائی دیتی ہیں جب وہ دکھ کا پیالہ اپنے ہونٹوں سے چھوتا ہے۔ اس وقت اس کے دکھی چہرے پر انتہائی نفیس اور باریک خطوط دکھائی دینے لگتے ہیں۔ گیلیلی میں تبلیغ کرتے ہوئے مسیح کا چہرہ ایسا پُر نور نہیں ہوا ہوگا جیسا یہ نور اس وقت تھا جب وہ صلیب پر لٹکا ہوا تھا۔ بدی پُرکشش ہے کیونکہ اس کے بغیر نہ کوئی نیکی ممکن ہے نہ یہ دنیا اور نہ ہی مسیح۔ اب میں تو سی فرکی ترغیب کو سمجھ سکتا ہوں۔ جو نشہ بدی میں ہے وہ نیکی میں نہیں ہے۔"

"ظاہر ہے" میں نے جواب دیا "کیونکہ بدی میں آپ نیکی کی باتیں کرتے ہیں اور نیکی میں آپ خود اچھائی اور نیکی ہوتے ہیں۔ نشے میں ہونے کے لیے آپ کو شرابی کی اور اس کی ضرورت ہے جو اپنے آپ کو نشے میں دیکھنا چاہتا ہے۔ تمہیں بائبل کا یہ قول یاد ہوگا کہ دائیں ہاتھ کو پتہ نہیں ہونا چاہئے کہ بائیں ہاتھ نے کیا کیا ہے۔ اچھائی خود کو نہیں جان سکتی۔ اس حد تک جس حد تک روشنی اپنے آپ کو نہیں جانتی۔"

"تو پھر روشنی اپنے آپ کو کیسے پہنچانتی ہے؟"

میں نے کہا: "یہ ٹھیک اسی طرح ہے جیسے کوئی شخص پیرس جارہا ہو اور اپنے آپ سے کہہ رہا ہو۔ ابھی تو پیرس ساڑھے چار سو کلومیٹر دور ہے۔ میں دی جاں میں ہوں۔ دو سو کلومیٹر۔ میں اوک سیار میں ہوں ۵۸ کلومیٹر۔ میں فنتین بلو میں ہوں۔ اور اچانک وہ پورت دے والو میں پہنچ جاتا ہے اور کہتا ہے: صرف سات کلومیٹر۔ اور جب وہ شہر میں داخل ہو جاتا ہے تو کسی سے پوچھتا ہے۔ مسٹر، مسٹر! کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ پیرس کہاں ہے' اور اگر پیرس کا رہنے والا چالاک ہو، مسٹر کہ پیرس میں رہنے والے اکثر لوگ ہوتے ہیں تو وہ کہے گا: "مسٹر پیرس یہاں سے اب بھی ۲۷ کلومیٹر دور ہے۔ آپ سیدھے اس بڑی سڑک پر جائیے اور دائیں جانب مڑ جائیے۔ آپ وہ سڑک دیکھ رہے ہیں نا جہاں دھوپ چمک رہی ہے۔ آپ

وہاں تک سیدھے جایئے، ہوائی اڈّے اور ٹیل کے پاس سے اور پتھروں کی بنی لمبی دو رویہ پاپلر کے پیڑوں والی سڑکوں سے آگے پھر ایک وادی ہوگی۔ ایک قبرستان، ایک اسٹیشن اور ایک شہر۔" لیکن تھوڑی دیر بعد باہر سے آنے والا ایک ہتھیار بند پولیس والے کے پاس پہنچتا ہے۔"پیرس! مسٹر یہ پیرس ہے نا!" جارجز! پیرس وہاں اس لیے نہیں ہے کہ وہاں اوک، سیار ہے یا وہاں پورت د والو ہے۔ پیرس وہاں اس لیے ہے کہ وہ پیرس ہے۔ پیرس میں آپ یہ نہیں پوچھتے کہ پیرس کہاں ہے اور نہ ہی ایک بار پیرس پہنچنے کے بعد پیرس کے علاوہ آپ کچھ اور جانتے ہیں۔ میرے دوست تم جانتے ہو تمام فاصلے نانتردام سے شروع ہوتے ہیں اور پیرس صفر سے شروع ہوتا ہے۔"

"لیکن پیرس ایٹویال اور بیوت شاں موں سے بنا ہے۔ پیرس لُوور اور ای ادسن رینا سے بنا ہے۔ پیرس مکمل نہیں ہے چونکہ اس کے اجزا اپنے وجود رکھتے ہیں اس لیے کل کا بھی اپنا وجود ہے۔"

"اچھا آیئے اب ہم منطق سے کام لیں۔ حالانکہ جُزء کے معنی ہیں کل، لیکن کسی بھی انسان کا ذہن کل کے مکمل کے معنی نامکمل کے مترادف نہیں سمجھتا۔" اگر کل کو کل سے منہا کر دیا جائے تو جو کچھ باقی بچتا ہے وہ 'کل' ہی ہوتا ہے۔" اپنشد یہی کہتے ہیں۔ پُنر جیون، تجدید حیات اس لیے نہیں ہے کیونکہ موت ہے بلکہ اس لیے ہے کہ زندگی ہے۔ کوئی آدمی نہیں مرا کوئی آدمی نہیں مرے گا۔ موت صرف ایک منفی خیال ہے۔"

"ارے تم پھر اسی بات پر آگئے۔ اپنے ویدانت پر مایا۔ مایا کے تعلق سے مایا ہے۔ جہاں برہمن ہے وہاں مایا نہیں ہو سکتی۔"

میڈلین مداخلت کرتے ہوئے بولی۔"لیکن مایا تو گوتم بدھ کی ماں کا نام بھی تھا۔ کیا اس کا مطلب یہ نہیں کہ التباس نے حق کو جنم دیا تھا اور چونکہ حق وجود میں آگیا اس لیے التباس ختم ہوگیا اور اسی لیے بدھ کی ماں بھی مرگئی۔"

"یہی بات اولڈن برگ یا اس جیسے کسی شخص نے کہی ہے۔ نہیں، یہ طریقہ نہیں ہے اس کو سمجھنے کا۔ چونکہ حق ہمیشہ قائم و دائم ہے اس لیے سچ کبھی جنم نہیں لیتا اور کسی طرح بھی اپنے

آپ کو ظاہر نہیں کر سکتا۔ اس کی کوئی ماں نہیں ہو سکتی۔ اس کا کوئی باپ نہیں ہو سکتا۔ مایا سچائی کو دیکھ کر بلکہ انسان سچائی کے روپ میں اپنی حقیقی فطرت کو دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ التباس کا کبھی کوئی وجود نہیں تھا اور نہ کبھی ہوگا۔ اس لیے مایا بُری نہیں۔ مایا نے سچائی کو سچائی کے روپ میں پہچان لیا، قبول کر لیا۔ اس طرح مایا سچائی ہونے کے علاوہ کچھ نہیں تھی۔ کچھ بھی نہ ہونے کو، نروان کو ۔ کس نے دیکھا ہے۔ خلا تو صرف وہ انّا ہے، وہ 'میں' ہے جسے عدم انّا کے روپ میں اندر سے دیکھا گیا ہے۔ بدی اخلاق ہے۔ میں نے کم و بیش یہ کہا: ایک بصری حقیقت ہے۔ بصریات اور کشش ثقل یکساں طور پر حقیقی نہیں ہیں۔ دھرتی سے ایک مخصوص دوری پر کشش ثقل ختم ہو جاتی ہے۔ آپ کے اعصاب کے اندر کوئی مخصوص لمس آپ کی بصریات کو بدل سکتا ہے اور سرجن کی خواہش کے مطابق آپ لمبی چیزوں کو چھوٹی چیزوں کے روپ میں اور چھوٹی چیزوں کو لمبی چیزوں کے روپ میں دیکھنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ جزوی یا اضافی سے کل کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اخلاقی ردّعمل آخر کار حیاتیاتی ردعمل ہی تو ہے۔"

"خدا بھگوان ہے اور اچھائی اس ہونے کا حصّہ ہے۔ اچھائی ہی صرف سچ ہو سکتی ہے جیسا کہ یونانی کہتے ہیں۔"

"تو پھر رات کس طرح بنتی ہے؟"

"غیاب۔"

"اور دن؟"

"اپنے آپ۔"

ایک لمبی غیر متوازن خاموشی طاری ہو گئی ۔ سر کہسار کی سی خاموشی۔ اگر کوئی مشرق کی طرف جاتا یا جنوب کی طرف ۔ دونوں طرف برف کی گہری تہہ تھی۔ اور وادی کی دوسری طرف برف کے تودے کو نیچے لڑھکتے ہوئے دیکھا جا سکتا تھا۔ اب سوال راستے کا نہیں تھا، بلکہ اس جبلّی جذبے کا، اس کا جو کہسار کے جغرافیے کی بجائے خاموشی میں پنہاں تھا اور جو متکلم تھا۔ حق ۔ کیفیت گریز ہے۔ خدا اثبات ہے۔ جارج جس نے برف کے تودے کو دیکھا تھا

دم بخود کھڑا تھا۔ اسے صرف نیچے بہتی ہوئی ندی کی گنگناہٹ سنائی دی اور پرندوں کی پرواز!

میں نے اپنی بات جاری رکھی "سزانے کو آپ کو معلوم ہوگا بادلیر کا 'لا شاروں' حفظ تھا۔ اور ریے نر ماریا رلکے پر سزانے کی تخلیقات کا گہرا اثر تھا۔ مصوری تو میری سمجھ میں نہیں آتی لیکن رلکے کا میں مداح ہوں۔ رلکے کا کہنا ہے " لا شاروں کی موجودگی نے انسانی سمجھ کو ایک نئی جہت عطا کی ہے" دراصل بدی کو تسلیم کر لینا درویشی کا آغاز ہے کیا تمہیں بادلیر کے وہ خوفناک مصرعے یاد ہیں:

"اے حسینہ، تم کیڑوں سے کہو
جو تمہیں چومتے ہوئے کھائیں گے
میں نے اپنے سڑے ہوئے پیار کے روپ
اور خدائی سچائی کی حفاظت کی ہے۔"

"یہ ہوئی نا بات!" جارجز نے خوش ہو کر کہا۔

"جی ہاں، یہی تو ہے۔ اور اسی لیے رے نر ماریا رلکے فرشتوں کے درمیان گم ہو گیا اور اپنے جسم کو اس قدر اہمیت دینے لگا کہ جب وہ بیمار ہو کر بستر مرگ پر تھا تو اس نے کسی ڈاکٹر کو اپنے پاس نہیں پھٹکنے دیا۔ جسم کی پوترتا یعنی جسم کا تقدس۔ دیوداسی کے فرض کی طرح ہے۔ اس کے اپنے فرائض اس کی اپنی جہت کے دائرے میں ہیں۔ اگر ذہن میں پاکیزگی نہ تو جسم میں بھی کوئی پاکیزگی نہیں ہو سکتی۔"

"تو پھر؟"

اس لیے انسان کو ذہن یا جسم کی پاکیزگی پوترتا کی تلاش نہیں ہونی چاہیے بلکہ بہ نفس نفیس پاکیزگی کی پوترتا کی، جیسا کہ تیرھویں صدی میں دھرم گرو مادھو آچاریہ نے کہا تھا کہ انسان کو شکر کی مٹھاس کا سواد لینے کی خواہش نہیں کرنی چاہیے۔ میں ہمیشہ ایک ایسے شخص کا تصوّر کرتا ہوں جو بون بون (مٹھائی) چوستا رہتا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ ایسا شخص بننے کی بجائے ویدانتیوں کے قول کے مطابق بذاتِ خود شیرینی میں، مٹھاس میں ڈھل جائے۔"

"کوئی چیز میٹھی ہے؟ کون ہے یہاں جو جانتا ہے؟"

"کیا تم سنجیدہ ہو؟" میں نے پوچھا۔

"سنجیدہ؟ کیوں۔ بلاشبہ میں سنجیدہ ہوں۔"

"تو آؤ" میں نے کہا۔ مجھے پہاڑی راستے کا علم تھا۔ میرے پاؤں میں برف کے تودے کا شعور تھا۔ میری ناک میں ہوا کی موجوں کی پہچان تھی، کوئی خوف نہیں تھا کیونکہ سناٹے میں آپ خود اپنے قدموں کی آواز سن سکتے تھے۔ میڈلین ہمارے درمیان تھی اور بعض اوقات میں کم و بیش اس کی دعائیں سن سکتا تھا۔ "جب آپ محسوس کرتے ہیں تو مٹھاس کہاں ہوتی ہے؟ آپ کی زبان پر۔"

"جی ہاں۔ وہی تو ہے!"

"کیونکہ بون بون (مٹھائی) ــ چاہو تو اسے شکر کہہ لو ــ تمہاری زبان پر ہوتی ہے تو کیا وہ مٹھاس بناتی ہے؟ اگر تم اسے مرے ہوئے آدمی یا سوتے ہوئے بچے کی زبان پر رکھ دو تو وہ جاگ نہیں اٹھیں گے اور کہیں گے "او، کیسی بڑھیا بون بون (مٹھائی) ہے" ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔

"نہیں۔ نہیں کہہ سکیں گے۔"

"اس لیے زبان کو حرکت کرنی چاہیے۔ رال نکلنی چاہیے کیمیاوی آمیزشیں عمل میں آنی چاہئیں۔ اور جب یہ سب گلے کے نیچے اُترتا ہے تو مٹھاس بن جاتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے جب تم کافی پیتے ہو تب اسی لمحے تم محسوس نہیں کرتے کہ وہ اچھی ہے۔ لیکن جب تم اپنی ریڑھ کی ہڈی کے نیچے جُھرجُھری سی محسوس کرتے ہو تو تم میڈلین سے کہتے ہو "بڑھیا۔ میڈلین۔ کتنی بڑھیا کافی ہے۔"

"میڈلین کی کافی کے بارے میں بہرحال یہ سچ ہے۔"

"یا پھر میری" میں ہنسا۔ "جو بھی ہو۔ بون بون تمہاری زبان پر ہے اور پگھل گئی ہے۔ مٹھاس تبھی شروع ہوتی ہے جب وہ پہچانی جاتی ہے۔ یعنی مٹھاس میں ہی۔ وہ جو بھی ہے، تمہیں مٹھاس کا ذائقہ آتا ہے۔ ایک دم بکواس۔"

"لیکن ایک حقیقت!"

جیسا کہ کسی عظیم درویش نے کہا ہے۔ تجربے میں کوئی چیز موجود نہیں ہوتی۔ محض تجربہ ہوتا ہے۔

"اچھا وہ کیسے؟"

"علم کے طلوع سے قبل حسی تاثر کو پنا کام ختم کر لینا چاہیے علم میں کوئی شے موجود نہیں ہوتی اور اگر ہو بھی کس کو علم ہے اس کا تم یہ بھی کہہ سکتے ہو 'میں' اور میں کو میں علم ہوتا ہے...

"علم کے ذریعے" میڈلین نے کہا۔

"اس کا مطلب ہوا علم 'میں' کا علم، علم کے ذریعے حاصل کرتا ہے جس کا مطلب ہوا علم ہی میں ہے۔"

"اسی لیے شکر میٹھی نہیں ہوتی بلکہ مٹھاس ہی میٹھی ہوتی ہے یا جارجز آدمی نہیں ہے بلکہ آدمی جارجز ہے۔"

میڈلین مسحور ہوئی بیٹھی رہی۔ وہ حیران ہو رہی تھی کہ اتنی ساری عقل و دانش میں نے کہاں سے حاصل کی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ میں نے کہسار کو محسوس کیا ہے اور یہ پہاڑ میرے اندر تھا۔ نہ کہ میں پہاڑ پر تھا۔

"جارجز۔ جارجز کے اندر کے تمام آدمیوں کو جانتا ہے۔" میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"اپنی بات جاری رکھو۔" وہ بولا۔

"صرف جارجز کو ہی جارجز پن کا علم ہے۔"

"ہم اس کو تسلیم کر لیں۔"

"جارجز آدمیوں — بہت سے آدمیوں کو دیکھتا ہے اور کہتا ہے یہ رہا آدم — ایک تجرید۔"

"ایسا ہی ہے۔"

"لیکن جارجز کے کسی آدم کو نہیں دیکھا، صرف آدمیوں کو دیکھا ہے۔"

"تو پھر آدمیت کیا ہے؟"

"آدمیت سب آدمیوں کا جوہر ہے۔ سب آدمیوں کی سچائی ہے۔ اور جارجز؟"

"وہ آدمی ہے مرد ہے۔"

"کیا آدمی کی آدمیتُ مرد کی مردی، جارجز کے جارجز پن سے مختلف ہے؟"

اس نے کافی دیر سوچنے کے بعد کہا "یقیناً نہیں۔"

"تو پھر جارجز کیا ہے؟ جارجز 'آدم' ہے اس لیے جارجز، جارجز نہیں ہے۔ جارجز آدم ہے، انسان ہے۔ اور آدم یعنی انسان صرف انسان ہے۔ ایک اصول ہے۔ ایک سچائی ہے اس لیے جارجز سچائی ہے۔"

میرے لیے یہ تجربہ گنگا اشنان کی طرح تھا۔ میرے سب پاپ دُھل گئے۔ جارجز بہت دور ارفع اور افضل دکھائی دے رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں اسے دعا کرتے ہوئے کم و بیش سن سکتا تھا۔ اس کا ہاتھ اس کی پیشانی پر پھیلا ہوا تھا اور وہ اپنی ہی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ شام چاروں طرف سے ہم پر حملہ کر رہی تھی۔ پرندے شور کر رہے تھے۔ میڈلین نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے گال کے اوپر دبایا۔ اس بار میں نے اسے پوری طرح جیت لیا تھا۔ میں کسی اجنبی دیوتا کے سامنے سجدہ ریز نہیں ہوا تھا۔ عورت کا بھگوان اس کے مرد کا بھگوان ہی ہو سکتا ہے۔ پو اور کہسار کی تنہائی نے مجھے اپنے آپ کو لوٹا دیا تھا۔ اب میں میڈلین کے ساتھ آش کے کیتھیڈرل میں واپس جا سکتا تھا۔ اور بلاخوف اس کے پہلو بہ پہلو گھٹنے ٹیک سکتا تھا۔ جب خوف اپنے آپ، آپ کو پہچان لیتا ہے تو وہ سچائی بن جاتا ہے۔

میں خوش نہیں تھا۔ میں سادہ و آسان تھا۔ دنیا وسیع اور گول اور قابلِ رہائش محسوس ہو رہی تھی۔ شام خوبصورت تھی اور ہم سیر کرتے ہوئے پہاڑی پر چڑھ گئے۔ ستمبر آ کر جا چکا تھا لیکن ابھی سردیوں کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ شام کی محراب تلے پیڑوں کے پتے بڑے پیارے لگ رہے تھے۔ دُور بہت دُور میں نے ایک سچائی کی طرح سوچا سمندر کو اپنے آپ کو پھیلانا چاہیے۔ آپ کھردری ہوا کو سونگھ سکتے تھے اور اپنے نتھنوں میں نمک کی سرسراہٹ محسوس کر سکتے تھے۔ ہاتھی پر کھڑا ہو کر میں گنگنانے لگا "شو وہم۔ شو وہم" اور اس طرح

متکلّم و مترنّم ہوا جیسے اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اپنے پھیپھڑوں کو پوری طرح پھیلا کر گانے لگا۔

نہ سن رہا ہوں، نہ چکھ رہا ہوں، نہ سونگھ رہا ہوں،
نہ دیکھ رہا ہوں،
لیکن شعور اور روحانی مسرت کا ایک روپ ہوں،
میں شِو ہوں، میں شِو ہوں۔

اعلیٰ و ارفع لمبے پہاڑیوں پر سے لڑھکتے ہوئے حق کی یقین دہانیوں کے ساتھ وادی میں اتر گئے۔

"میں ماورائے تخیّل ہوں، اس کی صورت ہوں جس کی
کوئی صورت نہیں ہے
میں شعور اور روحانی مسرت کا ایک روپ ہوں
میں شِو ہوں، میں شِو ہوں۔

بدی اس شام کو کہاں چھپ گئی تھی ۔ وقت کے ایک مخصوص لمحے میں بدی کہاں چھپ جاتی ہے۔ وقت کے ایک مخصوص نکتے پر سورج کیوں نہیں ہوتا۔ میں پوچھتا ہوں۔ روشنی کی کمی میں تمہارا اعتقاد ہی رات کو وجود میں لاتا ہوں۔ دن تو ہمیشہ رہتا ہے۔ بدی توہم پرستی ہے۔ ایک سایے کا نام۔

اسی شام کو جارجز مجھے بڑا پیارا لگا۔ وہ بڑا معصوم آسودہ اور ایک درویش سا لگ رہا تھا۔

اب میں ہیرو تھا اور میڈلین کی ساری فطری ہمدردی جارجز کو مل گئی تھی۔ میڈلین کو جیتا جا چکا تھا اس لیے میں اپنے آپ کو آزاد محسوس کر رہا تھا۔ سیر کے دوران اور گھر میں رہتے ہوئے لگاتار کئی دن میں سنسکرت منتروں کا جاپ کرتا رہا۔ اپنا کام بھی میں بڑی لگن سے کرتا رہا۔ میری تھیوری ۔ تواریخ کے فلسفے نے آل بجاں سیاں بدعت پرسے میرے لیے بہت سے پردے ہٹا دیئے۔ جو ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ یورپی تاریخ دانوں کو بڑی کٹھن

محسوس ہوتی تھی۔ فتح پوپ کی نہیں ہوئی۔ فتح ہوئی تو روایت پرستی کی، دقیانوسیت کی، کٹرپن کی۔

شام کو جب میں ابھی تک اپنے کام میں مصروف ہوتا تھا، جارجز آجاتا اور اس میں اور میڈلین میں ہونے والی پُرجوش بحث کی آواز مجھ تک بھی پہنچ جاتی۔ میڈلین نے ہولی گریل پر اپنا کام اب پوری طرح چھوڑ دیا تھا۔ وہ کہنے لگی۔ درحقیقت یہ سب آل بجاں سیاں روایت کا ہی حصّہ ہے۔ اس نے اس سلسلے میں اپنے آپ کو یقین دلادیا۔ اور اس لیے اپنی زیادہ سے زیادہ توجہ بدھ مت کی جانب موڑدی۔ بدھ کی قوت و زرخیزئ دانش اور اس سے گہرا جذبۂ ہمدردی اس کی شاموں کو اکثر تحیر و مسرت سے معمور کر دیتا۔ بستر پر میرے پہلو میں لیٹی ہوئی وہ ایک کے بعد ایک جاتک کہانیاں مجھے سنائے جاتی۔ وہ حیران ہوتی کہ یورپ کی تسخیر بدھ دھرم تو نہ کرسکا لیکن عیسائی دھرم کرگیا۔

میں نے اسے روایت کی یاد دلائی جس کے مطابق اشوک کا ایک بٹیا پاون دھرم یعنی بدھ مت کے پرچار کے لیے اسکندریہ بھیجا گیا تھا اور یہ بھی کہ اسکندریہ مکتبِ فکر کے کچھ ماننے والے خاص طور پر پلاٹنس بدھ مت کے خیالات کے ضرور کافی حد تک مرہونِ منت رہے ہوں گے لیکن ہماری اطلاع میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا اس سلسلے میں ابھی تک نہایت محدود ہے۔ یونانی ہندوستانیوں کی طرح فکری سطح پر بڑے پُرتجسّس لوگ تھے۔ ہم لوگوں کے مقابلے میں زیادہ کھلے دل والے۔ اس لیے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ ناگا سنیاسی کہاں سے آئے۔ بہر حال ان کا ہمیشہ خیر مقدم کیا گیا۔ ایک یونانی روایت کے مطابق ایک ہندوستانی رشی خود سقراط سے ملنے گئے تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب آقائے رحمدل یعنی مہاتما بدھ ابھی زندہ تھے۔ تصوّر کیجیے۔ میں نے بات کو ختم کرتے ہوئے کہا کہ ارسطو کے مدرسۂ فکر کے لیے بعد کی بدھ منظہریت کس طرح باعثِ کشش رہی ہوگی۔ وغیرہ۔ وغیرہ۔

جارجز اکثر میڈلین کے ساتھ لمبی سیر پر جاتا تھا۔ اس کی موجودگی میں وہ پُرسکون اور محفوظ محسوس کرتا تھا۔ ہم ایک نئے جارجز کو دیکھ رہے تھے۔ انتہائی منکسر مزاج، فکری طور پر افضل و ارفع۔ بعض اوقات جب اس کے چہرے پر نمایاں ہونے والے ڈرامے پر نگاہ جاتی تھی

تو ہم سوچتے تھے کہ اس نے رات دعاؤں کے بیچ گزاری ہے۔ وہ یقیناً انتہائی مضطرب تھا۔ کیتھولزم ابھی اس کے لیے نیا تھا۔ اس کو اپنا صحیح راستہ نہیں مل رہا تھا۔ جیسے کہ وہ اس سے قبل اپنے اجداد کے مذہب میں پا لیتا تھا۔ بوڑھا ایوان پاولووچ ضرور اسے اس موضوع کے بارے میں خط لکھتا ہوگا کیونکہ کبھی کبھی جارجز اپنے باپ کا خط کھول کر دو ایک پیراگراف پڑھ کر سنایا کرتا تھا۔ بدی خدا کے وجود کا ثبوت نہیں ہو سکتا پھر بھی بدی خدا کے وجود کی پیش آگاہی ضرور تھی۔ قولِ متضاد فی الحال باقی تھا۔ اور الیوشا کی طرح جب اسے بوڑھے کے سڑے ہوئے جسم سے سڑاند آنے لگی تھی۔ جارجز بڑا حلیم اپنا سا بے تکلف اور بےکس ولاچار نظر آنے لگا۔

میڈلین نے اسے وہ نسائی لمس دیا جس کی مرد دکھ میں ضرورت محسوس کرتا ہے۔ ہاتھ کا سہارا ایک نگاہِ گرم۔ کوٹ اٹھا کر دینا اور مشکل قدم اٹھانے میں مدد۔ میڈلین کا ہاتھ سدا وہاں تھا اور وہ اپنے بارے میں پُراعتماد تھی۔ اب جارجز تھا جو اس کا سہارا لیے رہا تھا۔ ہم لوگ بہت جلد خاصے مصروف ہونے والے تھے۔ ساوتری کے ۱۳ ؍اکتوبر کو آنے کا اعلان ہو چکا تھا اور میں اس کو لانے کے لیے جہازوں کے رُکنے کے پُشتے تک جا رہا تھا۔ یہ بات میں میڈلین کو بھی بتا چکا تھا۔ میڈلین میں ایک ہندوستانی لڑکی سے نباہ کرنے کا اعتماد نہیں تھا۔ وہ سوچتی تھی کہ ساوتری کو میڈلین کے طور طریقوں سے کہیں ٹھیس تو نہیں پہنچے گی۔ آخر ہم یورپی لوگوں کی تہذیب صرف ایک ہزار سال پرانی ہے۔ میں نے میڈلین کو یقین دلایا کہ ہندوستانی بڑے بردبار لوگ ہیں۔ بجائے اس بات کے ساوتری کو میڈلین کی بربریت سے دکھ پہنچے ممکن ہے وہ اس میں مزا لینے لگے۔ علاوہ ازیں ساوتری اس سے پہلے بھی یورپ میں دو برس رہ چکی ہے اور میڈلین کے دل میں ابھرنے والے یہ خدشات احمقانہ تھے۔

"تم ہمیشہ ٹھیک ہوتے ہو۔ سے نیر اور میں ہمیشہ غلط۔" اس نے مزا لیتے ہوئے اور ہلکی سی شرارت آمیز برافروختگی سے کہا۔ اور پھول گوبھی پر بیش میل ساس یعنی چٹنی ڈالنے کچن میں چلی گئی۔ جب سے وہ سبزی خور ہو گئی تھی، کھانا پکانے میں لطف لینے لگی تھی۔ اس کے کہنے کے مطابق سردیوں میں چونکہ صرف آلو، چقندر، ٹماٹر اور پالک جیسی سبزیاں ہی دستیاب تھیں۔ اس

کھانے کو ذائقے دار بنانے کے لیے بڑی سمجھ بوجھ اور ذہنی تازگی کی ضرورت تھی جبکہ گوشت سے۔ گائے یا سور کے گوشت سے کھانا کم و بیش پہلے ہی سے تیار ملتا تھا۔

"اور جہاں تک سمندری سبزی یعنی جل توری کا تعلق ہے۔" وہ اپنی کنگنہ میں چھوٹی ماں کی کہی ہوئی بات کو یاد کر کے کہتی "وہ تو سیدھی تمہارے منہ میں چلی جاتی ہیں اور ان کا ذائقہ بھی بہت بڑھیا ہوتا ہے۔ دیکھو صدف یعنی کستورا مچھلی کو دیکھو!"

خود کو قائل کرنے کے لیے میڈلین کو ہمیشہ بھیوری کی ضرورت ہوتی تھی۔ میں اسے چڑا کر کہا کرتا تھا "تم میڈلین اس لیے ہو کیونکہ تمہارا شناخت نامہ ایسا کہتا ہے۔ تم نام وادی پکیر یعنی اسمیت پسند ہو۔"

اکتوبر کے وہ دن ترچھی شاندار دھوپ سے بھرپور تھے۔ ہوائیں چلنے لگی تھیں اور موں سیاں وک ہویار ایسے لگ رہا تھا جیسے کسی نے خود کو بغیر خواب کی نیند میں دیکھا ہو آسمان میں کہیں کا نہ ہونے کا نکتہ۔ جاگنے پر آپ زیتون کے پیڑ دیکھ سکتے تھے اور لے باکس بہت دور لگتا تھا۔ آپ قریب قریب بحرہ روم کی خوبصورتی کا نظارہ کر سکتے تھے اور کہہ سکتے تھے۔ بلاشبہ میں یہاں موجود ہوں۔ میں ہی موں سیاں وک ہویار ہوں۔ جب دوسرے بچ بن جاتے ہیں تو دنیا بھی حقیقی بن جاتی ہے۔

کچھ اور حقائق بھی تھے جو ہماری شاموں کو خوشیوں سے معمور کر دیتے تھے۔ میڈلین فی الحال مشورے کے لیے ڈاکٹر کے پاس نہیں گئی تھی۔ وہ مزید ایک ہفتہ انتظار کرنا چاہتی تھی۔ دراصل اسے کوئی بھی ڈاکٹر کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ اس کے چہرے کی پُراسرار کیفیت۔ اس کا اپنے اندر جھانکنے کا انداز جیسے وہ اپنی ناک کی طرف دیکھنے کی بجائے اپنی ناف کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ان سب باتوں سے احساس ہوتا تھا کہ کچھ بات ضرور ہے۔ میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا تھا کہ جیسے سونگھ کر اچھے اور خراب تربوز میں تمیز کی جا سکتی ہے اسی طرح میں اسے سونگھ کر بتا سکتا ہوں کہ ننھا ڈمی جان لڑکا ہے یا لڑکی!

"میرا ایک راز اور بھی ہے۔" وہ موضوع بدلنے کے انداز میں کہتی۔

"وہ کیا ہے؟ میڈلین!"

" میں کیتھرین کو ایکس آنے کی دعوت دی ہے۔ کیونکہ اس نے گرمیوں میں کوئی چھٹی نہیں منائی۔ اس نے مجھے لکھا ہے کہ مہینے کے آخر میں یہاں ہو گی "

" بڑا اچھا خیال ہے "

" یہ محض اچھا خیال نہیں۔ یہ تو الہام ہے " اور مجھے اس نے اس انداز سے دیکھا جیسے وہ چاہتی ہو کہ میں بات کو کچھ اور بہتر طریقے سے سمجھوں۔

" اچھا یہ الہام ہے " میں نے کہا " تو پھر "

" میں کیتھرین کو کھونا نہیں چاہتی۔ وہ کس قدر سنجیدہ ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ کسی تعفّن بھرے بے تکے پن میں گھر جائے۔ اور کسی پلاس دے لا کیتھیڈرل میں پہنچ کر ختم ہو جائے۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ دھوپ دیکھے "

" اچھا۔ تو پھر "

اسے ناچ پسند نہیں ہے اور وہ سب مردوں کو بھی ناپسند کرتی ہے۔ وہ کہتی تھی وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی کہ وہ ان تو دولتیوں میں سے کسی سے بھی شادی کرے گی جن سے اس کا باپ چاہتا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ ان کی موجودگی ہی سے اسے جھرجھری آجاتی ہے۔

" پھر "

" وہ کسی آدمی سے اس کی خوبیوں کے کارن پیار کرنا چاہتی ہے۔ اپنی تڑک بھڑک یا پیرس میں اپنے فلیٹ اور دلیو دل میں اپنے کنٹری ہاؤس کی خاطر نہیں۔ چچا چارلس کسی زمیندار کے بیٹے کے آگے کچھ دیکھ ہی نہیں سکتے۔ جس نے قانون پڑھ رکھا ہو اور پیرس میں رہ رہی دولی میں اپنے کام میں جم گیا ہو۔ کیتھرین بڑی پیاری لڑکی ہے۔ اس کا بہت سارے بچوں کی ماں اور ایک اچھے کیتھولک شوہر کی بیوی بننے کا خواب ہے۔ وہ جدید زندگی کا سامنا نہیں کر سکی۔ وہ پہلے ہی زندگی سے خوف زدہ ہے۔ اور تانت زوبی اسے اس کا کھویا ہوا اعتماد واپس نہیں دلا سکتی۔ اسے ایک مرد کی ضرورت ہے۔ ایک حلیم، نیک دل نیک روح شخص!

میں سمجھ گیا "لیکن" میں نے ہنس کر کہا " صرف بدی ہی خدا کو ثابت کر سکتی ہے۔ نیکی

خدا کا اثبات نہیں دے سکتی ۔"

"تو تم ہی پیش آگاہی تھے" اس نے اضافہ کیا "ال یوشا نے ممکن ہے میڈلین کو حاصل کر ہی لیا ہوتا ۔"

سردیوں کے دکھوں کے بیش ردوں میں سے ایک دکھ وہ ہلکا سا زکام تھا جس کے باعث کچھ دنوں کے لیے میرے لیے بستر میں آرام کرنا ضروری ہو گیا ۔ میں اپنے تھیسس پر محنت کرتا رہا اور جونہی میں ٹھیک ہوا تو مجھے اس بات سے خوشی ہوئی کہ اب میں باہر نکل کر آزادی سے گھوم پھر سکتا تھا ۔ آسمان مجھے شفّاف اور تازہ دم اور اُمنگوں بھرا لگ رہا تھا ۔ ٹیلی گراف کے تاروں پر ابابیل پہلے ہی بیٹھے ہوئے تھے ۔ ہوا ساکت تھی ۔ نیچے وادی میں مسٹر شے واش کا گدھا اپنی کٹی ہوئی دُم سے مکھیاں اُڑا رہا تھا ۔ لگتا تھا وہ میرے خیالات سے واقف تھا کیونکہ اس نے میری طرف دیکھا اور پھر سر جھکا کر چارہ کھانا جاری رکھا ۔ خاموشی میں کیا گیا ایک اشارہ سچائی کی یاد دلاتا ہے ۔

میں ایک نوجوان دل کی سی اُمنگ کے ساتھ پہاڑی سے نیچے اُتر کر آیا ۔ اگلی صبح میں نے میڈلین کو الوداع کیا اور سادھو تری سے ملنے کے لیے کوے سیانت جیک کی جانب روانہ ہو گیا ۔ یہ سفر نینی تال جانے کے سفر کی طرح تھا ۔ ہواؤں میں تازگی تھی اور دور پڑی برف کو آپ محسوس کر سکتے تھے ۔ میں ہمالیہ سے ملنے جا رہا تھا ۔ گنگا ہر جگہ بہتی ہے ۔

دادی لکشما ہمیں ایک بڑی پیاری کہانی سنایا کرتی تھیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے جب دھرم پوری پر دھرم راج حکمران تھا اس کا سولہ برس کا بیٹا تھا ستیہ کام۔ اس کی سوتیلی ماں اپنے بیٹے لوک متر کو گدی پر بٹھانا چاہتی تھی۔ اس لیے ستیہ کام کو ملک بدر کر دیا گیا۔ دھرم راج کمزور آدمی تھا۔ وزیر ایک روز ستیہ کام کو دور لے گیا اور سرحد کے جنگل کو جانے والے راستے کے شروع میں چھوڑ دیا۔ ستیہ کام کے دست بازو خوب پرکشش تھے (ایسا لگتا تھا چاندی کرنوں کو پگھلا کر انہیں ٹھوس چاندی کا روپ دیا گیا تھا اور اس سے شہزادے کے ہاتھ پاؤں بنائے گئے تھے۔ دادی اماں کہا کرتی تھیں۔) ستیہ کام اب لاچار و بے یار و مددگار راہ پر چلتا جاتا تھا۔ کبھی وہ کسی تتلی سے صلاح لیتا کبھی کسی آوارہ ہاتھی سے مشورہ کرتا۔ اسے کہنے کے لیے کسی کے پاس کچھ نہیں تھا۔ سوائے ہمدردی کے طور پر آنسو بہانے کے۔ اس سے پتہ چلتا ہے ہاتھی کی نظر کمزور کیوں ہے اور تتلی کے پروں پر دو فالتو آنکھیں کیوں ہیں اور ہواؤں کے ذریعے کھوکھلے کئے ہوئے پیڑ ایسی آہ وزاری کیوں کرتے ہیں کہ پورا جنگل سن سکتا ہے۔ جنگل کے راستے پر اتنی ساری نیکی کا گزر کبھی نہیں ہوا تھا کہ ایک گیدڑ فوراً دوڑ کر ایک خرگوش کے پاس پہنچ گیا۔ یہ خوش خبری سنانے کے لیے کہ ایک شہزادہ ان کے درمیان گھوم رہا ہے۔ اور اس کے سر کے اوپر سچائی یعنی حق کا نورانی ہالہ روشن ہے۔

پھر اچانک سارے جنگل میں خاموشی چھا گئی اور اس چھوٹی پگڈنڈی پر ستیہ کام کے سامنے 'بدروے کیا' آ گئی جو ندی کنارے کے پتھر کی طرح گول، پھولوں کی ڈلیا کی طرح بڑی اور ہرن جیسی سفید۔ کالی دھاریوں والی تھی۔ اگر چہ وہاں نہ ہوا تھی نہ آواز پھر بھی یہ چھوٹا سا پھل بیل سے ٹوٹ کر گر پڑا اور شہزادے کے سامنے لڑھکنے لگا شہزادے کی آنکھیں آنسوؤں سے اس قدر ڈبڈبا گئیں کہ وہ اسے دیکھ بھی نہیں سکا۔ لیکن کچھ ہی دور پربت کی گپھا سے شیر کی دھاڑ سنائی دی اور خوف کے اس لمحے میں اس نے اپنی

آنکھوں سے اس لڑھکتے ہوئے پھل کو دیکھا۔ اس کی چال کی کشش میں کھویا ہوا وہ اس کے تعاقب میں چلتا گیا۔ چلتا گیا۔ یہاں تک کہ دن ڈھل کر دوپہر کی گرمی میں تبدیل ہو گیا۔ دوپہر نے بڑ کی شاخوں اور جڑوں میں پناہ لے لی۔ کہیں کوئی پرندہ، گلہری یا شہد کی مکھی۔ ہل جل رہے تھے۔ اپنے آپ میں کھویا ہوا وہ بُدھُوے کیا کے پیچھے چلتا رہا۔ یہاں تک شام ہو گئی۔ شام کی خنکی میں جب پرندے پانی کے لیے جاگے اور جانور اپنے بچوں کو چرنے کے لیے اور کھانے پینے کے لیے لے گئے تو رات ہوتے ہی گول گول سا پھل ایک بھاری بھرکم عمارت جیسی چٹان سے ٹکرا گیا اور پھٹ کر پاش پاش ہو گیا اور اس بُدھُوے کیا میں سے ایک نوجوان، مبارک شہزادی نمودار ہوئی جس کا حسن آنکھوں کو چُندھیانے والا تھا اور رات کو روشن کر سکتا تھا۔ عالمِ تحیّر میں شہزادے کے منہ سے بے ساختہ نکلا ''واہ'' لیکن بیشتر اس کے کہ شہزادے کو یہ پتہ چلتا کہ وہ کھڑا ہے تو بھاری بھرکم چٹان کچھ اس طرح اُبھری جیسے اندر سے اُبھر رہی ہو۔ جیسے کسی نے الماری کا دروازہ دھکیل کر کھول دیا ہو۔ اور ایک سنہرہ زینہ نمودار ہوا۔ ملازم خواجہ سرا اور خادمائیں نظر آئیں۔ نیچے اس دنیا میں ہال، بیٹھک خانے اور سونے کے بنے ہوئے کمرے تھے۔ ہر جگہ آئینے جگمگا رہے تھے اور چھ گوری چِٹی شہزادیاں شہزادے کو نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے لیے مل کر آگے بڑھیں۔ اور جب وہ جھک کر نمسکار کرنے کے بعد ایک طرف کھڑی ہو گئیں تو بُدھُوے کیا جو شہزادی کا روپ دھارن کر چکی تھی، سامنے کے ایک دروازے سے ہاتھوں میں پھولوں کی مالا لیے اندر آئی۔ وہ اس کے سامنے دوزانو ہو گئی اور بولی ''میں سات بہنوں میں سب سے بڑی ہوں۔ میں ادنتی کی وہ شہزادی ہوں جسے اس کے ظالم باپ نے ملک بدر کر دیا تھا'' پھر شہزادے اور شہزادی کی شادی ہو گئی۔ لیکن محل میں ایک دشمن بھی تھا۔ محل کے کاموں کی نگرانی کرنے والا موٹا، بوڑھا، بندر حاجب۔ وہ دودھ کے کڑاہے کے پاس بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ ساتوں بہنوں نے مل کر اسے اٹھایا اور اسے کڑاہے میں گرا دیا۔ اب ملازم، ملازمائیں سب خوش تھے۔ کیونکہ وہ بڑا ظالم تھا۔

''اس طرح وہ بیس برس تک رہے۔ اس بیچ دنیا بڑی ہو گئی اور بہت پھیل گئی۔

بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے بڑے وسیع علاقے کی ضرورت تھی۔ جنگل کے بیچوں بیچ ایک بہت بڑی راجدھانی کھڑی ہو گئی۔ اس میں سڑکیں، پارک اور دیوار و در سے لٹکتے ہوئے پھولوں کے ہار تھے۔ موسم گرما کے لیے تالاب تھے اور ساون کے لیے پناہ گاہیں تھیں۔ شام کو سڑکوں پر جنگلوں سے لائے گئے چندن ملے پانی کا چھڑکاؤ کیا جاتا تھا۔ یوں ڈنڈک وتی نام کی یہ راجدھانی وجود میں آئی۔ ستنیہ کام اور رما دیوی جب اپنی اس چھوٹی سی ریاست پر حکومت کر رہے تھے تو انھوں نے کسی دوسری ریاست کے ہاتھیوں، اونٹوں اور گھوڑوں کو راجدھانی میں داخل ہوتے دیکھا۔ یہ ایک بوڑھا راجہ تھا جو تیرتھ یاترا کے لیے بنارس جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی چار رانیاں تھیں۔ ان کا مناسب طریقے سے محل میں سواگت کیا گیا۔ اگرچہ ستنیہ کام مہمانوں کو دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔ پٹ رانی رما دیوی انھیں نہیں پہچان سکی۔ مہمانوں کی شاندار دعوت کی گئی۔ اور جب ستنیہ کام نے اپنے مہمانوں کو گنگا جل پیش کرنا شروع کیا تو پٹ رانی کی چھاتیوں سے دودھ اس طرح چھلک پڑا کہ دنیا حیران رہ گئی۔ ستنیہ کام اپنی ماں کے قدموں پر گر پڑا اور انہیں سات شہزادیوں کی داستان سنائی۔ بوڑھے راجا اور اس کی تین رانیوں نے آنکھوں میں آنسو بھر کر (کیونکہ چوتھی رانی بڑی تھی نوجوان تھی اور لالچی تھی) اطاعت اور خوبصورتی کے لیے شہزادے کی تعریف کی۔ انھوں نے بتایا کہ اس کے چلے جانے کے بعد ریاست میں قحط اور افلاس کی حکمرانی چھا گئی تھی اور کفار کرنے کے لیے وہ بنارس کی یاترا کو نکل پڑے تھے۔ ممکن ہے گنگا ان کو پوتر نا لوٹا دے۔ اس دوران میں بوڑھے راجہ کے حاجب نے اپنے گھوڑے راجدھانی کی طرف دوڑا دیئے۔

دھرم پوری کے نواسی قم قم، جل اور چاندی کے دھوپ دان لیے اپنے آنگنوں کو چاول کے آٹے کی الپناؤں سے سجا کر اور دروازوں پہ آم کے پتوں کے بندن وار لٹکا کر نوجوان شہزادے کا انتظار کر رہے تھے۔ بوڑھا راجہ اور اس کی چاروں رانیاں مغرب میں واقع پوتر نگری بنارس کی جانب بڑھ رہے تھے۔

جونہی ہواؤں میں راجدھانی لوٹتے ہوئے شہزادے کی خوشبو آنے لگی تو پگڈنڈی کے دونوں طرف سنہری گھاس اُگ آئی۔ خارپشت ساہیوں نے شاہراہوں کے سارے کانٹے

صاف کر دیئے اور جوڑے اپنی ننگی زرد رنگ کی گردنیں اُٹھا کر راجدھانی کو جاتے ہوئے ہاتھی کے ہودے میں بیٹھے ہوئے شہزادے اور شہزادی کو دیکھنے لگے۔ ہوائیں نو راگنیوں کی نغمگی لہرا رہی تھی۔

ننھے بچّو، جب تمہیں نیند آنے لگے تم اسے سن سکتے ہو۔" دادی اماں نے کہا۔

پروانس کے شفاف، ٹھنڈے دن کی ہوا میں مَیں بخوبی یہ سنگیت سن سکتا تھا۔ مسترال نے ٹھیک اسی طرح آسمان سے سارے بادل ہٹا دیئے تھے جس طرح خارپشت ساہی نے جنگل کی شاہراہ سے تمام کانٹے ہٹا دیئے تھے۔

ساوتری سچ مچ شہزادی تھی، جنم سے۔ لیکن جس وجہ سے مجھے یہ کہانی یاد آئی وہ یہ تھی کہ جب میں جہاز کے زینے کے نیچے کھڑا تھا تو یہ کچھ گول مٹول شرمیلی سی شے بڑے باوقار الگ سے انداز میں پھرتی سے لڑھکتی ہوئی زینے سے نیچے اتری اور دوڑی۔ اس کا اکیلا بھائی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ مجھے لگ بھگ اسے پکڑنا پڑا تاکہ وہ گھاٹ پر پڑے کسی ٹرنک یا سامان کے ساتھ نہ ٹکرا جائے۔

وہ میرے ساتھ ایکس آنے اور وہاں کچھ دن گزارنے کے لیے فوراً بخوشی تیار ہوگئی۔ لیکن اس کے بھائی کو جلدی ہی لندن بھجوانا تھا۔ اسے فوراً ہی اسکول واپس جانا تھا۔ پہلے ہی دیر ہو چکی تھی۔ کال بیار میں ہم نے جلدی جلدی دوپہر کا کھانا کھایا اور عورت کے چہرے پر اتنی ساری ہنسی دیکھ کر مارسیلز میں رہنے والے لوگ بھی حیران رہ گئے۔ ساوتری واقعی بڑی معصوم، سچّی، کھری اور آزاد لگ رہی تھی۔ اس کے مقابلے میں اس کا بھائی شرمیلا تھا۔ اور عالمانہ تیور لیے ہوئے تھا۔ داخلہ تو اسے ای ٹن میں لینا تھا کہ جنگ نے اسے ایک اینگلو انڈین اسکول میں بھیج دیا تھا۔ اس ماحول سے اسے دکھ پہنچا تھا اور سرکاری افسروں کے بیٹوں اور بینکروں کی مکروہ فربہ نسل کے عامیانہ پن سے فرار حاصل کرنے کے لیے وہ انگریزی شاعری پڑھنے لگا تھا۔ اور کھیتوں میں گھومتے ہوئے وہ اپنے آپ کو شیلے، ورڈزورتھ یا جیرالڈ مین لے ہاپ کنز کی نظمیں سناتا رہا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ پروفیسر بنے گا اور شاعری پڑھائے گا۔

اس نے اسکول میں فرانسیسی پڑھی تھی۔ فرانس کے بارے میں وہ جو کچھ جانتا تھا وہ
وہ فرانس کی شاعری تھی۔ اس کو وکٹر ہیوگو اور ویرلین سب سے زیادہ پسند تھے۔ گے رارڈ
نروال اسے بڑا پیچیدہ اور مبہم لگتا تھا۔ بادلیر اس کے قول کے مطابق اس کی سمجھ سے
باہر تھا۔ اسی طرح پال ویلیری بھی۔ میں نے آنند کو۔ یہی اس کا نام تھا۔ بتایا کہ ویلیری کا گھر
یہاں سے دور نہیں ہے اور جب تک کہ میں جان سکتا کہ میں کہاں ہوں میں نے ساوتری کو
اپنے نرم، بے تکلف لہجے میں نظم خوانی کرتے ہوئے سنا جیسے فرانسیسی بولنے میں میرا کی برج
جیسی ہی لگتی ہو۔

دوپہر نے جیسے اسے آگ لگا دی ہو
سمندر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نیا ہو گیا

آنند نے ہی اسے یہ دو مصرعے سکھائے تھے کیونکہ ان مصرعوں کے بعد کچھ ایسے لگا کہ
اس کا جوش ختم ہو گیا۔ آنند کچھ اور شعر سناتا رہا۔ میں صاف طور پر دیکھ سکتا تھا کہ وہ
یہ شعر اپنا علم دکھانے کے لیے نہیں پڑھ رہا تھا بلکہ یہ جاننے کے لیے کہ کہیں میرے نزدیک
اس کا تلفظ غیر مناسب تو نہیں تھا۔ نہیں! اس کا تلفظ اس کی بہن کے تلفظ کے مقابلے میں
کہیں بہتر تھا۔ وہ جو کچھ بھی کام کرتا تھا خوب اچھی طرح کرتا تھا۔

ساوتری کے لیے زندگی ایک کھیل تھی۔ ایک گیت وہ گلیوں میں میری بہنوں کی طرح
گھومتی تھی۔ اس کی بینائی کچھ کمزور تھی ؛ وہ ہوا میں چار گیند اچھالتی تھی اور پھر
پیروں کی تھاپ اور پُراسرار لَے تال کے ساتھ انہیں چلنے دیتی۔ وہ جلدی جلدی بولتی
تھی۔ اس کی ادھر اُدھر کی دلچسپ باتوں میں اس کی بڑی بڑی آنکھوں کی طرح افسردگی
کا خلا تھا۔ آپ لگ بھگ سانس لے سکتے تھے اور جان سکتے تھے کہ یہ کسی ایک واقعہ یا
خیال سے نہیں پیدا ہوا تھا بلکہ کسی پچھلے کرم کا، عمل کا نتیجہ تھا۔ کسی دوسرے عہد کا
دکھ تھا۔ بعض لمحوں میں یوں محسوس ہوتا تھا کہ چونکہ وہ اتنا سارا دکھ سہہ رہی تھی اس لیے
وہ اس دکھ پر پردہ ڈالنے کے لیے گاتی تھی اور سگریٹ پینے کا یا خود شعوری انداز میں بیٹھنے
کا ناٹک اس انداز سے کرتی جیسے کسی ایسی بیماری کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہو جس کو کوئی

نام نہ دیا جا سکتا ہو اور جسے دوسرے تو دیکھ اور سونگھ سکتے ہوں لیکن وہ نہ سمجھ سکتی ہو۔ میں جلد ہی سمجھ گیا کہ اس کا ہلکی پھلکی چیزوں کا ذخیرہ جس میں لاترے وی اتا یا کارمن کی کوئی دھن، یا کسی نیگرو روح نامے یا بلند آہنگ جاز کا ٹکڑا ! : آسمان نیلا ہے اور میں تم سے محبت کرتا ہوں، شامل تھے۔ انتہائی وسیع اور بھرپور تھا جتنا میرا کی روایت کے بارے میں اس کا گہرا علم !

ہم نے جلد ہی سے آنند کو اس کی گاڑی تک پہنچایا اور اس کے کمپارٹمنٹ کے نکلنے تک وہیں رہے۔ ہم مشکل سے کار تک پہنچے ہی ہوں گے کہ ساوتری نے گانا شروع کر دیا۔ "میرے پیارے ! میرے محبوب !" آنند کو ساوتری کا کہا ہوا آخری جملہ مجھے یاد آیا "میں نے مارسیلز کے پوسٹروں میں 'لاترے وی اتا' کا اشتہار دیکھا ہے۔ جا کر اسے دیکھنا نہ بھولنا۔ ٹاٹا — !" جب گاڑی چلنے لگی تو اس نے یہ جملہ کہا تھا۔ ساوتری اپنے آپ گنگناتی رہی۔ "اے میری فاختہ ... اے میری دوست" وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ وہ کہاں ہے۔ لگتا ہے اسے کبھی یاد ہی نہیں آیا کہ وہ مارسیلز سینٹ چارلس میں ہے۔

گھر لوٹتے ہوئے، راستے میں اس نے کسی گیت پر پاؤں سے تال دینا شروع کر دیا اور مجھے لگا مجھے پتہ نہیں ہے کہ میں کیا کروں کیونکہ نہ تو میں اس ٹینو روسی کو جانتا تھا اور نہ ہی اسے جاننا چاہتا تھا۔ میں قصباتی برہمن تھا میسور کا جہاں ہر کوئی رام اور کرشن کے بیاہ کے گیت اور سنسکرت کے اشلوک سیکھتا ہے کسی جشن کے موقعے پر ہونے والے مقابلوں میں حصہ لینے کے لیے۔ میں اس پس منظر میں اس روایت کے ساتھ فرانس آیا تھا۔ جہاں میں میڈلین اور اس کے دوستوں کی ٹولی میں آملا جس میں لگ بھگ سبھی یا تو کیتھولک تھے یا سنجیدہ کمیونسٹ۔ لیکن، دی سکائی از بلیو اینڈ آئی لو یو، کی دنیا میرے لیے غیر متعلق تھی۔ میں شاید جاز ماسٹروں کی نسبت برنارڈ وینٹاڈو یا میری د فرانس اور اس کے یہ الفاظ بہتر جانتا تھا۔

"ہمارے اچھے دوست

تمہارے بغیر میرا یا میرے بغیر تمہارا

کوئی مفہوم نہیں ہے۔"

اس کے علاوہ زیتون کے پیڑوں کے درمیان جو میرے سامنے عہد بہ عہد گزرتے رہے اور جنھوں نے رومن مشیر، بشپ، مجاہد اور شہزادے اور شاید خود نیپولین۔ جب وہ اپنی شان و شوکت کے سودن سے قبل ایلبا سے لوٹ کر آیا تھا۔ ان سب لوگوں کو دیکھ رکھا تھا تو میں سوچتا رہا۔ حیران ہوتا رہا کہ کیا موں سیانت وک ہویار کی قدیم روایت، دانش اور عظمت اور وقار کے مقابلے میں ہارلیم کا غیر شائستہ گیت کہیں تقدّس کی کمی کا غمّاز تو نہیں تھا۔ ممکن ہے کہ کسی اصلی نیگرو کو جاز کی آواز کسی ماورائے بصارت شے کی پرستش کی طرح لگے لیکن ایک ہندوستانی کے نزدیک یہ دھرتی کی۔ زندگی سے بھرپور پہاڑیوں کی اور فرانس کی تعظیم میں کمی کے مترادف تھا۔ دادا کہا کرتے تھے کہ ہم دوسروں کو صرف وہی نذر کر سکتے ہیں جو ہمارا اپنا ہے چاہے وہ املی کا ایک بیج ہی کیوں نہ ہو۔ اگر ہم چاہتے ہیں تو ہم ہندوستانی فرانس کو میرا یا شنکر کی عظمت تو دیں، لیکن اس کی صدیوں کی شاندار روایت کو، اس کے دریاؤں کی فراخدلی کو، اس کے شاعروں کی پاکیزگی کو بے کار کی ٹائیں ٹائیں تو نہ دیں۔ جو بھی فرانس کی دھرتی پر قدم رکھتا ہے کیا وہ جانتا ہے کہ وہ اس دھرتی پر آیا ہے جس پر سینٹ لوئی چلتا تھا، جہاں ہنری چہارم گھوڑے پر سوار ہو کر نکلا کرتا تھا اور جہاں وہ جا رہا ہے وہاں پر زور مسترال (طوفانی تخ بستہ ہوائیں) چلا کرتی تھیں۔ یا وہ اس موں سیانت وک ہویار کو دیکھ رہا ہے جسے سزانے نے بینگنی، روپہلے، سبز اور مٹمیلے سرخ رنگوں کے جادو سے شہرت عطا کر دی تھی۔ یا یہ کہ فرانس کی ملکہ اپنے ماباپ کا خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے پیگی پیرس سے چارٹرس تک ۸۸ کلومیٹر پیدل چل کر آیا تھا۔

صبح کے تارے کی طرح ملکہ معظمہ بھی بہت دور ہے
ہم تمہارے شہرت یافتہ دربار کی جانب قدم بڑھا رہے ہیں
یہ ہمارے معمولی سے پیار کا مرتفع ہموار میدان ہے
اور ہماری لامحدود سزا کا سمندر

بھلے ہی میں یہ الفاظ اپنے آپ سے کہتا تھا ساوتری نے بہرحال اس بات کو محسوس کیا ہوگا۔ کیونکہ اس کا جاذ کمزور ہوتے ہوتے ایک بڑے پیارے سے گیت میں ڈھل گیا اور پھر ایک فوری خاموشی میں ہوں سیانت وک ہو یار ہمارے ایک جانے مانے بزرگ کے اپنے پن کے ساتھ اُبھرا۔ یہ بزرگ باپ تو نہیں تھا لیکن چھوٹا چچا تھا ہم اس کے بچے تھے۔ جونہی کار مڑی اور تیزی سے پہاڑی پر چڑھنے لگی تو مجھے ولاں سیاں آں کی روشنیاں نظر آنے لگی۔ اور ساوتری کے کار سے باہر نکلنے تک میڈلین دوڑ کر زینے سے اُتر کر اس کا خیر مقدم کرنے کے لیے آچکی تھی۔

کئی مہینے بعد میڈلین نے مجھے بتایا کہ ساوتری ٹھیک ویسی ہی تھی جیسی ہندوستانی عورت کے بارے میں اس کا اپنا تصور تھا حلیم، سادہ اور انتہائی خاموش طبع۔

”ہمارے چھوٹے سے گھر میں آپ کا بار بار سواگت ہے“ بیل کے پاس کھڑے ہوئے میڈلین نے کہا ” اور بھی زیادہ سواگت، کیونکہ آپ عورت ہیں اور پھر ہندوستانی عورت۔ آیئے اندر تشریف لایئے۔“

جیسے ہی ہم نے سامان فرش پر رکھا۔ ساوتری نے کھڑکی کھولی اور باہر دیکھ کر بولی ” واہ کیسی خوبصورت ہے یہ جگہ رشو کا چاند تو دیکھو“ اور پھر اضافہ کرتے ہوئے کہنے لگی۔ ” یہ جگہ تو ٹھیک ویسے ہی ہے جیسے نینی تال ہے“ جونہی وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچی تو اس نے محسوس کیا اور ہم نے بھی کہ یہ تو محل تھا۔ ہم چیزوں کو بناتے ہیں۔ چیزیں ہمیں نہیں بناتی ہیں۔ نہ تو میڈلین اسے محل بنا سکتی تھی اور نہ اسے ایک گھر۔ میڈلین کے لیے یہ ایک ولا تھا اور میں ہمیشہ محسوس کرتا تھا میں میڈلین کا مہمان ہوں۔ ولا سیاں آں کو میرے لیے ایک جائے محفوظ ایک پناہ گاہ کی طرح ہونا چاہیے تھا۔ اور ایسی تمام جگہوں کی طرح اس صورت میں یہ جگہ دیوتاؤں اور میرے اجداد کی ملکیت ہوتی۔ برہمن کی نوعیت کبھی عصری نہیں ہوتی وہ وقت کے سفر میں آگے اور پیچھے چلتا رہتا ہے۔ اسی طرح ایک رشی کو نسلی تسلسل کا بیڑہ شروع کرنا ہوتا ہے اور پھر گرد کو جنم مرن کا چکر ختم کرنا پڑتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں میں کہاں مکان۔ گھر بنانے والا تھا؟ کس ندی، تال یا مندر کے

گلیارے کے پاس ؟۔

پروانس کا باغیچہ کسی چینی داستانی دھرتی کی طرح ہے۔ جس میں سب کچھ موجود ہو: پادری، چرچ کے شہزادے، نسوار کی ڈبیاں، داشتائیں اور شاتونیاف دو پاپ۔ ناجائز خزانے کا محافظ ترسکان کا عفریت۔ قیدیوں کے لیے موں ماجر کی کال کوٹھریاں، کوئی پری رانی جس کا دل تلوار یا نظر سے نہیں بلکہ کسی ایسی لطیف تہ دار نظم کی مدد سے جیتا جاسکتا ہے جس کو سمجھنے کے لیے اسے اس کا تجزیہ کرنا پڑے اور پھر شفاف آئینوں کے پانی میں اس پر معنی و مفہوم ظاہر ہو جائیں۔ لیکن چینی ملکہ جہاں جوان، بھرپور اور رس وتی ہوگی اس کے مقابلے میں پروانس کی رانی دبلی پتلی گھمنڈی اور کنواری ہوگی۔ سواری کے لیے ایک گدھا ہوگا۔ جس پر بیٹھ کر مے خانے میں جاکر کسی کی زبان سے سننے کو پرندوں کی کی دانشمندی کی یا بحری سفر میں مدد کرنے والے رہنما ستاروں کی باتیں ہوں گی۔ اور جب چاند چمکے گا۔ جیسا کہ سچ اس میں ہوتا ہے تو کیا سارا ملک ایسا نہیں لگے گا جیسے وانگ چو یا چانگ لی نے موسل اور شراب کے ساتھ دھان کوٹتے ہوئے (حالانکہ پروانس میں اس کی بجائے شراب کشید کرتے ہوئے ہوگا) اپنے رہنے کے لیے ایک سلطنت کا نغمہ گایا ہوگا۔

وانگ چو چانگ لی سے کہتا ہے۔ "جیسا کہ نویں اژدہے کی رات کو ہوتا ہے۔ چاند اپنی روشنی سے وادی کو معمور کردے گا اور چار وادیوں کی چار تتلیوں سے بنائے گئے سیال کو پی کر ہم چاند کی کرنوں پر سوار ہو کر چانگ ٹو کے قلعے تک پہنچ سکتے ہیں۔ وہاں بانس کی شراب اور بھنگ کی شراب سے شہزادی ہمارا سواگت کرے گی۔ لڑکیاں ناچتی ہوئی ہمارے اردگرد آجائیں گی۔ ہمارا وقت خوب موج مستی میں گزرے گا کیوں چانگ"

اسی وقت جیسا کہ مول دو پاپ کی کہانی میں ہوتا ہے۔ شہزادے کا کوئی گھمنڈی ملازم گدھے کو قلعے کی چوٹی۔ عین چوٹی تک لے جاتا ہے۔ اور جب گدھا دھوبی کے تالاب جیسی چوڑی ندی کو دیکھ لیتا ہے تو اسے چڑھتے ہوئے رتھ، مصروف بیوپاری، اور سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ تلوار، چھوٹی ڈھال اور نرم ملائم دھوپ دیکھتا ہے۔ بائیں

جانب ان خواتین کو دیکھتا ہے جو ڈیوک کو نذرانۂ عقیدت پیش کر رہی ہیں اور دائیں جانب ان عورتوں کو جو پہلے سادھو یا ماندرین کا ہاتھ اس وقت تک چومتی رہتی ہیں جب تک دُو پربت سے تین راج ہنس اُڑ کر آ نہیں جاتے۔ نیلگوں ہوائیں چلنے لگتی ہیں اور قلعے اور چاند کو اپنے ساتھ اُڑا کر لے جاتی ہیں۔ تب وانگ چو چانگ لی سے کہے گا "ہم نے بڑا شاندار سفر کیا۔ ہے نا! اور چاند کی کرنوں کی سواری کیسی بڑھیا تھی" اور وانگ موسل کو دیوار کے ساتھ ٹکاتے ہوئے کہے گا "چانگ کیا ہم تمہاری اور میری چار ہتھیلیوں جتنا بڑا مکڑی کا جالا نہیں بنا سکتے اور سلطنت کو اپنے کمر بند میں نہیں سمیٹ سکتے؟" چانگ کافی دیر تک سوچنے کے بعد کہتا ہے "شاید۔ شاید۔ لیکن فی الحال نسوار کی ایک چٹکی تو لو" اور جونہی وہ یہ کہتا ہے۔ مندر کے ایک مینار سے دوسرے مینار تک سویرے کی گھنٹیاں بج اٹھتی ہیں اور چانگ اور وانگ اپنے موسل کی بغل میں سوئے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ گھر کا کارندہ ان کے پہلو میں ٹھوکر مار کر کہتا ہے "اے اٹھو ہم پانچ 'پان لیانگ' مفت میں نہیں دیتے۔ کیا تم سمجھتے ہو' پان لیانگ' گھاس کے ڈنٹھلوں پر لگتے ہیں۔ ان کی آنکھ کھل جاتی ہے اور وہ دیکھتے ہیں کہ دن کا اُجالا پھیل گیا ہے۔

جو بھی ہو' بہر حال ہمارے لیے دن کا اُجالا ابھی پھیلا نہیں تھا۔ کیونکہ ہمارے اوپر پورا گول چاند چمک رہا تھا۔ کبھی سرو کے کالے پیڑوں کے سائے کے ساتھ۔ کبھی سادہ پیڑوں پر سیمگوں چاندنی کے ساتھ۔ کبھی کسی متروک رومن قصبے یا قلعے کے تالابوں اور کھنڈرات کے ساتھ' کبھی انگور کی بیلوں کے ساتھ اور کبھی ریل کی دُور جاتی لمبی پٹڑی کے ساتھ۔ پوری رات کے اندر کچھ ایسی گنگناہٹ اور تھرتھراہٹ کی کیفیت تھی کہ محسوس ہوتا تھا دنیا جگنوؤں کی بنائی ہوئی ہے۔ پریوں کی کوئی کہانی سچی ثابت ہو گئی تھی۔ واقعی کسی شہزادی نے اپنی ٹوپی سے ایک دُنیا بُن ڈالی تھی اور اپنا دل بہلانے کے لیے اسے پھیلا دیا تھا جیسے وہ بانسری کی دُھن میں اپنا مکھڑا دیکھ رہی ہو اور یروشلم کے کسی سردار کی آمد کی منتظر ہو۔

میں جانتا تھا کہ میں اول جلول بک رہا تھا۔ میں اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتا تھا۔

سا دتری ایسی مٹی کی بنی ہوئی تھی کہ اس کے لیے حقیقت کو بھی ٹھوس بنانے کے لیے فریب کا جامہ پہنانا پڑتا تھا۔ سچ کو بھی ایک پہیلی، ایک معمّہ، دانش کی ریاضی کا انکشاف پہنانا پڑتا تھا اس کے نزدیک ظاہر تھا ہر شے ایک اشارہ تھی ایک علامت تھی، وقت کو موقوف کر دیا گیا تھا، اب ندی بخوبی رات بھر بہہ سکتی تھی۔ پیڑ اونچا اٹھ سکتا تھا، پربت اپنے طور پر حرکت کر سکتے تھے۔ الفاظ اس طرح بولے جا سکتے تھے جیسے پیچھے چھوٹ گئے ہوں۔ خود جسم وہ صندوقچی ہو جس میں آپ اپنے آپ کو دیکھ سکتے ہوں۔ صرف دست و بازو یا شکل کے روپ میں نہیں۔ بلکہ ایسی روشنی کے طور پر جسے خنکی عطا کر کے وسعتوں میں ڈھال دیا گیا ہو۔ ایک تحفہ، ایک چیز، ایک سچائی، اپنے علاوہ اس کے لیے ہر شے ایک راز تھی۔ اس لیے سب کچھ ایک داستان تھا اور ہر واقعہ ایک معجزہ! ہر آدمی۔ اپنے گھوڑے پر بیٹھ کر آدھی رات کو گھر لوٹتا ہوا کسان۔ بازو پر بھوسہ اکٹھا کرنے والی کریدنی لیے رکی ہوئی لاری کا وہ ڈرائیور جس سے میں نے گاؤں کے ایک راستے کے بارے میں پوچھا تھا! اس گاڑی کی گاتی چہچہاتی لال بتّی، اس کے لیے سب کچھ کسی محل سے دیکھی ہوئی دھرتی کی طرح تھا جسے کسی پراسرار باپ نے کوئی نام دے دیا تھا لیکن آپ کو اس کے آس پاس جانے کی ہرگز اجازت نہیں دے رہا تھا۔ دنیا محل کے دروازے کے بھکاری کی طرح تھی اور ہر چیز پرکشش تھی۔ اور میں اس کا باپ بھی تھا، داستان گو بھی اور اسکول ماسٹر بھی۔ خوب کام تھا میرا۔ میں مسحور ہو گیا۔

میری سرشاری اور بھی گہری ہو گئی کیونکہ ایسی کوئی شے نہیں تھی جو سادتری کی سمجھ سے باہر تھی۔ اگر میں کہتا: "یہ گدھا گھاس ہے اور لاطینی میں اسے 'انین تھیرا' کہتے ہیں اور یہ باربری کا سرد ہے جسے ساراساں لائے تھے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں ملکہ تراں کے باپ کو رکھا گیا تھا کیونکہ وہ پاگل ہو گیا تھا اور یہ وہ جہنم ہے جسے دانتے نے بیان کیا ہے" (کیونکہ اب ہم باکس کے پٹھار پر آ گئے تھے) تو اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس کے لیے سب کچھ فوری انکشاف کی طرح تھا۔ اس کے چہرے پر تحیّر پھیل جاتا۔ اور شدید حیرانی کے عالم میں اس کے ہونٹ وا ہو جاتے۔ گھاس کو واقعی انین تھیرا ہی کہنا چاہیے اور باکس کا راجہ بالتھزا کے خاندان سے

تھا اور عالم و فاضل بالتھزا د ہندوستان سے آیا تھا۔ جیسا روایت کہتی ہے اور دانتے نے بھی بیان کیا تھا۔

اور میں سچ مچ تھا اور اس کا بھی وجود تھا۔ کوئی بھی شے ایسی نہیں تھی اور ہر شے ایسی ہی تھی۔ اس کے نزدیک سب کچھ ایسے حقائق کی طرح تھا جن کو کسی ثبوت کی ضرورت نہیں تھی وہ خود اس بات کا ثبوت تھی کہ رات کا مطلب دن نہیں اور دن کا مطلب رات نہیں۔ یا پھر چونکہ فرانس یہ تھا تو ہندوستان 'یہ' نہیں تھا۔ وہ ایک لڑکی تھی۔ ایک عورت اور میں ایک مرد سب کچھ ایک کھلے راز کی طرح تھا۔ اظہار اثبات۔ اس لیے آگلی عود کا چٹان اور پھر وہ چاند جو دور کے سمندر پر روشن تھا۔ وہ خاموشیوں سے معمور ہو سکتی تھی۔ اس وقت ہوا تو اذن سے لبریز ہو جاتی۔ جیسے دنیا اس لیے حقیقی بتائی گئی تھی کیونکہ کوئی اسے کبھی دیکھ ہی نہیں سکا تھا۔ اسی وجہ سے ساوتری اکثر اپنی آنکھیں موند لیتی اور پھر جب وہ بولتی تو ایسا لگتا جیسے وہ مجھ سے کہہ رہی ہو میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ لیکن واقعتاً میں صرف ایک واحد ہی تھا جو سنتے ہوئے سنتا نہیں تھا، دیکھتے ہوئے دیکھتا نہیں تھا اور جانتے ہوئے جانتا نہیں تھا۔ بذات خود علم تھا، گیان تھا۔

میں اسے کیا نہیں سنا سکتا تھا؛ گھاس پر بیٹھے ہوئے اس نے اس سے دھیرے سے کہا۔
"شاید تم وہ سنسکرت اشلوک جانتے ہو جو اس موقعے کے لیے مناسب ہو" میں نے بھرتری ہری کے یہ خوبصورت مصرعے گا کر پیش کر دیے:

"مات میدنی تات ماروت سکھا جیوتی: سبندھو جل"
اے دھرتی ماں۔ پون پتا
اے اگنی متر، میرے عظیم، میرے اپنے جل!
میرے بھائی آکاش! میں تم سب سے
آخری بار الگ ہوتے ہوئے پرنام کرتا ہوں
تمہارے ساتھ طویل وابستگی کے طفیل
نیک کام سر انجام ہوئے

تمہارے ہی کرم سے مجھے
دانش منوّر و شفاف عطا ہوئی
ذہن کے خوبصورت مایا جال کو سلجھاتے ہوئے
اب میں پرم برہم میں ضم ہوتا ہوں۔

ہم چاندنی میں ٹہلتے رہے۔ لے باکس پر واقع گاؤں میں کتّے بھونک رہے تھے۔ کوئی کار اس طرح خوفناک شور مچا رہی تھی جیسے اس کے نیچے سے سڑک کھسکتی جا رہی تھی۔ ہمارے سروں کے اوپر فضا میں رات کے بھیڑیوں کی پُراسرار سایوں بھری پھڑپھڑاہٹ آویزاں تھی۔ میں سوچتا تھا کہ کیا کبھی انسان اس دھرتی کا مالک بر ہے۔ کیا اسی لمحے میں دنیا میرے اندر قدم قدم نہیں چل رہی تھی اور کیا میں اپنے میں نہیں چل رہا تھا۔ ساوتری یہ احساس دلاتی تھی کہ چاہے تم کچھ بھی کرو تم صرف ہو ہی سکتے ہو اور کیونکہ تم صرف 'ہو' ہی سکتے ہو اس لیے تمہارے ساتھ کچھ بھی وقوع پذیر نہیں ہو سکتا۔ نیکی اس کے نزدیک ایک اصول نہیں تھا بلکہ نظم وضبط تھا تھا۔ یہ اس بات کو قبول کرنا تھا کہ کیا اس نے پرتاپ کے ساتھ بیاہ کیا تھا یا لندن میں رہنے والے اس 'مسلمان کو پسند کیا تھا۔ وہ غیر واضح انداز میں دونوں کا ذکر کرتی تھی۔ وہ دونوں ایک ایسے تجربے کی مثال کے طور پر تھے جو اپنے آپ کے ساتھ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اس کے لیے سچ آنے والا کل یا گزرا ہوا کل نہیں تھا۔ سچ وہی تھا جہاں کوئی شخص تھا کیونکہ کوئی کہیں بھی یا 'کبھی بھی' نہیں ہے بلکہ 'سب' ہے کیونکہ 'ایک' نہیں ہے۔

میں نے ایسے وجود کا احساس کبھی نہیں کیا تھا۔ سروجا کی شخصیت میں بھی نہیں۔ جو اپنے آپ کو زندگی بطور تحفہ نذر کرے اور اس طور پر فطری تقدس رکھتا ہو کہ تمھیں تمہارا عامیانہ پن اس طرح دکھا دے جیسے ایکس۔رے سے ہڈیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ میڈلین نے مجھے اسی صبح کہا تھا لے باکس کے لیے چلنے سے تھوڑی دیر پہلے۔" رام وہ حقیقی نہیں ہے وہ ایک فینتسی کی، ایک خواب کی دنیا میں رہتی ہے۔ کوئی یہ تصوّر بھی نہیں کر سکتا کہ وہ انگریزی بس کی چھت پر ہے پھر بھی اوروں کی طرح چلتی پھرتی ہے۔ بات چیت کرتی ہے اور ہنستی ہے وہ عجیب و غریب ہے۔ میں حیران ہو جاتی ہوں اسے دیکھ کر۔"

ہم جب کار کی طرف واپس آرہے تھے۔ ساوتری نے پوچھا "کیا تمہاری شادی ہوئے کافی عرصہ ہوگیا ہے۔" اس بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی کہ اس نے کیا پوچھا تھا اور میں نے جواباً کیا کہا تھا۔ جو بھی ہوا اکیلا چاند بہرحال چمکتا رہا در اصل صرف سچ ہی روشنی عطا کرتا ہے

"کوئی ساڑھے تین برس ہوئے۔" میں نے کہا۔

"میڈلین اتنی سچی ہے۔ لگتا ہے وہ جو کچھ محسوس کرتی ہے وہی کہتی ہے۔ ایسی انکساری کے ساتھ میں دل کی گہرائی سے متاثر ہوتی ہوں۔ مجھے بتاؤ کہ کیا ہمیشہ سچ بولنا ممکن ہے؟"

"نہیں" میں نے جواب دیا "کم سے کم میں ہمیشہ سچ نہیں بولتا۔ اس لیے نہیں کہ میں اکثر جھوٹ بولتا ہوں لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ سچ کا مسئلہ پس منظر کا مسئلہ ہے۔ ہم سب دنگل یا مذہبی جلوس دیکھنے والے، مردوں اور عورتوں اور بچوں کی طرح ہیں۔ لمبے قد والا باپ ایک پہلوان کو اپنے مدِ مقابل کو مارتے ہوئے یا ہیرے جواہرات سے سجی ہوئی دیوی کو دیکھتا ہے اور بیٹا پوچھتا ہے "پاپا تم ہنس کیوں رہے ہو۔ تم نے کیا دیکھا؟" باپ بیٹے کو کندھے پر بٹھا لیتا ہے اور اسے شمالی ہندوستان کے پہلوان کا نام بتاتا ہے یا اس دیوی کا نام بتاتا ہے جس کا سوامی مندر کے دوار پر اس کا انتظار کر رہا ہے۔ لیکن دونوں صورتوں میں اب بچہ چونکہ اپنے باپ کے مقابلے میں اونچی سطح پر ہے اس لیے مختلف انداز میں دیکھ رہا ہے۔ کوئی بھی شخص چونکہ آپ کی آنکھ کی سطح سے نہیں دیکھ سکتا اس لیے کوئی بھی شخص اصلی سچ نہیں بول سکتا۔ یہاں تک سائنس داں بھی نہیں۔"

"واقعی، سائنس داں بھی نہیں؟"

"نہیں۔ سائنس داں بھی نہیں۔ سائنس زیادہ سے زیادہ مساوات در مساوات ہے۔ دو علامتیں۔ جنھیں پہلے آپ قبول کرتے ہیں پھر پیمائش، ترتیب اور حرکت کے اعتبار سے ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ ٹھیک بیٹھتی ہیں یا نہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ یہ چاند تالاب میں جھانکے اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے اور یہ جانتے ہوئے کہ وہ چاند ہے کہے "میں چاند ہوں" ساری سائنس محض تکرارِ معنی ہے۔ کیا تم نے نُورا اور بھگوان کی وہ مشہور کہانی سنی ہے۔ میرے پتاجی مجھے یہ کہانی اکثر سنایا کرتے تھے۔ نُورا اور دردرو

دونوں کیتھرین دی گریٹ کے دربار سے وابستہ تھے۔ کسی نے دِدرو سے کہا "ایک آدمی آیا ہے۔ وہ جرمن ہے اور بڑا عظیم انسان ہے۔ وہ یہ ثابت کر سکتا ہے کہ خدا کا وجود ہے!" "خوب بہت خوب" دِدرو نے کہا۔ "پھر تو بڑا شاندار آدمی ہے وہ!" پس دِدرو کے سامنے خدا کا وجود ثابت کرنے کے لیے یُولر کو بلایا گیا۔ دربار میں سب لوگ جمع تھے۔ پاوڈر، وِگ، گارٹر، رومال کی خوب ریل پیل تھی۔ یُولر سیدھا دِدرو کے پاس گیا اور انگلی اُٹھا کر یوں گویا ہوا۔

"مسٹر۔ چونکہ $\frac{ا + ب}{ج}$ = د اس لیے خدا کا وجود ہے۔

ایک بلند قہقہے سے سارا دربار بھر گیا اور توہین زدہ دِدرو نے ملکہ سے فرانس سے چلے جانے کی اجازت کی التجا کی۔ ملکہ معظمہ کیتھرین نے خوشی سے رضامندی کا اظہار کیا اور دِدرو پیرس میں اپنے مین سرڈ میں لوٹ آیا اور اپنی لغات میں مصروف ہو گیا۔

"ہم سب ڈینس دِدرو ہیں کیونکہ "د" سے ہر شے واضح ہو جاتی ہے"

"بڑی عجیب کہانی ہے یہ" ساوتری نے کہا۔

"یہ نام نہاد 'ترقی' کی پوری تاریخ ہے۔ یہ کہنا کہ بجلی فلاں فلاں مساوات ہے صرف یہ ثابت کرتا ہے بجلی صرف بجلی ہے۔ یہ ٹھیک اسی طرح ہے جیسے میں کسی چیز کو دیکھتا ہوں یا پھر خدا مساوی ہے 'د' کے۔ جب بصارت فارم کی تشکیل کرنے لگتی ہے اور فارم بصارت کی تو مہارشی پوچھتا ہے: "ذرا بتاؤ تمہیں کیا دکھائی دے رہا ہے"

"تم کچھ نہیں دیکھتے یا دیکھتے ہو تو اپنے آپ کو دیکھتے ہو" ساوتری نے جواب دیا۔ میں اس کی اس کے اپنے ہی تجربے کی فوری پہچان پر ششدر رہ گیا۔

"تو پھر سچ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔ اب ہم فورٹ سارابن کے قریب پہنچ چکے تھے۔ یہ فورٹ لا ہاکس کے پٹھار کے کنارے پر تھا۔ اب سارا لا کا مارگ ہمارے نیچے تھا۔

"ہونا ہی سچ ہے" ساوتری نے جواب دیا۔

"اور ہونا کیا ہے؟"

"یہ سوال کون پوچھتا ہے"

"میں خود"

"کون ؟"

"میں"

"کس سے ؟"

"کسی سے بھی نہیں"

"تب 'میں ہوں' ہی ہے۔"

"بلکہ میں ہوں ہی 'ہوں'"

"تکرارِ معنی" وہ ہنسی۔

"ساوتری کہتی ہے۔ ساوتری، ساوتری ہے"

"اور تم کہتے ہو ساوتری کیا ہے ؟" اس نے گڑبڑا کر کہا۔

"میں"

ایسا لگا جیسے چاند اور خاموشی تسلیم کر رہے تھے کہ صرف 'میں' ہی پرنور تھا۔

"ساوتری کوئی نہیں ہے" کچھ دیر کے بعد میں نے بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں ہے۔ یہ میں جانتی ہوں"

"کچھ بھی نہیں ہے۔" میں نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں" وہ بولی "فرق صرف یہ ہے کہ دیکھنے کو دیکھنے میں ایک دیکھنے والا ایک صاحبِ بصیرت بھی ہوتا ہے۔"

"اور یہ دیکھنے والا صاحبِ بصیرت کیا دیکھتا ہے ؟"

"کچھ نہیں" اس نے جواب دیا۔

"جب 'میں' ہے اور جہاں 'کچھ نہیں' ہے تو 'کچھ نہیں' کیا ہے ؟ تو پھر 'میں' ہی تو ہے یہ۔"

"اس لیے جب میں چاندنی میں پیڑ دیکھتا ہوں۔ وہ سرو کا پیڑ، وہ چیڑھ کا پیڑ تو میں 'میں' کو دیکھتا ہوں۔ میں 'میں' کو دیکھتا ہوں۔ میں 'میں' کو دیکھتا ہوں"

"ہاں"

"بس یہی سچ ہے" اس نے کہا۔ ہم مڑے اور واپس گاؤں کو چل دیئے۔

وہ سارے راستے چپ رہی۔ رون پل پہ، موں مجار کے پاس، لوک یار، آرل، وودے نارس سے گزرتے ہوئے موں سیانت وک اویار کی دھیان میں ڈوبی چھوٹی پہاڑیوں تک۔ یا اگر وہ بولی بھی تو صرف 'سوری'، کہنے کے لیے ایک موڑ کاٹتے ہوئے جب اس کا پاؤں میرے پاؤں سے چھو گیا۔ تمام ہندوستانیوں کی طرح وہ لمس کے تئیں بڑی حساس تھی اور اس کا پاؤں یوں تیزی سے پیچھے ہٹ گیا جیسے اس نے کسی غیر حقیقی شے کو چھو لیا ہو۔

تب میں نے اسے بیل اور ہاتھی کے بارے میں بتایا اور میری کہانیوں سے وہ بڑی محظوظ ہوئی۔ "کیا میں تمہارے بیل کے لیے گھاس لے جا سکتی ہوں؟" اس نے پوچھا۔ اس وقت ہم سوئے ہوئے شہر میں داخل ہونے سے پہلے کباساں پہاڑی کے اوپر دیر سے کھڑے تھے۔ "بلاشبہ" میں نے کہا۔ اندھیرے میں اس نے تھوڑی سی گھاس توڑی اور کسی دیہاتی عورت کی طرح اسے ساری کے پلّو میں باندھ لیا۔ جب ہم پلاس دے لا ریپبلک پہنچے تو وہ بولی "یہاں ہر شے کس قدر بیدار ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی شے مردہ کیسے ہو سکتی ہے۔"

"یہاں ایکس میں لوگ کہتے ہیں کہ مردے کیتھیڈرل کی برجیوں میں رہتے ہیں۔ اور جب گھنٹے سو جاتے ہیں تو آپ ان کی گونج سن سکتے ہیں۔" اسے یاد آگیا کہ میری یادداشت فی الحال دھندلی نہیں ہوئی تھی۔

"مجھے افسوس ہے میں بار بار آپ کے پیروں کو ٹھوکر لگاتی رہتی ہوں۔" وہ کچھ ایسے گویا ہوئی جیسے اپنی ہی کسی بات کا جواب دے رہی ہو۔ "میرے پتاجی کہتے ہیں میں ضرور کبھی کوئی لنگڑا گھوڑا رہی ہوں گی۔ چپٹے سے چپٹے فرش پر بھی میں کسی نہ کسی چیز سے ٹکرا جاؤں گی۔ ایک بار جب ہم شکار کے لیے گئے تھے میں ہاتھی سے گر گئی تھی اور جونہی پتاجی کو پتہ چلا کہ میں ہاتھی کے نیچے آگئی ہوں تو وہ سسکیاں لینے لگے۔ لیکن میں پریوں کی کہانی کی بُدّو میکنے کی طرح جس کا تم نے ذکر کیا تھا۔ جنگلی جھاڑیوں سے ٹھیک ٹھاک باہر آگئی اور مجھے کچھ نہیں ہوا۔ اس طرح کے لوگ بھی ہیں۔ میں ہمیشہ گھوڑوں سے، زینوں سے، گاڑیوں سے گرتی ہوں۔ ایک بار میں الہ آباد

سے فیروز آباد جانے والی گاڑی سے گر پڑی تھی۔ پتاجی نے زنجیر کھینچ دی۔ خوش قسمتی سے یہ چھوٹی لائن کی گاڑی تھی اور پہاڑی پر چڑھ رہی تھی اور پھر ہم اسٹیشن سے زیادہ دُور نہیں تھے۔ اور میں ایک پر اعتماد بچّے کی طرح بے ٹنک ٹکیاں لیتی ہوئی گاڑی کے پیچھے دوڑی چلی آئی۔ تب سے جہاں بھی جاتی ہوں میرے ساتھ ہمیشہ ایک نوکر رہتا ہے جو مجھے کبھی آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے دیتا۔

"تو پھر گھر والوں نے تمہیں یورپ کیسے بھیج دیا؟"

"ہوا یہ ہے کہ انھوں نے جھوٹے تکبّر اور حفاظت میں سے جھوٹے تکبّر کو ترجیح دی۔ وہ چاہتے تھے کہ میں وہ سب امتحانات پاس کروں جو راجپوت فرقے میں سے کسی نے بھی آج تک نہیں کئے تھے تاکہ میرے پتاجی کہہ سکیں: "یہ رہی ساوتری جو آکسفورڈ یا لندن یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر آئی ہے۔ شہزادے چونکہ اپنے خطابات سے محروم ہو چکے ہیں انہیں بہرحال اب معاوضے میں کچھ اور چاہیے۔ لیکن مجھے لطف آتا ہے کہ میں یورپ میں ہوں۔ مجھے حرکت، مقصد کی وحدت اور آزادی کا احساس۔ یہ سب باتیں پسند ہیں"۔ اس نے کہا اور ہنس دی۔ لیکن اس قدر تساہل پسند کہ جب سو جاتی ہوں تو مجھے لال گرم سوئی چبھو کر ہی جگایا جا سکتا ہے۔ حیاتیاتی اعمال میں سے میرے لیے نیند اہم ترین حیثیت رکھتی ہے"۔

"مجھے افسوس ہے بہت دیر ہو گئی ہے"۔ میں نے کہا۔

"بیکار کی بات ہے۔ میرا مطلب ہے کہ میں جب سوتی ہوں تو فی الواقع سوتی ہوں۔ اس لیے صبح ۹ بجے سے پہلے میرے اٹھنے کی امید نہ کرنا۔ میں ایک بھینس کی طرح سوتی ہوں"۔

اب تک ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ چکے تھے "یہ رہا میرا بیل۔ بہرحال!" اور اس نے گھاس اس کے منہ پر رکھ دی جیسا کہ ہم آرتی کی رسم کے موقعے پر کرتے ہیں۔ میں اسے اس کے کمرے تک چھوڑنے گیا اور اس سے یہ کہا "خوب سوؤ۔ خوب سوؤ۔ ساوتری!" میں نے چاندی کے رنگوں میں نہائی رات پر آخری نگاہ ڈالی اور جب میں کمرے میں داخل ہوا تو میڈلین جاگ رہی تھی اور کھڑکی میں سے موسیو پوں چوں کے گھر کے پچھواڑے کو دیکھ رہی تھی۔

"کیسی خوبصورت رات ہے۔ رام!" وہ بولی۔ وہ مجھے کھڑکی تک لے گئی اور مجھے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ میں اپنے اندر اس کی موجودگی کی بھرپور مسرت محسوس کر سکتا تھا اور مجھے تنک ہوا کہ وہاں ایک دوسری، ایک اور موجودگی تھی اس رات کی طرح وجود کے تانے بانے میں پروان چڑھ رہی تھی۔ یہ تیسری موجودگی ہماری اپنی موجودگیوں سے زیادہ حقیقی تھی۔ زیادہ پائدار اور ایک سے دوسری تک دیگر موجودگیوں کے طفیل ظہور پذیر ہونے کے باعث مزید مستحکم اور پائیدار بن گئی تھی۔ زیتون کے ان پیڑوں کی طرح جس کسی دوسرے دور کے کسی رومن شہری نے بویا تھا اور حقیقت میں ڈھالا تھا اور جن کی موجودگی کو جس کا انھیں خود بھی علم نہیں نہیں تھا اس رات ممکن ہے محسوس کیا گیا ہو۔ یہ وہ صورتِ طفلِ نو تھی جس کی نہ تو آنکھ تھی اور نہ ہی پاؤں لیکن جس کے اندر کچھ ایسا اجتماعِ واقعات ظہور میں آیا تھا کہ دو انسانوں کو ایسے سچ کا ادراک ہو گیا جس کا اگرچہ ایک نقطۂ آغاز تھا۔ ایک درمیان تھا اور نقطۂ انجام لیکن جیسے میں کے کنارے ایک لمحے کے لیے تقدس عطا کر دیا گیا تھا۔ دریافت خود سے سرگوشی کی طرح ہے اور پیار کی رات مرہم کی طرح ایک ایسا تقدس ہے جسے ہم حدودِ وقت سے باہر رکھتے ہیں اس شعور کے ساتھ کہ تخلیق سچ ہے۔

جب میری نیند کھلی تو میں نے میڈلین کو روتے ہوئے سُنا جیسے اس کی بچّے دانی میں کچھ ایسی روشنی سما گئی تھی جسے اُٹھا کر چلنا مشکل تھا۔ میں نے پھر اسے بستر پہ لٹا دیا اور اس کے پہلو میں گھنٹوں لیٹا رہا۔ اس کی پیشانی کو چھوتا رہا اس کا پسینہ پونچھتا رہا جیسے اس کا دُکھ بنی نوع انسان کا پہلا اور واحد دُکھ تھا۔ کسی بے نام دکھ سے بڑھ کر کوئی دُکھ نہیں ہوتا اور دنیا کی ساری چمک دمک محض پیشین گوئی ہے۔ ایک شوہر کہ موت ہے اور اک انسان دوسرے کو کھو دیتا ہے اور تنی ہوئی چھاتی میں وہ درد اُٹھتا ہے جسے کوئی شوہر دُور نہیں کر سکتا۔ بھلے ہی وہ ہمارے اندر ہی کیوں نہ ہو۔ آخر کار اندر کون ہوتا ہے۔ کوئی بھی نہیں یہ انسان کا اپنا درد ہے جو اپنے آپ کے سامنے روتا ہے۔ عورت ہونے کا مطلب یہ دُکھ سہنا۔ مرد کے بندھن کو برداشت کرنا۔ غلّہ جمع کرنے کے کوٹھے کے دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی بارش آجائے گی۔ صرف رات کا وجود ہے اور خالی دن کی تھکن کا۔ میڈلین کا جسم نسائیت

کا مکمل عروج حاصل کر چکا تھا اور میں جھوٹ تھا۔

اگلی صبح جب میں اُتر کر نیچے آیا سادترسی پہلے سے ہی باغیچے میں موجود تھی۔ اس کی انگلیاں کبھی اِس گلاب کو چھو رہی تھیں کبھی اُس گلاب کو۔ اس کے نتھنے چیڑھ کے پیڑوں اور سمندر کی ہوا کو سونگھ رہے تھے۔ اس کی آنکھیں خود اپنے اندر جھانک رہی تھیں۔ جیسے کچھ بے اصول سی بات ہو گئی ہو۔ جیسے دھرتی کہیں اپنے مرکز سے پھسل کر ہٹ گئی ہو اور ایک نئے نقطۂ اعتدال کا آغاز ہو گیا ہو۔ یہ بھی نہیں تھا کہ قطبی برف پگھل گئی تھی یا ریچھ چیختے چلّاتے دنیا کے گرد دوڑنے لگے تھے نہ ہی گرمی کچھ ایسی بڑھ گئی تھی کہ شمالی قطب کی مادہ بالم پڈز' کو برف پر کھڑا ہونا اور سج سنور کر اعزاز یافتہ مسرت کے عالم میں اپنے 'مردوں' کے سامنے پیش کرنا مشکل ہو گیا۔ لیکن کہیں کچھ جانا پہچانا۔ کوئی ارضیاتی اساسی جوہر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔ اور خلا نے گہرائیوں میں سے اپنے آپ کو خالی کر دیا تھا۔ ایک نئے دور کا آغاز ہوا تھا۔ نئے پھول پودوں، پیڑوں کے ساتھ۔ ایسے بندروں کے ساتھ جو باتیں کرتے تھے۔ ایسے پرندوں کے ساتھ جو چلتے پھرتے تھے۔ ایسے مردوں کے ساتھ جو پہلے سے زیادہ بڑے قد کے تھے اور پہچان کے لمحے میں ہی ایک دوسرے کو سمجھ جاتے تھے۔ وقت دھوپ کی طرح دھرتی پر لیٹا ہوا تھا۔ اور جب پھول کھلتے تھے تو تزئین کاری یا ثمرداری کے لیے نہیں بلکہ شبنم کے ماورا آگہی میں اپنے آپ کو مجتمع کرنے کے لیے اور عورت کے لیے تاکہ وہ دھوپ کے روشن لمحوں میں اپنے آپ کو لمس آشنا کرتی رہے۔ عورتیں تعداد میں بہت نہیں تھیں۔ وہاں صرف ایک ہی عورت تھی۔ ایک ہی فارم، ایک ہی آواز، ایک ہی محبت۔ یہ ایک دوسرے کو کہنے کی بات نہیں تھی۔ نہ ہی لینے دینے کی۔ بلکہ یہ بات اپنے اندر اس طرح دیکھنے کی تھی جیسے بچّہ اپنی ناف کو دریافت کرتا ہے اور اس کو ایک بار پہچان لینے کے بعد بھی اس کے پاس اس کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ بچّے کے لیے ناف صرف ناف ہوتی ہے جسے وہ متواتر دیکھتا رہتا ہے۔

وقت کے ساتھ مصیبت یہ ہے کہ یہ اپنے اسطور خود تخلیق کر لیتا ہے اور سوچتا ہے کہ اس کے ہونے سے ہی ہم بھی ہوتے ہیں۔ جیسے ہم کار ریپلاک کر لیتے ہیں ویسے ہی ہم وقت میں اپنے خیالات

پارک کر لیتے ہیں اپنے کام پر جا سکتے ہیں۔ یہی جینا ہے۔ وقت کو بھولنے کا مطلب ہے پہچان کی حالت میں رہنا۔ اور یہ کس نے کہا کہ پیار پیدا کیا جا سکتا ہے۔ پیار کبھی پیدا نہیں ہوتا لیکن سب کچھ پیار ہی کا پیشگی احساس ہے۔ پیار سے آپ کی اچانک ملاقات ہوتی ہے جیسے سڑک کے کنارے کے پوست کے پودے سے آپ کار میں بیٹھے ہوئے اس کے پاس سے گزر جاتے ہیں اور کہہ اٹھتے ہیں "او کیسا پیارا پوست کا پھول ہے اور دھوپ میں کتنا سندر لگتا ہے۔" دراصل پوست کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔ یہ بھی نہیں کہ وہ پوست ہے۔ لیکن آپ کے ساتھ یہ وقوع پذیر ہوا ہے۔ اس کے ساتھ کچھ نہیں ہوا۔ کیونکہ جو 'ہے' اس کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے۔ 'ہے پن' کو 'ہے پن' میں جوڑا نہیں جا سکتا۔ پیار میں پیار جمع نہیں کیا جا سکتا۔ پیار کو جاننے کا مطلب ہے پیار کو پیار کرنا اور پیار سے پیار کرنا ہی ہوتا ہے۔

سافترسی نے سوچا ہوگا کہ کسی پریمی کی باہوں میں سمٹ جانا بس اپنے آپ میں مسرت محسوس کرنا ہے۔ کار کو گاؤں میں پارک کر کے رات کو دھند میں پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جانا سمندر کی آواز کو کھوجنا ہے۔

"تم جاگ کیسے گئیں، اور اتنی جلدی؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے جھوٹ کہا "مجھے نادر اور گہری نیند آئی۔ تم جانتے ہو میرے جیسے گول مٹول لوگ کدو کی طرح سوتے ہیں۔" اور وہ اپنے پر ہی ہنس پڑی۔

یہ صحیح تھا کہ وہ اس سے زیادہ گول مٹول تھی جتنا اسے یا ممکن ہے مجھے بھی پسند ہوتا لیکن لوگ اس کو بھول جاتے۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ اس کی شخصیت میں کچھ ایسا حسنِ دانش شامل تھا جس نے اس کی آواز کو اپنا پن عطا کر دیا تھا۔ اسے انتہائی تقویت بخش اور شفاف اور پاکیزہ بنا دیا تھا۔

"کیسا شاندار ملک ہے" اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا میں ان ڈرگین مکھیوں کو دیکھ کر حیران رہ جاتی ہوں۔ ایک کے ساتھ تو میں پورے باغیچے میں کھیلتی رہی۔ مجھے بہت جلد یہاں سے چلے جانا ہے۔

"ولاسیانت آن کہیں نہیں جاتا" میں نے جواب دیا "نہ ہی راما سوامی اور میڈلین

جب شہزادی آنا چاہے گی تو ہر چیز یہاں موجود ہوگی۔" اپنے جھوٹ پر ایک بربریت بھرے مذاق کا پردہ ڈال کر میں جھک گیا۔ ساوتری صرف اس قدر ہی اپنے آپ کو شہزادی محسوس کرتی تھی جس حد تک پوست کا پودا محسوس کرتا تھا کہ وہ پوست کا پودا تھا۔ ساوتری تو بس تھی۔ یہ صرف میں تھا جس میں برہمن تھا۔ برہمن اور وہ جو 'میں' تھا حوالے کے مقامات کے طور پر الگ الگ تھے۔ اس کا چونکہ حوالے کے طور پر ایک ہی نقطہ تھا اس لیے مجھے لگتا تھا اس کے نہ تو کوئی مسائل ہیں اور نہ ہی سلسلہ مساوات۔ اس کے نزدیک شادی کا مطلب ہے کسی سے بھی بیاہ کر لینا اور جو بھی ہوتا ہے بس ہو کے ہی رہے گا۔ اور بیاہ بھی ایک وقوعہ ہوگا۔ صرف وہ شخص عمل پیرا ہوتا ہے جو اپنے آپ کے لیے اجنبی ہے۔

معصومیت، میں نے سوچا اس کے یکایک گنگنا اٹھنے کی طرح تھی۔ حالانکہ ساوتری کو یقین نہیں تھا کہ یورپ میں بھی چنبیلی کے پھول ہو سکتے ہیں لیکن میرے باغیچے میں چنبیلی کا پھول دیکھ کر ساوتری پتھر کی سل پر بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔ "میں گاؤں؛ میرا من گانے کو کر رہا ہے۔" اور پانیوں سے آڑ کر آہستہ آہستہ اوپر جانے والی ۔سی گل' کی طرح وہ گانے لگی۔

اپنے آنسوؤں کے پانی کی بوچھار سے
میں نے اپنی پریم بیل کو پروان چڑھایا

اس کی آنکھیں بند تھیں اور زیتون کے پیڑوں پر ہمارے اوپر بیٹھی ابابیلوں نے خاصا غل مچا دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا وہاں رکنا نامناسب تھا اس لیے میں اسے اپنے گیت میں مگن چھوڑ کر میڈلین کے لیے کافی بنانے کے لیے میں اوپر چلا گیا۔ آج چونکہ جمعرات کا دن تھا اس لیے اس کو کالج نہیں جانا تھا اس لیے میں خاموشی سے اپنا کام کرنے لگا۔ دسترخوان لگ گیا۔ کافی تیار ہو گئی تو میں میڈلین کو جگانے کے لیے گیا لیکن وہ پہلے ہی آنکھیں پوری طرح کھولے ہوئے لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے بتایا کہ گیت سن کر اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔

"کیا اداس گیت تھا۔ آپ کے یہاں کے لوگوں میں کیسی افسردگی ہے۔ اسی لیے رام! جب تم ہنستے ہو تو ہمیشہ تم سے پوچھتی ہوں کہ اس کے پیچھے ایسی شدید افسردگی کیوں ہوتی ہے۔"

"وجود" میں نے جواب دیا۔ "زندگی اور موت کا اور جنم۔ مرن کا درمیانی سفر ہے۔ اور انسان کو درد و کرب کا کس قدر بڑا اجتماع برداشت کرنا پڑتا ہے۔ کیا یہ کوئی اچنبھے کی بات ہے کہ محلوں، رانیوں، سلطنت اور سلطنت کا جانشین ہونے کے باوجود بدھ اس شے کی تلاش میں نکل پڑا جس سے مفر ممکن نہیں؟ میڈلین کہ تم ہمیشہ ہمیشہ سفر میں رہیں ایک ہوٹل سے دوسرے ہوٹل تک۔ آتیل دو میدی سے آتیل د وینس تک۔ نلشن موسا سے آتیل بالٹی مور تک۔ پربت، سمندر، ہوا کا سفر تو تم کر سکتی تھیں۔ لیکن تم رہو گی کہاں؟ زندہ تو تم زندگی ہی میں رہ سکتی ہو۔ اور اس کا مفہوم تلاش کرنے کا مطلب ہے دانشِ کل کو جاننا اور اسے سمجھنا۔"

بعض اوقات رام میں تم سے دور بھاگ جانا چاہتی ہوں دور بھاگ جانا چاہتی ہوں صرف احمقانہ معصوم قہقہے کی آواز سننے کے لیے تانت زوبی کی طرح۔ یا پھر اس مسخرے کو جو سب لوگوں کو ہنساتا ہے۔ دیکھنے کے لیے سرکس دیکھنا چاہتی ہوں۔ گہری سنجیدگی مجھے بیچارے وَردَر کی یاد دلاتی ہے۔ رام تم جانتے ہو میں سنجیدہ نہیں ہوں اور ایک روز شاید میں یہاں سے بھاگ ہی جاؤں گی۔" وہ ہنس پڑی لیکن مجھے معلوم تھا یہ مذاق نہیں تھا۔ میں اس کی فکر کی قوس کو دیکھ سکتا تھا۔ "تمہارے بغیر کل میں اپنا راستہ کھو بیٹھی تھی۔" اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "تم سویرے جلدی نکل گئے تھے اور مجھے پتہ تھا تم دیر رات سے پہلے نہیں لوٹو گے۔ مجھے شدید تنہائی کا احساس ہوا اور میں نے ذہنی طور پر اپنے آپ کو کس قدر بے دست و پا محسوس کیا۔ میں اپنے بال بنوانے کے لیے کالج کے بعد ہیر ڈریسر کے پاس گئی۔ میں ایک ہفتہ پہلے ہی جا پہنچی تھی۔ وہاں پہنچ کر ان لوگوں سے میں نے جھوٹ موٹ کچھ کہہ دیا۔ پھر میں تمہارے لیے کچھ کاغذات خریدنے گئی۔ ابھی صرف چھ بجے تھے۔ میں نے دیکھا گریٹڈز میگاسینز ابھی کھلے تھے۔ میں ایک کے اندر گئی اور ادھر ادھر گھومتی رہی۔ ذرا سوچو میں نے اپنے لیے کیا خریدا ہوگا؟

۔۔ کالی مرچ پیسنے کے لیے کھرل۔ ایک معمولی سی چیز جس کا کوئی مصرف نہیں تھا لیکن بہرحال وہ رہے گی اور ممکن ہے کسی روز شاید کسی کام بھی آجائے۔ پھر میں نے اس کے لیے

کالی مرچ خریدی۔ ایک روز میں اسے ضرور استعمال کروں گی۔ ہر شے کسی نہ کسی کام آہی جاتی ہے۔ اسے بنے رہنے کا حق ہے۔ اس لیے کری کے بجائے وقتاً فوقتاً میں تمہارے لیے کالی مرچ پیسا کروں گی۔" وہ بولی اور اٹھ کر ہاتھ منہ دھونے چلی گئی۔

میں نے برآمدے میں ہی کھانے کی میز سجادی تاکہ ہم مل کر ناشتہ کر سکیں اور جب میں ساوتری کو بلانے گیا تو وہ اپنے بال بنا رہی تھی۔

"اندر آجاؤ"۔ اس نے بلا جھجک کہا لیکن میں اندر نہیں گیا۔ "ناشتہ تیار ہوگیا" میں چلّایا۔ ایک منٹ میں وہ تیار ہوگئی۔ اپنی چوٹی ہاتھ میں لیے اور ہیئر پن انگلیوں میں تھامے وہ دوڑ کر اوپر چڑھ آئی۔ وہ میز کے سامنے بیٹھ گئی اور میں کافی لینے چلا گیا۔ جب میں لوٹا تو میں نے دیکھا میڈلین ساوتری کے بالوں میں پن لگا رہی تھی۔ عورتوں میں جسم سے تعلق رکھنے والی چیزوں۔ جیسے فیس پاوڈر، جوتے، بیماری اور انڈرویر۔۔ کے تعلق سے ایسی بے تکلفی ہوتی ہے جو مردوں کے یہاں کبھی نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ عورتیں، فراکوں، بلاؤزوں، زیورات، دواؤں اور عورتوں کے امراض کے ڈاکٹروں کی کچھ ایسی باتیں کرتی ہیں کہ جیسے یہ سب ان کے جینے کا جبر المقابلہ یعنی الجبرا ہو۔ مردوں کا اس سب سے وہی تعلق ہے جو سورج مکھی کے پھول سے ہے۔

زندگی عورت کے لیے بنائی گئی ہے۔ مرد تو اس دھرتی کے لیے اجنبی ہے۔ ہم بودھی ستو ہیں اور ایک رات ہم بھی اپنے نوزائیدہ بچّے کے ساتھ سوئی اپنی بیوی کو چھوڑ کر چلے جائیں گے جس کے عقب میں چراغ جل رہا ہوگا اور جس کی آنکھوں کی محراب اپنی گہرائیوں میں خود زندگی کو اپنے اندر سمیٹے ہوگی۔ اور جب کنتھک یہ جان جاتا ہے اور ہنہنا کر کپل وستو کے شہریوں کو روانگی کی اطلاع دیتا ہے تو منتظر فرشتے 'کنجی چھید' اور ٹائل ایج کو بند کر دیتے ہیں تاکہ کوئی جاگ نہ پڑے اور جب تک سنتری محوِ خواب ہیں وہ سائس جس کو اس کام کے لیے مامور کیا گیا ہے گھوڑے کو دروازے پر آتا ہے۔ جیسے ہی شہر کا ایک کے بعد ایک پھاٹک کھلتا ہے اور پہریدار اپنی اپنی جگہوں پر سو رہے ہوتے ہیں۔ فرشتے دروازے کے قبضوں اور تالوں کا شور بند کر رہے ہوتے ہیں۔ کنتھک اڑتا ہوا سرحدوں تک پہنچ جاتا ہے۔ اپنے

بال تراش کر بدھ انہیں آکاش کی جانب بھیج دیتے ہیں تاکہ دیوتا انہیں نذرانۂ عقیدت و پرستش کے طور پر قبول کر لیں۔ اور جب وہ گنگا کے کنارے پہنچتے ہیں تو کنتھک بھگوان بدھ کے سامنے گھٹنے ٹیک کر پرارتھنا کرتا ہے۔ "پربھو اس حقیر جاندار کو بھی ساتھ آنے کی اجازت دیجیے"۔ بھگوان جواب میں کہتے ہیں "کنتھک میں وہاں جا رہا ہوں جہاں سے لوٹ کر کوئی نہیں آتا"۔ اور پھر وہ اس سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔ کنتھک کپل وستو لوٹ آتا ہے اور فوراً ہی اس کی موت ہو جاتی ہے۔ پُنر جنم کے بعد 'کرونامئے' کے سادا ایک شاگرد ایک ارہت کے طور پر پہنچنے کے لیے۔ "کیونکہ آنند جو بھی چیز تخلیق کی گئی مخلوط ہے۔ سامانک ہے اکائی ہے اور جو کچھ بھی مخلوط ہے سامانک ہے۔ وہ بالآخر گل سڑ جائے گی، مر جائے گی۔ فرد میں ایک ایسا نکتہ ہے، مرکز ہے۔ ایسا گیان ہے جس 'ہونا' شامل نہیں ہے۔ صرف تلاش کا انجام ہے۔ صورت قطعِ امید ہے اور سچائی"۔ تمام انسان 'بودھی ورکش' کے پاتری ہیں۔

ساوتری عام ہندوستانیوں کی طرح بدھ کے بارے میں بہت کم جانتی تھی۔ واقعہ یہ تھا کہ میڈلین ایسی دانشِ اعلیٰ کے تئیں یہ عجیب و غریب لاعلمی دیکھ کر حیران ہو جاتی تھی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ بدھ دھرم ہندو دھرم میں اس انداز سے جذب ہو گیا تھا کہ ہم دورِ حاضر میں ایک کو دوسرے سے الگ پہچان نہیں دے سکتے۔ ٹھیک اسی طرح سے جیسے ہم جنوب میں دراوڑی روایت اور آریائی روایت میں تمیز نہیں کر سکتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ آریائی دانش نے شمالی ہند کے مقابلے میں جنوبی ہند میں زیادہ مستحکم جگہ بنالی ہے۔

"ہندوستان ہر چیز کو اپنے میں جذب کر لیتا ہے اور اسے اپنا لیتا ہے"۔ میں نے ایک معمولی سے جملے کو دہرایا اور میڈلین نے میری جانب کم و بیش ایک مایوسی بھری جھنجھلاہٹ کے ساتھ دیکھا۔

ہندوستان ہر شے ہر جگہ کو ایک ہندوستان بنا دیتا ہے۔ لیکن اگر کسی شے میں ہندوستانیت پیدا نہیں ہوتی تو وہ ناسچائی ہے 'جھوٹ ہے' مایا یعنی فریب ہے اور برٹش ہیں"۔ وہ یہ کہہ کر ہنس پڑی۔

"نہیں۔ آج کل تو انگریزوں کو بڑا پسند جاتا ہے" میں نے کہا۔ مجھے معلوم تھا وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔ "ساوتری کیا ایسا نہیں ہے؟"

"نہیں، بالکل ایسا ہی ہے" ساوتری بولی "جب ماؤنٹ بیٹن ہندوستان سے روانہ ہو تو ہم سب رو دیئے۔ ہم سب جذباتی قسم کے بیوقوف لوگ ہیں" ساوتری نے بڑی سمجھ سے اضافہ کیا۔ میں نے سوچا یہ جملہ اس کا اپنا نہیں تھا۔ کسی سیاست داں کا مقولہ لگتا تھا سننے میں۔

"فرانسیسیوں نے ابھی پانڈی چری کو نہیں چھوڑا" میڈلین بولی "پرانا فرانسیسی کسان کسی چیز کو نہیں چھوڑتا۔ وہ اپنے اندر جذب کرتا ہے۔ منافعے کے طور پر!..."

یہ بڑی بودی دلیل تھی اور اس سے پتہ چلتا تھا کہ ہم کس طرح اپنے آپ کو ایک دوسرے سے چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس دوران میں پوسٹ مین ڈاک لے کر آ گیا اور ساوتری نہانے کے لیے نیچے چلی گئی۔ میڈلین بولی وہ کھانا پکانا شروع کرے گی کیونکہ ساوتری کی گاڑی، مترال، اڑھائی بجے چھوٹتی ہے۔ میں ڈاک سے آئی ہوئی چٹھیوں کو دیکھ رہا تھا۔ کچھ ہندوستان سے آئی تھیں۔ کچھ پیرس سے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہیں نہ ہوتا اور اگر ہوں تو پھر کبھی دوبارہ مجھے نہیں ہونا چاہیے۔

ایک خط انکل چارلس کا بھی تھا جس میں کیتھرین کے آنے کا ذکر تھا۔ انھوں نے لکھا تھا وہ اسے پیرس سے سنیچر وار صبح کو چلنے والی گاڑی میں بٹھا دیں گے۔ انھیں وہاں سے بہت سویرے (چار یا لگ بھگ چار بجے) چلنا پڑے گا۔ بہر حال کیتھرین ٹرین کی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے سو سکتی ہے۔ جوان لڑکی کے لیے رات کے سفر کا خیال انھیں پسند نہیں تھا۔ بلاشبہ وہ پرانے خیال کے انسان تھے لیکن ہم ان کی موجودہ عمر میں سے ان کے گزرے ہوئے برس بھی تو منہا نہیں کر سکتے تھے۔ سیاں اِتیان کے چاقو کی مدد سے بھی نہیں۔ جو تھا وہ جانتے تھے وہ جیسے بھی ہیں انھیں میں ویسا ہی قبول کر لوں گا۔ اور میں نے کیا تھی۔ کم از کم کوشش تو کی۔ ان کا خیال تھا میرے قریب رہ کر وہ بہت کچھ سیکھ جائے گی۔ "اسے اچھی اچھی باتیں بتاؤ تاکہ وہ اپنے گھر کو خوشیوں سے بھر سکے اور ٹھوس مضبوط بنا سکے۔ ایک عورت کے لیے اس کا اپنا گھر ہی اس کے لیے سورگ ہے" انھوں نے بات ختم کرتے

ہوئے لکھا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ مجھے اور میڈلین کو ایک ساتھ دیکھنے سے ہی وہ متاثر ہو جائے گی اور ہم لوگ زندگی بھر اس کے لیے ایک مثال بن جائیں گے۔" ایک باپ کی ہمیشہ یہ امید رہتی ہے کہ اس کے بچے خوش و خرم رہیں۔ عملی طور پر میں نے میڈلین کی خوشی کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔ وہ کم و بیش ایک بلیک برڈ کی طرح پل کر جوان ہوئی۔ کیتھرین اس سے مختلف تھی۔ رام اسے صلاح کی اور مدد کی ضرورت ہے، تم اس کی مدد کرو، میں اور زوبی ہمیشہ تمہارے ممنون رہیں گے تم دونوں کو میرا ڈھیر سارا پیار۔

چچا چارلس

کیتھرین کی متوقع آمد نے میرے آفاق روشن کر دیئے۔ اس سے مجھے دوسری چیزوں، زیادہ ٹھوس چیزوں کے بارے میں سوچنے کا حوصلہ ملا۔ مجھے کیتھرین پسند تھی۔ اس کی حیا آمیز خوش مزاجی اور دباؤ با ساز زندگی کی مسرت کا احساس۔ اس کا مادرانہ پن (کیونکہ ڈھیر سارے بچوں کے بغیر کیتھرین کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔) اور انسانوں اور چیزوں کے لیے اس کا فطری پیار۔ وہ وہی تھی جسے فرانسیسی سگھڑ بیوی اور گھر کی لکشمی کہتے ہیں۔ جو اس کے ساتھ بیاہ کرے گا۔ وہ محض ایک وارث سے بیاہ نہیں کرے گا کیونکہ اس کے باپ نے خاصا پیسہ کما رکھا تھا۔ بلکہ ایک اچھی بیوی سے بیاہ کرے گا۔ اور وہ اس سے خوش تھی اور اس بات سے بھی کہ جب اس کے والد ریٹائر ہوں گے تو نوٹری کلبیشہ انہیں ورثے میں ملے گا۔ اس طرح یہ باغیچہ کسی اور کے ہاتھ نہیں پڑے گا۔

دوپہر کا کھانا بڑا بے رنگ رہا۔ ہر شخص اپنے خیالات میں کھویا رہا۔ جارجز ساد تری کو الوداع کہنے آ گیا۔ وہ ہمیشہ خیالات کے اعتبار سے اس قدر مہذب اور شائستہ رہتا تھا جیسے زندگی دو زانو ہو کر سجدہ ریز ہونے کا ایک سلسلہ ہو جس کا اظہار لاطینی زبان کے بجائے فرانسیسی میں کیا گیا ہو۔ بھگوان ہر انسانی فعل کا فوری جواز تھا۔ وہ نیچے تک جھک گیا۔ اور ہیٹ اتار کر ساد تری اور میڈلین کو آداب کہا۔ سیڑھیوں سے نیچے اترتے ہوئے اس نے میری جانب بھی ہاتھ ہلایا۔

"میں اب تک جن لوگوں سے ملی ہوں جارجز ان میں سے نفیس ترین انسان ہے" میڈلین

نے بڑے وثوق سے کہا۔ "کاش وہ راہبانہ لباس میں نہ رہنے کے مسئلے کو زندگی بھر کی شرمندگی کا مسئلہ نہ بنا لیتا۔ ایک ایسا انسان نہ بن جاتا جو صرف اپنے آپ تک محدود ہو کر رہ گیا ہو۔" میری طرف دیکھتے ہوئے اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اور بالآخر ایک ریاضیاتی معمّہ بن کر رہ جائے۔ وہ اپنے خیالات کو بچّوں کی چیخ و پکار، عورت کی سسکیوں کا لباس پہنانا چاہتا ہے۔ اگرچہ انسان مافوق البشر بننا چاہتا ہے تو اس کے لیے بس انسان ہونا ہی ضروری ہے۔" وہ دونوں ہنس پڑے۔

"ممکن ہے اب بھی کسی روز میں یوگی بن جاؤں۔" میں نے کہا "میں سری آر۔ بندو کا پیروکار بنوں گا اور موت کو ختم کر دوں گا۔"

"او رام: تم میرے ساتھ ابد تک بور ہوتے رہو گے۔ بڑا تکلیف دہ خیال ہے۔"

"لازوال ابدیت صرف مردوں کے لیے ہے۔" میں نے کہا "عورتیں مناسب وقت پر مر جائیں گی۔ میں ہمیشہ تمہیں بتاتا ہوں کہ ایک سے زیادہ شادیاں رچانا انسان کی فطرت میں ہے۔ ہندو اور عیسائی دونوں ہی مکمل وابستگیوں کے سلسلے میں غلط ہیں۔ اسلام ان کے مقابلے میں بہتر مذہب ہے اس نقطۂ نظر سے کہ اسلام زندگی کو فطری انداز میں دیکھتا ہے۔"

"اور اس طرح تمہیں سیدھا پاکستان لے جاتا ہے۔" ساوتری نے کسی حد تک تلخ لہجے میں اضافہ کیا۔ یہ وہ واحد موقع تھا میں نے محسوس کیا جب اس نے اپنے ذاتی جذبات کو ظاہر کیا تھا۔

"ہم فرانس میں ہیں" میں نے اسے یاد دلایا۔ "اور فرانسیسی گاڑیوں میں ہندوستانی گاڑیوں کی سی قنوطیت اور خوش امیدی کی سی فضا نہیں ہوتی۔ اگر ہمیں 'مسترال' کو پکڑنا ہے تو ہمیں سامان باہر نکالنا ہوگا۔ جب تک خواتین کافی پینے سے فارغ ہوتی ہے۔ مافوق البشر سامان کار میں رکھ دے گا۔"

"بھگوان کی بنائی ہوئی دنیا میں کوئی شخص بھی مافوق المرد یا مافوق البشر نہیں ہے۔" میڈلین بولی "لیکن فرانس کی خاتون اعلیٰ بنائی ہی اس لیے گئی ہے تاکہ وہ برہمن کا بوجھ اٹھا سکے۔" وہ جانتی تھی کہ پھیپھڑوں کی تکلیف کے باعث مجھے وزن میں اٹھانا چاہیے۔ کافی پی کر

ہم سب نیچے آ گئے اور کس مکمل قبولیت کے ساتھ میڈلین ساوتری کا سامان اٹھا کر لے گئی ساوتری نے بیل کو کچھ گھاس پیش کی اور جس دوران میں میڈلین نے سامان ایک پتھر کے ساتھ ٹکا کر رکھا۔ ولاسیاں آن کی دو بڑی بڑی آنکھوں کو دیر تک دیکھتی رہی۔ اور پھر ہم ایک ہی کوشش میں کار تک پہنچ گئے۔

اشیا کے روبرو ہم دو ہندوستانیوں نے اپنے آپ کو کس طرح نااہل بکما محسوس کیا۔

"آخر میں ایک کسان عورت ٹھہری" ہمیں معاف کرتے ہوئے میڈلین نے کہا "میرے آباد اجداد ضرور آلو اور انڈے ڈھو ڈھو کر سیاں سیور تک لے جاتے رہے ہوں گے" ہم سب کار میں سوار ہو گئے۔

میڈلین بڑی حلیم، معموم اور سمجھ دار لڑکی تھی۔ ساوتری پہلے سے ہی لندن کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہاں حسین ہمدانی بڑے تشدّد اور خلوص سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

وہ بولی "میں لندن جانے سے ڈرتی ہوں۔ کاش ساری دنیا پروانس ہوتی"

تب ہمیں ہر شام رقص و نغمہ کی محفل ملتی۔ دوپہر بعد خوب اچھے خرآٹے اور درمیان میں مسترال کا می رل گیت سننے کو ملتا۔ اس سے زیادہ تساہل کہیں نہیں" میڈلین نے اپنے فیصلہ کن ردّعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

میری خاموشی قابل رحم تھی۔ میڈلین کے پاؤں زمین پر تھے۔ بہرحال کیتھرین سنیچر کے روز پہنچ رہی تھی اور میڈلین کے پاس ہر شے کے لیے بڑے شاندار منصوبے تھے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ کون کون سی الّم غلّم احمقانہ چیزیں خریدے گی اور جارج کو کس روز دعوت دے گی۔ پھر یہ سمجھتے ہوئے کہ جارج شروع میں شاید کچھ زیادہ ہی شرمیلا ثابت ہو۔ وہ سوچنے لگی کہ ممکن ہے لیزو اس سلسلے میں کارآمد ثابت ہو۔ اس لیے اس شام لیزو کو واپس وہاں آنا ہی تھا اور ایک بار پھر سنسکرت کا پہلا سبق مونا ہی تھا۔ نہیں وہ پہلے سیدھے پالی سیکھے گی۔ لیزو پہلے سے بھی زیادہ خوش تھا کیونکہ اس طرح اس نے اپنی اہمیت ثابت کر دی تھی کوئی چیز جتنی مبہم ہوتی لیزو اس سے اتنا ہی واقف ہوتا۔ لیزو میرے ساتھ گپ شپ کرنے پانچ بجے آ رہا تھا۔ چھ بجے ہم سب سیر کے لیے جائیں گے۔ ہاتھی کو 'ہیلو' کہیں گے اور اگر مسترال

زیادہ طوفانی نہ ہوئی تو سیاں اوفیلی تک جائیں گے اور چاندنی میں زیتون کی درختوں میں سے گذرتے ہوئے لوٹیں گے۔

میڈلین کم و بیش آسودہ اور مسرور لگ رہی تھی "رام کی عمر یا تو ۳۰۰۰ سال ہے یا پھر تین سال" وہ ساوتری سے کہنے لگی "وہ کوئی غلط کام کر ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ یا تو بہت عقلمند ہے یا معصوم! کار بھی خوب اچھی چلاتا ہے لیکن ذرا سی 'پر پر' کی آواز آنے کی دیر ہے کہ وہ سیٹ سے اچھل کر باہر کھڑا ہو جاتا ہے جیسے اس نے ناگ کی پھنکار سن لی ہو۔ اسے مشینوں سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ لیکن اگر اسے تنہا اور عالم خاموشی میں چھوڑ دو تو پھر وہ تمہارے ساتھ پیڑوں کی باتیں ایسے کرتا ہے جیسے پچھلے جنم میں وہ خود ایک پیڑ رہا ہو۔ اور اگلے جنم میں بھی پھر ایک پیڑ ہوگا۔ اس نے غلطی سے آدمی کے طور پر جنم لے لیا ہے۔ میری خوشی کے لیے" وہ بولی اس انداز سے جیسے وہ باور کر چکی ہو کہ اس کی خوشی یقینی ہے۔ ذرا سوچیے ایک شخص ہری ہر پور میں پیدا ہو اور وہ شادی کرلے پاروپاس دے بیاں مے دار میں رہنے والی ایک لڑکی سے۔ ہے نا عجیب، بڑی عجیب بات! رام کہتا ہے کہ جب میسور کی کوئی کسان عورت دھنک کو دیکھتی تو بے اختیار کہہ اٹھتی ہے" وہ دیکھو۔ وہاں وہ یقیناً کتیا اور گیدڑ کی شادی ہو رہی ہے۔ کہیں کہیں ضرور کوئی دھنک ہوگی۔ اس نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا "رویاں کے اداس، ساون کے آکاش میں!"

میڈلین اس طرح کی باتیں خوب کرتی تھی کم و بیش اپنے آپ سے ہی۔ جب اسے پتہ ہوتا کہ جو سچ نہیں ہے اسے سچ ہونا چاہیے اور دہرانے سے وہ سچ بن سکتا ہے! بعد میں وہ اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ لیتی جیسے کوئی اس سے بھی بڑا سچ اس کے اندر تھا۔ اور میری آنکھیں جب اس کے اس اشارے کو دیکھ لیتیں تو میرے اندر یہ اعتماد پیدا ہو جاتا کہ زندگی جاری رہے گی کیونکہ مرد جنم لیتے ہیں، مرتے ہیں۔ عورتیں بھی جنم لیتی ہیں۔ شادی کرتی ہیں اور زندہ رہتی ہیں۔ زندگی ایک ریلوے لائن کی طرح ہے۔ وہ چلتی ہی جاتی ہے۔ جیسے اپنے آپ ہی کبھی کسی برانچ لائن پر پھسل گئی اور کسی چھوٹے دیہاتی اسٹیشن پر رک گئی، سیٹی دی اور گھنٹی بجنے پر پھر دوڑنے لگی۔ پھر سرو کے پیڑ آئیں گے۔ دلدلیں آئیں گی اور سیاں

پجول، ،سیاں ٹروقم اور سیاں میڈلین کے بعد ترسکن آئے گا اور وہ سب لوگ جو ترسکن سے واقف ہیں جانتے ہیں کہ رون ندی اس میں سے ہو کر بہتی ہے اور رون ندی اپنا پاٹ پھیلا کر بہتی ہوئی مارسیلز پہنچ جاتی ہے۔

مارسیلز، جیسا کہ آپ جانتے ہیں، ایک بڑی بندرگاہ ہے اور دنیا بھر سے وہاں جہاز آتے ہیں۔ امریکہ سے، ہندوستان سے بھی ان میں بیٹھ کر لوگ بھی آتے ہیں۔ گاڑی پکڑ کر پیرس اور لندن چلے جاتے ہیں۔ لوگ لندن جاتے ہیں۔ کوئی بھی لندن جا سکتا ہے۔ میں خود اکثر لندن جاتا ہوں اور وہاں برٹش میوزیم میں کام کرتا ہوں۔ میں یہ سب اسے نہیں بتایا۔ میرا مطلب ہے ساوتری کو۔ صرف میڈلین جانتی ہے۔ ساوتری بلاشبہ اس شعور کے ساتھ جانتی ہے کہ ساوتری کیا تھی۔ اس شعور کے ساتھ نہیں کہ میں کیا تھا۔ ساوتری کے لیے لندن ایک شہر نہیں تھا یا ایک جغرافیائی مقام بلکہ لندن تو کہیں کسی جگہ واضح ایک مقام تھا ایک نکتہ ایک سرخ نکتہ۔ اس کے اپنے اندر۔ لندن کی ٹریفک کی بتیوں کی طرح ممکن ہے۔ یہ نکتہ اچانک سرخ ہو جاتا اور پھر کسی بنگالی عورت کے گول چہرے پر قم قم کی ایک بہت بڑی بندی یا ٹیکے کی طرح روشن ہو جاتا تھا اور پھر ہرا ہو جاتا تھا۔ لندن کا خنک انگول اور مبارک سبز!

"یہ ٹرامیں کیا عجیب و غریب شور مچاتی ہیں!" وہ کہنے لگی۔ "اور یہ روڈ سائنز کیسے عجیب لگتے ہیں۔ بڑے قدیم دکھائی دیتے ہیں یہ!" اور پھر یہ یاد کرکے کہ میڈلین فرانسیسی ہے وہ اضافہ کرتے ہوئے کہنے لگی "اور جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، ہمارے یہاں روڈ سائنز سرے سے ہوتے ہی نہیں!" کار رُک گئی۔ ہم لوگ سیاں چارلس اسٹیشن پر پہنچ گئے تھے۔ گاڑی عام انداز میں بہ آسانی آ گئی۔ ساوتری ڈبّے میں سوار ہو گئی جیسے وہ مارسیلز اور گاڑی سے ہمیشہ سے واقف تھی لیکن اسے خود ہمیشہ بھول بھی سکتی تھی۔ میں اس کے بارے میں فکر مند ہو گیا اور اس سے کہنے لگا "لندن پہنچتے ہی ہمیں تار ضرور دے دینا۔ دو گی نا!"

"یہ بالکل میرے پتا جی یا تاؤجی کی سی بات ہے" وہ بے اختیار کہنے لگی۔ ساوتری کے لیے سچ اور اظہار کا طریقہ اور احتیاط ایک ہی جبلی تجربہ تھا۔ جس طرح وہ لمبی یا

پتلی نہیں ہو سکتی تھی اسی طرح وہ اصلی جھوٹ بھی نہیں بول سکتی تھی۔ اس کی روانگی بھی نارمل اور بلا تکلف رہی ہیں نے اسے رات کے کھانے کا ٹکٹ خرید دیا اور دیر تک بڑے عام طریقے سے الوداع کہنے کے لیے ہاتھ ہلاتا رہا۔ میڈلین اس سے مل کر خوش ہوئی تھی اور اس کے جانے سے اداس ہو گئی۔

"یہ تین ہزار سالہ تہذیب ہے جو ایسی چیز کو جنم دیتی ہے"، وہ بولی۔ جیسے میری تعریف کر رہی ہو۔

"اور میرے جیسی چیز پانچ ہزار سال کی تہذیب!" میں نے کہا اپنشدوں والے اپنے کسی جد کا دعوہ کرتے ہوئے جیسے میرے دادا پر دادا نے اسے دیکھا ہو اور ہمیں اس کی جاگیر میں سے زمین ملی ہو۔ میری اداسی دانشورانہ تھی۔ تجریدی، اس نے تواریخ اور مابعد الطبیعات میں لے لی تھی۔ اگر پانچ بجے کوئی جارجز نہ آ رہا ہوتا اور مجھے وحدتِ فطرت کے بیر دکاروں کے بارے میں دلوانہ ہونے کا موقعہ نہ ملتا تو میں سوچتا ہوں میں کیا کرتا؟ ہم لوگ اب ان کی کتابوں کا مطالعہ کر رہے تھے اور عیسائی دھرم کے افکار کے بجائے کیتھولک تحریروں کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے لاطینی زبان سے ناواقفیت کے باعث مَیں میڈلین اور جارجز کی مدد لے رہا تھا۔ جارجز اس میدان میں ماہر تھا۔ اور خوش تھا۔ کام مقدّس ہے کیونکہ یہ ہمارے عشق کے عشق کو چھپا لیتا ہے۔ انجیر کا پتّہ ہی شاید تہذیبی کام تھا۔

بہر حال یہ میرا خوشی کا دن تھا اور میڈلین گا رہی تھی۔ وہ ایک دیہاتی لوری کی پرانی ٹیک گا رہی تھی۔

وہ بولی "اب میں کار چلاؤں گی" جونہی اس نے اسٹیرنگ تھاما کار نے ایک نئی لَے، ایک نیا آہنگ تیار کر لیا۔ اور کچھ ایسی مانوس اور خوش لگنے لگی جیسے گھوڑے سائیس کی بجائے اصلی مالک کا ہاتھ لگنے سے محسوس کرتے ہیں۔ دوڑتی، مڑتی اپنے آپ کو آویزاں اٹھاتی کار ہمیں واپس لے آئی میں اپنے اندر گر چکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہاں اس پختگی میں برقراری میں انسان دائمی سکون کا ادراک حاصل کرتا ہے۔

"میڈلین۔ امن و سکون وہاں ہے جہاں بیوی ۸۰ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے کار چلاتی ہے اور مرد اپنی ناک کو دیکھتا دیکھتا اپنی ہی اتھاہ گہرائی میں اتر جاتا ہے" میں نے کہا۔

"میں کسی روز تمہاری ناک پر شہد لگا دوں گی" وہ بولی اور یہ ثابت کرنے کے لیے کہ پیار اپنے پن میں ہے اس نے میرے سونگھنے کے انگ کے اوپری حصے کو چوم لیا۔ تم سوچتے ہو تمہارے پاس وہ سب ہے جس کو تم خوب اچھی طرح جانتے ہو۔ ۱۹ برس کی عمر میں پیار اتنا ہی فریب کار ہے جتنی ۲۵ برس کی عمر میں خوشی۔ بیاہ ایک بندھن ہے اور چونکہ تم باری باری کار چلا سکتے ہو اور رما دام تیسیے کے علاقے سے گزرتے ہوئے مہمانوں کے لیے کیک لا سکتے ہو اس لیے تم مل کر رہتے ہو۔ میں اکیلا محسوس کر رہا تھا اور پلاس دے لا ریپبلک کے پیڑوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے ان کو گنا۔ وہ تعداد میں ۲۵ تھے۔

میری ڈائری کے اوراق۔

۱۷ اکتوبر: کیتھرین یہاں پرسوں آئی۔ اسے اور جارجز کو ایک دوسرے کے بازوؤں میں دھکیلنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ بلاشبہ وہ شرمیلی ہے لیکن وہ مردوں کو اس طرح دیکھتی ہے جیسے وہ کسی قانون کی کتاب کو حوالے کے لیے یا انحصار کے لیے دیکھے گی۔ اس لیے نہیں کہ وہ وکیل ہے بلکہ اس لیے کہ اسے استحکام کی تلاش ہے وہ سب مرد اور عورتیں (اور انہیں کسی وجہ سے حقارت سے بورژوا کہہ کے پکارا جاتا ہے) جنہیں استحکام درکار ہے اور ان میں انسانوں کی اکثریت شامل ہے۔ مذہبی ہیں۔ ان معنوں میں کہ اگر انہیں اس بات کا علم نہ ہوتا کہ یہ موتی، بھاری بھر کم صحیفے بھی وجود رکھتے ہیں تو فرانس کا نظم و نسق چلانا ناممکن تھا۔ نہ تو کوئی بچہ جنم لیتا، نہ کوئی شخص کوئی دکان چلا سکتا، نہ کوئی کسی شناختی کارڈ رکھ سکتی اور نہ کوئی عورت اپنا شوہر۔ جنم اور موت کے لیے قانون چاہیے۔ ایسا قانون جو کسی بڑے قانون میں سے نکلتا ہے۔ جنم اور موت سے ماورا۔ سب اصول آزادی کے لیے ہیں۔ دھرم کا پالن کرنے کا مطلب ہے آزاد ہونا۔ (ایک سپاہی یا پولیس کے افسر سے بڑھ کر کوئی آزاد نہیں لگتا)۔ ایک سچا بورژوا اسی لیے سنت ہے۔ ایک وجود مقدس، جس کے لیے اس کا گھر ہی ایک خانقاہ اور اس کا دھرم ہی اس کی شہریت ہے۔

"خانقاہ کا سنت یا درویش ہی سچا بورژوا ہے۔ وہ بڑی سادہ اور کفایت شعاری کی زندگی گزارتا ہے۔ وہ جنت کے لیے سامان جمع کرتا ہے۔ وہ شخص جو کسی اور عہد، کسی دوسری دنیا کے لیے جمع کر کے رکھتا ہے صرف عظیم تخیل کا مالک ہی ہو سکتا ہے۔ یہ ایک 'برو انسل' کی عورت ہی تھی جس نے کہا تھا اور میڈلین نے کسی دوست سے سنا تھا "مسٹر لے پا سچر کیا سورگ میں انگریز لوگ بھی ہوتے ہیں؟" "ہاں! مادام ہوتے ہیں"۔ این ڈائینز کے بھلے مانس پادری نے جواب دیا۔ "اس صورت میں"۔ اس خاتون نے جواب دیا "میری

وہاں جانے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔ بڑے بد اخلاق ہیں یہ انگریز لوگ۔ مِٹرلے یا سچر"
ایک اور سوال"۔ آپ کا کیا خیال ہے کیا میری پوتی مارگریٹ بھی میرے ساتھ سورگ میں
جاسکتی ہے؟"، "جی ہاں! عزیز خاتون بالکل جاسکتی ہے"۔ "مارگریٹ بہت اچھے تلے ہوئے
آبرجن بناتی ہے"، نیک دل پادری کچھ نہیں کہہ پایا۔ اس لیے وہ مسکرایا، الوداع کہنے کے لیے
ہیٹ سر سے اٹھا کر اونچا کیا اور بہت سی دعائیں بڑبڑاتا ہوا چل دیا۔

۲۳ر اکتوبر: میں بہت تھک گیا ہوں۔ میں اس واماندہ تھکی ہاری نسل کا آدمی ہوں
جس نے تین (چار یا پانچ) ہزار برس سے کچھ ایسی کتابی مُطالعاتی، بہت کم کھا کر، اور بے حس و
حرکت رہ کر زندگی گزاری ہے کہ ہمارے ناک، حلق، کان، زبان اور آنکھیں اپنی فطری
چستی پھرتی کھو چکے ہیں۔ ہم دیگر ذرائع سے چیزوں کو سمجھنے لگے ہیں۔ لیکن میرا اندازہ ہے کہ
ہماری حیثیت انسانوں سے گفتگو کرنے کے مقابلے میں دیوتاؤں سے باتیں کرنے کے لیے اور
ٹھوس کے مقابلے میں ان چیزوں کو باضابطہ بنانے کے لیے تیار کی گئی ہے جن کا تخمینہ لگانا ممکن
نہیں ہے۔ ہمارا ذہن اشیا کے اِردگرد سے ٹھیک اسی طرح پھسل جاتا ہے جس طرح کنکر
پتھروں سے پانی۔ یہ سچ ہے کہ برہمن لوگ آج کل انجینئر، ڈاکٹر، یہاں تک کہ فوجی بھی بن جاتے
ہیں لیکن یہ ٹھیک اسی طرح ہے جیسے ہمارے پرانے گھروں کے اندر کے کمروں کا کوئی ستون
ہو جسے اگرچہ دیمک چاٹ چکی ہے لیکن وہ پھر بھی ایستادہ و برقرار ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ
ستون چھت کو سہارا دیتا ہے۔ نہیں بالکل نہیں۔ یہ تو اپنی جڑوں کو سہارا دیتا ہے۔ باقی سب کچھ
تو ہوا اور اعتقاد سے قائم ہے۔ جدید زندگی اور جدید تہذیب کے خلاف لڑی جانے والی
یہ لڑائی شروع ہونے سے پہلے ہی ہاری جاتی ہے۔ ہمارے اندر جانے کے رلیشے تو ہیں لیکن
عمل پیرا ہونے کے لیے پٹھے نہیں ہیں۔ ہم دھرتی کے اصل نامرد ہیں"۔

۲۶ر اکتوبر: عورت کی حیاتیات اور اس کی نقل و حرکت میں اس کے اہم رول کو ہم
بہترین انداز میں اس وقت نہیں دیکھتے جب وہ گرفتارِ محبت ہوتی ہے (کیونکہ یہ میلوڈراما
ہوتا ہے) بلکہ اس وقت جب وہ کسی مرد کو حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اور نسل کو جاری رکھنے
کے لیے عورت کے طور پر اُلجھ جاتی ہے، پھنس جاتی ہے۔ جس طرح ماں مٹھی دشمن کی بھنک

پاتے ہی غصّے میں سونڈ اٹھا لیتی ہے چاہے متوقع خطرے کا ہدف اس کا اپنا بچّہ ہو یا کسی اور کا کیونکہ ممتا بے نام ہے۔ اسی طرح میڈلین بھی لڑتی ہے۔ (ذہن اور جسم میں) دھوپ اور اور بارش کے خلاف۔ اسے ایک تشویش ہمیشہ رہتی ہے۔ کھانا خراب نہ ہو یا پھر کہیں طوفانی مسترال حالات و واقعات کے جیو تش چکر کو نہ بگاڑ کر رکھ دے۔ کسی قدر سنگدلی سے اور جبلّی دانشمندی سے وہ ہر قدم اُٹھاتی ہے۔ کبھی توازن اور استحکام کے مقصد سے کیتھرین کو آگے بڑھانے کے لیے (اقتصادی زاویے سے یا پھر کسی دوسرے زاویے سے۔ نتیجۃً وہ نوٹریوں کی بدبختی کا ذکر کرتی ہے جن کا دارومدار ہر شخص کی نیک نیتی پر ہے ڈاکٹر سے زیادہ وہ اقبال گناہ کرنے والے شخص کی طرح۔) کبھی اس کی تعلیم کے لیے (کیونکہ کیتھرین نے امتحان کے پرچے بہت اچھے کیے ہیں خاص طور پر لاطینی کا پرچہ) لیکن معاملہ جب جارجز کا ہوتا ہے اس کا مادرانہ جذبہ کسی زیادہ شرمیلی، زیادہ غیر تسلیم شدہ چیز کے سامنے سپر ڈال دیتا ہے۔ میڈلین جیسا کہ سب جانتے ہیں انسانی ذہن کو بڑی گہرائی سے سمجھتی ہے، اس بات کو جانتی ہے، جارجز اس پر انحصار کرتا ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اسے بس آنا ہے اور ہمارے پیچھے کھڑا ہونا ہے۔ اور جب ہم سب مل کر شطرنج کھیل رہے ہوں تو میرے شانے پر ہاتھ رکھنا ہے۔ تمام روسیوں کی طرح جارجز یہ قدیم ہندوستانی کھیل خوب اچھا کھیلتا ہے جہاں جارجز کی انگلیوں میں یکایک پھرتی آجاتی ہے۔ وہیں وہ اپنے اندازوں اور حساب کتاب میں احمق بن جاتا ہے۔ وہ ان کے عفریت کے مقابلے میں فرشتہ ہے۔ اب وہ اس کے چیتھڑوں کا بوجھ نہیں اُٹھاتا بلکہ اس کے بنائے ہوئے تاج کو وہ پہن لیتی ہے۔ میرے اعلیٰ برہمن پن کے روبرو یہ تاج شاندار طریقے سے جگمگاتا تو ہے لیکن کسی حد تک فسردہ خاطر سا۔

برہمو! انسان کی نہ دکھائی دینے والی قوّت نے برہمن کے ہاتھ میں ایک کوڑا، ایک ترشول تھما دیا ہے جس سے وہ شطرنج کھیلتا ہے۔ اور اسے کھیلتے ہوئے کوئی دیکھ بھی نہیں سکتا۔ اس نظر نہ آنے والے جادوگر کے حکم پر ہاتھی کبھی جنگل کے اندر چلا جاتا ہے کبھی باہر آجاتا ہے۔ بادشاہ کسی خاموش بد دعا یا منتر کے مطابق ڈھیر ہو جاتا ہے یا چال چلتا ہے۔

الفاظ دورن ذات تشکیل پاتے ہیں۔ ذرا سا دباؤ یہاں، ذرا سا وہاں۔ اس سے مسکراہٹ، غصّہ اور آنسو جنم لیتے ہیں۔ کسی بھی مرد کا عورت پر اس حد تک غلبہ نہیں ہونا چاہیے۔

اس معاملے میں عورت کے پاس کوئی اخلاقیات نہیں ہیں۔ اس کے نزدیک دھرتی کی سُندرتا، مکانوں اور پارلیمنٹوں کی شان و شوکت، تلوار اور زری کا کام چاہے وہ بنارس ہی کا کیوں نہ ہو۔ موتیوں کا ہار، خوبصورت جھولنا، سنیما، سرکس، گرجا گھر۔ سب، سب کے سب جنسی ملاپ اور ثمر داری کا ذریعہ ہیں۔ موت پرے ہٹ جاتی ہے، دُور چلی جاتی ہے۔ قحط ناممکن ہو جاتا ہے اور دیوی ماں کی گودی میں بیٹھے ہوئے بچّے کی مُسکان چمک اُٹھتی ہے، روشن ہو جاتی ہے۔ غالباً تہذیب جوں جوں زمینی ہوتی جائے گی۔ نسائی استقلال بڑھ جائے گا، جیسا کہ امریکہ میں ہوا ہے۔ شمشانوں کے توسط سے موت ختم کر دی جائے گی اور پیار کو بستر کا جذبۂ ہوس بنا دیا جائے گا۔ انسان دھرتی کے لیے اجنبی ہے اسے جانا ہی چاہیے۔"

۲۹ر اکتوبر: آج میں خود کس قدر رومانسا ہو رہا تھا۔ ہم سیانت اونیلی تک نے چاند کی چاندنی میں گئے تھے (میڈلین کا جیوتش گیان اس کا اپنا تھا)۔ آہستہ آہستہ یا شاید حادثہً وہ مجھے زیتون کے پیڑوں کے باغیچے میں لے گئی۔ کچھ کھُمبیاں ڈھونڈنے کے لیے جیسا کہ اس نے کہا۔ بے شک جارج جھاڑیوں اور جھکی جھکی شاخوں کی دنیا میں ہمارے پیچھے نہیں آسکا اس لیے کیتھرین اور وہ اکیلے رہ گئے ایک دوسرے کے ساتھ۔ شام ہو گئی اور میڈلین نے ہمارے نیچے اُترنے کے لیے ایک نیا راستہ ڈھونڈ نکالا۔

"مجھے کل ہی اس کا پتہ چلا تھا" اس نے جھوٹ بولا" اور رام میں تمہیں بھی یہ راستہ دکھانا چاہتی تھی۔ تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ اس پہاڑی کے نیچے کھڑے ہو کر دیکھنے سے ہمارا مکان کس قدر خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔ رام میں بہت خوش ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے میرے گال کا بوسہ لیا۔ وہ جانتی تھی کہ میں جانتا تھا کہ اس وقت اس کا خیال کہیں اور تھا۔

نیا چاند زیتون کے پیڑوں کے اوپر سے پھسل کر ایسے آگیا جیسے وہ بھی ہم راز تھا۔ "مادو۔ مادو۔" کیتھرین آواز لگا کر ہمیں ڈھونڈنے لگی۔ میڈلین نے کوئی جواب نہیں دیا اور میرے منہ پر بھی اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "ش ش۔ جواب مت دینا" چاند جلدی نیچے چلا جائے گا اور نصف

فالج زدہ ہاتھ کے علاوہ جارج کو دکھائی بھی کم دیتا تھا۔ جب ہم سیر کے لیے نکلتے تھے تو میں اسے راہ دکھاتا تھا اور اِدھر اُدھر لے جاتا تھا۔

" میڈلین اور میں پتھروں پر بیٹھ گئے اور بیکار کی باتیں کرنے لگے۔ میں جو کچھ کہہ رہا تھا اسے اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میرے کُنبے کے بارے میں، ہندوستان کے بارے میں اور اس چِٹھّی کے بارے میں جو سرد جانے لکھی تھی۔ میڈلین اپنے کالج کی باتیں کرنے لگی۔ اس کے لیے ہمیشہ یہ موضوع بڑا اہم تھا، خاص طور پر اس کی ہیڈ مسٹرس جو سنت ہونے کے علاوہ کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ وہ میڈلین سے ڈرتی ہے۔ کیونکہ وہ ان میں سب سے زیادہ متوازن ہے۔ ان میں سے بیشتر بوڑھی عورتیں ہیں جو کافی پیسہ نہ ہونے کے باعث ان مردوں سے شادی نہیں کر سکیں جنہیں وہ چاہتی تھیں۔ وہ لوگ جن کے پاس کچھ زیادہ پیسہ نہیں تھا اور ان میں سے زیادہ تر وہ جو یا تو ٹیچر تھے یا میونسپل کلرک تھے انھوں نے ان عورتوں کو رِجھانے، منانے کی کوشش کی تھی۔ یہ وہ دن تھے جب میڈلین کی رفیق کار خواتین ابھی کافی جوان تھیں۔ لیکن پروفیسر تو آخر پروفیسر ہی ہیں اور انھوں نے اپنی تعلیم، مستقبل میں بننے والے اپنے کُنبے کے بارے میں سوچتے ہوئے ان میں سے کسی سے بھی بیاہ نہیں کیا تھا۔ میڈلین ان کے سامنے اپنی ازدواجی زندگی اور اپنی خوشی کا کس طرح مظاہرہ کرتی تھی! کبھی کبھی میں اسے کہہ ہی دیتا تھا خوشی کی ضرورت تو سرکاری مقاصد کے لیے ہوتی ہے۔ کوئی اتنی دور نہیں جاتا کہ ایک ہندوستانی سے شادی کرلے چاہے وہ کتنا ہی چُست اور کھاتا پیتا ہو۔ اور بہت سے لوگوں کی نظر میں میں کم سے کم چھوٹا موٹا راجکمار تو ہوں گا ہی۔ کیونکہ سارا ایکس یہی سمجھتا ہے۔ جب تک کہ وہ اپنے چہرے پر یہ ثابت نہ کر سکے کہ خوشی محض ضمنی قسم کی پیداوار نہیں ہے بلکہ اس کی روزمرّہ زندگی کا حصّہ ہے۔ عورت کے لیے خوشی ایک سماجی میزانِ مقدار ہے۔ اس کے اپنے سچ کا ثبوت!

جارج ناخوش ہوا ہوگا کیونکہ ہوا اب بھی کافی تیز تھی۔ مسترال تو نہیں لیکن سمندر سے آ رہی ہوا۔ وہ لنگڑاتا ہوا نیچے اُترا ہوگا۔ کم و بیش گدھوں کی طرح کان نیچے کی طرف کیے ہوئے جب وہ پہاڑوں سے زیتون کے بیرل ڈھو رہے ہوتے ہیں۔ کیتھرین بھی خوش نہیں

رہی ہوگی ۔ وہ شرما گئی ہوگی۔ غالباً یہ پہلا موقعہ تھا جب کسی مرد کے ساتھ اکیلے میں ملی ہوگی اور وہ بھی شام کو ۔ وہ ضرور ڈر بھی گئی ہوگی کہ وہ کہیں اس کے ساتھ کچھ کر نہ بیٹھے لیکن ہم جب نیچے اُترے تو وہ دونوں ہاتھی پر بیٹھے تھے، دو بچوں کی طرح جو کسی گڑیا پر لڑ پڑے ہوں ۔ اور اس انتظار میں ہوں کہ ان کی ماں آکر ان کے جھگڑے کو نمٹا دے ۔ اس لیے جونہی کیتھرین نے ہمیں دیکھا اس کا چہرہ خوشی سے جگمگا اُٹھا ۔ اس کی آواز تک بدل گئی ۔ اور کسی اسکولی لڑکی کی طرح سسکنے لگی ۔

"ہم کچھ کھمبیوں کی کھوج میں گئے تھے ۔ وہ اتنی لذیذ ہوتی ہیں ۔ میں چاہتی ہوں کہ جانے سے پہلے تم انہیں چکھ لو۔" میڈلین چلائی ۔ آخری جملہ جارجز کے لیے تھا تاکہ وہ جان لے کہ کیتھرین یہاں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نہیں رہے گی ۔ کیتھرین اور میڈلین دونوں نے جارجز کو رات کے کھانے تک رکنے کی درخواست کی اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ مان گیا ۔ ہم نے چاول اور کڑھی بنائی ۔ کم سے کم میں نے اور کیتھرین نے بنائی ۔ جبکہ جارجز اور میڈلین ڈرائنگ روم میں بیٹھے بدھ دھرم پر باتیں کرتے رہے ۔ جارجز کبھی اتنا خوش نہیں ہوتا جتنا اس وقت جب وہ تجریدی موضوعات پر گفتگو کر رہا ہوتا ہے اور خاص طور پر اس وقت جب میڈلین آس پاس ہوتی ہے ۔ اس کے نزدیک میڈلین پہچان کا ثبوت ہے ۔ شانے پر کا وہ لمس جو کہتا ہے "ہاں ، یہ مکمل ہے" اور تب دنیا جتنی واقعی ہے اتنی روشن نہیں لگتی ! جارجز کے نزدیک اگر ہر شے اپنی جگہ پر ہے تو وہ پوتر ہے ۔ گھنٹی ، موم بتی اور دھوپ دانی کی طرح ۔ اس طرح ایشور کی عظمت کا جشن منایا جا سکتا ہے ۔ دراصل جارجز ایک مقدس سرکاری افسر ہے ۔

پھر اس میں بھی کیتھرین اور اس میں بہت کچھ یکساں ہے کیونکہ ایک قانون یا اصول کا تسلسل اور تعیّن ہی بذاتِ خود قانون ہے صرف وراثت کے سلسلے کا فرق ہے ۔ جارجز کی حکمرانی سورگ میں ہے اور کیتھرین کی دھرتی پر ۔ صرف ایک سیڑھی کی ضرورت ہے ۔ ایک زرّیں سیڑھی کی !

مجھ پر شک سوار ہو رہی ہے ۔ لہٰذا مجھے رُک جانا چاہیے ۔ میں کسی سے ناراض ہوں ۔ مجھے اس ناراضگی کو بیج کے روپ میں ہی ختم کر دینا چاہیے ورنہ یہ بھوہر کی طرح سب جگہ پھیل

جائے گی اور پھر اپنی زمین کو اس سے نجات دلانے کے لیے بہتر قسم کی دخل اندازی کی ضرورت پڑے گی۔ اوہ۔ دھان کے کھیت زرد رنگ اختیار کرتے ہوئے ہرے بھرے کھیت جو نہر سے تالاب کے باندھ تک پھیلے ہوتے ہیں اور پھر تالاب کے باندھ سے ہم وتی کے آر پار پھیلے ہوئے کٹھل کے کھیتوں تک ۔۔ اور ناریل کے باغیچوں تک ۔۔ دادا رمنا ان بوڑھے کھوسٹ لوگوں کو اپنشد سناتے ہیں جو ہر روز بعد دوپہر سننے کے لیے آتے ہیں اور کہتے ہیں: "اوہ، ہاں یہ 'مایا' کسی بانجھ کے بیٹے کی طرح ہے یا پھر کسی خرگوش کے سینگ کی طرح!" اور سر منڈھی بیوہ عورتیں اور گچھے دار بالوں والے لوگ کہتے ہیں" سچ مچ ایسا ہی ہے رمّانور!" مجھے بھٹ مونا چاہیے تھا اور مجھے اپنے دھان کے کھیتوں کی دیکھ بھال کرنی چاہیے تھی۔ گوڑ پاد کی کاریکا کے ساتھ مانڈوکیہ اپنشد پڑھنا چاہیے تھا۔ اور پھر اس پر شنکر کی کومینٹری ارامائن اور اُترکانڈ پڑھنا چاہیے تھا۔ خاص طور پر دیہاتیوں کے فائدے کے لیے۔ اپنا تانبے کا گلاس اور چمچ لے کر تعزیتی دعوتوں میں شامل ہونا چاہیے تھا۔ اپنے کاندھے پر شال سجائے منہ میں پان دبائے (اپنی دکشنا کو بھولے بغیر۔ دھوتی کی انٹی میں اڑوسا ہوا چاندی کا سکہ!) ڈکار لیتے اور تھوکتے ہوئے میں گھر آتا جہاں کوئی کومُدی یا رُکمنی میری ٹانگیں دباتی اور میرے پاس بیٹھ کر پنکھا کرتی۔ "واہ، کیسی ٹھنڈی ہوا ہے" پر بھو سو جاتے چاہے جانور پانی پینے آتے یا کسان جیوتش کے لیے آتے۔ انھوں نے آج ڈیڑھ روپیہ دیا۔ اشٹ ستمبھی بھون ننجو دیا نے۔ راما تعزیتی دعوت کے بعد جھپکی لے رہے ہیں۔

کسان دروازے پر کھیرے اور ککڑیاں چھوڑ جاتا ہے 'ماں پنڈت جی سے کہہ دیتا کہ کچھو ٹما کل آئے گا، ہمیں ندی میں کشتی اُتارنی ہے' جاگنے پر رُکمنی یا کومُدی گرم گرم کافی دے گی اور جونہی شام کی پرارتھنا ختم ہوگی پان چبایا جا چکے گا اور رسوئی کے برتن مانجھے دھوئے جا چکیں گے تب ایک گلاس گرم دودھ سے کیا مزا آئے گا اور پھر پہلو میں رُکمنی کے جوان جسم کا حسن! اس میں سے کستوری اور پرندوں کے گھونسلوں کی خوشبو آتی ہے...

" نہیں۔ میں کبھی برہمن نہیں بنوں گا۔ تعزیتی دعوت میں اتنا کم کھانے والا۔

میں اپنے کپڑے پھاڑ کر ہمالیہ پربت کے لیے نکل پڑوں گا۔ کوئی دیوی شکتی مجھے پکارتی رہی ہے۔ میری ماں میں ضرور جاؤں گی۔"

یکم نومبر: "مجھے کم بولنا چاہیے خود اپنے آپ سے بھی کم بولنا چاہیے!"

۳۔ نومبر: "کل رات ایک بار پھر ایسا ہوا۔ وہی خالی پن، وہی میرے اندر کی بڑی آم کی گٹھلی جیسا اور مجھے یاد آ گیا جو میری دادی نے آم کی گٹھلی کے بارے میں کہا تھا۔ 'میرے بچے اگر تم اسے نگل جاؤ تو یہ تمہارے بھیتر اُگ کر بڑھتی جائے گی۔ اس کی شاخیں باہر نکل آئیں گی۔ پہلے نتھنوں سے، پھر کانوں سے، پھر منہ سے اور وہ اتنی بڑی ہو جائے گی کہ تمہارے اندر سے پیڑ بن کر باہر آ جائے گی۔' ساری رات میں اسے اپنے اندر لیے لیٹا رہا۔ اور صبح تک نہیں سو سکا۔ میڈلین بھی، میں سُن رہا تھا۔ بستر میں دیر تک کروٹیں بدلتی رہی تھی۔ تب اس کی آنکھ لگ گئی اور خواب میں بولنے لگی۔ میں سمجھ نہیں سکا وہ کیا کہہ رہی ہے لیکن وہ خوش بھی نہیں تھی۔ کسی بھی عمل میں بذات خود عمل کے علاوہ کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن اگر آم کی گٹھلی اس میں داخل ہو جاتی ہے تو پھر یہ عمل تین قسم کا عمل بن جاتا ہے۔ ایک پہلے ایک بعد میں اور درمیان میں کسی کی بھی جگہ نہیں ہوتی جسے کوئی بھی نہیں چاہتا۔ یہ پلیگ کی وبا میں مرے ہوئے چوہے کی طرح ہوتا ہے۔ تم اسے اپنے گھر کے سامنے سے اُٹھا کر اپنے پڑوسی کے مکان کے دروازے پر پھینک دیتے ہو اور وہ کسی اور کے گھر کے دروازے پر پھینک دیتا ہے اور پھر وہ شخص اسے کسی بیوہ یا کسی داشتہ کے مکان کے برآمدے میں ٹیک جاتا ہے۔ وہ اسے پونچھ سے پکڑ کر اُٹھاتی ہیں اور مچھروں، پسّوؤں وغیرہ کے ساتھ کسی مناسب کوڑے دان میں پھینک دیتی ہیں۔ جب تک میونسپل کمیٹی کی گاڑی نہیں آتی اور اسے لے نہیں جاتی وہ وہیں پڑا رہتا ہے۔ چُھوت سے لگنے والی بیماری کی یاد کے روپ میں۔ بلاشبہ کچھ لوگ اس سے مر بھی سکتے ہیں...

"یہ ساری بات میرا خیال ہے اس سنیچروار رات کو شروع ہوئی۔ بے شک شام کی سیر کا سلسلہ چل رہا تھا۔ قدیم کلاسیکی شاعروں کسی سچائی سے۔ بنی نوع انسان کے عیاشانہ رجحانات پر تی بی اور اس کے اثرات گیتوں میں ڈھالا ہے۔ بلاشبہ جادجز ہر شام آیا کرتا تھا اگرچہ وہ بڑا معصوم انسان تھا یہ سمجھنے کے لیے زیادہ وقت نہیں لگتا تھا کہ اسے کیا جان لینا چاہیے تھا۔

ایک سچے اور اچھے انسان کی طرح وہ اپنا کھیل احتیاط سے، صحیح طریقے سے کھیل رہا تھا۔ اب وہ میڈلین کے لیے۔ بہت کم پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے۔ کبھی کبھی ہم بھی سہولت کے لیے پیچھے رُک جاتے ہیں یا گھر لوٹنے کا کوئی مختلف راستہ اختیار کر لیتے ہیں۔ کیونکہ ہمیں اپنے دست و بازو کو استعمال کرنے میں کافی مہارت ہے اور بکریوں کے چلنے کے راستے سے پھلانگتے ہوئے آسانی سے نیچے آ سکتے ہیں۔ سیانت اوفیلی کے شروع میں ہی میڈلین چلاّ کر کہتی ہے۔ کیتھرین رام کو سردی لگ رہی ہے اور تم جانتی ہو اسے مناسب ورزش کی ضرورت ہے۔ اس لیے ہم دوڑتے ہوئے چلیں گے"! اور میرے بازو میں بازو ڈال کر وہ مجھے پہاڑی کے نیچے گھسیٹ لاتی ہے حالانکہ میرے پھیپھڑوں میں درد ہوتا ہے۔ میں دخل نہیں دیتا "کیتھی جارجز کا خیال رکھنا" وہ زیتون باڑی کے نیچے سے دوبارہ چلاتی ہے۔ "کیتھی جارجز کا خیال رکھنا" اور جواب میں ہم جارجز کی آواز سُنتے ہیں "مزے اڑاؤ ہم سوپ پینے کے لیے جلدی لوٹ آئیں گے"

پوری ایمان داری سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جارجز ناخوش ہے۔ اگر اس کی آواز میں بے ساختگی نہیں ہے کم و بیش معصوم سی لہک تو بھی وہ انسانی لمس سے خالی نہیں ہے کیونکہ جارجز بھی سبھی انسانوں کی طرح دوسروں کا دھیان رکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کا بھی خیال رکھا جائے۔ کوئی نہیں جانتا کہ اس نے اپنی زندگی میں کسی سے پیار کیا بھی ہے یا نہیں۔ وہ اس کا کبھی ذکر نہیں کرتا لیکن اس کے دل و دماغ پر کہیں نہ کہیں کوئی زخم کا نشان دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے بے حرکت بازو کسی اندرونی واقعہ کے خارجی مظہر لگتے ہیں۔ کیتھرین میں ایک چیز ہے جسے جارجز دیکھے بنا نہیں رہ سکتا۔ وہ اس کا کنوارا پن ہے' اس کی معصومیت ہے۔ گرجا گھر کے معنوں کی معصومیت۔ کیونکہ میری سمجھ میں کیتھرین وہ سب جانتی جو اسے عورت کے طور پر یا ہونے والی ماں کے طور پر جاننا چاہیے۔ اور وہ اچھی کیتھولک ہے۔ مابعد الطبیعاتی گفتگو میں اسے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ یہ بات ایسی ہے جس کی اس معاملے میں مثبت نوعیت ہے اور اس کے حق میں جاتی ہے۔

"تصور کیجیے کیتھرین چار بچوں کے جھنڈ میں! وہ کہتی ہے وہ کم از کم چھ چاہتی ہے۔ وحدت، فطرت اور دین مانی پر بحث کرتی ہوئی! جارجز چینی زبان سیکھ رہا ہے تاکہ ایک

خانقاہی پوشاک اور دوسری خانقاہی پوشاک میں فرق بتا سکے۔ ایک مخصوص فرقہ ممکن ہے اونٹ کے بالوں سے بنی پوشاک پہنتا ہو جبکہ دوسرا یاک کے بالوں سے بنی پوشاک۔ جارجز کے نزدیک اس سے ہی ان کے جابلا اصولوں میں ہیں پورا پورا فرق پڑ جاتا ہے۔ جارجز کے لیے روایت لغت کی طرح ہے۔ لفظوں کے صحیح معانی بتاتی ہے۔ پر ذرا سوچیے، کیتھرین لفظ: ات سویا کی تو کی شکل کی نوعیت جاننا چاہتی ہے جس کا مطلب چینی زبان میں میں نے کہیں پڑھا ہے "دو کے بیچ" یا "نہ دکھائی دینے والا" ہے۔ اس کا اطلاق مُنے جانے والے کپڑے پر بھی اتنا ہی ہوتا ہے جتنا اس خیال پر جسے تشکیل کیا جاتا ہے۔ شاید بدھ مت سے اخذ کرنے کے باعث بانی پرست اس کو خیال و فکر پر بھی لاگو کرتے تھے اور جہاں تک جارجز کا تعلق ہے وہ وحدت فطرت کے پیروکاروں کو اسے بطور لباس قبول کروا دے گا۔ سخت مواد سے بنا کپڑا، کسی سخت پھل کا ریشہ یا پیڑ کی چھال جیسے اکیشیا، سنّا وغیرہ وغیرہ...

میں نے میڈلین کی باتیں یقین کے ساتھ سنیں۔ میں جانتا ہوں اور مجھے یقین دلانے کے لیے کوشش کی ضرورت نہیں ہے کہ کیتھرین جارجز کے لیے صحیح بیوی، اعلیٰ رفیقِ حیات اور مقدس ساتھی ہے۔ اگر اس میں کچھ بھی نہ ہوتا تو بھی وہ کم از کم جارجز کے لیے جذباتی مسئلہ نہیں بن سکتی۔ جارجز کو اپنے کام اور دعا کے لیے سب سے زیادہ سکون اور آرام کی ضرورت ہے۔

یہ سچ ہے کہ میڈلین اس کے لیے کشش رکھتی ہے۔ وہ جس شے سے اسے اپنی جانب متوجہ کرتی ہے وہ ایسی شے ہے جسے وہ حاصل ہی نہیں کر سکتا اور قطعاً کرنا بھی نہیں چاہیے۔ کسی اور موضوع کے سلسلے میں اس کے اپنے ہی قول کے مطابق "یہ شہوت پرستی" ہے۔ جارجز کو میڈلین کے ذہن کی سنجیدگیاں، اڑانیں، صاف ستھرے کھلے میدان۔ اس کے دلدل اور صاف شفاف خاموشیاں پسند ہیں۔ اسے یہ احساس ہے کہ اس کے قریب رہنے کا مطلب ہے اپنے آپ کو ذہین محسوس کرنا۔ میڈلین کے قریب رہتے ہوئے کوئی گناہ آلودہ خیال اس کے ذہن میں ٹھیک اسی طرح نہیں آسکتا جس طرح ایسا خیال اس کے ذہن میں بہتی ہوئی ندی کے کنارے نہیں آسکتا۔ نہیں۔ بالکل وہی نہیں لیکن کم و بیش ویسا ہی۔

دوسری طرف کیتھرین بڑی محفوظ، بڑی جانی پہچانی لڑکی ہے (جیوتش کے زبان میں کیتھرین کیپری کارن یعنی مکر راشی کی ہے اور میڈلین سکارپیو یعنی ورشچیک راشی کی اور اسی سے دونوں چچیری بہنوں میں بڑا فرق ہے)۔ کیتھرین کو یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کہ جارجز کو کہاں آرام کرنا چاہیے۔ اپنے فالج زدہ ہاتھ کی پوزیشن بدلنے کے لیے کہاں رکنا چاہیے کبھی وہ اسے بائیں کہنی پر ٹکا دیتا اور کبھی دونوں ہاتھوں کو آپس میں جکڑ لیتا تھا۔جس طرح میں دادا کٹنا سے پوچھتا تھا۔" داداجی۔ اب میں آپ کو نسوار کی ڈبیا دوں؟" اور دادا کٹنا کہتے تھے: "اچھے لڑکے تم کتنی اچھی طرح جان جاتے ہو جب مجھے اس کی طلب ہوتی ہے"۔ اور مجھے اپنی چاندی کی نسوار کی ڈبیا کھولنے دیتے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ جب وہ پڑھتے پڑھتے رک جاتے تھے تو اس لیے نہیں کہ صفحے کا آخر آپہنچا ہے بلکہ اس لیے کہ وہ کچھ سمجھنا چاہتے تھے کسی فلسفیانہ نقطے کو ذہن کی گرفت میں لانا چاہتے تھے۔ یا شاید لمحۂ انکشاف کا انتظار کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت وہ نسوار ہی تھی جو معجزہ کر دیتی تھی۔ کیتھرین کا معاملہ بھی ٹھیک اسی طرح ہے۔ جب کوئی خیال جارجز کا پیچھا کر رہا ہوتا ہے اور تاریک کمرے میں مکھی کی طرح اس کے سر کے اردگرد چکر پر چکر کاٹتا ہے تو وہ رویاں اور پشتے کی باتیں کرنے لگتی ہے۔ زوبی کے سفارتی عہد ملازمت کی کہانیاں۔ (اگرچہ یہ عہد ملازمت بڑا مختصر تھا)۔ یا چچا چارلس اور ری پبلک کے بارے میں ان کے چٹکلے سنانے لگتی ہے۔ کیتھرین شروع کرتی ہے۔ چچا چارلس نے ایک بار بڑے فخر سے بتایا: میرے گاؤں میں لوگ کہتے ہیں کہ جب ۱۸۷۰ء میں تیسری ری پبلک کا اعلان ہوا تو میری پر لہراتے ترنگے کو سلام کرنے کے لیے صرف ایک آدمی تھا اور ایک کتیا۔ اس آدمی کا نام تھا لے ہنری پرتی شو اور اس کے "کتے" کا نام تھا زی زی۔ اس لیے ہم تیسری ری پبلک کو زی زی پرتی شو کی ری پبلک کہتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ چوتھی ری پبلک کو بھی ایسا معزز اور منفرد نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اسے بھی می می پرتی شو ری پبلک کے نام سے پکارا جانا چاہیے۔ اس مشہور خاتون کے اعزاز میں جس نے پردے کے پیچھے رہ کر اس عظیم ری پبلک کی تشکیل میں اپنا رول ادا کیا"۔ جارجز یہ سُن کر کہنے لگتا" واہ کیتھرین کیا ایسا ہوا تھا: تمہارے پاس کیسی کیسی شاندار کہانیوں کا ذخیرہ ہے"۔

کیتھرین کچھ زیادہ نہیں چاہتی۔ وہ اس آدمی کے ساتھ بس گھومنا پھرنا چاہتی ہے اور جب انگریز کے بنگلے اور کتّے والے کونے تک پہنچ جائیں تو وہ کہتی ہے۔ "کیا ہم تھوڑی دیر کے لیے یہاں رُک جائیں"۔ پھر دیکھئے اس نیک تجویز سے جارجز کس قدر ممنون دکھائی دیتا ہے اس کے چشمے پر شام کے سورج کی کرنیں پڑ رہی ہوتی ہیں اور وہ سر سے پاؤں تک پروفیسر لگتا ہے۔ یا جب وہ لنگڑاتے لنگڑاتے اور اوپر جاتے ہیں اور وہ کہتے ہیں: "اسکولی بچّے یہی کرتے ہیں۔ چوپایوں کی طرح ہاتھوں اور پاؤں کے بل چلنے والے بچّے"۔ اس موقعے پر جارجز ہنسنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ کیتھرین نہ تو بیوقوف ہے اور نہ اَن پڑھ۔ لیکن اس کے اندر کچھ ایسی اُٹ پٹی ہمدردی ہے جس سے عورتیں سوچنے لگتی ہیں کہ آدمی سنیما دیکھنے لے جانے سے یا اس کی پسند کا کیک کھلانے سے یا صاف بڑھیا رومالوں کا پیکٹ دینے سے خوش ہو جاتا ہے۔ کیتھرین کا دل اپنی صحیح جگہ پر ہے۔ صرف اس کی مابعدالطبعیاتی تربیت کی ضرورت ہے۔ اگر وہ واقعی کیتھولک ہے جیسا کہ وہ کہتی ہے تو اسے سینٹ جان کے اس عظیم قول کا علم ہونا چاہیے "کیونکہ پیار ایشور کا ہی ہے۔ اور جو پیار کرتا ہے وہ ایشور کو ہی پیار کرتا ہے"۔ اگر کیتھرین صرف اپنا چہرہ ہی سمجھ لے تو مجھے یقین ہے کہ وہ دیکھ لے گی کہ اس میں کیسی سُندرتا آگئی ہے۔ کیسا نکھار آگیا ہے اور کیسی مکمل امید پیدا ہو گئی ہے۔ وہ عام لوگوں جیسا اعتقاد رکھتی ہے اور اس کی مدد سے چیزوں کو سمجھتی ہے۔ مقامی گاڑی کی طرح جو ہمیشہ کسی نہ کسی طرح صحیح اسٹیشن پر پہنچ ہی جاتی ہے۔ وہ جانتی ہے اس کا مقدّر اس مرد سے وابستہ ہے۔ جب وہ اپنی چچیری بہن مادو کو بار بار چومتی ہے تو یہ صرف پیار نہیں ہوتا بلکہ ممنونیت کا اظہار ہوتا ہے۔

اس دن ہم نے کیتھرین کو جارجز کا بازو پکڑتے ہوئے دیکھا۔ شاہراہ پر نہیں بلکہ جب وہ بے صبری سے خچّروں کے چلنے کے راستے پر اُترنا چاہتا تھا اور فاصلے کو موڑ کاٹ کر اور جلدی سے سفر کے مدارج طے کر کے کم کرنا چاہتا تھا۔ لیکن جونہی وہ بڑی سڑک پر پہنچا وہ بولا: "شکریہ مِس!" جیسے اپنی کسی شاگرد سے کہہ رہا ہو۔ میڈلین کا بازو وہ شاذونادر ہی تھامتا ہے۔ وہ اس کی ضرورت سے زیادہ عزت کرتا ہے اور شاید اسے اس کو خوف بھی آتا ہے کوئی ایسا خوف جس کو کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔

اس طرح ایک کے بعد ایک شام کسی بھی طرف سے ایک لفظ تک کہے بنا، کوئی اہم اشارہ کیے بنا ہی گزرتی جاتی ہے (کیونکہ میڈلین انتظار کرتی ہے اور کیسی فکر مندسی ہر شام گھر لوٹتی ہے اور کیتھرین کے ہونٹوں پر بڑی چالاکی سے نگاہ ڈالتی ہے۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ سُرخی کہیں سے مجروح ہوئی ہے یا نہیں — میرے نزدیک یہ ٹھیک اسی طرح ہے جیسے اونچے طبقے کے مسلمان گھرانوں میں خواجہ سرا یعنی ہیجڑے عروسی چادروں کا امتحان کرتے ہیں۔ ساس کو یہ بتانے کے لیے کہ دولہا، دلہن میں سہاگ رات کو معاملہ جم گیا ہے،) پھر بھی سب کچھ لے اون کے بعد ویلینس، مون تلے مر اور ترسکان سے ہو کر نکلتے ہوئے رون کے پرسکون معمول کے بہاؤ کا سا محسوس ہوتا ہے جیسے بالآخر کشادہ، ناگزیر سمندر کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ دنیا کے وسط کی ان آبی وسعتوں میں ایک مقام ہے۔ انتہائی متبرّک جگہ اور وہ ہے سیانت ماری ولا میاڈ یہاں سال میں ایک بار جپسی آتے ہیں اپنے سنت کا تہوار منانے کے لیے کیونکہ یہیں اسی مقدّس ریت پر پہلے پہلے عیسائی میری میڈلین کے تبرکات لے کر آئے تھے اور انہیں یہاں کے غاروں اور تہ خانوں میں اس وقت تک کے لیے چھپا دیا تھا۔ جب تک کھلے طور پر ان کی موجودگی کا اعلان کیا جا سکے اور پھر وہاں سیاں میکسمیاں کا کیتھیڈرل تعمیر کر دیا جائے اور اس کی مدح و تعریف کی جا سکے۔

اگر جارجز شادی کرے گا تو وہ بلا شبہہ سیاں میکسمیاں میں چیپل آف میری میڈلین میں ہوگی۔ اس کے بارے میں قطعی طور پر کوئی شبہہ نہیں۔ ایک گواہ فادر ذے نو بیاس ہوں گے اور دوسرا میں انکل چارلس کو یہ بڑا اچھا لگے گا اور وہ زندگی بھر ہمارے شکرگزار رہیں گے۔

ہاں بس ایک اشارے کی دیر ہے ورنہ ہر چیز یہاں تیار ہے۔ کھردرے ڈھنگ سے۔ کہیں تو یہ صرف سہاگ رات کی چادر کی جانچ پرکھ نہیں ہوگی — اور میڈلین نے اب تک یہ پوری طرح سمجھ لیا ہے — بلکہ یہ روحانی ارتفاع اور دلوں کی رفاقت و ترسیل کے توسط سے ہونے والا دہ معجزہ ہوگا جس سے ناگزیر ظاہر ہو کر سامنے آ جائے گا گیان یا علم کے طور پر نہیں بلکہ ایک زندہ حقیقت، ایک اعتراف، اپنے وجود کی پرستش گاہ پر ایک اٹوٹ بندھن

کے روپ میں!"

ان صفحات کو پڑھتے ہوئے مجھے احساس ہوتا ہے کہ کس طرح ایک خاص قسم کا عامیانہ پن میرے وجود میں داخل ہو گیا تھا۔ میں جو اپنے آپ کو بڑا عظیم، پاک اور شفاف دانشور سمجھتا تھا۔ اور اس عامیانہ پن نے مستقبل میں رونما ہونے والے اُلجھے ہوئے دُکھ بھرے ناگوار مسائل کو بھی ظاہر کر دیا تھا۔ افسوس! یہ مسئلہ ایسا ہے جسے ماہر تحلیل نفسی نہیں سمجھا سکتا۔ بلکہ مابعد الطبعیات کا ماہر ہی اس کی تشخیص کر سکتا ہے۔

تحلیل نفسی کا ماہر آخر محض کسی ہندوستانی جادوگر کی طرح جو آپ کے سامنے آم اُگا سکتا ہے۔ لیکن آپ اسے کھا نہیں سکتے۔ وہ ضلع کے خزانے کی ساری دولت منگوا کر آپ کے سامنے ڈھیر کر سکتا ہے۔ لیبل، مہر اور تمام چیزوں سمیت لیکن آپ اس ڈھیر میں سے تانبے کا ایک سکہ تک نہیں اُٹھا سکتے۔ وہ رسی کو اونچا اُٹھا سکتا ہے اور چڑھتی ہوئی رسی کے ساتھ سورج بھی اوپر چڑھ سکتا ہے لیکن آپ سورج تک نہیں پہنچ سکتے۔ نہ ہی آپ اس لڑکے کی طرح ہو سکتے ہیں جو ایک ٹوکری میں باندھ کر رکھا ہوا ہے اور تلوار اور چاقو سے اس کے ٹکڑے کر دیئے گئے ہیں اور جب اسے 'بالو' 'بالو' کہہ کر پکارا جاتا ہے تو وہ ناریل کے پیڑ سے نیچے اُتر آتا ہے۔ نہ آپ 'بالو' ہو سکتے ہیں اور نہ ہی میں گاؤں کا کارندہ یا ماہرِ نفسیات کا تعلق غیر حقیقی اشیا سے ہے۔ پھر بھی کوئی بھی ذہن یعنی من سے خوش یا ناخوش نہیں۔ ہم خوش یا ناخوش اپنے دل سے ہیں۔ ہم اپنے دل کے بارے میں اتنا ہی جانتے ہیں جتنا سگمنڈ فرائڈ لیونارڈو کے وجود کے بارے میں جانتا تھا۔ تحلیلِ نفسی کے ماہرین کے جادو نے ثابت کر دیا تھا کیونکہ لیونارڈو کے منہ میں کام کرتے وقت ایک پر تھا اس لیے عظیم اطالوی مصور ہم جنسیت کا شکار تھا یا اس کی شخصیت میں "دوئی یا باہم متضاد رجحانات" پائے جاتے تھے۔ تحلیل نفسی یہ ثابت کرنے سے قاصر ہے کہ لیونارڈو نے سینٹ این یا سنٹ جان دی بیپ ٹسٹ کے پُرتر سینے کی تصویر کیسے بنائی۔

یہ عامیانہ پن کسی طرح کے ردِ عمل سے پیدا ہوا۔ میری کہانی سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ ہم کس طرح بھٹک کر ندی کے بھنور میں پھنس گئے۔

ٹھیک اسی طرح جیسے ہر سچی بات سادگی سے غیر ڈرامائی انداز میں ہو جاتی ہے یہ بھی انتہائی فطری انداز میں ہوا۔

ایک شام کیتھرین کچھ اداس لگ رہی تھی۔ ہم سب معمول کے مطابق شام کو سیر کرتے ہوئے سیاں اوفیلی گئے ہوئے تھے۔ میں تھوڑی دیر کے لیے رُکا، اس کے پاس رہنے کے لیے، اس کو ٹٹولنے کے لیے، اس کو جاننے کے لیے یا پھر اسے کچھ امید، کوئی مشورہ دینے کے لیے۔ جو کوئی عمر میں بڑا ہونے کے ناطے، بڑے بھائی کی طرح دے سکتا ہے۔

بلاشبہ یہ میں نے اپنے ہندوستانی ہونے کے مخصوص جذبے کے تحت کیا کیونکہ ہندوستان میں ہر وہ عورت جو آپ کی بیوی نہیں ہے یا داشتہ نہیں ہے آپ کی بہن ہے۔ اس دھرتی کی ہر عورت کے تئیں وہ چاہے کوئی بھی ہو اور دنیا کے کسی حصّے کی رہنے والی ہی کیوں نہ ہو، آپ بھائی کی ذمہ داری محسوس کرتے ہیں۔ اگر اس کا بس چلے تو ہندوستانی مرد جس عورت سے بھی ملے گا اس سے راکھی بندھوائے گا اپنے آپ کو اس کا بڑا بھائی سمجھے گا اس کے پیار کی رکشا کرے گا اور شادی یا بچّے کی پیدائش کے موقع پر ماموں ہونے کا فخر محسوس کرے گا اور پھر یتیموں کو اپنی پناہ میں رہنے والے بچّے یا بھانجے سمجھے گا۔ اس طرح خطرے کو ٹال دیا گیا ہے۔ ہیرو کا سر فخر سے اونچا ہے اور جب آپ کی موت ہو جائے گی تو اور کوئی روئے نہ روئے آپ کی بہن آپ کے لیے ضرور آنسو بہائے گی۔

اسی لیے میں کیتھرین سے مذاق کرنے لگا۔ کیونکہ مذاق عورت کو رکشا کے بندھن میں باندھنے کا ہی ایک حصّہ ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ وہ میری ننھی منّی بیٹی ہے۔ میری بھانجی ہے۔ بھتیجی ہے اور چونکہ جارجز میرا بھائی ہے اس لیے وہ میری بھابی ہے۔ کیتھرین آہستہ آہستہ کھلنے لگی اور اس نے اپنے بارے میں اس گہری افسردگی کے بارے میں بتایا جس کا کوئی نام نہیں رکھا جا سکتا اور جو سمجھ سے باہر ہے۔

”مجھے خوش ہونا چاہیے بہت خوش میرے بھیّا!“ وہ بولی۔ ”لیکن میرے اندر بہت دُکھ ہے، بہت دُکھ! ایسا لگتا ہے یہ میرے وجود کی گہرائیوں سے اُبھر کر آ رہا ہے۔ میں رونا چاہتی ہوں۔ میں میڈلین کو رات کو اپنے پاس بُلانا چاہتی ہوں۔ اس سے التجا کرنا

چاہتی ہوں کہ وہ میرے ساتھ لیٹ جائے، میرے ساتھ رو دے، میری حفاظت بھی کرے۔ رام! میں نہیں جانتی کہ یہ کیا ہے۔ بس درد ہوتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ میں کیا جواب دے سکتا تھا۔ صرف ایک عورت ہی اس کو سچ بتا سکتی تھی۔

پھر بھی میں نے کہا "کیتھرین اصل بات یہ ہے کہ جب لڑکی عورت بننے والی ہوتی ہے تو اس کے اندر ساری کائنات باغی ہو جاتی ہے۔ جیسے کسی سلطنت کے اقتدار کے ہاتھ سے نکل جانے کا خطرہ ہو۔ یا اس کی گپھا کے دروازے پر کوئی راکشس آ کھڑا ہوا ہو۔ اور اس کا سب کچھ خوف و کرب اور خون میں کھو جانے والا ہو۔ یہ آمدِ بہار سے پہلے مارچ میں گرنے والے پالے کی طرح ہے۔ موت اور زندگی مخالف اشیا نہیں ہیں بلکہ باری باری ہونے والے واقعات ہیں۔ ٹھیک بہار، سردی، گرمی اور برسات کی طرح ۔ برسات سے پہلے ہندوستان میں لوگ بڑا دکھ اور تکلیف محسوس کرتے ہیں۔ یا پھر جیسے لوگ موسم بہار میں مر جاتے ہیں۔ جانتی ہو اکثر بوڑھے لوگ سردیاں ختم ہوتے ہی، موسم بہار کے شروع میں مر جاتے ہیں۔ اس لیے کیتھرین!" میں اپنی بات کو ختم کرتے ہوئے کہا "موسم بہار میں اتنا سارا دکھ ہوتا ہے۔ آپ جنم نہیں لینا چاہتے کیونکہ موت، سردی کا موسم، شکستہ شانتی کی طرح لگتے ہیں۔ آدمی کے لیے میرا مطلب ہے مرد کے لیے موسم گل میں کود پڑنا اس کی موت ہے۔ لیکن عورت کے لیے زندگی کی یہ چھلانگ درد و کرب ہے، علم ہے، گیان ہے۔ تواتر ہے، تسلسل ہے۔ عورت درد اور تسلسل ہم معنی ہیں اور آدمی کے لیے موت اور مسرت ہم معنی! یہی اسرار تخلیقِ کائنات ہے۔" میں کچھ اس طرح بات کرتا گیا جیسے میں کیتھرین کا نہیں بلکہ میڈلین کا ذکر کر رہا تھا۔

ہم رُک رُک کر آہستہ آہستہ چلتے رہے جیسے علم ہمارے لیے درد تھا اور اسرار مسرت! ہم چلتے چلتے چٹانوں اور پیڑوں کے پاس رُک جاتے۔ ہم پل پر بیٹھ گئے اور خالی زمین پر پتھر پھینکنے لگے۔ ہم خاموش تھے حالانکہ ہم جانتے تھے ہم ایک دوسرے سے گفتگو کر رہے تھے۔ اس وقت کیتھرین نے جارجز کے بارے میں سوچا ہوگا کیونکہ وہ بولی "آؤ چلیں۔"

ہم کچن کے دروازے سے بچوں کی طرح چوری سے اندر داخل ہوئے کیونکہ اوپر جانے

والی بگڈنڈی ہمارے پچھواڑے سے ہوکر نکلتی تھی۔ اور ڈرائنگ روم کے دروازے پر کچھ اس طرح دستک دی کہ جونہی میڈلین دروازہ کھولے گی ہم چلائیں گے: "باگھ، شیر ببر، ہاتھی"، لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں۔ آہستہ سے دروازہ کھلا۔ یہ جارجز تھا جس نے دروازہ کھولا تھا۔ ہم چلتے ہوئے کمرے میں آ گئے۔ کمرہ کشادہ، خاموشی سے معمور تھا۔ کیتھرین دبے پاؤں گئی اور میڈلین کے پاس ہی دیوان پر بیٹھ گئی۔ جارجز اپنی کرسی پر لوٹ گیا۔ اور میں نے کمرے کی کچھ زیادہ بتیاں جلا دیں اور کھڑا کتابیں دیکھنے لگا۔

لمحہ بھر کے بعد کیتھرین نے کہا کہ اس نے اپنے بہنوئی کے ساتھ بہت بڑھیا سیر کی ہے۔ میں نے کہا: "میں نے کیتھرین کو راکھی باندھی ہے" جارجز پوچھنے لگا۔ یہ کیا ہوتی ہے رام!" میں نے جواب دیا۔ "یہ وہی ہے۔ ایک ریشمی دھاگا، ایک زرد ریشمی دھاگا زری کے کام والا، جو ایک پرانی روایت کہتی ہے۔ رانی پدماوتی نے شہنشاہ اکبر کی کلائی پر باندھا تھا اور اب چونکہ وہ اس کی بہن بن گئی تھی اس لیے اس کی دلہن نہیں بن سکتی تھی۔

"واہ کیا خوبصورت کہانی ہے"! جارجز بولا۔" او" میڈلین بولی "ہندوستان میں خوبصورت داستانوں کی کمی نہیں ہے"۔ میں نے سرجاکی دی ہوئی راکھی اپنے کمرے میں رکھ چھوڑی تھی۔ جب میں اسے تلاش کرنے کے لیے کمرے میں گیا۔ میڈلین کچن میں چلی گئی اور جب میں کمرے میں لوٹا تو میں نے دیکھا۔ جارجز اور کیتھرین ایک دوسرے کی باہنوں میں تھے اور بہت خوش تھے۔ جارجز نے میری موجودگی میں اس کو ایک بار اور چوما اور اس نے ایسے بے اختیارانہ انداز میں اسے ایسا کرنے دیا کہ جارجز کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جارجز کو کچھ ہو گیا تھا۔ وہ ذہنی طور پر بلند روشن اور شفاف لگ رہا تھا۔

"کیتھرین یہ رہا میری جانب سے شادی کا تحفہ" میں نے کہا اور کیتھرین کی کلائی پر راکھی باندھ دی۔ وہ خوشی سے ناچ اٹھی، دوڑ کر کچن میں چلی گئی اور وہاں سے بلند آواز میں چلائی۔

"دیکھو مادو! دیکھو مجھے کیا بڑھیا شادی کا تحفہ ملا ہے"!

اس دوران میں جارجز بولا"۔ رام! کیا تمہارے پاس ایک اور نہیں ہے؟"

میں نے کہا" نہیں" اس لیے جب کیتھرین لوٹی۔ اس نے وہ اس کی کلائی سے کھول لی۔ جب میڈلین ہاتھ میں پیاز اور رسوئی گھر کی چھری لیے یہ دیکھنے کے لیے آئی کہ کیا ہو رہا ہے تو جارجز نے اسے پکڑ لیا اور اس کی بائیں کلائی پر راکھی باندھ دی اور اس کے منہ کا بوسہ لے لیا جی ہاں! جارجز نے ہم سب کے سامنے! اس غیر متوقع لمحے میں کمرے کی بتیاں تک کچھ اور بھی روشن ہو گئیں۔ ہم سب نے محسوس کیا کہ ہم سب کسی طلسماتی دائرے سے متعلق تھے اور ہم سب ہنس پڑے جیسے کسی کھڑتال اور تنبورے کے تئیں۔ ہم سب ہنستے اور ہنستے ہی رہے۔ ہم کچن میں اور برآمدے میں ایک دوسرے کو چھیڑتے رہے۔ میز پر کھانا لگاتے ہوئے۔ چھری کانٹے ڈھونڈتے ہوئے ہم ہنستے رہے۔ لیزو کی باتیں کرتے ہوئے ہم ہنستے رہے۔ ہم نے ہیڈ مسٹرس کا مذاق اڑایا اور ہنستے رہے۔ پھر لمبی خاموشیوں میں اُتر گئے اور ایک بار پھر ہنسنے لگے۔

میڈلین تو غسل خانے میں چلی گئی اور اتنی دیر تک وہیں رکی رہی کہ کیتھرین دروازہ کھٹکھٹانے لگی اور بولی" ہنستے ہنستے کچھ لوگوں کو دست بھی ہونے لگتے ہیں"۔ جارجز نے اپنا فالج زدہ بازو لٹکا لیا اور دیگچی میں کلچھی چلانے لگا۔ کیتھرین نے جارجز سے کلچھی لے لی اور میڈلین کو پھر دستوں کے بارے میں چھیڑنے لگی۔

میں تھوڑی دیر کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا اور کواڑ بند کر دیئے۔ میرا کام اچھی طرح آگے نہیں بڑھ رہا تھا۔ اس لیے کچھ نئے کاغذات کے پاس پنسل رکھ دی جیسے اپنے کام کو تیزی سے آگے بڑھانے کے لیے یہ سب کافی تھا۔ جب میڈلین غسل خانے سے باہر آ گئی تو میں میں ہاتھ منہ دھونے کے لیے اندر گھس گیا۔ ہم نے بڑا شاندار کھانا کھایا۔ ہر چیز بہت بڑھیا تھی۔ صرف ٹماٹو ساس میں نمک کچھ زیادہ تھا۔ یہ عین فطری تھا کہ ہم ایک وسیع اور بامعنی خاموشی میں اُتر گئے۔ بعد میں کیتھرین اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ضرور روئی ہوگی کیونکہ جب وہ باہر آئی تو اس کی آواز بدلی ہوئی لگ رہی تھی۔

جارجز ایک کتاب اٹھا کر چلا گیا" شب بخیر رام، شب بخیر میڈلین، شب بخیر میری ننھی دلہن!" اس نے کہا اور ایک بار ہم دونوں کے سامنے اس کو چوم لیا۔ دنیا میں پھر سے

رات اتر آئی اور جب میں بیڈ روم میں پہنچا تو میڈلین اپنی کیتھرین مینس فیلڈ میں مصروف تھی۔ میں کیتھرین کو شب بخیر کہنے کے لیے گیا۔ اس کے دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی ہیں اپنے سونے کے کمرے کے اندر تھا۔ وہ برآمدے سے چلّائی۔ "شب بخیر۔ بھیّا، شب بخیر۔ میرے بہادر رکشک، میرے محافظ!"

"شب بخیر میری پوتر بہنا! اچھی طرح سوؤ"

میں نے میڈلین کا بڑا انتظار کیا۔ تب کہیں وہ ہاتھ منہ دھو کر لوٹی۔ میں اِدھر اُدھر کی چیزیں پڑھتا رہا لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ جب وہ اندر آئی تو اس نے اپنے خوبصورت سنہرے بال کھول رکھے تھے، نیچے تک لٹکا رکھے تھے۔ اس نے شب خوابی کا وہ کشمیری لباس پہن رکھا تھا جو میں نے اس کے لیے لندن میں خریدا تھا۔ اس کے بازو کچھ اس طرح حرکت میں تھے جیسے مقدر کی جانب گامزن ہوں۔ وہ میری طرف سنجیدہ اور سرشار آئی اور مجھے اپنے آپ میں سمیٹ لیا۔

نومبر ۴: اب میں میڈلین کو ایک نئے پیار کے ساتھ پیار کرتا ہوں۔ میں ٹکڑوں اور حصّوں میں بھی پیار کرتا ہوں اور مکمل طور پر بھی۔ جیسے ہِرن ہرنی سے کرتا ہے۔ جیسے ہاتھی ہتھنی سے کرتا ہے اور مستی بھرا سیّال اس کے ماتھے سے بہہ رہا ہوتا ہے۔

کنڈل دوئی پر گنڈ پنڈ سمو تپتنے نن

شہوانی سیّال سے پاگل بدمست ہوئے ہاتھی
پیڑوں کو جھنجھوڑتے ہیں۔ ان کے تنوں پر اپنی سونڈ رگڑ رگڑ کر
آزاد ہونے پر، دھوپ سے گرنے والے پھول، پوجا کے لیے
دیوی گوداوری کے جل میں گرتے ہیں
پرندے، پتوں کی چھتریوں والے پرندے سرنگ بناتی سنڈی کو کھانے کے لیے
مروڑ دیتے ہیں
ندی کنارے کے پیڑوں کی چوٹیوں کے ندی میں پڑنے والے عکس میں

گرمی زور زور سے گنگناتی ہے۔ سست روہنسوں کے ساتھ
اور گھونسلے بناتی فاختاؤں کی 'کو' کو' مکولرن' کوئلے' کی آوازوں کے ساتھ
مجھے اس کی صراحی دار گردن کی گدی بڑی پیاری لگتی ہے۔ کس قدر حلیم، میرے لیے سنگ مرمر کی سی۔ چاندنی ہیں کم و بیش گیروے رنگ کی۔ اور جب میں دن میں اسے اپنے پاس بلاتا ہوں اور اسے اپنی باہوں میں بھر لیتا ہوں تو کس طرح کسی جانی پہچانی کستوری کی سی خوشبو اس کے گلے سے اٹھتی ہے۔

"عورت کا جسم ایک ایسے جنگل کی طرح ہے جس میں جڑی بوٹیاں مروا اور اوپر سے گرنے والی بیلیں ہوتی ہیں۔ شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ ہوتی ہے اور شیرنی کو اپنے پاس بلانے کے لیے شیر کی پکار ہوتی ہے۔ ان کے سب بچے آس پاس ہوتے ہیں۔ آپ پہلے سر کو چاٹتے ہیں، پھر گردن کو، پھر پیٹھ کو اور جب آپ پھسل کر چھاتیوں پر آتے ہیں تو آپ محسوس کرتے ہیں ناف کپکپا رہی ہے جیسے شدتِ لمس کے کرب سے۔ آپ دیر کرنے لگتے ہیں۔ بھٹکنے لگتے ہیں۔ اس کے علاقے کے اوپر رینگتے ہیں، اور اپنے آپ سے میٹھی میٹھی گھنٹیوں کی آواز والی باتیں کرتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ساکت چمتکار پہلے ہی اس کے اندر ہے۔ وہ چمتکار وہ اعجاز جو سورج کو روشنی اور چاند کو گفتار عطا کرتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ دنیا ضرور ہوگی کیونکہ وہ ہے آپ جانتے ہیں کہ کیلا تنے پر پک جاتا ہے اور ناریل زرخیز دھرتی پر آ گرتا ہے۔ ندیاں بہتی ہیں۔ اور پتوں کے بیچ سفید اور گلابی پاری جات کے پھول کھلتے ہیں۔ اور جونہی موج در موج ہوا چلتی ہے پہاڑ ہلنے لگتے ہیں ہوا رک جاتی ہے اور آپ اپنے آپ میں سمٹ جاتے ہیں اور ایک بار پھر آپ اسے سنتے ہیں۔ اور میڈلین وہیں ہے۔ اس کے کولھے نیلے اور سرخ کولھے کیسے شاندار ہیں اور اس کے جسم سے خوشبو اٹھتی ہے۔ اور میں اس سے کچھ پوچھتا ہوں اور وہ زیرِ لب کچھ ایسی بنیادی باتیں بڑبڑاتی ہے کہ اس کی آنکھیں بے حرکت لگنے لگتی ہیں اور مجھے میرے اپنے اندر سمیٹ لے جاتی ہیں۔ میں سچ کے روپ میں اُجاگر ہوتا ہوں جیسے خود اسی نے مجھے چھو لیا ہو اس موج کی طرح جو اپنے آپ کو سمندر سمجھتی ہے۔ اس دھرتی کی طرح جو پھیلی ہوئی تھی اور جس کا نام تھا میڈلین! لیکن جب میں اسے میڈلین

کے نام سے پکارنا چاہتا ہوں تو مجھے رام کہنا پڑتا ہے۔ اس کے ہونٹ میرے ہونٹ ہیں باہر کی طرف مڑے ہوئے۔ اس کا جسم میرا ہے۔ اندر کی طرف مڑا ہو اور کیسی آواز وہ نکالتی ہے جنگلی ہرنی کی سی۔

وہ مجھے بلاتی ہے وہ ہرنی! میٹھی میٹھی چینخوں سے، درد بھری چینخوں سے جیسے میں کہیں دور ہوں۔ میں اسے کہتا ہوں۔" میری پیاری، میری ہرنی میں بہت سے چشموں کا پانی پی رہا ہوں۔ شام آپہنچی ہے اور شیروں نے ابھی تک اپنی ماندوں کو نہیں چھوڑا ہے۔" وہ کہتی ہے "میں مکمل ہوں اور تنہا ہوں۔ میں دن کو دھارن کرنے والی ہوں۔ میں جل دھاراؤں کے کے ساتھ دوڑتی ہوں۔ میں آسمان کے ساتھ پھلانگ لگاتی ہوں۔ میں پیڑوں اور مینڈکوں کے ساتھ گنگناتی ہوں۔ میں مدھرتا کا 'مٹھاس کا سانپ بن جاتی ہوں۔ میں وہ گیت ہوں جو کود کر ابھرتا ہے۔ مجھے شام میں سمیٹ لو' اور مجھے کشمیری ریشم میں لپیٹ لو۔" اور میں اسے ایک ایسی دنیا میں لے جاتا ہوں جہاں سے لوٹنا نہیں ہوتا۔ ان تبتی تنکاؤں کی طرح جن کے نیچے سرو کے پیڑ، چاند اور سمندر ہوتے ہیں اور وسط میں ڈریگن یعنی اژدہے کا سنگھاسن ہوتا ہے۔ آپ اسے بٹھاتے ہیں اور کہتے ہیں " بٹیا یہاں بیٹھو" اور وہ بیٹھ جاتا ہے وہ لاما بیٹھ جاتا ہے۔ آپ اسے زری کے بنے کپڑے سے ڈھانپ دیتے ہیں۔ باہر سینگی بجاتے ہیں اور اس کی آواز کی گونجتی ہوئی موجیں ایک تسلسل میں لاسا میں لوٹ آتی ہیں۔ پربتوں اور ریگستانوں کے آر پار تجسیم کا معجزہ کرتی ہیں اور آتی ہیں کیونکہ لاما کی تاجپوشی ہوئی ہے اور وہ پوٹالہ میں براجمان ہو گیا ہے۔ سب خزانوں کے منہ کھول دیئے گئے ہیں اور سب کھڑکیاں بھی اور سجا سنورا سفید گھوڑا دوپٹے، پٹکے اور بانسری کے ساتھ انتظار کر رہا ہے۔ موسم گرما کے لیے مخصوص محل کا اور تالابوں کا۔

ہے پرکھو! اس جگہ خوب ہری بھری گھاس ہے اور سنگیت کافی دیر سے جاری ہے۔ اور کانوں کے بیچ آپ کی آنکھیں ہیں۔ آپ کام کرنے کے عمل کے دوران تحفے قبول کرتے ہیں، آپ چھاتیوں کے درمیان دل کو چھوتے ہیں اور آپ میڈلین کے اوپر اس طرح لیٹے ہوئے ہیں جیسے وہ عظیم ساحل ہو سمندر کا۔ رات ختم ہو چکی لیکن پو پھٹنے میں ابھی دیر ہے

یہ ہاتھ منہ دھونے اور نہانے دھونے کا وقت ہے۔ پرارتھنا کرنے کا بھی اور ندی کے پاس کے مندر کی طرف جانے والی راہ پر چلنے کا بھی۔ ایشور آپ کو جانتا ہے اور آپ ایشور کو جانتے ہیں اور اس کے ہیرے جواہرات کچھ ایسے چمک رہے ہیں جیسے کل رات ہی دھرتی سے نکلے ہوں۔ لمحہ بھر کے لیے آپ جسم سے ماورا چلے گئے تھے۔ ہائے! کیسا دردناک ہے جسم میں پھر لوٹ آنا اس بھاری بھرکم کایا کا بھار ڈھونا۔!

ہاتھی موسم سرما کے تالاب کے پاس کسی خواب میں کھو گیا ہے۔ آپ محسوس کرتے ہیں اس کی بائیں آنکھ میں ایک آنسو ہے۔ اسے اٹھنا چاہیے اور جانا چاہیے۔ کیونکہ بیٹے! تم کبھی آزاد نہیں ہو سکتے۔ اگر ہو سکتے ہو تو صرف اپنے ذریعے! وہ پہاڑیاں دیکھ رہے ہو؟ میرے بیٹے میرے بچے، تم ان سے پرے ان پہاڑیوں کے پار جاؤ گے جہاں بڑے بڑے پربت اور دریا ہیں بہت بڑے ایال والے شیروں سے بھرے۔ ببر شیروں سے پرے انسان کی دنیا ہے۔ جہاں لوگ گھر، فیکٹریاں اور شمشان بناتے ہیں جہاں لوگ خرید و فروخت کرتے ہیں جہاں وہ بلند آواز سے روتے چلاتے ہیں اور گیت گاتے ہیں۔ اور اس سے پرے پھر ایک اور جنگل ہوگا ایک اور جھیل ہوگی ایک اور شیر ہوگا ایک اور ساہی! پھر اس سے پرے اور شہر اور قصبے ہوں گے اور دنیائیں ہوں گی اور راتیں ہوں گی۔ خواب وہی ہے۔ لیکن تم اسے پکڑ نہیں سکتے گرفت میں نہیں لے سکتے ہیں اور نہ تم اس ہاتھی سے بات کر سکتے ہو جو تم سے ... رہا ہے۔ وہاں پانی میں دوسری جانب سے دیکھو تو وہ تم ہی ہو تم دوسری طرف بات نہیں کر سکتے شہوانی سیال یعنی مدراس اپنے آپ ... رہا ہے اور یہ آنسو جاتا ہے جس سے ہم نے جھیلیں۔ فوارے اور بارشیں بنائی ہیں۔ شہوانی سیال یعنی مدرس نے دنیا کے دریا بنائے، جھیل بنائے، خوشبوئیں بنائیں، شہر بنائے اور چڑیا گھر بنائے۔

آدمی کا شہوانی سیّال مدرس ہی اس کی رہ نمائی کرتا ہے

میڈلین میں یہ تمہاری نذر کرتا ہوں۔ لیکن تم جہاں ہو وہیں ہو اور میں کہیں بھی نہیں ہوں۔ میڈلین میری پیاری میڈلین آؤ ہم ایک اور سفر پر نکلتے ہیں دنیا کی ایک اور سیاحت کے لیے۔ میں تمہیں ... ہوں جیسے پڑھنا چاہتا ہوں۔ مجھے ہونٹ کو انتہا تک مروڑنے دو، لمحۂ انبساط تک جانے دو۔ میڈلین مجھے اپنی کمر کے پاس وہاں چھونے دو جہاں سے افزائش کا

عمل طلوع ہوتا ہے اور میڈلین مجھے یہ اپنا دایاں پستان نہ چھونے دو اور میں اس طرح لیٹ جاؤں جیسے میں اپنے بسترِ مرگ پر دراز ہوں۔ میڈلین پیاری میڈلین! او مجھے دو، یہ سب مجھے دو۔ بس دے دو۔ وہ مجھے دے دو میڈلین کراہو نہیں! او میڈلین دکھ نہ سہو۔ بھگوان کے لیے میڈلین میں سارے رتنا کا، تمہارے ارد گرد لٹکا دوں۔ اور میڈلین میں اسے پھر کرشن کہہ کر پکاروں گا۔ مجھے تم میں سے تمہارا رس نچوڑنے دو۔ اپنے آپ کو تم مجھے ایک کتّے کی طرح چاٹنے دو اور اپنی زبان پر اپنے تھوک میں دیکھنے دو۔ میڈلین مجھے تم اپنے آپ کو سونگھنے دو۔ اس تم کو سونگھنے دو جو میرا ہے اور وہ بھی جو تمہارے اندر ہے۔ میڈلین اس کا سواد بڑا میٹھا ہے۔ بڑے شاندار انداز میں بڑا تیکھا ہے۔ اس میں پیپرمنٹ اور جلے ٹین کی مہک ہے۔ میڈلین، میری پیاری میڈلین مجھے میرا زعفران، جنگلی پھولوں کا شہد اور مندر کے آنگن کا پارس جات کو لوٹا دو۔ تم اس طرح رو کیوں رہی ہو کراہ کیوں رہی ہو۔ میڈلین۔ کیا میں نے تمہیں دکھ پہنچایا ہے۔ کیا میں نے تمہیں جگا دیا ہے۔ کیا تم بیدار ہو گئی ہو اور میں ناکامیاب ہو گیا ہوں۔ او میڈلین میں تمہاری سسکیوں کو پیار سے خاموش کر دوں گا میں تمہارے درد سے مر جاؤں گا۔

"باہر دن ابھی روشن ہے لیکن میں میڈلین کو چاہتا ہوں اور اسے کہتا ہوں" میری پیاری، ایک بار اور کوشش کریں ہم؟ کیونکہ مور باغیچے میں گھوم رہے ہیں اور میں ہمالیہ پر پہلی پہلی برف پگھلنے کی آواز سن رہا ہوں۔ اور شمال میں اٹھتی ہواؤں کی آواز بھی! میں تمہیں الک نندا لے جاؤں گا اور میڈلین ہم بادل بن جائیں گے۔ ہم یکشوں کی سبھی بستیوں میں جائیں گے۔ میں تمہیں ہیرے جواہرات سے آراستہ محلوں میں لے جاؤں گا اور تمہیں کالی داس سناؤں گا۔ میں تمہیں وہ عورتیں دکھاؤں گا جن کی چھاتیاں پیار کے بوجھ سے لٹک جاتی ہیں اور جن کے کمر کے پٹکے گر گر جاتے ہیں کیونکہ وہ اپنے آپ میں اٹھتے ہوئے پیار کی شدت کو برداشت نہیں کر سکتیں۔

یکشوں کی عورتوں کو اچانک پتہ چلتا ہے
کہ ان کی کمر کی پٹیوں کی گانٹھیں ڈھیلی ہو گئی ہیں

ان کے عاشق شدّتِ شوق سے والہانہ دلیری سے
ان کے ڈھیلے لٹکتے ہوئے لباس پھاڑ کر پھینک دیتے ہیں
شرم سے پاگل ہو کر عورتیں
روشن چراغوں پر جڑے ہوئے قیمتی جواہرات پر
مٹھی بھر اُبٹن کا سفوف پھینک دیتی ہیں
لیکن بیکا! روشنی بھی اسے نگل جاتی ہے!

میں تمہیں ہمالیہ پربت پر لے جاؤں گا اور وہاں تمہارے ساتھ پیار کروں گا۔ آؤ۔ میڈلین آجاؤ۔ گاڑی تیار ہے۔ کیا تم سیٹی بجنے کی آواز نہیں سن رہی ہو۔

میڈلین کا دم گھٹ رہا ہے۔ اور میں اسے اپنی پیٹھ پر اُٹھائے لیے جا رہا ہوں۔ وہ چلاّتی ہے کہ اسے دنیا کے تمام اسپتالوں کی دوائیں درکار ہیں۔ وہ بے ہوشی کے عالم میں ہے۔ اسے کوئی اندرونی بیماری ہے۔ سرجن بونن فان کو بلاؤ۔ ڈاکٹر شجیرو کو بلاؤ، ناتھن اور برن ڈین کو بلاؤ۔ آپ چاروں طرف سفید ایپرن اور ایتھر کی بو محسوس کر سکتے ہیں۔ ہمالیہ پر کیتھوں کا شاندار سنگیت ہے۔

"میڈلین کیا میں نے تمہیں دُکھ پہنچایا ہے۔ کیا میں نے تمہیں بہت دیر تک اور بہت دور تک حاصل کر لیا تھا؟"

میڈلین جواب میں بس اتنا ہی کہتی "پربھو! مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ میں مردوں کی سلطنت نہیں ہوں۔ اندر سے جیسے ساہی نے مجھے چیر پھاڑ ڈالا ہے۔ میں ختم ہو چکی ہوں گم صم ہو رہ گئی ہوں۔ اوتانت زوبی!" اور میڈلین رونے لگتی ہے۔

۱۷ر نومبر" اس نے اس بار اپنی گھڑی دیکھی۔ دو بجنے میں دس منٹ باقی ہیں۔ پہلے ہی اتنا وقت ہو چکا ہے۔ میڈلین دوڑ کر غسل خانے میں جاتی ہے۔ اپنے بال ٹھیک ٹھاک کرتی ہے اور چلاّ کر کیتھرین کو الوداع کہتی ہے کیتھرین کو یہ سمجھنے کے لیے کہ کیا ہوا ہے اپنی فطری نسوانی حس کی کچھ زیادہ ضرورت نہیں پڑی۔ "رام! الوداع" میڈلین کہتی ہے۔ کچھ اس انداز سے جیسے اپنے آپ سے کہہ رہی ہو اور پھر اپنے طالب علموں کو نپولین کی لڑائیوں کے

بارے میں بڑھانے کے لیے چلی جاتی ہے۔ وہ انھیں رائش ماڈ کے ڈیوک روویا دردم کے بارے میں پڑھا رہی ہے جبکہ میں کسی رسالے کے صفحات میں ڈبکی لگاتا ہوں اور ہاتھی کو بھول جاتا ہوں۔"

۷ر نومبر: "کل میں نے جارجز کے اپنے گھر جانے کا بڑا انتظار کیا۔ مجھے سخت نفرت ہوئی کہ وہ وہیں پڑا ہوا ہے۔ جانے کا نام ہی نہیں لیتا۔ وہ میرے اس علم سے، میرے اس احساس کو جانتا تھا۔ کاش جارجز ہوتا ہی نہیں کیونکہ بھگوان نے شیطان کو آنکھیں دی ہیں۔ جونہی میں اور میڈلین کمرے میں آئے جبکہ کیتھرین ہاتھ منہ دھونے میں مصروف تھی۔ میں نے پھوہڑپن اور بے شرمی سے میڈلین کو زور سے گلے لگا لیا اس کو لباس اتارنے پر مجبور کیا۔ اور بغیر کسی شیرینی، نفاست کے، بغیر ایک لفظ کہے اس کے ساتھ مباشرت کی اور اس نے بغیر کسی خوشی یا تکلیف کے مجھے اپنے اندر اُترنے دیا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ جارجز اس وقت وہاں نہیں تھا۔

مجھے لگا مجھ میں کوئی شرم نہیں تھی۔ کیونکہ جب میڈلین ہاتھ منہ دھو دھا کر لوٹی میں نے بھی جلدی سے ہاتھ منہ دھو لیا اور اس کے پاس پہنچ گیا اور اس کو بہت سی احمقانہ اور جھوٹی باتیں کہیں۔ وہ صرف ہاں یا نہ کہتی رہی جیسے اس سے کوئی فرق نہ پڑتا ہو۔ پھر میں اس کے ساتھ کالی داس اور بکیتوں کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔ اس کو ایک بار پھر اس شدید جذبے کے ساتھ چوما کہ وہ کہنے لگے۔ "آؤ" میں خالی برآمدوں میں گھومتا رہا اور تنہا۔ میڈلین نے ہمدردی سے میرا سر تھپتھپایا اور بولی: "خوش رہو میرے پریتم۔ خوش رہو۔"

"لیکن میں خوش نہیں تھا اس لیے میں دیر تک اس سے طرح طرح کی باتیں کرتا رہا۔ اپنے دادا کنٹھا کی اپنے پتاجی کی اور چھوٹی ماں کی۔ میں نے میڈلین کو وہ سب تفصیل بتائی جو اب تک نہیں بتائی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ چچا سیتارام دن میں چار پانچ بار اپنے کمرے میں جایا کرتے تھے اور چلّا کر کہتے تھے "او لکشمی! لکشمی! اور اس کی گول مٹول بیوی آجاتی اور دروازہ بند ہو جاتا۔ چچی جیسے اندر جاتی ویسے باہر آجاتی۔

اور ہم بچّے یہ جاننے کے لیے کہ اندر کیا ہوا تھا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتے ۔ بچّا سیتارامو کے دس بچّے ہوئے ۔ ان میں سے آٹھ زندہ ہیں" میں نے کہا ۔

"تم اگر چاہو تو میں تمہارے لیے گیارہ بچّے پیدا کردوں گی" اس طرح بے عزت سا ہوکر میں نے غسل کیا اور سونے چلا گیا ۔

آدھی رات کو میڈلین کو جانے کیا ہوا وہ میرے بستر میں آگئی اور مجھ سے اس کا مطالبہ اس قدر شدید تھا کہ بعد میں مَیں نے اپنے آپ کو گرمیوں کے دریا کی طرح محسوس کیا ۔ سطحِ مرتفع دکن پر سورج آگ برسا رہا ہے اور پتھّر جل رہے ہیں ، مویشی اپنی زبانیں باہر لٹکائے کھڑے انتظار کر رہے ہیں اور نیم کے پیڑ کے پتّے ساکت ہیں ۔ یہاں وہاں آپ کوّے کی کائیں کائیں یا پھر کسی موٹر گاڑی کے بھونپو کی دبی گھٹی آواز سن سکتے ہیں ۔

"آج صبح میں نے میڈلین کے لیے کافی نہیں بنائی ۔ وہ شرماتی جھجکتی کچن میں خود گئی اور جب وہ گڈ مارننگ کہنے کے لیے آئی تو میں سونے کا بہانہ کرکے لیٹا رہا ۔

مجھے اس ریگستانی طوفان کو روک دینا چاہیے ۔"

۸ ر نومبر : آج رات بھی میڈلین میرے پاس آئی ۔ وہ غالباً فطری طور پر جانتی تھی کہ میں اس کے پاس نہیں جاؤں گا ۔

جب مرد اپنے آپ کو کھینچ لیتا ہے تو عورت اس سے نفرت کرنے لگتی ہے ۔ وہ اس کی شکست برداشت نہیں کر سکتی ۔ مرد کی شکست اس کی نسوانیت کی شکست ہے ۔ اسے بہرحال اس کے پیار کا رس بننا ہے ۔ اسے بار بار وہی دینا ہے جو وہ مانگتا ہے اس لمحے تک جب تک اس کا مطالبہ ہی کراہت میں نہ بدل جائے ۔ تب عورت اس سے شدید نفرت کرنے لگتی ہے ۔ وہ اپنی چھاتیاں اس کی پیٹھ پر رگڑتی ہے ۔ اس کے کانوں میں پیار بھری سرگوشیاں کرتی ہے ۔ جو بات الفاظ نہیں کہہ سکتے اس کا جسم کہتا ہے ۔ وہ اسے اٹھاکر اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے جیسے ماں ایک بچّے کو ! تب آپ تھوہر کی شاخ لے کر اس سے اس کو پیٹنا چاہتے ہیں اور اس کے پورے جسم پر خراشیں ڈالنا چاہتے ہیں ۔ آپ اسے اپنا پہلا پیار بنانا چاہتے ہیں ۔ پہلی عورت ۔ آپ اسے پوری دھرتی کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں ۔ وہ

یہ سب جانتی ہے کیونکہ ہر عورت داشتہ ہے اور وہ کنواری، سیدھی سادی بن جاتی ہے۔ ہے بھگوان کیسی نئی نویلی، مہکی مہکی خوشبو بھری اور پھر ہاتھی میں مدرس شہوانی سیّال زور مارتا ہے اور پھر وہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

"اس بار آپ دور، بہت دور نکل گئے ہیں۔ ہوائیں چلنے لگی ہیں۔ اگرچہ گرمی کے موسم کی حدّت ابھی باقی ہے اور نیم کے پتّے بس ذرا ذرا ہل رہے ہیں۔ آپ ایک بچّے کے رونے کی آواز اور کنوئیں کے پاس کپڑے دھونے کی آواز سن رہے ہیں۔ دنیا پوتر ہو جائے گی دنیا پوتر ہے کیونکہ رکھیل ماں بن گئی ہے۔"

۱۰ر نومبر: آج تو میں نے میڈلین کو برباد کر دیا ہوتا۔ وہ کس قدر شدّت سے مہکتی لہکتی میرے ساتھ چمٹی رہی۔ میں نے اس کے منہ میں تھوک دیا ہوتا اور اسے کتیا کہا ہوتا۔

"وقت آ گیا ہے کہ میں یہاں سے چلا جاؤں۔ میں جتنا دور جاتا ہوں سچ اتنا ہی دور دکھائی دیتا ہے۔ یہ اس کے لیے اچھا نہیں ہو سکتا جو میڈلین کے اندر پل رہا ہے۔ مجھے بہر حال زندگی کی تعظیم کرنی چاہیے۔ میڈلین کی عزت کرنی چاہیے۔ مجھے لندن چلے جانا چاہیے۔

۱۲ر نومبر: تین دن سے میں جارجز کے ساتھ بڑی اچھی طرح پیش آیا ہوں۔ ہاتھی نے سارا جنگل اجاڑ کر رکھ دیا ہے۔ بیلوں۔ چیونٹیوں کے گھروندوں اور کانٹے دار شاخوں سمیت۔ پروائیاں چلنے لگی ہیں۔ عنقریب بارش ہو گی، اور میں چلا جاؤں گا۔

۱۵ر نومبر: جارجز اور کیتھرین کے بیچ جو یہ سب چل رہا ہے۔ اس کے بارے میں سوچ کر دہشت ہوتی ہے۔ کل رات میڈلین نے مجھ سے کہا "رام! اب معاملہ پاؤڈر اور لپ اسٹک کی مدّ سے بہت آگے نکل چکا ہے" میں نے جواب میں کہا "دیکھو جو بھی ہو میڈلین بھگوان کے لیے ہجڑا مت بنو، بھگوان کے لیے!" میڈلین پہلے تو خاموش ہو گئی۔ پھر اپنے کمرے میں جا کر کیتھرین مینسفیلڈ پڑھنے لگی۔ آج کل وہ کیتھرین مینسفیلڈ بہت پڑھنے لگی ہے "کوئی بھی مرد عورت کو نہیں سمجھ سکتا۔ رام! کبھی نہیں۔" کتاب ایک طرف رکھتے ہوئے وہ بولی "صرف عورت ہی عورت کی بات کر سکتی ہے ہم نہ فرشتے

ہیں اور نہ ہی حیوان"۔ میں نے کہا۔" ہاتھی کہاں مرتا ہے۔ کوئی نہیں جانتا تم سچ جاننا چاہتی ہو کیونکہ تم پورا جھوٹ جانتی ہو۔ شاید جارجز صحیح ہے"۔

"نہیں جارجز صحیح نہیں ہے"۔ میڈلین نے جواب دیا۔" لیکن شاید تم بھی صحیح نہیں ہو۔ کیونکہ سچ اگر سچ ہے تو اس سے ہر بات واضح ہو جانی چاہیے۔ کیا تم نے نہیں بتایا تھا۔ رام اکایک بحث میں شنکر کے ایک عورت سے شکست کھانے کے بعد اس عورت نے جب ان سے کچھ لازمی طور پر نسوانی باتوں کے بارے میں سوالات پوچھے تو شنکر نے اپنے جسم کو نربدا کے کنارے کے ایک پیڑ کی کھوہ میں چھوڑ دیا تھا اور ایک مرے ہوئے راجہ کے جسم میں داخل ہو گئے تھے۔ وہ دس برس تک چار رانیوں کے ساتھ رہے اور سنگار رس میں وہ مشہور گیت لکھے جو تم کہتے ہو ہندوستان کے انتہائی خوبصورت گیتوں میں سے ہیں"۔" لیکن وہ بات شنکر کی تھی"۔ میں نے کہا اور قدرے توقف کے بعد اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا" میں اب بھی تمہیں شکست دے کر ہی رہوں گا"۔

" رانی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ میرے راجہ!" وہ بولی۔ اس بار جو بول رہی تھی وہ میڈلین نہیں تھی بلکہ کوئی اور تھی بلند تر صاف، سادہ!

۷ ار نومبر: آج میں صرف بادلیر کی نظم کا یہ اقتباس نقل کرتا ہوں۔

اے چراغ! پتنگا اڑ کر تمہارے پاس آتا ہے
اور جل کر کہتا ہے اے چراغ کی لو! تم مبارک ہو!
محبوبہ پر جھکا ہوا عاشق، گنگناتا ہوا عاشق
اس کی قبر کو چومتا ہے، قریب المرگ لگتا ہے
اے دیو قامت، پرہیبت طہارت انگیز حسینہ!
تم جنت سے آؤ یا جہنم سے
بس تمہاری آنکھیں، تمہاری مسکراہٹ اور تمہارا اندازِ خرام
دوام کا، ابد کا در وا کر دیں
جس سے میں پیار کرتا ہوں لیکن جو میرے لیے انجانا ہے

۲۰ر نومبر : میں پھر بادلیر کا ایک اقتباس نقل کرتا ہوں۔

سمندر تم سے نفرت کرتا ہے
تمہارے شور اور طوفان سے
شکست خوردہ مرد کی توہین زدہ اور آنسوؤں بھری تلخ ہنسی
میں تمہارے بلند آواز قہقہے میں سنتا ہوں
اے رات! ستاروں کے بغیر تم مجھے کیسے خوش کروگی۔
جن کی چمک جانی پہچانی زبان بولتی ہے
کیونکہ مجھے تو چاہیے سیاہ اور برہنہ خلا!

اس طرح میں اپنی جاری و ساری ڈائری کے صفحات سے ایک کے بعد ایک کئی مثالیں دے سکتا ہوں لیکن میں یہیں رکتا ہوں۔

میں صرف یہ اضافہ کروں گا کہ میں مہینے کے آخر میں لندن روانہ ہو گیا اور یہ کہ میڈلین اپنے آپ سے ناخوش نہیں لگتی تھی۔

میں ساد تری کو کیمبرج واپس لے گیا۔ اسٹیشن سے ہم جلدی سے ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئے اور میں نے اسے گرٹن کالج پر چھوڑ دیا۔ پھر لائن ہوٹل میں (پیٹی کیوری میں) جہاں میرے لیے ایک کمرہ ریزرو تھا۔ جان نام کا ناٹے قد کا پورٹر سیڑھی سے مجھے میرے چھوٹے سے کمرے میں لے گیا۔ چھت کے نیچے۔ کمرہ کچھ تکونہ سا تھا لیکن پلنگ کی بغل میں بائبل اور اوپر صلیب یعنی کراس دیکھ کر مجھے محسوس ہوا۔ جو میں ہمیشہ سے جانتا ہوں کہ میں تیر تقدیر بکلا ہوا یاتری ہوں۔ رات طویل نہیں تھی۔ دن جلدی نکل آیا۔ میں لائبریری چلا گیا اور معمولی سی دِقت کے بعد مجھے وہاں کام کرنے کے لیے کارڈ مل گیا۔

کتب خانے ہمیشہ میرے ساتھ گفتگو کرتے ہیں۔ وہ مجھے مجھ پر منکشف کرتے ہیں۔ اپنی گہری سنجیدگی سے، اپنی وسعت سے اوراس متنوع جہت علم سے جو لوگوں کو اپنے بارے میں ہوتا ہے اور جس کے ذریعے کتاب وجود میں آتی ہے کیونکہ تمام کتابیں خودنوشت سوانح یعنی اتم کتھائیں ہی ہوتی ہیں چاہے وہ علم تولید کے بارے میں ہوں چاہے اینگلیکن چرچ کی تاریخ کے بارے میں جو ۲۲ جلدوں پر مشتمل ہے۔ وہ چاہے موٹر کار کی میکینکس ہو یا حیوانات کا معالجہ۔ سبھی کا آغاز اس انسان ہی سے ہوا ہے جس نے ان سے متعلقہ کتاب کو لکھا اور اس عمل میں نہ صرف اپنی راتیں اپنے اندر جذب کیں بلکہ اپنی بیوی یا بیٹی کے اعصاب کو بھی جذب کیا۔ وہ سب اس کے ایک حصّے کی نمائندگی کرتے ہیں اور وہ لوگ جو مطالعہ صحیح ڈھنگ سے کر سکتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ نمائندگی مکمل فرد کی نمائندگی ہوتی ہے۔ آدمی کا اسلوب۔ چاہے وہ اینٹیکس کے بارے میں لکھ رہا ہو یا مخصوص قسم کے پھول پتّوں کے بارے میں۔ اس طریق کار میں مضمر ہے جس سے وہ لفظ کے مقابل لفظ رکھ کر تحریر کا تانابانا بنتا ہے۔ آوازوں کی اقدار میں جملوں کے وجود کو گوندھتا ہے۔ یہاں مختصر سا وقفہ رہتا ہے۔ وہاں ذرا لمبا وقفہ۔ یہ سب اس کی اندرونی حرکت کی اس

گئے ہیں، اور وقت ان کے قریب سے گزر گیا ہے اور ہرٹ فورٹ شائر میں داخل ہو گیا ہے پیڑ جنھوں نے وقت تشکیل کیا کیونکہ سردیوں کے موسم نے دھرتی کو سیاسی مائل سفیدی سے ڈھانپ دیا تھا وجود کائنات کو یاد کرتے تھے۔ انسان کے اندر ایک آگ ہے، ایک شے ہے، ایک روشنی ہے اور وہ اپنی رات اس چیز سے روشن نہیں کرتا جسے بجلی کہتے ہیں بلکہ ایسے لمس سے جو لمس نہیں ہے ایسے ہونٹ سے جو ہونٹ نہیں ہے بلکہ ایک مہک ہے۔ تنفس کی قوس ہے، اور خاموشی ہے جیسے سچائی ایک موجودگی ہو، ایک لمحہ ہو، ایک آنکھ ہو۔ الفاظ کچھ ایسی شے سے بنے ہوتے ہیں جن سے تنفس کی تشکیل ہوتی ہے۔

غیر ممکن ہی حقیقت ہے۔ پُر جوش ہی دلیر اور بے خوف ہے۔ جذبہ شدید ہے بلند ہے۔ پھل وسعتوں سے بنے ہوئے ہیں۔ گھاس روشنی ہے۔ نوع انسان راستے اور سڑکیں بناتی ہے۔ سب، تاکہ رات کو اس کی اپنی خاموشی سے ناپا جا سکے۔ گنگز چیپل کو کاریگروں نے نہیں بنایا تھا بلکہ یاتریوں کی دعاؤں نے۔ کالج امراء، شرفا اور بادشاہوں کی خیرات سے تعمیر نہیں ہوئے تھے بلکہ نورِ دروں کی لپک سے۔ اس متاعِ حقیقی کے ہالے سے جو انسان کے خون میں اور اس کے ہونے میں ہے۔ جس میں خدا ایک قطعے کی طرح تیرتا ہے، پُل تعمیر کرتا ہے اور ایک مینار کی تشکیل کرتا ہے اور محرابی دیواروں کے درمیان محنتی طالب علم لڑکے ہیں اور فاصلے پر وہ لڑکیاں ہیں جو وسعت فکر جسم بصارت اور حرکتِ ماہتاب کو زندگی کے تانے بانے میں بنتی ہیں، شامل کرتی ہیں تاکہ ایک بہتر انگلستان، ایک بہتر ہندوستان اور ایک بہتر دنیا کی حدیں مقرر کی جا سکیں۔ کیم وہ ندی ہے جو خوابوں کے نذرانے دے کر زندہ ہے۔

ساوتری شرمیلی تھی، بہت شرمیلی۔ اس کا لمس فطری تھا اور اس کا کوئی نام نہیں تھا۔ وہ بات کرتی تھی تو ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنا سر ساڑھی سے ڈھانپ رہی ہو اور پلّو کو اپنے سینے پر اچھی طرح پھیلا رہی ہو۔ وہ کسی اور سے نہیں شرماتی تھی بلکہ اپنے آپ سے۔ کئی ایسے بھی موقعے آئے تھے جب ہم سوچتے تھے کہ کہیں وہ اپنی ہی کمر کو چھو کر یا اپنی ہی آواز سن کر تو نہیں شرما جائے گی۔ میرا خیال ہے کہ اسے اپنے دل کی دھڑکن سننا بڑا اچھا

لگتا تھا۔ اور یہ وہ مقام تھا جہاں اگر آپ جرات کرتے تو اسے مل سکتے تھے لیکن لطف کی بات یہ تھی کہ آپ جرات ہی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ایسا کرنے کے لیے آپ میں ایک درویش کی سی منکسر مزاجی کا ہونا ضروری تھا۔ مجھے اگر ساوتری کو جاننا تھا تو میرا درویش یعنی سنت بننا ضروری تھا۔ ایسا درویش نہیں جو گیروے لباس میں ہو اور استخوانی کشکول اٹھائے ہوئے ہو بلکہ ایسا سنت جو 'انہدام انا' سے واقف ہو۔ جسے وقتِ طلوع شعر پڑھنا اپنے خواب کے واقعات کو یاد کرنے کے بجائے اپنے خوابوں کے لمس کو یاد کرنا ہے۔ ساوتری کو جاننے کا مطلب زندگی کی سچائی سے متعارف ہونے ایشور کو یاد کیے جانے کی طرح تھا۔ وہ آپ کو دھکیل کر کبھی پرے نہیں کرتی تھی بلکہ آپ خود اس سے پرے ہو جاتے تھے کیونکہ آپ میں اور اس میں کوئی مشترکہ دائرہ علم یا گیان نہیں تھا۔ کوئی ایسی زبان نہیں تھی جس میں تبادلۂ خیالات کے لیے ایک جیسی علامات موجود ہوں۔ اس کی سادگی ہی اس کی دفاع تھی اور اس کی ہنسی۔ وہ اس قدر کھل کر لیکن نرمی سے ہنستی تھی کہ اس کی ہنسی سرکس کے اس مسخرے کی ہنسی لگتی تھی جس کا جسم شیر ببر کے روبرو آتے ہی خوشی کی موجوں میں لہرانے لگتا ہے۔ ساوتری بس خوفزدہ تھی، میرا حوصلہ میری ناکامیابی تھی جسے قوت میں بدل دیا گیا تھا۔ اس کی ہنسی اس کا خوف تھا جسے فطری سادگی میں بدل دیا گیا تھا۔ ہم دونوں کو ملانے کے لیے کوئی کلیر برج نہیں تھا۔ ہم آمنے سامنے کے کناروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے تھے۔ بطخ ایک طرف تھی اور سائیکل دوسری طرف۔ لیمپ کی روشنی والی بے یار و مددگار اپنے گیئر پہ پیر رکھ کے گھومنے والی سائیکل۔

ایک شام میں ساوتری کو گرٹن کالج تک چھوڑنے گیا۔ ہم کو محسوس ہوا جیسے ہم سنیما میں ہنس رہے ہوں۔ ہوٹل پہنچا تو پورٹر جان نے مجھے ایک خط دیا۔ یہ میڈلین کا تھا۔ یہ دکھوں اور پریشانیوں کا بے سر و پا بیان تھا۔ لیکن اس سے مجھے حوصلہ ملا۔ مرد کو اپنے پیروں کی ہڈیوں پر کھڑا ہونے کے لیے عورت کی ضرورت ہے۔ آپ کے پاس فرار کے لیے ایک مقام ایک مرکز کا ہونا ضروری ہے۔

لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں اور چارجز بھی ان میں شامل ہے کہ کیمبرج میں میرے اور ساوتری

کے درمیان کیا ہوا تھا۔ واقعتاً اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوا تھا کہ اگر آپ خاموشی کو گہری نظر سے اور دیر تک دیکھتے ہیں تو آپ آواز کا ایسا مائل مرکز دائرہ دیکھتے ہیں جو سمجھاتا ہے کہ پاروتی کیوں ہمالیہ کی بیٹی تھی اور سیتا کیوں کھیت کی 'ہل ریکھا' سے پیدا ہوئی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے اپنے آپ کو سنا ہے یا میں نے اپنی آنکھوں کو یہ دیکھتے ہوئے دیکھا کہ میں نے دیکھا ہے۔ وہ میرے شعور کے عقب کا شعور بن گئی۔ میرے اور راک کی لیک میں نے دنیا کھودی اور وہ دنیا بن گئی۔

میں نے اسے جو کچھ بھی دیا اس نے قبول کر لیا جیسا گنگا ہمالیہ کے پانی کو قبول کرتی ہے اور پھر بہہ کر سمندر تک جاتی ہے۔ پھر برف کے سفید گالوں کے روپ میں آتی ہے۔ پھر نیلگوں ہو جاتی ہے، پھر سبز اور جب سورج شمال کی طرف آتا ہے برف پگھل جاتی ہے اور گنگا ایک بار پھر پانی کو سمندر تک لے جاتی ہے۔ اس طرح ہم نے ایک دوسرے کو پیار دیا جیسے وہ پیار ہمارا نہیں تھا بلکہ ایک اصول تھا۔ ایک ایسی دوسری غیر ذاتی حقیقت تھی جس سے ہم نے ہم میں سے ہر ایک کے اندر ظہور پذیر ہوتے ہوئے تحائف کو دیکھا۔ اور پھر انہیں آداب کے ساتھ ایک دوسرے کی نذر کر دیا۔ اس لیے ہمارے لیے سب کچھ ایک جشن کی طرح تھا ایک تہوار کی طرح!

سچائی زندگی کی حقیقت ہے۔ یعنی سچائی جو ہر حقیقت ہے اور اس طرح سے سچائی اور زندگی ایک ہی چیز ہیں۔ مرد اپنے آپ کو عورت میں ایک جوہر کے روپ دکھتا ہے۔ نسائیت بطور حقیقت اس کی زندگی کے معنی ہیں۔ اگر کچھ دیگر نہ ہوتا تو آپ کو پتہ ہی نہ چل سکتا کہ آپ ہیں اگر پاروتی بیٹھ کر پیار تھنا نہ کرتی کہ شوا اپنے نیتر کھولے تو شو کبھی اپنی آنکھیں نہ کھولتا اور دنیا کبھی ہوتی ہی نہیں۔ پیار گیان امرت ہے علم کا شہوت ہے۔ جاننا اس لیے مدھر ہے کیونکہ عورت ہے۔

مرد کی دنیا ہمیں ایک ایک کر کے ہمالیہ کے شکھر بدلے جاتی اور کبھاروں کی طرح جو عورت مرد کے جنسی رشتے سے اور بچے پیدا کرنے سے نفرت کرتے تھے ہم نے بپتسمہ لے لیا ہوتا اور خلا کے بھجن اور گیت گاتے ہوئے اپنے آپ کو کھڑی چٹان سے نیچے گرا دیا ہوتا۔ بدھ مت ہندوستان

میں اس لیے ختم ہو گیا کیونکہ وہ ریاضت کش ہو گیا اور عورت کو اس کے وجود کے حق سے محروم کر دیا۔ وہ لوگ جو عورت سے نفرت کرتے ہیں جو اس کی تذلیل کرتے ہیں انہیں بہرحال اپنے آپ کو ختم کر دینا چاہیے جیسے کیتھا لوگ مرن برت رکھ کے کیا کرتے تھے۔ مہاتما گاندھی بہنوں کے طور پر عورتوں کی عزّت کرتے تھے۔ ساتھیوں کے روپ میں نہیں۔ وہ بھی پیار کرنے کے عمل کو اور بچّے پیدا کرنے کے عمل کو ناپسند کرتے تھے اس لیے انھوں نے عورتوں کو چھوٹے چھوٹے مرد بنا کر رکھ دیا۔ مرد کی کائنات دھرتی سے انکار ہے۔ یہ ٹھیک اسی طرح ہے جیسے کوئی ایسا ملک ہو جس کا صدر تو ہو لیکن بادشاہ نہ ہو۔ ساری دنیا کی وسعت عورت کے ہونے کے لیے ہے۔ اور دنیا سے ہمیں متعارف کرانے کے عمل میں وہ بتاتی ہے کہ اپنے آپ کو دوسرے کے روپ میں دیکھنا ہی دُنیا ہے۔ ملن اس بات کا ثبوت ہے کہ سچّائی میں وحدت ہے دُوئی نہیں ہے۔ برہدارن یک اپنشد میں کہا گیا ہے "جس طرح اپنی پیاری دلہن میں سمٹا ہوا فرد 'میں' اور 'تو' کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اسی طرح پہلے سے جاننے والا (آفتابی) وجود اندر کے 'میں' اور باہر کے 'تو' کو نہیں جانتا۔ سچ 'ایک' نہیں ہے لیکن سچ 'دو' بھی نہیں ہے۔ ساوتری نے ثابت کیا کہ میں 'میں'، ہو سکتا تھا۔

مرد دنیا تو بن سکتا ہے لیکن اس پر قبضہ نہیں کر سکتا۔ میں ساوتری کا مالک تو نہیں بن سکا لیکن میں میں بن گیا۔ یگیہ ولکیہ کے اپنی بیوی سے کہے گئے الفاظ کتنے صحیح ہیں "شوہر بیوی سے بیوی کی خاطر پیار نہیں کرتا بلکہ وہ بیوی سے اس وجود کی خاطر پیار کرتا ہے جو بیوی میں پنہاں ہے۔

اس لیے اپنی سلطنت کے تعلق سے بادشاہ مذکر ہے اور کل یعنی حق، کے تعلق سے مونّث۔

بھدّے انقلابی لفظ 'سرمایہ دار' نے میرے نزدیک ایک نئی اہمیت اختیار کر لی۔ یہ لفظ واضح طور انیسویں صدی میں سامنے آیا تھا اور یہ صدی مرد کے تکبّر کی صدی تھی۔ ایجادات اور سلطنتوں کی صدی۔ مرد انسانوں کا ہیرو تھا۔ کلایو کسی آزاد ملے دلو کا ملازم ہونے کے بجائے کمپنی کے ڈائرکٹروں کا تابعدار ملازم ہونے میں زیادہ فخر محسوس کرتا تھا۔ اپنے شہزادے

خاوند کی وفات کے بعد ملکہ وکٹوریہ کی تجسیم اپنے آپ میں ہونے کے بجائے اس میں کہیں زیادہ ہوئی ۔ وکٹورین ازم کا جنم اس کی بیوگی سے ہوا! اس، کا تصور کرتے ہوئے ۔گلیڈ سٹون اور ڈزرائیلی اس کی متبادل علامات کے طور پر تھے ۔ وہ اپنی سلطنت کی مختار کل تھی جس کے سامنے خرطوم کا گورڈن اس طرح دوزانو ہوتا تھا جس طرح کوئی اپنے آقا کے سامنے گھٹنے ٹیکتا ہے ۔ ملکہ الزبتھ اول کے عاشقوں اور مارلو، شیکسپیر اور آرمیڈا کی دنیا کس قدر مختلف تھی ۔ ملکہ وکٹوریہ کی زاہدانہ دنیا کئی مرد سلطنتوں میں منتشر ہو گئی ۔ اور آخری وہ تھی جسے مہاتما گاندھی نے بنایا تھا ۔ وکٹورین ازم کا خاتمہ لندن یا ملبورن میں نہیں ہوا بلکہ نئی دہلی میں ۔ جرمن ۔ برٹش شاہی خاندان کے معزز نمائندے نے اس نے سپرد آتش کیا ۔ گوڈسے جس نے مہاتما گاندھی کو قتل کیا ۔ سینٹ ڈومنک کی طرح تھا ۔ لیکن کلیسائی عدالت احتساب کا جنم زندگی کے جواز کے طور پر ہوا نہ کہ زندگی کو ختم کرنے کے لیے ۔

ان دلوں مجھے کیم کے کنارے گھومتے ہوئے اپنے آپ شنکر کے بھجن گاتے ہوئے کسی بس یا کار کا انتظار کرتے ہوئے جب میرا ایسا کرنے کا عمل سادتری کو میرے پہلو میں لے آتا تو مجھے بڑا عجیب سا لگتا ۔ کس طرح میرے خیالات ارضیت اختیار کر لیتے اور اس کے توسط سے میں کس طرح تواریخ کے معنی اور آہنگ کو سمجھنے لگتا ۔ میرے خیالات کا رخ عیسائیت کی جانب مڑ گیا ۔ کیسی عجیب بات ہے کہ سوال اور جواب کے طریقہ علم میں سارا سلسلہ حوا اور زوال آدم سے ہی شروع ہوتا ہے ۔ ہندو دھرم بھی ماں کا ہی گن گان کرتا ہے ۔ ماں کی شان میں لکھے گئے شنکر کے بھجن کس قدر خوبصورت ہیں ۔

ان پورنے ، سدا پورنے
شنکر پران ولبھ

سدا بھرپورا در مکمل ہے
شنکر کی پران پیاری دیوی ماں !

لیکن افسوس ہوتا ہے کہ زوال پذیر ہندو دھرم نے خالص ویدانت کو نسوانیت کی تجسیم

تک لے جاکر اس کو تانترک روپ دے کر ختم کر دیا۔

مجھے اچانک یاد آیا میرے پتاجی کہتے تھے سولھویں صدی میں یا اس کے آس پاس میرے آبا و اجداد میں سے کوئی بہت بڑا تانترک تھا جس نے یوگا چاروں پر ایک نصابی کتاب لکھی تھی، کہانی کچھ اس طرح تھی کہ کس طرح وہ ایک کنواری کو گھر میں لے آیا پوجا ارادھنا کے لیے۔ اور جب وہ گھنٹوں منتروں کا جاپ کر چکا اور دھیان مگن رہ چکا تو دودھ لایا گیا۔ اور شہد کافور اور کدم کے پھول بھی۔ تب اس نوجوان لڑکی کو جو رادھا نام کی کوئی داشتہ تھی، کھڑی رہنے کے لیے مجبور کیا گیا اور سولہ مرد، جنھوں نے گیارہ دن کا برت رکھا تھا اور گیارہ راتوں تک پرارتھنا کرتے رہے تھے اندر آ گئے۔ ان کی ململ کی سی سفید جلد تھی اور ان کی آنکھیں قربانی کی اس آگ کی طرح چمک رہی تھی جو ان کے سامنے جل رہی تھی۔ ان کے ماتھے پر بھبھوت تھی اور ان کی کمر اور ٹخنوں پر زردوزی کا کام تھا۔ انھوں نے اس نوجوان لڑکی کے سر، چھاتی اور بازوں پر پہلے شہد پھر دودھ اور پھول چڑھائے اور یہ سب چیزیں اس کے نسوانی جسم اس کی نسوانیت پر ایسے بہہ گئیں جیسے یہ دنیا عورت ہی کے عنصر حقیقی سے بنی ہوئی تھی ٹھیک اسی طرح جس طرح شہد، پھول کے حقیقی عنصر سے بنا ہوتا ہے۔ لڑکی خود آگے بڑھی یہ گیت گاتی ہوئی۔

میرا کوئی جسم نہیں ہے۔ میرا کوئی ذہن نہیں ہے
میں جوہرِ تخلیق ہوں
خود ہی اپنی رہنے کی اس جگہ کو، اس دنیا کو
نا تخلیق کرتی ہوں
میرا سوامی وہ ہے جو کیلاش پربت پر رہتا ہے
ترشول دھاری
اس کی جٹاؤں میں چاند ہے
میرا پتی - آواز کا سرچشمہ!

پھر وہ آگ کی جانب بڑھی۔ اس کے اِردگرد پھیرے لیے، سات پوتر پھیرے، اپنے شریر

پر بھبھوت مل لی۔ اور ایک برہمن سے گیرواں دھارے کر ایک تیاگی، ایک راہبہ کی طرح باہر چلی گئی۔ تسکین روح سے سرشار۔! اپنی تکمیل سے سرشار۔ عورت کو اپنی تکمیل کے لیے ہماری پرستش چاہیے اس کی پرستش میں ہی ہمیں دنیا کا پتہ چلتا ہے اور ہم اسے غارت کر دیتے ہیں۔ اور اسے اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں۔ ہمیں رشو ہونا چاہیے کہ عورت اس میں تحلیل ہو جائے اور اس کے ساتھ ہی دنیا بھی کیونکہ دنیا انکار کرنے کے لیے نہیں ہے بلکہ تحلیل ہونے کے لیے۔

عورت ہی اصل شے ہے میں نے اپنے آپ سے کہا۔ اس لیے راہبوں کی نفسیاتی وابستگی ہے اپنے لنگوٹ کے ستھ اپنے کمنڈل کے ساتھ اپنی لاٹھی کے ساتھ اور اپنے ننگے پیروں کے ساتھ جارجز مارملیڈ یا جیسٹ نٹ جام کھاتے ہوئے اسے کیسے چوستا ہے۔ اسے بار بار اپنی زبان پر گھماتا ہے تب کہیں جاکر اسے نگلتا ہے۔ تھوڑا تھوڑا کر کے۔ مزے کی آوازیں نکالتے ہوئے، ڈکار لیتے ہوئے اور معصومیت سے میڈلین کی جانب دیکھتے ہوئے۔ آبے دیہ گرانن ول جب وہ ہم سے ملنے ہمارے یہاں آیا تو اپنی نسوار اس انہماک سے ملنے لگا جیسے اس عمل سے اسے خود کو برانگیختہ کرنے والا احساس عطا ہو رہا ہو۔ اپنے آپ کی رہائی۔ جب نسوار اس کی ناک میں اوپر چڑھ گئی تو اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ جلن کے خوف سے نہیں بلکہ اپنے کو اندر محسوس کرنے کی خوشی سے۔ کوئی بھی گناہ گار کوئی بھی ڈان جان بھوت بن کر دنیا میں نہیں لوٹ سکا ہوگا۔ لیکن بہت سے خانقاہ نشین اسی شکل میں لوٹے ہوں گے۔ اس لیے یہ حیران کن بات نہیں ہے کہ زیادہ تر عورتیں ہی بھوتوں کے قبضے میں آجاتی ہیں۔ مرد نہیں۔ کم از کم ہندوستان میں بھوت پریت سولہ سالہ لڑکیوں یا بیواؤں کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔

ایک دن بعد دوپہر اندھیرے میں اور ٹھنڈ میں ساوتری کا انتظار کرتے ہوئے مجھے بڑی سڑک اور کلیر برج کے بیچ کی دوری بہت لمبی لگی تھی۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ اپنے کمیونسٹ ساتھیوں کے ساتھ کسی مشکوک اور لاختم قسم کے بحث میں الجھی ہو گی ہیں بورژوا اور سرمایہ دار لوگوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ ساوتری اپنے کمیونسٹ ساتھیوں سے اکثر ملتی تھی۔ ان کے خلوص ان کی نیک نیتی۔ ان کے صاف ستھرے پن کو پسند کرتی تھی۔ "ان سے بورژوا لوگوں جیسی بو نہیں آتی"۔ اس کے ذہن میں ان کا یہ تصور تھا!

میں نے خود سے کہا۔ نازی ازم مرد کی برتری کے اصول سے پیدا ہوا ہوگا۔ نازی ازم کے پیغمبر اعظم نطشے کے ذہن میں سپرمین کا خیال اس لیے آیا کیونکہ لو اینڈر یاس سلوم نے افسوس!! اس کے ساتھ بے وفائی کی تھی۔ مادہ کائنات کی نفی کرتے ہوئے نطشے نے زرتشت کو پہاڑ کی چوٹی پر چڑھا دیا جہاں سے وہ دنیا کو کوسنے لگا۔ یہودی دنیا دار لوگ ہیں۔ دنیا کو بنانے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ یہی یہودی کے تئیں 'مرد آدمی' کی حقارت کا کارن ہے۔ جتنے یہودی غیر یہودی عورتوں سے بیاہ کرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ غیر یہودی مرد۔ یہودی عورتوں سے شادی کرتے ہیں۔ کم از کم کیمبرج میں یہی صورت حال ہے۔ سادتری کی سب سے پیاری سہیلی ایک یہودی لڑکی تھی۔ وہ ایک جرمن مہاجر ماں اور اعلیٰ خاندان۔ اعلیٰ سے اعلیٰ خاندان۔ کے انگریز باپ کی بیٹی تھی اور سادتری سے بہت پیار کرتی تھی۔ کیمبرج میں بیٹھی تے ایک بار ایک یہودی لڑکے کو کہتے ہوئے سنا تھا۔ "آؤ کم از کم ہم اپنے لیے تو کچھ یہودی لڑکیاں چن لیں۔ اگر کیمبرج کی سبھی یہودی لڑکیوں کو ڈیوکوں اور لارڈوں کے بیٹوں سے پیار ہو گیا تو ممکن ہے ہم لوگوں کو غلط طریقے اپنانے پڑیں۔

مارکسزم ایک یہودی کی تخلیق تھی۔ یہ بات ناگزیر تھی۔ یہ بات بھی ناگزیر تھی کہ مارکسزم چین میں کامیاب ہو رہا تھا۔ چین کے علاوہ کون ایسا ملک ہوگا جس نے مکمل اعتبار کے ساتھ دنیا کی حقیقت کو قبول کیا ہو۔؟ اگر دنیا میں رہنا ہی ہے تو دنیا کو قبول کرنا ہی ہوگا۔ عورت کو قبول کرنا ہی ہوگا۔ نازی ازم اور کمیونزم اور ہٹلر اور لینن کی بیچ کی لڑائی گاڈس برگ کے ایک راہب اور ٹھگنے، بھاری بھر کم سلاد کی لڑائی تھی جو بائسکل اور کتاب کے ساتھ برٹش میوزیم سے گرم آگ اور کرد پ سکایا کی جانب لوٹ رہا تھا۔ پاکباز ڈانٹن کی بیوی کا کون ذکر کرتا ہے؟ لیکن آسٹریا کی شہزادی کو کون نہیں جانتا! کمیونزم زندگی کی قبولیت ہے زندگی کا جواز ہے نازی ازم زندگی کی نفی ہے۔ اس کا غارتگر ہے۔ مجھے یقین ہے ہیمبرگ کے جلنے پر کمیونسٹ اتنے خوش نہیں ہوں گے جتنے یہودی لندن کے جل جانے کے خیال سے جب جرمن فرانس میں داخل ہوئے تو ان کی فوج کے کچھ افسر ایسے تھے جنھوں نے سمندر کی خاموشی کو ممکن بنایا۔ جب روسی برلن میں داخل ہوئے تو انھوں نے ہر اس عورت کے ساتھ زنا بالجبر

کیا جس کے ساتھ وہ کر سکتے تھے۔ ایک زندگی کی تکمیل کی طرف لپکا دوسرے نے نفی میں فخر محسوس کیا۔ ابلیس انانیت پسند تھا۔ لیکن وہ سینٹ فرانسس تھا جو محتسبِ کلیسا بن گیا۔ اگر میں شاہ پرست نہ ہوتا تو مجھے کمیونسٹ ہونا چاہتے تھا۔ اسٹالن بالآخر غاصب تھا۔ ایک سیزرے وچ راس پوتین کا جانشین بن گیا۔ ایوان کرمازوف عیسیٰ کا بڑا اچھا شاگرد تھا۔ احتساب کا مخالف۔ الیوشا سچا عیسائی تھا۔ جب مادرِ خدا نے فرزندِ آدم کی جگہ لے لی تب کیتھولک مذہب ساری دنیا کا مذہب بن گیا۔

اب بھی جب میں راستے پر آگے اور پیچھے چل رہا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے کہ تواریخ کے بارے میں سوچنا ساوتری کے بارے میں سوچنا ہے، میں نے سوچا یہ واقعی سچ ہے کہ راہبانہ پروٹسٹنٹ مذہب جذبۂ مقدس نسوانی کمیونزم کی مدافعت کر رہا ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر کمیونزم کی شکست ہو گی تو ایٹم بم یا کوریا کی جنگ کے سورماؤں کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لیے کیونکہ امریکہ کی تہذیب اپنے پیورٹین پس منظر سے عورتوں کے کلبوں کی کشادگی کی جانب تغیّر پذیر ہے۔ یورپی مرد کے مقابلے میں امریکی مرد نے عورت کو زیادہ بھرپور طریقے سے قبول کیا ہے۔ عورت کی پرستش میں ہی دنیا کی نجات ہے۔

پھر وہ میرے پاس آتی غالباً اسی انداز سے جیسے وہ اس سے پہلے کسی روز آئی تھی۔ برہنہ پیڑوں تلے، چراغوں کی زرد روشنی تلے۔ ساڑھی اور کتابوں کا حسین و جمیل اشارہ لے۔ آواز میں بہانوں کی کھنک لیے معذرت کی التجا کرتی ہوئی ”کیا میں نے تمہیں بہت انتظار کرایا؟“ اس نے کچھ اس طرح پوچھا تھا۔ میرے اوورکوٹ کے بازو میں اپنا گرم ہاتھ ڈالتے ہوئے جیسے نہر کے آبی دروازے کھلتے ہی نہر کا پانی شور مچاتا تیزی سے پیچھے کی طرف دوڑتا ہے جاری و ساری ماضی پر خوشیوں کی بوچھار کرتا ہوا۔ احساسِ قربت اور پُرجوش پُرحرکت دعا کے عالم میں یہ کہتا ہوا کہ مرد کی ذات میں جو سلطنت ہے وہ خالی اور ویران نہیں بلکہ سب کچھ سچا ہے اور قابلِ تعظیم ہے۔

جی ہاں۔ ساوتری کے دل میں ہر شے کے لیے بڑی تعظیم تھی۔ چاہے وہ چمچہ اٹھا رہی ہوتی یا پتہ لکھنے کے لیے اپنا قلم! وہ اپنا قلم اور چشمہ جہاں بھی رکھتی ہمیشہ بھول

جا یا کرتی تھی۔ کلاس میں اپنے رہنے کی جگہ پر، ریستوراں میں کہیں بھی۔ سب سے اچھی بات جو میں اس کے لیے کر سکتا تھا۔ وہ یہ تھی کہ میں لیونس یا وٹ فولڈز جاتا تھا اور وہاں کے منتظمین سے ساوتری کے چشمے کے بارے میں پوچھتا تھا۔ میں ان کو صفائی دیتے ہوئے بتاتا کہ ”ایک ہندوستانی عورت آج بعد دوپہر اپنا چشمہ کہیں بھول گئی تھی۔“ اکثر یہ ہوتا کہ چشمہ مل ہی جاتا تھا۔ کبھی کبھی یہ بھی ہوتا۔ ٹرنٹی کے عقب میں کسی بنچ پر بیٹھے ہم کسی انتہائی گہرے اور مشکل مابعد الطبعیاتی موضوع پر محو گفتگو ہوتے اور کوئی بانکا سجیلا شائستہ نوجوان ہندوستانی یا انگریز ادھر آ نکلتا (”تمہارے آشنا“ میں اکثر مذاق کے طور پر ان کو ان الفاظ میں بیان کرتا تھا۔ لیکن بعض دوسرے جذبات کی آمیزش کے بغیر نہیں) جس کو اپنا کھویا ہوا چشمہ تلاش کروانے کے مقصد سے اس نے 'ہیفر' کے یہاں بھیج رکھا تھا یا مائیکل ڈرے ٹن لانے کے لیے (کیونکہ ابتدائی سترھویں صدی پر وہ خصوصی کام کر رہی تھی) یا پھر کور پر کیٹل (کنگز کے سامنے) جہاں لڑکیاں بعد دوپہر جمع ہوا کرتی تھیں اور اپنے مشاغل اور اپنے کام کے بارے میں باتیں کیا کرتی تھیں۔ کئی بار لڑکیاں چاہے وہ بیٹسی تھی (جسے میں اب تک مل چکا تھا) یا لکشمی یا شریف — دو ہندوستانی لڑکیاں۔ ایک ترچناپلی کے برہمن خاندان سے اور دوسری لکھنؤ کی مسلمان لڑکی۔ دونوں اس کی آنچ اور ذہانت کی تلاش میں ہوتیں لیکن اپنی نسوانی وجوہ سے اس سے نفرت کرتیں۔ اس لیے کوئی لڑکی یا لڑکا ساوتری کا چشمہ یا اس کا قلم یا اس کی نوٹ بک تک ڈھونڈ کر لے آتا اور یوں گویا ہوتا۔ ”مخل ہونے کے لیے معافی چاہتا ہوں ساوتری“ اور کئی بار یہ بھی ”شہزادی مخل ہونے کے لیے معذرت خواہ ہیں۔ لیکن ہم نے سوچا آپ پھر کھو جائیں اور گرٹن دروازہ ہی نہ ڈھونڈ پائیں۔ آپ یہ تو نہیں چاہیں گی آپ کے ساتھ پھر ایسا ہو۔ کیا آپ ایسا چاہیں گی؟“ — ”نہیں“ ساوتری مسکرا کر جواب دیتی۔ ”نہیں نہیں آپ کا بہت بہت شکریہ!“

میرے دیکھنے کے انداز سے کسی دخل اندازی کی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے ہماری گفتگو چاہے وہ ناگو ملِ تنویت یعنی دوئی کے بارے میں تھی یا ۱۹۴۸ء کے 'انقلابِ خیز' کے بارے میں جاری رہتی۔ در اصل وہ کوئی ایسی پکی کمیونسٹ بھی نہیں تھی لیکن ایک بار

اس نے کہا " جانتے ہو راما سوامی وہ کلفت اور پریشانی جو میں نے شمالی ہندوستان میں دیکھی ہے پاسیوں کے قبیلے میں جہاں صرف پانچ روپے کے لیے ایک آدمی دوسرے آدمی کا قتل کر دیتا ہے یا تم کسی ایسے گاؤں یا وہاں کے کسی گھر میں گئے ہوتے جہاں میں چوری چھپے اس وقت تک جایا کرتی تھی جب میرے پتا شیر کے شکار پر نکلے ہوتے تھے یا ان کے تئیں اظہار عقیدت کے لیے تلواروں یا اشرفیوں سے لیس بڑے بڑے لوگوں کا ہجوم آیا ہوتا تھا یا اس سے بھی بڑے اس ظالمانہ موقعے پر کاش تم میرے ساتھ ہوتے جب میرے پتا جی نے ایک کلرک کے بیچارے بیٹے کو ۔ منشی کے بیٹے کو محل کے دربار کے ایک درمیانی ستون کے ساتھ باندھ دیا تھا اور اس پر اس لیے کوڑے برسائے تھے کیونکہ اس نے ایک سچے مسلم نوجوان کی طرح میرے اعزاز میں شعر لکھنے اور میری کھڑکی تلے کھڑے ہو کر بڑی معصومیت سے انہیں گنگنانے کی جرأت کی تھی ۔ اور جس انداز سے جب سیلاب آیا تھا ماں گومتی کی مہربانی سے ۔ برساتوں کے وسط میں اور کمبل جھولا اور برتن سروں پر رکھے مردوں ، عورتوں اور بچوں کو پیڑوں پر چڑھنا پڑا تھا اور پندرہ روز وہاں گزارنے پڑے تھے ۔ جیسے یہ چاند سے چاند کا سفر تھا ۔ کیونکہ ندی کا پانی جھونپڑوں اور گھروں میں داخل ہو گیا تھا اور مویشی ، چار دیواریوں کے پتھر اور بچے اپنے ساتھ بہا کر لے گیا تھا ۔ تم نے اگر یہ سب دیکھا ہوتا تو تمہیں پتہ چلتا کہ میرا کمیونزم کہاں سے آیا ہے ۔ میرا کمیونزم بھارت ماتا کے آنسوؤں سے بنا ہے ۔

"جی ہاں " میں نے جواب دیا " لیکن یہ اس لیے ہے کیونکہ تم رو نہیں سکتی ۔"

" یہ بات تو ٹھیک ہے تمہاری " وہ ہمیشہ مان جانے کے لیے تیار رہتی تھی ۔ میں اس کا اسکول ماسٹر تھا اور اسے مجھ سے سیکھنا اچھا لگتا تھا ۔"

" سچی بات تو یہ ہے کہ پیار تمہارے نزدیک ایک تجریدی مفروضہ ہے ۔"

"کس قدر صحیح کہہ رہے ہو تم " اس نے کہا اور اس کی آنکھیں ایک فوری روشنی سے چمک اٹھیں ۔ "لکشمی کہتی ہے ۔" اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا " کہ ساوتری کبھی کسی سے پیار کر ہی نہیں سکتی ۔ پیسہ ، تعریف ۔ سب کچھ اسے مل چکا ہے ۔ یہ اس کے اپنے

الفاظ ہیں۔ اس لیے ساوتری کبھی پیار نہیں کر سکتی"۔

"نہیں" میں نے شاید کسی حد تک اپنی خود غرضانہ دفاع میں احتجاج کیا "تم پیار کر سکتی ہو یا بلکہ تم بذات خود پیار بن سکتی ہو"۔

"اچھا! اب یہ کیا کہہ دیا تم نے"

"کیونکہ تمہارے نزدیک پیار کوئی بندھا ٹکا نظام نہیں ہے۔ جذبے کی سمت سازی، یا کوئی خیال۔ تمہارے نزدیک پیار ایک حقیقت ہے کہ فوری تجربہ ایک فطری احساس"۔ میں نے کہا۔

"خوب! بہت خوب۔ بات جاری رکھو اپنی"

"میں نے تمہیں پھول کو دیکھتے ہوئے دیکھا۔ یا پھر تم بند پر کھڑی کرکیم ندی کی گنگناہٹ اس وقت تک سنتی رہتی ہو جب تک تم اپنے آپ میں پوری طرح کھو نہیں جاتی۔ بڑی طویل خاموشی کے بعد تم ہوش میں آتی ہو اور ان الفاظ کے ساتھ 'کیا میں نے تمہیں انتظار کروایا' اور ایسا لہجہ جو دل کو بیچ کر رکھ دیتا ہے"۔

"بڑے عقل والے ہو تم! اچھا یہ بتاؤ کہ جب میں کیم ندی کی آواز سنتی ہوں تو کیا ہوتا ہے"؟

"گیانی کا کہنا ہے کہ جب کیم ندی دیر تک گنگناتی ہے تو ساوتری، ساوتری بن جاتی ہے۔ پہلے ساوتری ندی کی آواز سنتی ہے پھر اپنے دل کی آواز سنتی ہے پھر اپنی خاموشی کو سنتی ہے اور پھر اپنے آپ میں کھو جاتی ہے"۔

"کہاں۔ سر!"

"کہیں بھی نہیں۔ نوجوان لڑکی۔ تم ہر شے کے تعلق سے کھو جاتی ہو۔ اپنے آپ کے تئیں نہیں۔ امبو بیتھا سلیلم سیوا قوتت ساگرم — یعنی اگر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کسی چیز کو دوام ہے کوئی چیز رواں ہے تو وہ پانی ہے"۔

"اپنی بات جاری رکھو۔ میرا خیال ہے میں سمجھ رہی ہوں"۔

"میں حکم مانتا ہوں۔ جیسا کہ پروست نے کہا ہے۔ آخر کار ہم صرف اپنے آپ کو ہی

جان سکتے ہیں۔"

"کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی شخص کسی دوسرے سے پیار نہیں کر سکتا۔" وہ جلدی میں تھی ۔ وہ اس بات کے ثابت کیے جانے کو سننا چاہتی تھی کہ پرتاپ اس سے پیار کر سکتا تھا لیکن یہ کہ ممکن ہے وہ خود اس سے پیار نہ کرے لیکن اس کے باوجود اس سے شادی کر لے۔ پرتاپ ہمیشہ اس کے ذہن میں رہتا تھا۔

نہیں ایسا نہیں۔ انسان کسی دوسرے انسان سے پیار کر سکتا ہے۔ لیکن پیار کبھی کوئی تحریک، کوئی احساس یا عمل میں ہوتا ہے۔ تمام اعمال صرف جسم کے ہو سکتے ہیں یا ذہن کے یا پھر انا کے۔ صرف خود غرض لوگ ہی پیار کر سکتے ہیں۔

"اور وہ جن میں پیار نہیں ہے"

"وہ پیار بن جاتے ہیں۔"

"اس دوران میں" اس نے اس کسان کی طرح معذرت کرتے ہوئے تیزی سے پوچھا جو جیوتشی سے دریافت کرنا چاہتا ہے کہ بارش کب ہوگی۔" اس دوران میں آپ سوویت لینڈ کا نغمہ گاتے ہیں۔" میں نے جواب دیا اور ہم اس زور سے ہنسے کہ ایک مہربان پروفیسر کی بیوی کو جو اپنے چپٹی ناک والے کتے کو سیر کروانے کے لیے نکلی ہوئی تھی یہ محسوس ہوا۔ ہماری اس غیر شائستہ حرکت سے سلطنت برطانیہ میں برطانوی حیثیتِ سگ مجروح ہوگئی ہے۔ ٹرنیٹی کے ایوانوں نے ضرور ہمارے بلند قہقہوں کی آواز سنی ہوگی۔ کتے نے اپنا زور زور سے بھونکنا بہر حال جاری رکھا۔

"چپٹی ناک والے کتے۔ مادام" میں نے سادگی سے کہا" ایک بورژوائی تصور ہیں۔ اور اشتراکیت کے فادر لینڈ میں ان کا داخلہ ممنوع ہوگا۔ ہمارے اپنے دیس ہندوستان کے کسانوں کے کتوں کو بلانے کے انداز میں تم بھی مخصوص آوازیں نکال کر سوویت لینڈ کے اکثر لوگوں کو بلا سکتی ہو۔ بہر حال وہاں وہ لوگ لیبل سجا کر' یا بہ زنجیر، میونسپل کمیٹی کے ہیلتھ سرٹیفکیٹ لے کر چلتے ہیں۔ اپنی دم کٹنے دیتے ہیں یا اپنی تھوتھنی پر منہ بند کرنے کی پٹی باندھنے دیتے ہیں۔ اس لیے کتوں کو لانے کی اجازت نہیں ہے۔"

"یہ خالصتاً امریکی پراپیگنڈا ہے،" اس نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔
"تمہیں پتہ نہیں میں تو امریکیوں کا تنخواہ دار ہوں،" میں ہنسا۔ "بات صرف یہ ہے کہ امریکی جارج سوم کے مخالف ہیں۔ سچے شاہ دشمن ہیں۔ وہ صرف میری بنا بادشاہ کی شہنشاہی اور میرے ویدانت کا مذاق اُڑا سکتے ہیں۔ مجھے سترھویں صدی میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔ اپنا نام رام بھٹ رکھنا چاہیے تھا۔ اور عظیم جگن ناتھ بھٹ کے انداز میں کسی گمنام شہزادے کی شان میں کوئی پیچیدہ قسم کا قصیدہ لکھنا چاہیے تھا۔
"کسی شہزادی کی شان میں کیوں نہیں؟" وہ پوچھنے لگی۔
"نہیں ان دنوں میں ایک برہمن کسی شہزادی سے شادی ہی نہیں کر سکتا تھا۔"
"لیکن جگن ناتھ بھٹ نے تو کی تھی۔"
"ہاں۔ لوگ کہتے ہیں ایسا۔"
"اس نے تو شاہ جہان کی اپنی بیٹی سے شادی کی تھی۔" اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ کچھ مذاق کے طور پر کچھ نیم سنجیدگی سے۔ "بلکہ وہ شہزادی کو بنارس لے گیا اور وہاں کے سب لوگ احتجاجاً اُٹھ کھڑے ہوئے کہ ایک مسلمان مغل شہزادی ساکشات کال بھیرو کے مندر میں کیسے داخل ہو سکتی ہے۔ لہٰذا شاعر اسے گلیوں اور گندی نالیوں کے درمیان سے گنگا گھاٹ لے گیا اور یوں گویا ہوا۔ "گنگا میّا۔ مہان گنگا میّا۔ میں اپنی دلہن اپنی شہزادی تمہارے پاس لایا ہوں۔"
"گنگا کا پانی چڑھنے لگا۔ موج در موج اوپر اُٹھنے لگا اور گنگا میّا اس پوتر دلہن کے چرن دھونے لگی۔ جی ہاں۔ گنگا میّا نے یہ کیا۔"
اور پھر جگن ناتھ بھٹ نے گنگا ندی کی شان میں "گنگا لہری" کے یہ مشہور شعر تخلیق کیے:

ندھانم، دھرمانم، کماپی چہ ددھانم
نو سدانم، تیرتھانم، امل یری دھانم، ترج گت
۔ سب دھرموں کا نواس،

نوجوانوں کو خوشی دینے والی

ایک اکیلی۔

تمام پوتر پانیوں کا مرکز

تینوں لوکوں کی چمکتی ہوئی مالا۔!

"اس نے کم ازکم اس دلہن کی بھی کچھ تعریف کردی ہوتی!" ساوتری نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"خیر وہ تو میں خود کردوں گا۔ تو پھر میں تمہاری شان میں سنسکرت میں شاردول وکری ڈت بحر میں ایک اشلوک کی رچنا کردوں" میں نے پوچھا "کیا تم مجھے اجازت دو گی" چونکہ میرے اٹھارھویں صدی کے اجداد کو چھوڑ کر آج تک کسی دوسرے کو سنسکرت زبان میں قصیدہ نہیں پیش کیا گیا لہٰذا کوئی ہرج نہیں اگر اب ایسا ہو جائے میرے نسبتاً قریبی اجداد سکندر اعظم یا رستم سہراب کے بارے میں لکھنے کے لیے مغل شاعروں کو مامور کیا کرتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا علین ممکن ہے۔ شہزادی کی مرمریں ہتھیلی سے کوئی بلبل آنسو پینے کے لیے آجائے۔ اور اگر تم حد سے زیادہ بڑھ گئے تو تمہیں ستون کے ساتھ باندھ کر تمھاری پیٹھ پر سے تمہاری کھال اُدھیڑ دی جائے گی۔ میں نے تمہیں کہانی کا انجام نہیں بتایا۔ میرے پتا ساری رات لڑکے کے باپ کے پاس بیٹھ کر روتے رہے اور سلطان نوجوان کو وظیفہ دے کر علی گڑھ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیج دیا۔

شعر برے نہیں تھے۔ مجھے آج بھی یاد ہیں۔

شبنم نے بیدار ہو کر آفتاب سے کہا۔

اے! سب کچھ دیکھنے والے

مجھے وہ بصیرت عطا کر جو

اس سرخ چراغ کو دیکھ سکے

جو روشنی دیتا ہے

تاکہ بلبل کے اپنی نوائے زیاد بلند کرنے سے پہلے

میں تمہارے ابروؤں کی قوسوں کا نظارہ کرلوں!

"اس بات میں کوئی شک نہیں" میں نے کہا "تمہارے ابرو تمہارے چہرے کا حسین ترین حصہ ہیں۔"

"بڑی بھدّی بات ہے۔ بہر حال کہتے جاؤ۔"

"تمہاری جلد غالباً اس سے بھی کہیں بڑھ کر خوبصورت ہے، کیونکہ پچھلے پانچ سو برسوں سے تم زنانے میں قید تھیں..."

"سات سو برس جناب کیونکہ وہ التمش تھا جس نے پہلے پہل ہم پر فتح حاصل کی تھی۔"

"بہر حال سات سو برس تک زنانے میں رہنے کے باعث تمہاری جلد میں اپنے آپ جگمگاتے رہنے کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔"

"تو پھر۔"

"اور اس لیے جب تم خاموش ہو جاتی ہو تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تم اندر سے بطور یہ دھیان لگائے بیٹھی ہو"

"اور وہ بھی کیسی گول مٹول سی کٹوراسی" اس نے خوش ہو کر بات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "گول مٹول۔ واقعی! لیکن جل ترنگ جسے سنگیت کار بجا سکے" اچانک جوش ختم ہو گیا۔ پلکیں اپنے آپ پر آ گریں اور یہ وہ موقعہ تھا جب کسی بھی پروفیسر کا چپٹی ناک والا گستا ساوتری کے دائرہ علم کے طلسم میں گرفتار ہو سکتا تھا جیسے کچھ کتے ایسی حالت میں بالوں کی دری پر آ بیٹھتے ہیں۔ کان پیچھے کی جانب کھڑے کر کے۔ دُم اٹھا کر اس انداز سے کہ ان کے جسم کے پچھلے حصوں سے کچھ ایسا اعتماد، کچھ ایسی قوت اُبھرنے لگتی ہے جس سے ان کی آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں۔

جب ساوتری اس عالم میں ہوتی تھی تو میں بھی اپنے آپ میں کھو جاتا تھا۔ اور مجھے اس احساس کے علاوہ کہ میں ہی وجود ہوں باقی سب کچھ بھول جاتا تھا، چونکہ میں ہوں اس لیے دنیا ہے۔ چونکہ میں ہوں اس لیے ساوتری ہے۔ ساوتری کو میں بازوؤں میں بھر لیتا تو کتنا اچھا لگتا مجھے! بالکل فطری، بالکل سچا ہوتا یہ سب! لیکن ہم سکوتِ واحد نہیں تھے۔ ہم دو

الگ الگ سکوت تھے۔ میرے اور ساوتری کے درمیان جو کچھ بھی حائل تھا وہ پرتاپ نہیں تھا۔ بلکہ ساوتری خود تھی۔ پھر اس کے اپنے دیوی دیوتا تھے۔ اپنی پوتر دھرتی تھی اور پھر وہ اپنے کامریڈ ساتھیوں اور سوویت سوشلسٹ جمہوریتوں کی یونین کے ساتھ خوش تھی۔ ماؤ ابھی مشہور نہیں ہوا تھا اور ہندوستانی سرحدوں کے کچھ زیادہ ہی قریب تھا۔ ساوتری نے اسے اپنے اندر فی الحال سرکاری طور پر قبول نہیں کیا تھا۔

اس مخصوص بعد دوپہر کو وہ غیر معمولی طور پر دیر سے یکایک نمودار ہوئی۔ اونچی ایڑی کے جوتوں میں اپنے پاؤں پر اپنا توازن برقرار رکھنے میں اسے ایسی دقت اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ بھاگم بھاگ آئی۔ اس کے دو ساتھی کم و بیش اس کے پیچھے پیچھے تھے اور میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔ میں ضرور اسے کچھ تنہا اور ناراض دکھائی دیا ہوں گا اس لیے اس نے آتے ہی میرے اس ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا جسے میں پل کی دیوار پہ ٹکائے ہوئے تھا۔ ہم میں سے کسی نے کچھ نہیں کہا۔ کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس کے لمبی اور گہری آہ بھرنے کے انداز سے لگتا تھا کہ اس کی اداسی بڑے متکلم انداز سے اس کے وجود سے بہہ کر باہر آ رہی ہے۔ اس کے ساتھی پل کے دوسری طرف کھڑے تھے اور پانی کی گہرائی کو گھور رہے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ نمی میرے پھیپھڑوں کا علاج نہیں تھی اور جس طرح کوئی دایہ کسی بچے سے مخاطب ہوتی ہے وہ یکایک مجھ سے کہنے لگی ”میں نے بہت دنوں سے تمہیں کھانستے ہوئے نہیں سنا۔ بہت بہت دنوں سے لمبے عرصے سے، صحیح بات ہے نا یہ۔ ہے نا!“ یہ بات واقعی صحیح تھی اور وہ جانتی تھی کہ اسی کے کارن میری سانس میں باقاعدگی آئی تھی اور مجھے آرام ملا تھا۔

جب ہم سینیٹ ہاؤس والے راستے سے اڈیلفی کی طرف جا رہے تھے تو وہ بولی ”معافی چاہتی ہوں۔ راما سوامی کیوں نہ ہم رات کا کھانا اکٹھے کھائیں۔ سب کے سب لوگ۔ کھانے کے بعد تم اپنا کام جاری رکھ سکتے ہو۔ میں بالکل بھول ہی گئی کہ میں نے جیک کو بتایا تھا کہ میں بدھ کی شام ڈانس کے لیے خالی رکھوں گی۔ اس نے ٹکٹ خرید رکھے تھے اور میں ادھر آنے کے لیے نکل ہی رہی تھی کہ وہ یکایک آ گیا۔“

جیک ہالنگٹن کچھ اس طرح گویا ہوا جیسے وہ معذرت کے انداز میں ہماری جانب آرہا تھا۔ "آہ! اگر میں ایک منٹ بھی دیر سے آتا تو مجھے اس وقت تک پتہ ہی نہ چلتا کہ ساوتری کہاں ہے جب تک کہ میں لاؤڈ اسپیکر والی گاڑی لے کر اِدھر اُدھر چکر نہ لگاتا۔ فرانسیسی حاضر جوابی کی نزاکتوں کے بعد برطانوی مزاج طبیعت پر کس قدر گراں گزرا" "جی ہاں" اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے یوں کہا جیسے وہ رگبی میچ کا ذکر کر رہا ہو۔ "ہم نے ابھی دس گز کا ہی فاصلہ طے کیا ہوگا کہ مائیکل سوین سٹن گرٹن کے گیٹ پر یہ کہتا ہوا نمودار ہوا: "ہیلو مس راٹھور۔ میری آج تمہارے ساتھ ڈیٹ ہے۔ کیا تمہیں یاد نہیں کہ ہم نے کنگ زلے مارٹن کے لیکچر میں جانے کا وعدہ کیا تھا؟" لیکن سوین سٹن نے فی الحال ٹکٹ نہیں خریدے تھے اور چونکہ وہ کامریڈ ہے اس لیے وہ میری طرح مناسب لباس میں نہیں تھا۔" ہالنگٹن نے اپنے آپ کو اُوپر سے نیچے تک دیکھا۔

"اور پھر" ساوتری بیچ میں ٹپک پڑی۔ "ناچ کے لیے کپڑے پہننے اور مائیکل سے ملنے میں بھول ہی گئی کہ ہم نے یہاں بالا ئبریری میں ملنے کے بارے میں طے کیا تھا۔ اس لیے ہم پہلے وہاں گئے۔ میں ان تکلیف دہ اونچی ایڑی والے جوتوں میں، ہم نے وقت پر پہنچنے کی پوری کوشش کی۔ آپ جانتے ہیں گھڑیاں ہمیشہ ہماری مخالف ہوتی ہیں۔" اس نے کوٹ اتارتے ہوئے معذرت کی۔

ہم ایڈیلفی پہنچ گئے تھے۔ کیمبرج میں جو کچھ بھی خوشگوار، پسندیدہ اور شگفتہ ہے وہ ٹیرس ہی ہے۔ گلابی ملبوسات، تڑک بھڑک۔ بیگ نولیا، بوٹائیاں۔ سرگوشیاں، قہقہے، سوین سٹن اور میں۔ صرف ہمیں دو تھے جو اُجڈ گنوار لگ رہے تھے۔ سوین سٹن نے اپنے لیکچر کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ ساوتری کا لوگوں سے معذرت کی التجا کرنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ وہ جہاں بھی جاتی سب لوگ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگتے۔ جونہی ہم ڈنر کے لیے بیٹھ گئے تو میں نے پہلی بار دیکھا کہ ساوتری بھی خوبصورت ہو سکتی تھی۔ اس نے آگرہ کے کچھ قدیم قسم کے زیورات پہن رکھے تھے۔ اس کے کانوں کی بالیاں بڑی خوبصورت تھیں۔ اور اس نے اپنے ابروؤں کو کاجل سے کالا کر رکھا تھا۔ لکھنؤ کے عطر کی خوشبو نے مجھے یہ سوچنے

پر مجبور کر دیا کہ مجھے ہندوستان لوٹ جانا چاہیے۔ ہالنگٹن یم بروک میں ریڈیو انجینیرنگ کر رہا تھا۔ اس کے لیے ساوتری محض کسی بھی انڈر گریجویٹ کی طرح تھی۔ ساوتری کے باپ اور اس کے باپ نے مل کر شیروں کا شکار کیا تھا۔ یا کوئی دوسرا ایسا ہی کام کیا تھا۔ اس لیے بزرگ راجہ صاحب نے سرایڈمنڈ کو لکھا تھا اور پھر سرایڈمنڈ نے جیک کو لکھا تھا اور کہا تھا کہ وہ ساوتری کا خیال رکھے۔ یہ پہلی بار تھی کہ وہ ایک ساتھ باہر جا رہے تھے۔

سوین سٹن سے دونوں کا تعارف یونین میں ہوا تھا جہاں وہ کمیونزم کے مقاصد کے حق میں بولتے ہوئے اسے سنا کرتے تھے۔ وہ ہوشیار تھا، عالم و فاضل تھا اور ہمیشہ دوسروں کی خدمت کے لیے تیار رہتا تھا۔ وہ مولوٹوف! ہالڈین کے بارے میں گفتگو کرتا ہوا یا تو لائبریری میں مل جاتا تھا یا کورپر کیٹل کے باہر۔ یہ وہ زمانہ تھا جب روسیوں نے امریکیوں پر کوریا میں جراثیمی جنگ کرنے کا الزام لگایا تھا اور سوین ٹن کے پاس جولیوٹ کیوری سے لے کر آسٹریلیا کے کسی گمنام پروفیسر کے نام سمیت انٹرنیشنل کمیٹی آف انکوائری کے ممبران، ان کے تعلیمی کوائف اور تحقیقات کے نتائج تک کی سب تفصیلات موجود تھیں۔ جو بات مجھے لگاتار حیران کرتی تھی وہ سوویت لینڈ کے عظیم حمائتیوں کی وہ نوعیت اور حیثیت تھی جو مبہم تھی۔ لائی سینکو کو صحیح ثابت کرنے کے لیے آپ کو ملبورن کے کسی اخبار کا حوالہ دینا پڑتا تھا۔ اگر اسٹالن کو نیک ہونا تھا تو آپ ہمیشہ ٹوکیو یا ٹورنٹو کے کسی ذریعے کا حوالہ دیتے تھے۔ اور اگر امریکہ کا کوئی نیگرو ہوتا تھا چاہے وہ جم ہو یا ہیری یا پیٹر تو وہ کوئی عظیم رہنما ہی ہوتا جسے عظیم عوامی جمہوریتوں کے بارے میں ہر بات کا پتہ تھا۔ مجھے بڑا لطف آتا تھا کیونکہ یہ سب باتیں مجھے جارجز کی یاد دلاتی تھیں جو اپنے کٹر پن سے اپنے کسی مذہبی عقیدے کی دفاع میں غیر اہم اور مبہم دلائل پیش کیا کرتا تھا۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ جارجز کی تھیوری صحیح تھی یا تو آبائے کلیسا کی ضرورت پڑتی تھی یا پھر تیرھویں صدی کے بشپ آف نیورز کی۔ جب وہ کہتا تھا ”یہ بات اوک سیارد کے آرچ بشپ نے کہی تھی“ تو اس کا کوئی بدل نہیں تھا اور مجھے چپ ہو جانا پڑتا۔ سوین سٹن کے نزدیک ہالڈین کی بھی وہی اہمیت تھی۔ اوک سیارد کے آرچ بشپ ہنری کے لیے ہالڈین کے ساتھ

تواریخ کا سامنا کرنا بڑا پُرلطف رہتا۔ ہالڈین کے مقابلے میں اٹھارھویں صدی کے اس آرچ بشپ کی تربیت زیادہ تر ڈپلومیسی یعنی سفارتی معاملات اور مذہبی جوش و خروش میں ہوئی تھی لہٰذا اس صورت حال پر وہ اوک سیار کے قرب وجوار میں تیار ہونے والی بہترین برگنڈی کی بوتل کھولتا اور پھر کباب کے ساتھ گزرے۔ کلاہِ باراں کے ساتھ کلیجی پر مشتمل کھانے کا اہتمام کرتا اور آخر میں پنیر کا لطف اُٹھانے کے بعد لیونٹ کی مشہور نسوار کی ایک چٹکی ہالڈین کو پیش کرتا جس سے یہ ثابت ہو جاتا کہ بشپ اور کامریڈ چاہے وہ کہیں کے بھی ہوں کبھی غلط نہیں ہو سکتے۔

"تو ڈاکٹر راما سوامی تم کیا سوچ رہے تھے؟" ساوتری نے بات شروع کرتے ہوئے کہا۔ "راما سوامی کے پاس ہر چیز کے بارے میں کہنے کے لیے بڑی دلچسپ باتیں ہیں۔ بظاہر غیر متعلق چیزوں میں راما سوامی تعلق پیدا کر لیتا ہے۔ اس کے نزدیک تاریخ ایک وسیع کینوس ہے۔ اقدار کی دریافت کے لیے مابعد الطبعیاتی قدر کے لیے۔ راما سوامی میرے گرو ہیں" اس نے کچھ جھجک کر کچھ شرما کر اپنی بات ختم کرتے ہوئے ایسے کہا جیسے یہ کہنا اسی بہت بڑی بات تھی کہ اسے بے نام ہی رہنے دیا جا سکتا تھا۔

"وہ کیا ہوتا ہے؟" جیک نے پوچھا۔

"یہ سمجھنا بہت مشکل ہے۔ گرو ایک حقیقی استاد ہوتا ہے جو آپ کو سچائی کا راستہ دکھاتا ہے۔"

"یہ تو کسی سے ضرورت سے زیادہ توقع رکھنا ہوا۔ ہے نا!" سوین سٹن بولا۔ اس لیے نہیں کہ وہ سوچتا تھا کہ سچائی ممکن نہیں تھی بلکہ اس لیے کہ اس کے نزدیک اس کا صرف ایک راستہ تھا۔ جیسا کہ تھا۔ ایک نظام، ایک جدلیاتی منطق کا اختتام۔ اور اس نے اپنے ذہن میں اپنے آپ کے لیے ایک نام محفوظ رکھا تھا۔ ایک آدمی کا نام، ایک عظیم آدمی کا نام جو دور تھا اور بڑا تھا۔ بڑا حلیم تھا اور بچوں کے لیے اپنے دل میں بڑی ہمدردی رکھتا تھا۔ تین شادیاں کرنے کے باوجود بڑا نیک اور پاکباز تھا۔ ایک بہت بڑا جرنل، قائد لشکر، نادر، ماضی، حال، مستقبل کی اشتراکی جمہوریتوں کا تخلیق کار۔ میں اس کے سوچنے کے

ڈھنگ سے واقف تھا اس لیے میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

"دراصل میں کمیونزم کی ناگزیریت کے بارے میں غور کرتا رہا ہوں۔ کمیونزم جو کہ ایک نیا کیتھولزم ہے اور اس سوال کے بارے میں بھی کہ نازی ازم کو شکست دینا کیوں ضروری تھا۔" "ہٹلر" میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا "ایک غیر معمولی شخص تھا لیکن وہ اسی طرح ناکامیاب رہا جس طرح رام کے مقابلے میں راون رہا۔ رام دریائے حیات ہے۔ اپنی مکتی تک لے جانے والا قدم۔ اپنے وجودِ حقیقی کا اثبات۔ راون نفی ہے۔ زمین ہے ایک امرِ واقعہ! لیکن زمین چونکہ تحلیل و انہدام کے لیے بنائی گئی ہے اس لیے وہ شخص جو دھرتی کو بندی یعنی قیدی بنا لیتا ہے۔ وہ جو صحیح معنوں میں اس پر قابض ہے۔ زندگی کے خلاف عمل پیرا ہے۔ کمیونزم کا اگر کوئی مطلب ہے تو یہی ہے۔"

"آپ کے بیان میں بہت سی ناقابل فہم باتیں ہیں" سوین سٹن نے اپنا چشمہ اُتارتے ہوئے کہا۔ چشمے کو بڑی احتیاط سے بڑی تنظیم سے اچھی طرح صاف کیا اور پھر اسے آنکھوں پر اس طرح سجا لیا جیسے اس کی ناک کی چمک نے اس کی ذہانت کو تیز دھار عطا کر دی ہو۔

"یہ راما سوامی کا مخصوص انداز ہے" ساوتری نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "وہ علامات اور مساوات کی زبان میں بات کرتا ہے۔ اس کے نزدیک تواریخ وسیع جبر المقابلہ کی طرح ہے اور اسے سمجھانے کے لیے ہر جگہ سے نامعلوم باتیں لے آتا ہے۔"

"ہم ایسا ہی کرتے ہیں" سوین سٹن نے کہا۔ جیک ہارلنگٹن دوسری چیزوں کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ اس کا سُرخ گلاب بڑے خود نمائی کے انداز میں اس کے بٹن کے سوراخ میں سجا ہوا تھا۔

"ایک فرق ہے بہرحال! راما سوامی ایک سائنس دان کی طرح ہے۔ خدا کا شکر ہے اس کی تواریخ میں کوئی اخلاقیات شامل نہیں ہے۔ اس کی تواریخ میں نہ کوئی بورژوا ہے نہ سرمایہ دار۔ اس کے نزدیک پوری کی پوری تواریخ ایک مائلِ فروغ معنی کی طرح ہے بلکہ ایک فوری قسم کا معنی ہے" وہ میری طرف مڑی۔ "کیا میں صحیح کہہ رہی ہوں؟ عجیب بات ہے میں تمہارا نقطہ نظر سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں جبکہ اس کام کے لیے تم خود یہاں

موجود ہو؟" اس کے گلے کا زیور بڑی فطری، جانی پہچانی، قریبی اور پر استقلال شان سے جگمگا رہا تھا۔

"مہاتما گاندھی نے جو رامائن روز پڑھا کرتے تھے۔ اس عظیم رزمیہ کے کردار راجہ راون کا موازنہ اپنے وقت کی برطانوی سرکار سے کیا تھا۔" اس بات پر سب لوگ ہنس پڑے۔

"تمہارا باپ" میں نے سوین سٹن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اور تمہارا باپ ۔ راون کے پٹھّو تھے اس لیے مجھے یہ کہنے کی اجازت دی جائے۔"

"... اس نوجوان عورت کا باپ بھی؟" ساوتری نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

اور ہم سب ایک بار پھر ہنس دیئے۔

"جی ہاں، راون دنیا پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ ہل کی لکیر کی بیٹی، ہمالیہ کی بچی اور رام کی پتنی سیتا کو لے گیا تھا۔ اسے اغوا کر کے لے گیا تھا اور اسے اپنا قیدی بنالیا تھا۔"

"تو پھر؟" جیک نے بحث میں شامل ہوتے ہوئے کہا۔

"اس لیے رام کو جنگ کرنی پڑی ہے۔ وہ جنگل میں بھٹک رہا ہے۔ وہاں کے جنگلی جانور اور ہوا میں اڑنے والے پرندے اس کے ساتھی بن جاتے ہیں کیونکہ رام کا مقصد دھارمک ہے۔ یہ قانون کے پہیے کا راستی کا سچائی کا سفر ہے۔ کیونکہ صحیح اور غلط شخصی اور ذاتی تناظر کے سوالات ہیں اور دھرم غیر شخصی سے منسلک رہنے کا نام ہے۔ اس لیے جب رام سیتا کو راون کے جزیرے کے قید خانے سے آزاد کرنے کے لیے جاتا ہے تو بندر اور گلہریاں تک اس کے لیے سڑکیں اور پل تیار کرتے تھے۔ اس کے پیغام لے کر جاتے ہیں۔ خوفناک شہروں کو آگ لگا دیتے ہیں کیونکہ فتح بہرحال دھرم کی ہونی چاہیے۔

"دھرم کیا ہے؟" سوین سٹن نے پوچھا۔

"دھرم لفظ دھر سے نکلتا ہے۔ یعنی کسی چیز کو زندہ و برقرار رکھنا۔ اس کی حمایت کرنا۔ بلاشبہ جہاں تک دنیا کا وجود قائم ہے جیسا کہ ہے۔ دھرم دنیا کی مابعد الطبیعاتی بنیاد ہے۔ کہانی کو جاری رکھتے ہوئے یہ کہنا ہوگا کہ یہ وہی دھرم ہی تھا جس نے رام کو لنکا جلانے، راون کو مارنے، سیتا کو آزاد کرانے اور لہراتے ہوئے جھنڈوں کی شان ؛

شوکت۔ سچ کے ستونوں، سنگیت اور پوجا ارادھنا کے درمیان راجدھانی ایودھیا میں لوٹنے کے بعد رانی کو شہر بدر کرنا پڑا۔ سندر اور حاملہ سیتا کو شہر بدر کر دیا گیا۔ کیونکہ رام کے دھرم کا، راجہ کے دھرم کا یہی تقاضا تھا۔"

"کیوں؟" سوین سٹن نے پھر سوال کیا۔

"کیونکہ ایک دھوبن اور کشتی بنانے والے کی بیوی کی نواحی گپ شپ ایک منہ سے دوسرے منہ پر اچھلتی ہوتی کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ عفریت راجہ راون کی قید میں رہتے ہوئے سیتا کے لیے ستی رہنا اپنی عصمت کی حفاظت کرنا ممکن نہیں تھا۔ اور حالانکہ دھرتی اور قربانی کی چتا نے سیتا کے پوِتّر ہونے کا اعلان کر دیا تھا، پھر بھی چونکہ لوگ باتیں کرنے سے باز نہیں آرہے تھے اس لیے سیتا کو شہر بدر کرنا ضروری تھا، تاکہ ایودھیا کی سلطنت مسلسل اور متواتر راہِ حق پر رہے۔ صرف غیر شخصی ہی صحیح ہے۔" میں نے کہا۔

"اس بات کی کس طرح وضاحت کروگے؟" ساوتری نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

"صرف غیر شخصی ہی 'سچ' ہو سکتا تھا کیونکہ وہ یعنی رام ہی سچ تھا۔"

"ایک فرد سچ کیسے ہو سکتا ہے؟" سوین سٹن نے ہلکی سی بیہودہ کھلکھلاہٹ کے ساتھ کہا۔ کچے ذہن جن پر کمیونسٹوں کی اکثریت مشتمل ہے بڑے صبر آزما اور اشتعال انگیز ہوتے ہیں۔

"ایک فرد 'سچ' کیوں نہیں ہو سکتا جناب۔" میں نے قدرے غصّے سے پوچھا "کہاں کھڑے ہو کر تم جھوٹ کو پرکھ سکتے ہو؟"

"ظاہر ہے سچ میں ہی۔" ہالنگٹن بولا۔

"اور کیا سچ، سچ کی پرکھ کر سکتا ہے؟"

"نہیں۔" ساوتری نے کہا

"تو پھر جب سچ، سچ کو دیکھتا ہے، جیسا کہ وہ ہے، تو کیا ہوتا ہے؟" ہر شخص سوچ میں پڑ گیا اور اپنے اندر جھانک رہا تھا۔ سب لوگ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"فرد ہی سچ ہے۔" ساوتری نے کم و بیش سرگوشی کے انداز میں کہا جیسے اسے ڈر

لگ رہا تھا کہ کہیں دوسرے ہتک آمیز بات کہہ کر سچ کو مجروح نہ کر دیں۔ ہم سب گہری خاموشی میں ڈوب گئے۔

اس دوران میں کھانا اور پینے کی چیزیں آگئیں اور بہت سا وقت چبانے کے عمل کی نذر ہو گیا۔ سادتری میمنے یا بچھڑے کی اپنے حصے کی بوٹی سے کھیلتی رہی۔ کیونکہ جب وہ سوچ رہی تھی تو کھانا اس کے حلق سے نیچے نہیں اترتا تھا۔

"تو آپ کا کہنا ہے کہ کمیونزم ناگزیر ہے۔"

"جی ہاں۔ چیچک کی طرح چیچک کا ٹیکہ بھی ناگزیر ہے۔"

"یہ تو نئی بات ہے۔"

"پیدائش کی باقاعدگی اور معمول اور وجود کے تسلسل کی باقاعدگی اور معمول میں فرق ہے۔" میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "ایک میں تمہیں زندہ رہنے کا موقعہ دیا جاتا ہے دوسرے میں تمہیں مخصوص مدت کے لیے وقت کی نارمل طوالت تک مرنے سے روکا جاتا ہے اس لیے تم حفاظتی ٹیکہ لگوا لیتے ہو۔" سوین سٹن نے میری طرف دیکھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔

"تو تاریخ ڈارونزم کو ثابت کرتی ہے۔" میں نے بات جاری رکھی "جس طرح ایک حیاتیاتی ڈارونزم ہے۔ مضبوط ترین کی بقاء کا نظریہ۔ مارکس نے جس کی تصدیق کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ انسانی تاریخ کی سب سے بڑی سچائی ہے — اسی طرح ایک نفسیاتی ڈارونزم بھی ہے۔ آپ اپنی بقاء کے تحفظ میں کامیاب ہو جاتے ہیں کیونکہ آپ چاہتے ہیں آپ کی نسل جاری و ساری رہے۔ لیکن میں پوچھنا چاہتا ہوں تواتر اور تسلسل کیوں ضروری ہے؟"

"یہ کوئی سوال نہیں ہے"، سوین سٹن نے تھوک اگلتے ہوئے کہا جیسے میں کوئی بچگانہ بات کر رہا تھا۔ اس کے نظام منطق کو اس دلیل کی توقع نہیں تھی۔

"اس بات کو بخوبی سمجھایا جا سکتا ہے۔ تم صرف یہ نہیں کہتے کہ روشنی فلاں فلاں رفتار سے سفر کرتی ہے بلکہ آپ یہ بھی دریافت کرتے ہیں کہ کیا وہ دھڑکنوں کی صورت میں سفر کرتی ہے یا موجوں کی شکل میں اور وہ ایسا کیوں کرتی ہے؟"

"تو" ساوتری نے پوچھا۔ وہ میری دلیل کی انتہا تک پہنچنا چاہتی تھی۔ بلکہ واقعہ یہ تھا کہ ساوتری میری طرح جانتی تھی کہ میں اس علم اور اس متعلقہ دریافت کی بنیاد پر بات کر رہا ہوں جو اس پر منکشف ہوئی تھی۔

"'کیوں' تمام سوالات میں سے اہم ترین سوال ہے۔ اگر 'کیوں' نہ ہوتا تو کوئی جدلیات نہ ہوتی۔ دراصل کوئی مارکسزم ہی نہ ہوتا۔ مارکسزم کی مصیبت یہ ہے کہ وہ اپنے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ متوازی لکیروں کے برعکس جدلیات کو کسی نقطے پر تو ملنا ہی چاہیے۔ اسے یا تو تواریخ کے کسی سپارٹے کس پر ختم ہونا تھا۔ یا ۱۷۸۱ء میں پیرس میں یا ۱۹۱۷ء میں ماسکو میں۔ اور اس طرح جنت وجود میں آئی۔ خدا جبریل اور جنرل زمو۔ قائد لشکر!

گفتگو کے اس موڑ تک پہنچ کر سوین سٹن کے دل میں میرے لیے نفرت کے علاوہ کچھ نہیں بچا تھا۔ جبکہ دوسری چیزوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ساڑھے آٹھ بجنے والے تھے اور انہیں ڈالنس کے لیے تیار ہونا پڑے گا۔ ساوتری ایسے بیٹھی تھی جیسے اس نے وقت کو اپنے اندر اس طرح جذب کر لیا ہو جیسے شونے زہر اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔ جیسے اس نے اسے اپنے گلے میں لٹکانے کے لیے ایک زیور کی صورت میں ڈھال لیا ہو۔ اس کی سانسیں گہری ہو گئیں۔ اس کے پورے جسم میں ایک ایسی کیفیت، بلور کی سی چمچماتی جھنجھناہٹ پیدا ہو گئی جو اپنے آپ سے اندر ہی اندر محوِ گفتگو تھی۔ ایک ساز موسیقی بن گیا۔ ایک جل ترنگ!

ساوتری کو خیالات و افکار سے جو سرور ملتا تھا وہ کسی اور شے سے نہیں۔ اس کے نزدیک مرد صرف خیالات و افکار دینے والے لوگ تھے۔ اس کے کنوارے پن کی کوئی بنیاد نہیں تھی۔ اس کا وجود ویسا ہی تھا جس طرح پریوں کی کہانی میں معمہ حل کیے بغیر شہزادی کو حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس کے نزدیک زندگی ایک معمہ تھی۔ اور وہ ایک کے بعد ایک سب مردوں کو انکار کرتی جاتی تھی۔ اس لیے نہیں کہ وہ بلند قامت تھے یا دُبلے پتلے یا موٹے یا مالدار، بہت پڑھے لکھے یا بور کرنے والے بلکہ اس لیے کہ جیسا کہ وہ تھا۔ وہ زندگی ہی سے نشوونما حاصل کرتی تھی۔ معانی ہی میں خوراک، سانس اور سنسنی شامل تھے۔ وہ

مضطرب تھی۔ کیونکہ کچھ بھی ۔قطعی طور پر کچھ بھی اس کے وجود کو معمور نہیں کر سکتا تھا۔ سوائے ایک متوازن، خود متکلّم ہموار خاموشی کے! جو خاموشی اس کی نذر کرتا تھا وہی اسے زندگی عطا کرتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ کبھی کبھی یہ خاموشی میں اسے دیتا تھا اس لیے وہ میری صحبت میں رہنا پسند کرتی تھی۔ میں نے ایک بار اسے یہ کہہ کر چڑایا تھا۔"تم مغیات کی ریزشِ غدود کے مطابق زندہ ہو۔" بات کو پسند کرتے ہوئے وہ ہنس پڑی تھی۔ اور ہنستے ہوئے اس نے اپنے بالوں میں سجا ہوا پھول نیچے گرنے دیا۔

کمیونزم اس شام اس کی سمجھ میں آگیا۔ اس لیے سمجھ میں آگیا کیونکہ اس کا طریق عمل صحیح تھا۔ بیشتر احمقانہ وجوہات کی بنا پر ہی سہی۔ ممکن ہے اس نے یہ کہہ دیا ہوتا۔"مجھے کمیونسٹ بننا اس لیے پسند ہے کیونکہ سوین سٹن بڑا نفیس آدمی ہے" یا "میں جیک کے ساتھ ناچنا پسند کرتی ہوں کیونکہ اس کا باپ میرے باپ کا بڑا گہرا دوست ہے" وہ یہ بات نہیں دیکھتی تھی کہ دونوں وجوہات جھوٹی تھیں۔ ہوا یہ تھا کہ وہ صحیح چیز سے ٹکرا گئی اس نے انگریزی ٹرائی پوس مضامین کا اس لیے انتخاب کیا تھا کیونکہ کسی نے کہہ دیا تھا۔" یہ مضامین اچھے ہیں۔ یہی لے لو" لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ انگریزی اگرچہ ہندوستانی لب و لہجے میں بولتی تھی لیکن بولتی بہت اچھی تھی۔ جس میں حلیمی اور نرمی تھی۔ ایک فطری انداز تھا، اور کیفیتِ دروں تھی جیسے یہ اس کا عزیز ترین عمل تنفّس تھا۔ ایسا لگتا تھا ہر لفظ کی تخلیق ہوتی ہے۔ اسی لمحے ہیں۔ آواز کی گہرائیوں سے معنی و مفہوم سے ... اچانک! یہی وجہ تھی کہ جب میں نے اس کے سامنے کالی داس کے رگھو ونش کے اس پہلے اشلوک کا حوالہ دیا۔

جس طرح لفظ اور معنی ثنائی ہیں۔ دو عددی ہیں
اسی طرح واقعتاً خود پاروتی اور شِو بھی ہیں

تو اسے سُن کر اس روز وہ ایوی نون میں حیران و ششدر کھڑی کی کھڑی رہ گئی یہ سوچتے ہوئے کہ کالی داس جیسے عظیم شاعر نے اس کی اپنی قریبی شخصی پہچان اور ستائش کو کس کمال خوبی سے لفظوں میں ڈھال دیا ہے۔ ساوتری راٹھور کو اپنے آپ سے متعارف کرا دیا ہے۔

کمیونزم بھی اس کے نزدیک ایک وضاحت تھی ۔ ایک بامعنی تاریخی حقیقت جو بھی کچھ کھردا بھدا اور غیر مہذب تھا خود بخود اس سے دُور ہٹ جاتا تھا کسی عام سے انکار کی کسی قوت سے ۔ جیسے پانی راج ہنس یا کنول کے اوپر سے پھسل جاتا ہے ۔ ایسا نہیں تھا کہ بھدّی داغدار کرنے والی چیزیں اس کے قریب نہیں آتی تھیں ۔ واقعہ یہ تھا کہ وہ ان تک پہنچتی ہی نہیں تھیں ۔ دوسرے سرے پر ان کو لینے والا ہی کوئی نہیں تھا ۔ اس لیے نفسانی جذبات ایک اشارے کے بعد مدھم پڑ جاتے تھے ۔ عامیانہ پن اپنے آپ کو نگل جاتا تھا اور حاصل سکوت سب کو شفاف اور منوّر کر دیتا تھا ۔ ہر زوال پذیر انڈر گریجویٹ کو ایک پاکیزگی عطا کر دیتا تھا ۔

مجھے یاد آیا کہ کیسے ایک شام جب ساوتری کو کسی کام کے لیے اپنے ٹیوٹر سے ملنے جانا تھا لکشمی مجھ سے ملنے میرے ہوٹل میں آ گئی تھی ۔ لکشمی اپنی عمر کی دوسری لڑکیوں سے مختلف نہیں تھی ۔ وہ ساوتری کے لیے اپنے امر پریم کی قسم کھاتی تھی (وہ کہا کرتی تھی ۔ ساوتری یہاں ہے ، میرے گربھ ، میرے پیٹ میں ہے ۔ میرے بچّے کی طرح) ۔ بہرحال لکشمی نے کہا تھا " میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ساوتری ایک ہی وقت میں اتنے سارے مردوں کے ساتھ کیسے گھوم پھر لیتی ہے ۔ میری اس بات کے کارن تم مجھ سے نفرت کرو گے لیکن ساوتری فلرٹ ہے ۔ میں نے لکشمی کو اس طرح گھورا تھا جیسے ایک برہمن پرندے پکڑنے والے کو یا حجام کو گھورتا ہے ۔ کچھ کہنے کے لیے برہمنوں کو لفظوں کی ضرورت نہیں ہوتی ۔

" میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ کچھ کرتی ہے " ، لکشمی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا تھا " لیکن چاہے وہ سوشلسٹ ہیں ، کمیونسٹ ہیں یا قدامت پسند یا جو بھی ہیں ، سب کو اس کے اِرد گرد چکّر کاٹنے پڑتے ہیں ، ناچنا پڑتا ہے ۔ ہندوستانیوں کو اس قسم کی آزادی سے ٹھیس پہنچتی ہے ۔ صدیوں تک زنانے کی قید میں زندگی گزارنے کے بعد ایک دم آزاد ہو جانے سے ایسا ہی ہوتا ہے " ۔

" یہ چھوٹے چھوٹے پلّوں یا پرندوں کی طرح ہے ۔ جب وہ اپنی آنکھیں کھولتے ہیں اور چلنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ کہیں بھی گر جاتے ہیں ۔ لکشمی ! ایسی بھرپور معصومیت کو اپنے

سامنے دیکھ کر کیا سچی خوشی نہیں ہوتی! میں اور تم جو جنوب سے آئے ہیں ہم کچھ ضرورت سے زیادہ جانتے ہیں۔ جو معصومیت سادتری میں ہے وہ ہمارے اندر ہو ہی نہیں سکتی۔ سادتری نوسنتہ ہے"۔ میں نے کہا اور بحث ختم کر دی۔ اس کے بعد لکشمی میرے ساتھ پہلے کی طرح بے تکلف نہیں رہی۔ وہ بس جلتی تھی۔ عورتوں میں حسد حساباتی مقدار میں کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ ہم دوسری عورت کے پاس جاتے ہیں لیکن عورتیں اپنے احساسات اپنے جذبات چباتی ہی جاتی ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ مرد طوائف کس قدر غیر فطری ہے۔ حصول اور کسی شے پر قبضہ عورت کے لیے علم ہے، گیان ہے۔ پکڑے رہنا ہوتا ہے، پیار کرنے کا مطلب ہے سپردگی۔ غلامی اس کا مقدر رہے۔"

لیکن سادتری ایسی نہیں تھی۔ غلامی کو قبول کرنے کے بعد وہ آزاد تھی۔ وہ جانتی تھی کہ عورت ہونے کا مطلب ہے ایک مرد میں جذب ہو جانا۔ اگر ایسا مرد موجود نہیں تھا۔ تو مردی اصول اس کی ذہانت کے لیے خوراک مہیا کر سکتا تھا۔ یہ مردی اصول مردوں میں بھی تھا۔ اور ذہین ہونے کی صورت میں عورتوں میں بھی! کیونکہ سادتری کے دوستوں میں بہت سی عورتیں بھی تھیں۔ وہ سچ کے سامنے سر تسلیم خم کر کے آزاد ہو جانا چاہتی تھی۔ زندگی میں دکھ ہی دکھ تھے۔ اس کا مطلب خوشی نہیں تھا بلکہ دکھ سے رہائی! اس لیے جب میں نے اسے سری شنکر کا نردان شتک پڑھایا تو وہ بہت خوش ہوئی تھی۔ وہ اسے خوب مگن ہو کر گا سکتی تھی۔ وہ منو بدھی اہنکار سے شروع کرتی اور آنکھیں بند کر کے اپنے آپ میں کھو جاتی۔ اور اپنی ہی شانتی میں لین ہو جاتی!

وہ میرے خیالات سمجھ گئی ہوگی اسی لیے وہ کہنے لگی "میرا ایک کام کرو گے؟"

"وہ کیا؟"

"لکشمی اور شریف سنیما دیکھنے گئی ہیں۔ بیچاری لڑکیاں اکیلی ہیں۔ میری خاطر کیا تم انہیں اپنے ساتھ باہر لے جا کر اچھا سا کھانا کھلا سکتے ہو؟ اور اب ایک بار پھر ہو جائے کمیونزم کی گفتگو۔"

اس نے سگریٹ سلگائی اور حالانکہ وہ جانتی تھی کہ مجھ جنوبی ہند کے برہمن کے لیے

ایک ہندوستانی لڑکی کا سگریٹ پینا کس قدر تکلیف دہ تھا اس کے باوجود وہ کش لیتی رہی۔ مجھ سے اپنی سگریٹ نوشی منوانے کے لیے نہیں بلکہ دوسروں پر یہ ثابت کرنے کے لیے وہ بھی کسی عام انڈر گریجویٹ طالب علم جیسی ہی ہے۔ سب چیزوں کے کم سے کم مشترک عناصر کو قبول کر لینا ہی اس کا انکسار تھا۔ یہی وجہ تھی وہ کہیں بھی اپنے آپ کو اجنبی محسوس نہیں کرتی تھی۔ وہ واقعات میں پھسل کر داخل ہو جاتی تھی اور پھر جیسے مچھلی پانی میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پھسل جاتی ہے وہ ایک واقعے سے دوسرے واقعے تک بڑی ملائمت سے پھسل کر پہنچ جاتی تھی۔ میں کھڑا زندگی کو دیکھتا رہتا تھا۔

"کمیونزم ایک مثبت تحریک ہے، ایک روحانی تحریک ہے۔ اس کا رخ زندگی کی جانب ہے۔ جب امریکی یہ سوچتے ہیں کہ کمیونزم کیوں کامیاب ہوتا ہے تو انھیں یہ بھی سوال کرنا چاہیے کہ تیسرے ارضیاتی دور میں کس طرح اینونائٹ اور بلمنائٹ تو ختم ہو گئے کہ صدفے کے سلسلے سے تعلق رکھنے والے لیملی افراد کا وجود کا برقرار رہا۔ دراصل کچھ نہیں مرتا۔ موت بھی نہیں۔ سب کچھ جاری و ساری رہتا ہے اور بالآخر کچھ بھی جاری و ساری نہیں رہتا۔ وہ جو ہے کیونکہ خود ہی ہے اس نے اپنے آپ میں جاری و ساری نہیں رہ سکتا۔ ایک مہارشی نے کہا تھا "پانی کو موجِ آب میں بدلنے کے لیے زمان و مکان کی ضرورت ہے اور اور وہ کیا شے ہے جو زندگی کو موج کا روپ دے سکتی ہے؟ وہ اپنے آپ کو نہیں بنا سکتی اور کوئی دوسری شے بھی نہیں"۔"

"تو پھر کیا ہوتا ہے؟" اس نے پوچھا۔ لیکن اب تک سوین سٹن ذہانت کی ہر امید کھو چکا تھا۔ اس کا خیال تھا ہم جھک مار رہے ہیں۔ بیکار کی باتیں کر رہے ہیں۔

"کچھ نہیں ہوتا" میں نے جواب دیا "سوال خود جیسا کہ ہوتا ہے جواب بن جاتا ہے۔"

"اور کمیونزم؟"

"۔۔۔ مر جاتا ہے" میں نے کہا۔

"باقی کیا رہ جاتا ہے؟"

"سچائی" میں نے جواب دیا۔ جیسے وہ جانتی تھی کہ میں کیا جانتا ہوں۔

وہ میز پر پڑے ایک چمچ سے کھیل رہی تھی۔ اس نے سر اٹھایا اور بولی — "تو پھر تواریخ کیا ہے؟"

"تواریخ اپنے آپ کے سامنے اپنا نام دہرانے کی طرح ہے۔ یہ ہمیں یقین دلاتی ہے کہ تم زندہ ہو۔ تمہارا وجود ہے۔ یہ انسان کا شناختی کارڈ ہے" میں نے یہ بات فرانسیسی زبان کے ذریعے اس لیے نہیں کہی کہ میں فرانسیسی زبان کی اپنی دسترس ثابت کرنا چاہتا تھا بلکہ اپنی بات کو ایک مقولے کی اہمیت عطا کرنا چاہتا تھا جس کی فرانسیسی زبان کفیل ہے۔

"اور کمیونزم؟"

"یہ مُہر تجدید و احیا ہے"

"اور نازی ازم؟"

"ایک ایسا اعلان جسے رد کیا جا چکا ہے۔ ختم"

"اور کمیونزم کے بعد۔ آگے کیا ہوگا؟"

"ایک راجہ"

"ایک راجہ؟" ساوتری نے جرح کرتے ہوئے کہا۔

"حکمراں اور سلطنت کے ناظم کے طور پر مرد کا اصول۔ ٹھیک اسی طرح ہے جس طرح عورت گھر کی رانی ہے اور گھر کی مسیحا ہے" بادشاہت عمل میں تیزی لانے والا اصول ہے۔ وہ ہم لوگوں کو زندہ رکھنے کے لیے تمام زمینی تضادات کو تحلیل کر دیتا ہے"

"کیا بڑھیا کام ہے" سوین سٹن بڑبڑایا۔

"پرائڈ تو پرائڈ ہے چاہے وہ افریقہ میں ہو یا رینڈ اسکوئر میں۔ ممی بنانا مردانہ اصول بنائے گئے نسوانی اصول کو ختم کر دیتا ہے"

"اب یہ کیا کہہ دیا آپ نے؟"

"مادہ پرستی۔ ین یعنی پرکرتی کو دی گئی اہمیت۔ مادہ پرستی ہمیں صرف شے کو حقیقت تسلیم کر لینے کی طرف لے جا سکتی ہے"

"شے ہی تو حقیقی ہے" سوین سٹن نے کہا جیسے احتجاج کرتے ہوئے اپنے آپ سے۔

اُس میں جھنجھلاہٹ اور بوریت پیدا ہو رہی تھی۔

"انسانیت کی پوری تاریخ میں کسی کو اب تک چیز یعنی شے کا پتہ نہیں چلا۔ میں نے کہا "اگر لوگوں کو پتہ ہوتا تو نہ کوئی رائل کالج ہوتا نہ ہی کیوری انسٹی ٹیوٹ۔"

"کیا بکواس ہے؟" وہ چلّایا۔

"مائیکل سمجھنے کی کوشش کرو۔ پلیز! ہندوستان میں اب بھی دنیا کی قدیم ترین تہذیب قائم و برقرار ہے۔"

"جی ہاں۔ چابک سے اور پانچ روپے والے قتل کے واقعات سے۔" اس نے ساوتری کے اپنے ہی الفاظ کا حوالہ دیتے ہوئے ساوتری سے کہا۔

"اور مہاتما گاندھی!" ساوتری نے غصّے سے کہا۔

"اور مہاتما گاندھی سے کچھ بڑھ کر" میں نے مزید وضاحت کے بغیر اضافہ کرتے ہوئے کہا" جب تک مرد کا اصول نسوانی اصول کو ختم نہ کر دے۔ دنیا منہدم نہیں ہو سکتی اس لیے خوشی نہیں ہو سکتی۔ خوشی خیال میں نہیں ہے بلکہ جیسا کہ ہے خیال کے خیال میں ہے۔ ملارمے کے "میرا خیال سوچا گیا ہے" میں ہے۔ واقعتاً وہ صرف مادہ خیال ہی ہے جس میں کوئی خیال نہیں ہوتا۔

"واہ واہ، بہت خوب!" ساوتری نے داد دیتے ہوئے کہا۔

"میں واحد ہندوستانی شاہ پرست ہوں۔" میں نے کچھ اس طرح کہا جیسے میں اپنی دلیل کو کسی نتیجے پر پہنچانا چاہتا تھا۔

"خوب! جب تم راجہ بن جاؤ گے تو میں رانی بنوں گی۔" ساوتری نے اضافہ کیا۔ مذاق کے طور پر نہیں۔ جیسا کہ لگتا تھا بلکہ ایثار کے پیشین گوئی کے طور پر۔

یہ گوشۂ عافیت، یہ آشرم، بڑا پُر سکون ہے
لیکن پھر بھی میرا بازو پھڑک رہا ہے۔
یہ کس بات کی پیشین گوئی ہے
کیونکہ اس سے اور ان سب چیزوں سے جو

ہم سب کے اردگرد پڑی ہیں
آنے والے واقعات کی طرف دروازے کھلتے ہیں

مجھے خیال آیا کافی دیر ہو چکی ہے۔ آٹھ بج کر بچیس منٹ ہوئے تھے اور مجھے لکشمی اور شریف سے سینما گھر میں ملنے کے لیے بھاگنا تھا۔

میرا خیال ہے ساوتری کو اس بات کا افسوس تھا کہ اس نے مجھے ایک کام سونپ رکھا تھا۔ اسے افسوس تھا کہ میں جب جا رہا ہوں۔ اس نے کم و بیش کہہ ہی دیا "مت جاؤ" لیکن چیزوں کو قبول کر لینا ساوتری کے مزاج کا فطری طور پر حصّہ تھا۔ میں نے دیکھا صرف لمحہ بھر کے لیے اس کے ذہن میں کشمکش پیدا ہوئی جیسے وہ چاہتی ہو کاش ہندوستانی صوبوں کے ایسے گورنر نہ ہوتے جن کے بچے کیمبرج میں زیرِ تعلیم تھے۔ نہ جاز کی خوفناک موسیقی ہوتی جس کا شور ساتھ کے کمرے سے اب سنائی دینے لگا تھا۔ نہ کمیونزم ہوتا نہ سوین سٹن جو سرخ نکٹائی اور سنہرے فریم والے چشمے میں درزی لگ رہا تھا۔ یا پھر فوج کا کوئی کوارٹر ماسٹر! ایسا لگتا تھا جیسے ساوتری چاہتی ہو کہ دنیا بھر میں صرف کیم ندی بہتی رہے۔ مربع شکل کے مینار اور بہت سے پرندوں اور چھتوں کے پرنالوں والی بڑی ٹٹی کے درمیان سے۔ رات اتر آئے اور تاریکی اپنے نہ سوچے گئے خیالوں اپنے سانسوں سے معمور ہو جائے۔

لیکن جیسے ہی میں اس سے الگ ہوا وہ اپنے مثبت وجود کو دوبارہ حاصل کر چکی تھی۔ اس نے پیروں سے فرش پر کم و بیش تال دینا شروع کر دیا۔ میں اجنبی بن چکا تھا۔ سوین سٹن یہ کہتے ہوئے پیچھے رک گیا: "میں آپ کی پارٹی میں شامل ہو جاؤں؟"

باہر سردی تھی اور جب میں کیمبرج کی ان بھرپور اور تحیّر کن گلیوں سے گزرا جہاں گرجا گھروں، صلیبوں، کتابوں کی دکانوں اور بائیسکلوں کی خوب رونق تھی تو مجھے محسوس ہوا کہ میرے دل میں کچھ ایسے عجیب و غریب جذبات تھے جن پر میں فخر نہیں کر سکتا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کاش میں اکیلا ہوتا اور ساوتری کے ساتھ ہوتا۔ اگر میں سوین سٹن کے بارے میں ایسا سوچ سکتا تھا تو لکشمی وہ سب کیوں نہ محسوس کرے جو وہ ساوتری اور میرے بارے میں کرتی تھی؟ اپنی مردانہ خصوصیت کے باعث میرے دل میں لکشمی کے لیے

جذبۂ ہمدردی اُمڈ آیا۔ کسی چیز پر قبضہ کرنا کس قدر آسان، کس قدر ناگزیر لگتا ہے۔ حقیقت اس وقت عیاں ہوتی ہے جب آپ کو پتہ چلتا ہے آپ کسی چیز پر بھی قبضہ نہیں کر سکتے۔ ہم زیادہ سے زیادہ اپنے اُوپر قبضہ جما سکتے ہیں۔ اور جیون ایک لمبی یاترا ہے۔ اس نوعیت کے قبضے کی ایک لمبی تکنیک۔ مجھے دُکھ بھی ہوا اور ہمدردی بھی میں لکشمی اور شریف کے ساتھ خوب ہنسا۔ میں انہیں تاج محل نام کے ایک ہندوستانی ریستوراں میں لے گیا۔

میرے ملک سے باہر میرے ہم وطن مجھے خوف زدہ کر دیتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے وہ کہیں کے بھی نہیں ہیں۔ کسی مخصوص صوبے، ذات یا پیشے سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ برہمنوں کی گایوں کی طرح لگتے۔ وہ گائیں جو کسی انتم سنسکار کے موقعے پر چھوڑ دی جاتی ہیں۔ جیسا کہ بنارس کے برہمن بتاتے ہیں جب اجداد پرلوک سدھارتے ہیں تو وہ چندر لوک میں اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے گائے یا سانڈ کی پونچھ پکڑ لیتے ہیں۔ اس دوران میں گائے اِس یا اُس دکان پر منہ مارتی ہے۔ کوئی راہ گیر اسے گھاس کھلا دیتا ہے۔ کوئی سرمنڈی بیوہ اسے قُم قُم سے سجا دیتی ہے۔ بچے بچیاں اسے ڈرتے ڈرتے چھوتے ہیں اور اس سے ہیرے، جواہرات، کپڑے مانگتے ہیں اور بچیاں اپنے لیے پتی! یہ سلسلہ جاری رہتا ہے جب تک کہ ادھر سے گزرتا ہوا کوئی پولیس والا اس پر لاٹھی برسا کر اسے کسی گلی میں نہیں دھکیل دیتا۔ وہاں پڑی پھر وہ جگالی کرتی رہتی ہے۔ شام ہونے تک۔ اور شام کو شام کے یاتری آجاتے ہیں جیسے اپنے آپ سے منتروں کا جاپ کرتے ہوئے۔ وہ اسے بڑی شردھا اور دیا سے، پیار سے تھپتھپاتے ہیں "گوری، گنگا، مہیشوری!" وغیرہ وغیرہ۔ بعض اوقات جب دیر سے شروع ہونے والی دعوت جنازہ بالآخر ختم ہوتی ہے تو گائے یا سانڈ کو خوب پیٹ بھر کر کھانے کو ملتا ہے۔ ذرا سوچیے کچھ ایسے برہمن بھی ہیں جو دن میں تین تین انتم سنسکار نمٹاتے ہیں۔ اس لیے بعض اوقات لوگوں کو ان کے لیے دیر تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ دیر سے آنے کے لیے ہمیشہ یا تو بیماری کا بہانہ پیش کرتے ہیں یا کسی نئے آنے والے کا جس کے کارن وہ پہلے نہیں پہنچ سکے۔ لیکن ان کے ڈکارنے

اور ان کی گول گول توندوں کو دیکھ کر آپ سمجھ جاتے ہیں کہ پہلے ہی بہت سا کھانا ان کے پیٹ میں جا چکا ہے۔ میرے بھائی بنارس، بنارس ہے۔ پوتّر کاشی ہے۔ اور کاشی میں آپ جو بھی پاپ کرتے ہیں، چاہے پاپ کرنے والا کوئی کتّا یا سانڈ ہو یا چتر بھج برہمن۔ اسے مکتی مل جاتی ہے۔

میں نے لکشمی اور شریفہ کو بنارس کی باتیں سنا کر خوب ہنسایا۔ "اس طرح سے ہم برہمنی گائیں ہیں۔ اور جب کوئی شخص جس کا کوئی عزیز جدّ امجد چلا گیا ہو کسی گائے یا سانڈ کی تلاش کرتا ہوا ادھر آ نکلتا ہے تو سانڈ اچانک اپنے پیروں کی طاقت محسوس کر کے اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور آہستہ آہستہ بڑے شفیق انداز میں آگے بڑھ کر نہ صرف سارا چاول کھا جاتا ہے بلکہ در بھا گھاس بھی۔ باہر کے دلیسوں میں رہنے والے ہم ہندوستانی، میں دہراتا ہوں برہمنوں کے سانڈ ہیں۔ ہمیں اس لیے کوئی ہاتھ نہیں لگاتا۔ کوئی نہیں مارتا پیٹتا کیونکہ ہم بڑے نیک ہیں۔ ہمیں کوئی نہلاتا دھلاتا کیوں ہم بڑے صاف ستھرے ہیں ہمیں دوسروں کی پرستش مل جاتی ہے اور ہمیں کچھ نہیں کرنا پڑتا ہم کشتیوں میں لاد کر مردوں کو دوسرے کنارے تک لے جاتے ہیں۔

ہمارے قہقہوں کی موجوں سے دوسرے ہندوستانی قطعی طور پر محظوظ نہیں ہوئے۔ پنجابی سوچنے لگے کہ قہقہے پنجابی نہیں لگتے تھے۔ دکشنیوں نے سوچا یہ اصول کے خلاف تھا۔ مہاراشٹر کی عورتیں ہنسنے سے گریز کرتی ہیں۔ جنوبی ہندوستان کے باسیوں کا خیال تھا یہ آسان یوگ کی علامت تھی۔ اکّا دکّا مسلمان لطف اندوز ہوا۔ انسانی آزادی کے احترام کے لیے اس شام ہم اسلام کے ممنون تھے۔

"آج کا ہندوستان" میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا" اگر ہم استعارہ بدل دیں تو دوسری مملکت کی طرح ہے، کیمبرج میں رہنے والا ہر ہندوستانی یا تو کسی وزیر کا بیٹا ہے یا کسی ایڈوکیٹ جنرل کی بیٹی ہے (شریفہ کا باپ ایک ایڈوکیٹ جنرل تھا) اور اب وزیر اعظم کے بھتیجے کے سامنے جودھپور کے فائنس منسٹر کے بیٹے یا سردار پٹیل کے پوتے یا رفیع احمد قدوائی کے کزن یا ٹراونکور کے چیف منسٹر کے بہنوئی یا سالے کو بیٹھا ہوا پاتے

ہیں۔ آپ کے اب کئی نئے مہاراجہ ہیں اور ایک نیا شہنشاہ۔ پہلے شہنشاہ عقاب، کو اب یا تو جلاوطنی میں مرنا ہے یا گولی کا نشانہ بننا ہے۔ یئں نپولین بوناپارٹ شہنشاہ فرانس وغیرہ وغیرہ... اور پھر ایک انقلاب آتا ہے اور اس کا حلیم اور شریف الطبع ایک بیٹا ہے ڈیوک آف رائسٹاڈ ردیا دے روم لا اے ای لون جوشین برن میں یا پھر کہیں اور مر جاتا ہے۔ وغیرہ۔ ۱۸۴۸ء کا انقلاب، اقتصادی ارتقاء کے ذریعہ بھی ممکن ہے۔ تواریخ کا تعلق واقعات یا حقائق کے سلسلے سے نہیں بلکہ زائچوں اور مثالی نقشوں کے سلسلے سے ہے۔ نپولین ایک بار پھر پیدا ہو جاتا ہے۔ شہزادے صدرِ مملکت کی صورت ہیں۔ ایک جلاوطن وکٹر ہیوگو تھا لیکن اب ماسکو میں اس کا نام بپن چٹرجی ہوگا۔ ایک بالزک ہوا تھا ممکن ہے آج اس کا نام جنیندر کمار جین ہوگا۔ ایک شہزادی یوجینی بھی ہے لیکن وہ بیوی نہیں ہے، بہن ہے"

شریف نے زوردار قہقہہ لگایا۔ "یہ بتائیے تیسری ری پبلک کب بنے گی؟"

"مادام اس بار کوئی تیسری ری پبلک نہیں ہوگی اور نہ ہی کوئی مسٹر تھئیرے ہوگا۔ اس بار ہمارے یہاں ایک بادشاہ، ایک راجہ ہوگا۔"

"کون؟"، لکشمی نے خوش ہو کر پوچھا۔

"شری رام خاندان کا کوئی راٹھور جس کی پشت پر کوئی واسشٹ ہوگا بیشتر اس کے کہ ہندوستانی سچے معنوں میں آزاد ہو ویدانت کا حقیقی بنیاد ضروری ہے آپ کو معلوم ہے مہاتما گاندھی نے کہا تھا 'آزادی کا مطلب انگریزوں کا یہاں سے جانا نہیں کیونکہ یہ تو ناگزیر ہے۔ اور بہت جلد ہونے والا ہے بلکہ سچے معنوں میں ہم تبھی آزاد ہوں گے جب ہم سچے ستیہ گرہی بن جائیں گے اور انکساری سے، جوش سے دلوں میں عدم تشدّد کا جذبہ لیے تلاش حق کریں گے'۔ میرے تصوّر کا ہندوستان یہ ہے۔ ایک ملک کے طور پر نہیں، نہ ہی اقوام کے درمیان ایک تاریخی موجودگی کے روپ میں بلکہ ایک مثالی موجودگی کے طور پر! جنگ سے پہلے کسی نے ایک کتاب لکھی تھی، 'فارورڈ فرام لبرلزم' اب کسی کو اس نام کی کتاب لکھنا چاہیے' فارورڈ فرام مارکسزم'۔"

"کہاں تک فارورڈ یعنی آگے؟" شریفہ نے پوچھا۔

"ویدانت تک" میں نے اس انداز سے جواب میں کہا جیسے میں اپنے آپ سے بڑبڑا رہا تھا "ساوتری"!

"آپ وقت کے نقطۂ نظر سے پیچھے کی طرف جا رہے ہیں۔" لکشمی نے کہا۔

ویدانت میں کوئی آگے بڑھنا یا پیچھے ہٹنا نہیں ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے ہندوستانی سنگیت میں کچھ بھی نیا نہیں ہو سکتا۔ وہ سب جو موسیقیانہ ہے، سنگیت سے جڑا ہوا ہے۔ ہندوستانی راگوں ہی میں شامل کر لیا گیا ہے۔ آپ صرف گا سکتے ہیں، رچنا کر سکتے ہیں گھنٹوں تک، دنوں تک مسلسل۔ فیاض خاں کی طرح جب وہ چار راتوں تک متواتر گاتا رہا۔ کھیلت نند کمار۔ ٹھیک اسی طرح ہندوستانی تاریخ بھی اپنے آپ کے لیے سنگیت کی مدھر دھن بجاتی ہے۔ بار بار اپنی رچنا کرتی ہے۔ آواز کے مقابل آ کر نہیں بلکہ خاموشی میں سکوت میں! ہندوستان سب سے الگ ہے اس لیے اس کی کوئی تاریخ نہیں، ہندوستان ہر فرد کا ہے۔ ہندوستان ہر فرد میں ہے۔ میرا خیال ہے مہاتما گاندھی نے انھی معنوں میں کہا تھا "جب ہم آزاد ہوں گے تو سب آزاد ہوں گے" ہمیں چاہیے ہم سچے ستیہ گرہی بنیں۔ سچ کو سمجھنے والے۔ سچ کی راہ پر چلنے والے بنیں۔ اور پوری انکساری سے کہوں تو یہی میرا ہندوستان ہے۔" میں نے کم و بیش ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

میں اپنے دیس کو خراج عقیدت نہیں پیش کر رہا تھا۔ بڑے بڑے پربتوں اور ندیوں کی دھرتی کو نہیں حالانکہ میں ان سے بھی پیار کرتا ہوں۔ نہ ہی اشوک اور اکبر کی سرزمین کو چاہے وہ کتنے ہی عظیم اور آفاقی کیوں نہ ہوں۔ بلکہ میں شردھانجلی ارپن کر رہا تھا اس بے نام فراخدلی کو، اس صورتِ اسرار کو جو بصیرت رکھتی ہے، وجود کا احساس رکھتی ہے۔

میری پیاری ماں، بھارت ماتا!

گھر پہنچ کر میں نے میڈلین کو پیار بھرا ایک خط لکھا۔ میں نے اسے بتایا میرے نزدیک کیا سچ تھا۔ مجھے وہ پہلے سے بھی زیادہ پیاری لگی۔ اس لیے نہیں کہ وہ کیا تھی کیونکہ جیسا کہ تھا یہ اس کا اپنا معاملہ تھا بلکہ اس لیے کہ میں بدل گیا تھا۔ اپنے آپ میں کشادہ اور وسیع

ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے کو دُبلا اور ہلکا پھلکا اور وجود کی عظیم تر کشادگی سے سرفراز محسوس کیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اس سے پیار کرتا ہوں۔ کیونکہ اس نے پی ار کو جنم دیا تھا میں اس سے پیار کرتا ہوں۔ اس سچائی کی خاطر جو اس کے وجود میں تشکیل پا رہی ہے۔ میں اس سے پیار کرتا ہوں۔ اس کے عورت ہونے کے ناطے جو وہ ہے اور میری ہے اور میں نے ایک لمحے کے لیے بلکہ لمحوں کے سلسلوں میں یہ محسوس کیا تھا اور روشنی میں کھو گیا تھا۔ میں پہلے سے کہیں بڑھ کر اس کی عزت کرنے لگا تھا کیونکہ انسانی پیار جیسا کہ میں اس وقت جانتا تھا نامکمل ہے، زبان کی طرح نامکمل۔ لیکن پیار حقیقی ہے، ممکن ہے زیادہ سچا اور ممکن اس لیے کیونکہ میں بہت دور تھا۔ اور ہو سکتا تھا میں اور دور چلا جاؤں۔ خلا کی کشادگی پیار کی ضرورت ہے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا اور وہ عورت جو کسی کو کشادگی دیتی ہے اسے پیار کرنے کی اجازت بھی دیتی ہے۔

اب تک مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ میں واقعتاً یہ خط میں میڈولین کو نہیں بلکہ ساوتری کو لکھ رہا تھا اس لیے میں خط کو یک دم ختم کرتے ہوئے لکھا۔ ”میں جلدی ہی ایکس لوٹ آؤں گا۔ ہفتے میں یا دس روز میں۔ اس دوران میں میری پیاری، میری پتنی! میں دعا کرتا ہوں تم اور سندر ہو جاؤ“ میں نے ایسے ملتجیانہ انداز میں لکھا جیسے میں کسی نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔ بچھوئے میرے ٹرنک میں پڑے تھے اور میرے من میں چین نہیں تھا سب کچھ غیاب تھا۔ ننگے پیڑوں اور کیم پر پھیلے ہوئے کھلے ہوئے آسمان کی طرح کسی گھڑیال نے وقت کا اعلان کیا اور خاموشی پیڑوں میں پھر لوٹ آئی۔ پروکٹر محوِ خواب تھے۔ اور ایک دھندلے، برستی بارش والے اتوار کے دن میں کیمبرج سے لندن کے لیے روانہ ہو گیا۔

میں کہہ نہیں سکتا لندن میں میں خوش تھا یا ناخوش۔ کین سن سگٹن میں میرا کمرہ ایک پرانی عمارت کی تیسری منزل پر تھا۔ میں کمرے میں آگے پیچھے چہل قدمی کرتا رہتا تھا۔ کھڑکی سے ایک خوبصورت سکوئر دکھائی دیتا تھا۔ جس سے پرے بہتی ہوئی ندی کو آپ محسوس کر سکتے تھے۔ کمرے میں چہل قدمی کرتے ہوئے کبھی کبھی میں گیس میٹر شیلنگ کا سکہ ڈالنے یا اپنے آپ کو کچھ گرمی دینے کے لیے رُک جاتا۔ یا میں کوئی کتاب اُٹھا لیتا اور چوتھائی صفحہ پڑھ جاتا۔ یا پھر اُچھل کر پلنگ پر دراز ہو جاتا اور پندرہ منٹ کے لیے جھپکی لے لیتا۔ اس طرح میں اپنے آپ کو اپنے تئیں منظم کرنے کی کوشش کرتا۔ میں اپنے اور دوسروں کے خیالات کے سلسلے میں اس قسم کی مساوات پسند کرتا ہوں۔ یہ میری خوراک ہیں۔

میں اپنے آپ میں ایک وسعت کا کشادگی کا احساس کر سکتا تھا۔ کیونکہ یہ ایک نفسیاتی بُعد کی تبدیلی تھی۔ میرے اندر کا جو قدیم تر تھا اس کا ادراک تھا۔ اس شعور میں کوئی خوشی نہیں تھی نہیں! کوئی سرشاری نہیں تھی۔ بس ایک مکرّر دریافت تھی۔ جیسے قحط میں یا کسی یاترا میں میرا بھائی کھو گیا تھا۔ اور میں سینکڑوں میل بھٹکنے کے بعد کسی پولیس والے سے یا کسی گرہنی سے گھر کی مالکن سے اس کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ بلکہ حجاموں، تاجروں اور سادھوؤں سے بھی پوچھ رہا تھا۔ مجھے ایسا لگا وقت کی رہ گزر پر پیچھے چلتے ہوئے میں نے ایسے لوگوں سے پوچھا تھا جن کے سر پر زیادہ قدیم قسم کی چوٹی تھی۔ جن کی آوازیں زیادہ سنجیدہ تھیں۔ ہونٹ زیادہ بدکار تھے۔ مسلمانوں سے جب وہ قلعوں کی فصیلیں حفاظتی چوکیاں اور محل مستحکم کر رہے تھے۔ "بھائی! کیا تم نے میرے بھائی کو کہیں دیکھا ہے؟" میں نے راجاؤں سے پوچھا تھا۔ اور گنگا اور کاویری کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے سادھوؤں اور رشیوں سے پوچھا تھا۔ یہاں تک کہ تاریخ کے کسی دورِ قدیم میں لوٹ کر اپنشدوں کے عہد میں لوٹ کر یگیہ ولکیہ اور میں ترے ئی سے بھی پوچھا تھا۔ جیسے ہر یگ کے ہر فرد

کے پاس ہیں نے اپنے بارے میں معلومات، اپنے آپ کی یاد کی ہوئی تصدیق محفوظ کر رکھی تھی اور اس تصدیق اور اثبات میں اس موجودگی کا شعور تھا جو میں ہوں یعنی میں ہی اپنا بھائی ہوں۔ میں اپنے کین سن سگٹن والے کمرے میں کچھ اسی انداز میں گھوم رہا تھا۔ لندن کی سردی، دریا کی نمی محسوس کر رہا تھا۔ میرا پھیپھڑا ابھی کبھی یہاں مڑ جاتا تھا کبھی وہاں جیسے وہ بھی ایک اعتراف تھا، ایک یادداشت!

ہم اپنا کتنا وقت اپنے ماضی میں گزارتے ہیں۔ فلورن ٹائن پل میں یا سانتا میریا نوویلا کی گھٹنوں کے بل جھکی میڈونا میں۔ پی رے نے سے اٹھنے والی اجوائن یا روزمیری کی خوشبو میں۔ موستائی سیائت جن ویو کی ایلسٹر دعا کے موقعے پر دیکھے گئے بچے کے چہرے میں۔ کسی کتاب کے نام میں۔ پادری کی نگاہ میں اور بہت دور پورے ہندوستان میں اس کے چھوٹے چھوٹے ریلوے اسٹیشنوں اور ان کے پگڑی باندھے، بیڑی پیتے اسٹیشن ماسٹروں میں دھو متھ کھیڈ، ابھو متھ کھیڈ، پرسورام، الویا مسیدھی مادھو پور میں۔ سب نام سننے میں ایسے لگتے ہیں جیسے جانے پہچانے ہیں جن کے ساتھ زندگی گزری ہے۔ ٹھیک ویسے ہی یاد آتے ہیں جیسے مدرسے میں ہم تاریخ کی کتابوں میں لڑائیوں کے نام یاد رکھتے ہیں۔ آپ کو کھیرا اچھا لگتا ہے، کرڑ اکیریلا نہیں۔ وندھیا پربت کا شہر اچھا لگتا ہے۔ کروائی کی پہاڑیوں کا نہیں۔ سر امنیا پہلی ہی نظر میں بھا جاتا ہے لیکن آپ اپنے بنگلور والے بہنوئی سُبوتّی کی پرواہی نہیں کرتے، آپ چھوٹی ماں کو پسند کرتے ہیں لیکن دادی ماں سے آپ کو نفرت ہے۔ آپ کو اپنی بہن سروجا پسند ہے اس لیے نہیں کہ وہ آپ کی بہن ہے بلکہ کسی اور وجہ سے اور شادی آپ میڈلین سے کر لیتے ہیں۔ تاریخ کا سفر کہاں ختم ہوتا ہے میں پوچھتا ہوں۔ اور آپ کہاں سے آغازِ سفر کرتے ہیں۔ آپ حیاتیاتی تعمیرات کے ذریعے ماضی میں لوٹ سکتے ہیں اور اگرچہ اپنے آپ کو جاننا سمجھنا مشکل ہے آپ اپنے آپ کو ڈونوسور بن مانس، جنگلی بھینسا یا بُلبُل تصور کر سکتے ہیں۔ آپ اپنے آپ کو مور یا ساہی خارپشت بھی تصور کر سکتے ہیں۔ اور ہمالیہ کا نسبتاً قدیم تر دیودار کا پیڑ بھی۔ اس پیڑ کے نیچے بیٹھ کر آپ ایسی باتوں کو محسوس کر سکتے ہیں جن کی کوئی عمر نہیں اور جو آپ کو تسلسل اور تواتر سے معمور

کر دیتی ہیں۔ وقت سے فرار تو ممکن نہیں لیکن خود سے فرار ممکن ہے۔ اور اس فرار میں آپ
کی اپنی دھندلی سرحد پر آپ کا سامنا خوف سے ہوتا ہے۔ حیاتیاتی خوف سے لیکن اگر آپ
سؤر یا کتے کی طرح اپنی تھوتھنی سے گہرا کھود دیں تو آپ عالم حیرت میں دیکھیں گے کہ
بُدّوے کا پیے آزاد ہو کر جنگل کے راستے پر آ گیا ہے۔ اور جیسے ہی بھاری بھرکم چٹان
دروازے کی طرح کھل جاتی ہے۔ آپ داخل ہوتے ہیں۔ آپ داخل ہوتے ہیں سات بہنوں کی
سلطنت میں۔ ایک کبھار، ایک معصوم شریف النفس انسان کی طرح آپ گرت داور لاک
میں، تنی میں۔ ہول گریل اپنے ہاتھ میں تھامے داخل ہوتے ہیں۔
نہ کبھی وقت نہ تاریخ، شو وہم، شو وہم، کے علاوہ کبھی کچھ نہیں تھا۔ میں شو ہوں میں
ہی پرم ہوں، میں ہی مکمل ہوں۔

اس روز اپنے کین سنگٹن والے کمرے میں آگے پیچھے ٹہلتے ہوئے۔ اس دن برہسپت وار
تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ وہ برہسپت کا دن تھا۔ مجھے خیال آیا، مجھے پرتاپ کو خط
لکھنا چاہیے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ میں کیمبرج جانے اور ساوتری سے بھرپور ملاقاتوں کے
بعد اسے ایک جملہ بھی نہ لکھتا۔ لفظوں اور پیکروں کا ایک ایسا زائچہ نہ بھیجتا جو اس کی امید
بندھاتا کیونکہ اس سے یقیناً اسے امید حاصل ہو سکتی تھی۔ ساوتری ہمیشہ پرتاپ کا اس
طرح ذکر کرتی تھی جیسے کوئی اپنے سکریٹری کا ذکر کرتا ہے۔ یہ رویّہ محلوں کے ماحول سے پیدا
ہوا ہوگا۔ ہر مشکل میں ایک سہارے کی طرح۔ غیر یقینی کے عالم میں ایک یقین کی طرح۔
اگر وہ کچھ سرپرستانہ انداز میں اس کا ذکر کرتی تھی تو وہ سماجی اختلافات کے باعث نہیں
تھا بلکہ محض اس لیے کہ وہ ہر شے کے لیے، ہر ناگزیر شے کے لیے، نامعلوم کے لیے کچھ کرنا
چاہتی تھی۔ یہ اصطبل کا لنگڑا گھوڑا بھی ہو سکتا تھا یا پھر کوئی بوڑھا بیل بھی۔ جیسے محل
کے صحن میں اس کے مرنے تک چارہ ملتا رہتا ہے۔ بلکہ درباری بیل کو بڑا بوڑھا سمجھ کر
اسے اچھے سے اچھا بنگالی چنا اور اچھی سے اچھی گھاس کھلائی جاتی ہے۔ اور جب وہ
مر جاتا ہے، مرنا تو اسے ہے ہی۔ تو باجے گاجے اور پھولوں کے ساتھ اس کا جنازہ نکلتا
ہے اور اس کی قبر پر سنگترے کے پیڑ لگائے جاتے ہیں، کسی دن کوئی کنواری آ کر اس

کی چتا پر دیا جلائے گی اور اسے پوِتر تا پردان کر دے گی۔ اس کے بعد جونہی محل کے باغیچے پر شام اترے گی تو ہمیشہ اس جائے محفوظ کو چراغ سے روشن کیا جائے گا۔

سچی بات یہ تھی کہ مجھے ساوتری کے اس رویّے سے سخت نفرت تھی۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ واقعی لاتعلق ہے۔ اس نے اپنے آپ کو اپنی تقدیر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔ تمام ہندوستانی عورتوں کی طرح اس کے نزدیک زندگی کی کسی چھکڑے کے پہیئے کی طرح تھی۔ جو گول تھا اس لیے اسے ہر رات اور ہر دن مسلسل چلنا ہی چلنا تھا۔ مرچ یا اِملی چاول یا ناریل خوشبو سونگھتے ہوئے اپنی ڈگر پر۔ اطراف میں شور کرتے ساون کے برستے پانیوں میں میدانی علاقے کے کسی میلے کی جانب یا اونچے پہاڑوں پر یا کسی جانی پہچانی یاترا کے لیے۔ وہ کہتی تھی اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ دھوپ جھلس کر رکھ دے گی یا موسلا دھار بارش ہو گی تمہارے پاس اِملی ہو گی یا زعفران۔ زندگی کا چکّر خود ہی اپنا باطنی قانون ہے۔ ساوتری سے کوئی بھی شادی نہیں کر سکتا تھا۔ ایک روح سے کوئی بھی بیاہ نہیں رچا سکتا تھا۔ ایسی صورت میں کیوں نہ کسی سے بھی شادی کر لی جائے؟ اور پھر وہ جو کوئی بھی ہے تو ٹھنڈہ پرتاپ کیوں نہیں ہو سکتا۔ یقیناً وہ کوئی حسین ہمدانی تو ہو نہیں سکتا۔ بھگوان کا شکر ہے اس کا تکبّر اور اس کی خود غرضی اسے اچھی ملازمت کی خاطر پاکستان لے گئے۔ بہر حال پرتاپ کس قدر صاف ستھرا، کس قدر حلیم اور مخلص تھا! اگر شوہر حاصل کرنا ہی ضروری ہے۔ ساوتری کہتی تھی تو پرتاپ سب سے بڑھیا ہے۔" آپ کا کیا خیال ہے؟" کیمبرج سے [illegible] ی روانگی سے دو ایک روز پہلے اس نے مجھ سے پوچھا تھا۔ ہم ندی کے کنارے نہر [illegible] تھے۔ وہ جگہ ہمارے لیے، شعر اور تاریخ کے لیے، میرا کے کسی گیت یا آدی نون، نا [illegible] سکار کاسن، ایلبی یا موں پی ای لے کے کسی تاریخی کردار کے بارے میں مشترکہ فطری ادراک کے تجربے [illegible] لیے مخصوص تھی۔ لیکن باہر کھلی سڑک کی روشنی میں آجانے کے بعد ہم کسی بھی مو[illegible] ع پر گفتگو کر سکتے تھے۔ نہرو سرکار، سولھویں صدی کے راجندر سنگھ سوم کے عہد سے چلا [illegible] ہی وہ روایت جس کے مطابق باپ اس لیے مایوسی کا شکار ہو گیا تھا کیونکہ اس کے [illegible] ں آٹھ کے بجائے صرف تین ہاتھی تھے۔ بہر حال اس

خارج بین دنیا میں آدمی اپنے لیے ہمیشہ کوئی گڑھا کھود سکتا ہے یا غار بنا سکتا ہے۔ یا بس شیلٹر میں اپنے آپ کو محفوظ محسوس کر سکتا۔ ا۔ ب۔ ج یا کاپر کیٹل میں بیٹھ کر ہاتھ میں کافی کا پیالہ لیے پرتاپ کے بارے میں بات کر سکتا ہے۔

"وہ بڑا اچھا آدمی ہے۔ میں نے ایسا نیک آدمی کبھی نہیں دیکھا تم نہیں بھی" اس نے جعلی درشتی کے ساتھ کہا۔

"میں نے کبھی نہیں کہا کہ میں اچھا ہوں، نیک ہوں"

"بے شک نہیں" وہ چڑانے کے انداز میں بولی۔ "لیکن تم اپنے آپ کو درویش یعنی سنت تو کہلانا چاہتے ہو"

"تم ایسا کہتی ہو" میں نے ہنس کر کہا۔ "اور یہ تمہاری ذمے داری ہے" میں نے بڑی ٹاور سے بجنے والے گھنٹے کی آواز سنی۔ اس لیے اس کے نوٹس کے کاغذات اٹھاتے ہوئے ہم مارکٹ سکوئر پر جلدی سے ٹیکسی میں گھس گئے اور اسے گرٹن گیٹ پر بحفاظت پہنچانے کے لیے جلدی سے چل دیئے۔

"میں ہوں" وہ اپنی پیاری دلاویز آواز میں بولی اور ایسا لگا دربان نے بھی برا نہیں منایا۔ "کیا مجھے بہت دیر ہو گئی ہے؟"

دربان نے پہلے گھڑی کی طرف دیکھا پھر میری طرف۔ "مس راٹھور دنیا ہمیشہ گھڑی کے مطابق نہیں چلتی۔ چلتی ہے کیا؟" اس نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

میں نے جو سرخ گلاب خرید کر اسے پیش کیا تھا اس نے وہ گلاب یہ کہتے ہوئے اس کی میز پر رکھ دیا۔ "یہ کیتھرین کے لیے ہے" اور میری طرف مڑتے ہوئے بولی "بڑی پیاری لڑکی ہے۔ سات برس کی۔ ہم دونوں میں بڑی دوستی ہے۔ شب بخیر راماسوامی شب بخیر مسٹر سکاٹ شب بخیر"

ٹیکسی میں لوٹ کر میں نے اپنے آپ سے کہا "وہ کیتھرین ہو یا پرتاپ سادتری کو کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اسے دونوں اچھے لگتے ہیں کیونکہ دونوں مانوس ہیں، معصوم ہیں اور اس کی روزمرہ کی زندگی میں ناگزیر ہیں"

ان خیالوں میں کھویا ہوا میں پرتاپ کو خط نہیں لکھ سکا۔ اس دن ہوا میں بڑی نمی تھی اور میں اپنے کام کے سلسلے میں برٹش میوزیم نہیں گیا کیب کے تین بج چکے تھے اس لیے میں ندی کے کنارے گھومنے کے لیے چل دیا۔

ٹیمز ندی کیا شاندار ندی ہے۔ اس کے پانی کا رنگ چاہے کالا ہو یا بھورا لیکن وہ بڑے وقار کے ساتھ۔ خود شناسی کی پختگی کے ساتھ بہتی ہے۔ جیسے اس نے اپنے کناروں پر بلند قامت مینار خود اُگائے ہوں اور عمارتیں اسی کے روپ میں اُجاگر ہوتی ہوں اور آدمی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے اس کے پاس سے گزر رہے ہوں جیسے دو گھوڑے کرتے ہیں۔ موسم سرما کے کسی سرد دن کو جب ان کے مالک شراب خانے کے لیے لایا ہوا سامان شراب خانے والوں کو دے رہے ہوتے ہیں۔ سرگوشی میں۔ سرگوشی میں منہ سے جھاگ اُڑا کر ہنہنا کر۔ لندن کے لوگ بیشتر اچھے ہی ہوتے ہیں۔ لندن کا عام آدمی بڑا پیارا اور نیک دل ہوتا ہے۔ وہ واقعی دنیا کا اوّلین شہری ہے۔ ٹیمز ندی کی یہ دھندموتیوں کی چمکتی ہے جیسے ملکہ الزبتھ اوّل نے اپنی دولت اور اپنی نسائیت سونے کے جہازوں پر لٹا دی ہو اور اوبرن نے اپنی بین بجا کر دنیائیں، باغ پریاں اور رغار تخلیق کر دیئے ہوں۔ سلطنتیں بنا دی ہوں۔ گنوا دی ہوں۔ آدمی ایک دوسرے کے سامنے سورماؤں کے سے نعرے لگا کر کھپ گئے ہوں۔ بہر حال کہیں نہ کہیں ایسی سنہری، گول مٹول شاہانہ وقار والی خاتون موجود تھی جو ہمیشہ اپنے نوجوان عاشق کے پہلو میں لیٹی رہتی تھی۔ اور اس کے عاشق کا ہاتھ اس کے دائیں پستان پر تھا اور ہونٹ سیل مکافات میں اس کے ہونٹوں پر پیوست تھے۔ خوشی میں تقدیس ہے۔ شیکسپیر اس لیے مقدس تھا کیونکہ الزبتھ خوش تھی۔ کیا انگلستان کو یہ پرانی پوترتا ایک بار پھر نصیب ہوگی یا نہیں۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ حال کو سمجھنے کے لیے مجھے ماضی کی ضرورت تھی۔ میں چیلسیا کے قریب ایک پُل پر کھڑا تھا اور شام کی گلابی اور زرد روشنیاں دیکھ رہا تھا۔ اور وہ کشتیاں جو روشنی کی جانب رواں تھیں۔ شہر اپنے پھیلاؤ کو اپنے محسوس کر رہا تھا۔ مجھے لگا انگلستان میری ہڈیوں میں، میری سانسوں میں رچ بس گیا ہے۔ میرے دل میں کس

قدر تعظیم تھی اس کی! اونچی اونچی جگمگاتی ہوئی بسیں سڑکوں پر دوڑ رہی تھیں ٹیکسیاں چل رہی تھیں۔ سبز اور شریفانہ! اور وہ مرد اور عورتیں اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے جو ایسا لگتا تھا دنیا بھر کے لیے ذمّہ دار تھے صرف اس جزیرے کے لیے نہیں بلکہ کرۂ ارض پر پھیلی ہوئی پوری کائنات کے لیے چہل قدمی کرتے ہوئے لوگ۔ کوئی کام کرنے والا جس نے کام پر جاتے ہوئے لمحہ بھر کی فرصت حاصل کر لی تھی۔ کوئی باپ جو اپنی ننھّی بیٹی کو لندن کی سیر کرا رہا تھا۔ باہوں میں باہیں ڈالے دو عاشق۔ پیڑوں اور بہتے ہوئے پانی کے پس منظر میں ایسا لگتا تھا انھوں نے تاریخ کا سفر روک کر اسے اپنے آپ پر غور کرنے کے لیے مجبور کر دیا ہے۔

لندن بڑا پراسرار لگ رہا تھا اور نئی ملکہ کی تاجپوشی کی تیاریوں میں معروف تھا۔ انگریزوں کا خیال تھا یہ موقعہ انسان کے لیے دروں بینی کی بصیرت کا بڑا اہم موقعہ ہوگا میں نے محسوس کیا گوری قومیں بھلے ہی اتنی بڑی ذمے داری کو نہ محسوس کرتی ہوں انگریز بہرحال یہ محسوس کرتا تھا۔ کیونکہ بالآخر یہ انگریز ہی تھے جنھوں نے نئی دنیا کی بنیاد رکھی تھی اور اب یہی امریکہ تھا جو بڑی سادگی سے لاف زنی کے انداز میں اعلان کر رہا تھا کہ بھی انگریز مرد، عورت واقعتاً یہ سوچتے ہیں کہ انسان کا دائرہ اختیار رہے بی ایس سی کا رلیس قانون یا بحر الکاہل کے جزیرے پر ہیٹ سن کے کچھ گھنٹے ٹھیک ڈھنگ سے پہنچانے کا کام ان باوقار میناروں، گھڑیوں، ترازوؤں، اسٹاک کے بہی کھاتوں۔ سفر کرتے بحری جہازوں اور آسمان میں اڑتے ہوائی جہازوں کا ہے۔ دنیا میں بالآخر ایک اچھی حکومت قائم ہوگی اور انسانی طور طریقوں میں نفاست اور ایک مخصوص قسم کا وقار پیدا ہوگا اور یہ سب انگلستان کے وجود سے عمل میں آئے گا۔ مقصد یہ تھا کہ میں ایک ہندوستانی جو برطانوی حکومت کو ناپسند کرتا تھا۔ یہ محسوس کروں کہ انگلستان کس طرح اپنے روحانی مقدّر کی بازیافت کر رہا تھا اور وہ ملکہ کی تاجپوشی کی رسم کے توسّط سے اس طرح اپنے آپ کو اعزاز سے سرفراز کرے گا۔

چھ بجنے والے تھے اور یہ جانتے ہوئے کہ اس وقت جو لیے ٹاسٹیگ میں ہوگی میں اندر گیا

نارنجی کا شربت لیا اور بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ جولیٹا ساوتری کی بڑی پکّی سہیلی تھی۔ اس نے ایک سال پہلے گرٹن چھوڑا تھا اور حالانکہ میں اس نے صرف ایک بار ملا تھا میں محسوس کرتا تھا میں کسی بھی موضوع پر اس سے بات چیت کرسکتا ہوں۔

جولیٹا اور نوجوان انگریزوں کی وہ پوری نسل جو جنگ میں لڑی تھی یا جنگ کے دوران پروان چڑھی تھی۔ (جولیٹا ۱۹۴۵ء میں اٹھارہ برس کی تھی)۔ مجھے اچھی لگتی تھی۔ اسی لیے کسی نووارد کے لیے پب کی زندگی کی بڑی اہمیت تھی۔ بھلے ہی وہاں ملنے والے انگریز مرد اور عورتیں، خاص طور پر کم عمر کے نہیں ہوتے تھے لیکن پھر بھی وہ نئے انگلستان کی ہی تصویر پیش کرتے تھے۔ انگلستان بذات خود نوجوان ہو گیا تھا۔ اور مطلق العنان بھی۔ نوجوان انگریز کھلے مزاج کے لگتے تھے۔ ذہنی طور پر تجسّس سے بھرپور، لڑکیاں، نسائیت کی تصویریں اور بالکل بے جھجک۔ سب کچھ جین آسٹن اور تھیکرے کے عہد سے مختلف تھا۔ بلکہ ورجینیا وولف کے عہد سے بھی مختلف! لڑکے لڑکیاں آزادی سے ملتے تھے، ایک دوسرے کا ساتھ دیتے تھے۔ ساوتری کو کہے ہوئے ایک انگریز لڑکی کے الفاظ میں سیب کھانے کی سہولت کے توسط سے زندگی کرنے کے عمل میں ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔

''سچی بات تو یہ ہے'' مارگریٹ ہوف نر بولی ''جب اس نے میرے ساتھ وہ سب کیا تو میں سیب کھا رہی تھی۔ اس میں ایسا کیا ہے کہ واویلا مچا دیا جائے'' مجھے بتایا گیا کہ نر اور مادّہ کا سمبھوگ دن بدن عام سی بات کی طرح جاری ہے۔ اب کسی جدید لیڈی چیٹرلی کو کسی گیم کیپر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں رہی۔ اس کا مطلوبہ مرد تھیٹر میں اس کی بغل میں بیٹھا ہوا یا چیلسا پُل پر یا پھر کسی پب میں ہی مل جائے گا۔ مجھے تو صرف فرانس کے بدبودار شراب خانوں کا ہی علم تھا۔ میں کم و بیش وہاں کبھی نہیں گیا۔ کیا آپ کیفے دے مارنیے یا راکنتر دے پیتی آر میں میڈلین کا تصوّر کر سکتے ہیں؟ ان کے مقابلے میں انگریزی پب سٹینگ کس قدر مہذب تھا۔

جولیٹا اندر آئی۔ اس کے ساتھ سنہری بالوں کی تیلی سی لٹ، کھلی پیشانی اور چمکتی سبز آنکھوں والا لا منطقی مثبتی، سٹیفن تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ارسطو یہ ثابت کر چکا ہے

کہ دنیا واقعتاً بالکل حقیقی تھی۔ یہ بات اس کی سمجھ سے باہر تھی کہ کوئی شخص اپنے آپ کو بھی شک و شبہہ کی نظر سے دیکھ سکتا ہے۔

"شک کرنے والے پر کون شک کرتا ہے" میں نے پوچھا۔

"شک کرنے والا"

"شک کرنے والے کو کون دیکھتا ہے"

"میرا ذہن!" اس نے جواب دیا۔

"کیا میرا ذہن اپنے آپ کو دیکھ سکتا ہے" میں نے زور دے کر کہا۔

"بلاشبہہ کیوں نہیں؟"

"کیا تمہارے ذہن میں بیک وقت دو خیال پیدا ہو سکتے ہیں" میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"بولو بولو" اس نے اپنا گلاس لہراتے ہوئے بہت خوش ہو کر کہا "کہیں تم یہ تو نہیں چاہتے کہ میں صوفی بن جاؤں۔ بولو، بولو"

"نہیں" میں نے کہا "میں تو ارسطو سے بات کر رہا ہوں"

"ہاں، ارسطو نے قیاس کی نوعیت پر فیصلہ کن انداز میں کہا ہے"

"عجیب بات ہے، کیا تم نے آج تک ہندوستانی منطق کے نیائے مکتبِ فکر کے بارے میں کچھ نہیں سنا"

"نیائے، محض بکواس" سٹیفن نے ہنسی ہنسی میں کہا۔

"اچھا اچھا" جولیٹا نے اس کے سنہری بالوں کی لٹ پیچھے دھکیلتے ہوئے نسوانی شائستگی اور نرمی کے ساتھ کہا۔ میں نے دیکھا اس کے ہاتھ اتنے نفیس نہیں تھے جس قدر حسّاس اس کا چہرہ تھا!

"کیا روشنی اپنے آپ کو دیکھ سکتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ظاہر ہے نہیں" سٹیفن نے کہا۔

"تو پھر ذہن اپنے آپ کو کس طرح دیکھ سکتا ہے"

"میں نے تمہیں بتایا تھا،" سٹیفن چلّایا۔ "میرے ساتھ تصوّف کی بات مت کرو۔"

"وہ عقل کی بات کر رہا ہے۔ اور تم بکواس۔" جولیٹا نے بڑے جرأت آمیز انداز میں کہا۔

"اور تم جانِ من۔" اس نے سب کے سامنے اس کا بھرپور بوسہ لیتے ہوئے کہا "تم ایوانِ ذہانت کی مالکن اور میں آقا۔" ظاہر ہے کہ اس کو نشہ ہونے لگا تھا۔ میں رُک گیا۔ ان کے لیے شراب کا ایک ایک جام لایا اور بیٹھ گیا۔ اب تک کہنیوں پر تھگلی لگے کوٹ میں ملبوس آرٹسٹوں، تھنے ار مارکیٹ کے بوڑھے دلالوں، ناقابلِ تفہیم عورتوں، اپنے کتوں کے ساتھ آئے ہوئے زمینداروں۔ باتونی ادیبوں (جو ہوا کو یوں سونگھ رہے تھے جیسے کتابیں چھاپنے والے ناشر چمڑہ رنگنے والوں اور ڈھول بجانے والوں کی ذات کے لوگ تھے۔ کیونکہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ادیب لوگ برہمن ہوتے ہیں) کی اچھی خاصی زندہ دل بھیڑ جمع ہو چکی تھی۔ وہاں وہ خاموش، غنودہ خاطر مصوّر بھی موجود تھے جو اپنے دھندے کے اوزار اور غلاف میں چھپائے ہوئے اپنے کینوس اپنے ساتھ لائے تھے۔ یہ زندہ دل ہجوم بارٹنڈر سے باتیں کرنے میں معروف تھا "مجھے نصف 'بٹر' دیجئے۔" عام فرمائش تھی۔ کبھی حلیمی سے کبھی کھردرے انداز میں۔ کبھی نفیس لب و لہجے میں کبھی مقامی لب و لہجے میں۔ سارا ماحول دھوئیں، خاموشی اور گفتگو کے شور میں ڈوبا ہوا تھا۔ عطر کی خوشبو میں مردوں، عورتوں کی مہک شامل ہو گئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا فطرت کا بنایا ہوا آدمی فی الواقع نیک، اور اچھا ہے "لا ناتورال" اے سامپر سین زا ادور" یعنی منطق کا زندگی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ زندگی بہرحال خوبصورت تھی حسن کے بال سنہرے تھے اور اس کے اندر نسائی، بے تکلفی تھی۔ اور ٹیمز ندی اپنی روانی میں مست تھی۔ مگن تھی!

"ایک آخری سوال" میں نے جولیٹا اور سٹیفن کے لیے ایک اور بیئر لاتے ہوئے کہا۔
"دماغ مادّے ہی سے بنا ہوا ہے۔"

"جی ہاں! میرے محتسب"۔ سٹیفن نے ہنستے ہوئے کہا۔

"۔۔ یعنی دماغ اسی مواد سے بنا ہے جس سے یہ دھرتی ۔"

"جی ہاں! میرے ہندوستانی فلسفی!"

"تو پھر دھرتی، دھرتی کو معروضی انداز میں کیسے دیکھ سکتی ہے؟ دھرتی کو کیسے سمجھ سکتی ہے؟"

"یہ تو ایسے ہی ہوا جیسے کوئی پوچھے۔ معاف کرنا جولیٹا۔ اگر میں جولیٹا کے ساتھ سمبھوگ کروں جیسا کہ میں اکثر اور خوشی سے کرتا ہوں اور جب شراب بھی ساتھ ہو تو یہ اور بھی اچھا اور لطف اندوز ہوتا ہے تو جولیٹا کو سمجھنے کا میرا کیا طریقہ ہوا؟ سچی بات یہ ہے کہ میں جولیٹا کو سمجھتا ہی نہیں۔ میں اسے کبھی سمجھ ہی نہیں سکوں گا۔ میں اس سے جب پیار بھری اچھی اچھی باتیں بھی کرتا ہوں تو بھی مجھے پتہ نہیں ہوتا کہ میں اس سے پیار کرتا ہوں یا نہیں میں خوش ہوں اور میرے لیے یہی سب کچھ اہم ہے۔ میں عینیت پرست ہوں۔" اس نے ہنستے ہوئے اپنی بات کو ختم کیا۔

جولیٹا اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا۔ سٹیفن کی باتوں کا اس پر کوئی اثر نہیں تھا۔ "میں اس موضوع سے متعلق ایک کتاب پر تبصرہ کر رہی ہوں۔" اس نے گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے کہا۔ "اس کتاب کا موقف یہ ہے کہ بدی ہے اس لیے خدا ہے، بھگوان ہے۔ تمہارے کہنے کا مطلب یہی ہے نا!"

"میں نہیں جانتا خدا یا بھگوان سے تمہارا کیا مطلب ہے۔ لیکن جب دو مخالف متضاد عناصر سے ہی دنیا بنتی ہے۔ دو مختلف بناوٹ کی مختلف مواد سے ہی بنی ہوئی چیزیں ہی ایک دوسری کے لیے معروضی نوعیت کی ہو سکتی ہیں۔ وگرنہ یہ ٹھیک اسی طرح ہے جیسے آپ کی ہتھیلی پر پارہ کے دو قطرے ہوں یا بحرِ احمر اور بحرِ عرب کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا جائے۔ دونوں پانی ہیں اور ایک جیسے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ ذہن جو اسی مواد سے بنا ہے جس سے دھرتی بنی ہے کس طرح مثبت نوعیت کا ہو سکتا ہے؟ پانی پانی کے لیے مثبت نہیں ہے۔ پانی درحقیقت کسی شے کے لیے مثبت حیثیت نہیں رکھتا۔ پانی تو ہے۔ اس لئے کچھ ہے۔ اور چونکہ ہونا ہی کسی شے کا مواد ہے تو آپ زیادہ سے زیادہ یہ

کہہ سکتے ہیں "یہ ہے ہی یہ ہے، ہے۔"

"مجھے معلوم تھا ہندوستانی پاگل ہوتے ہیں۔ گاندھی بھی پاگل تھا۔ اب مجھے اس بات کا ثبوت مل گیا ہے۔" سٹیفن نے کہا "میں ایک پرانا انارکسٹ ہوں۔ میرا اعتقاد ہے کہ مادہ ہی سچ ہے۔ جو لیے ٹا سچ ہے۔ میں سچ ہوں۔ اور تم بھی میرے دوست جو ہر بار میرے لیے اور جو لیے ٹا کے لیے نوینس خرچ کرتے ہیں خراب بلا رہے ہو۔ سچ ہو اب جاؤ اور میرے لیے ایک اور جام لاؤ۔ اس بار مجھے نصف نہیں چاہیے۔ مجھے پورا بالکل پورا چاہیے۔ پنڈت نہرو زندہ باد۔"

کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے لوگ دیکھنے کے لیے مڑے اور پینے کے لیے میری اور ہندستان کی صحت کے جام ہوا میں لہرا دیئے۔ مجھے خیال آیا انگریزی پب میں بیٹھنے کا کیا شاندار مزا ہے۔ فرانس میں یہ انسان دوستی صرف مزدور طبقے کے لوگوں میں آپ کو ملے گی۔ غلیظ چہروں والے ہانپتے، انگلیاں چلاتے چالاک بورژوا طبقے کے لوگوں میں نہیں۔ بورژوا لوگوں کی ہوس پرستی جانی بوجھی ہے۔ یہ عیب ہے۔ کیونکہ اسے وہاں تک پہنچنے سے پہلے ہی شکست دے دی گئی تھی۔ جبش تک اس کے پہنچنے سے پہلے ہی بادلیئر کو اس کے سوتیلے باپ اور اس کی بدبودار ماں نے مات دے دی تھی۔ آپ اندھیرا اس لیے دیکھتے ہیں کیونکہ آپ اپنے آپ کو روشنی ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ جدلیت ہمیشہ عیاش کی زبان پر رہتی ہے۔ لیکن تازہ دم نوجوان انگلستان میں جس کے بارے میں مَیں بہت کم جانتا تھا مجھے محسوس ہوا انسان مقابلتاً زیادہ بنیادی، معصوم اور بے تکان اور متواتر تھا۔ اس کے در پر کوئی 'یہودا' نہیں تھا۔ اس نے ہنوز عمارت کی دیکھ بھال کے لیے محافظ یا دربان نہیں پالا تھا۔ اس کے باغیچے میں پھول کھلتے تھے۔ اس کی عمارتوں کی رفعتوں کو جگمگاتی روشنیاں منوّر کرتی تھیں اور ان کے پاؤں میں ٹیمز ندی رواں تھی۔ دہانے کے جزیرے کے اردگرد چاک مٹی کی سفید پہاڑیاں ہیں۔ اور آپ کشتیوں کی روشنیوں کے ساتھ فضا میں ابھرتے اور دامنِ شب میں لوٹتے ہوئے آبی پرندوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ جلد ہی مجھے فرانس لوٹنا ہوگا اور میں اپنی ریڑھ کی ہڈی کے آخری سرے تک کانپ گیا۔ بھگوان کاش میں لمحے کا سفر روک سکتا اور دنیا کو انگلستان بنا سکتا!

اگلے روز شام کو ساوتری کے ساتھ گھومتے ہوئے ہم بند تک پہنچ گئے۔ میں نے اسے اس نئے جزیرے انگلستان سے متعلق اپنی پیش اندیشگی کے بارے میں بتایا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہاں کے تخت پر ایک ملکہ بیٹھنے والی ہیں۔ بادشاہ پہلے ہی نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ شدید طور پر بیمار تھا۔ ہائڈ پارک کے پتے اور پانی یہاں تک کہ وہاں کی چڑیاں، فاختائیں اور بطخیں تک محسوس کرتے ہوئے لگتے تھے کہ انگلستان میں کچھ نیا وقوع پذیر ہونے والا ہے اور ریجنسی ختم ہونے والی ہے۔

"ریجنسی؟ کیسی ریجنسی؟" ساوتری نے اس انداز سے پوچھا جیسے کوئی طالب علم اپنے استاد سے پوچھتا ہے۔

"تم کیوں نہیں سمجھتی کہ جارج پنجم کی وفات اور نئے بادشاہ ایڈورڈ ہشتم نے کنگ حال، کے تخت سے دستبردار ہونے کے بعد سے ہی جس نے اپنا فال سٹاف تخلیق کر لیا ہوتا لیکن جسے ایک موٹے اور بیوقوف بینک کلرک کی تہذیب نے جلاوطن کر دیا۔ یہ ملک جس نے اپنا چرچ اس لیے منتخب کیا کیونکہ یہاں کا بادشاہ اپنی بیویوں کو چُننے کا فیصلہ خود کرتا تھا اور وہ سلطنت اور اس کے متعلّقات حاصل کر کے پھیل کر بڑا ہو جانے کے باعث اسٹاک ایکسچینج سے یا اس بات سے کہ مسز پٹ ورتھ پرتھ میں اور مسٹر کینیڈی ایڈمونٹن، البرٹا میں کیا کہیں گے زیادہ رکھوسارا مسئلہ اون کے تھے اروں کا تھا یا لندن الیکٹرک کا) اس قدر خوف زدہ ہو گیا تھا کہ اس تاجر ملک نے اس بادشاہ کو دھکیل باہر کیا جو اس کا بہترین یا ہنری پنجم کے بعد سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا حکمراں ثابت ہو سکتا تھا۔ کیا تمہیں اپنی کیٹ کو ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی میں اس کا کہا ہوا جملہ یاد ہے "اس طرح فرانس تمہارا ہے اور تم میری ہو" اور انگلستان نے کیا کیا اس نے اس کی جگہ ایک شریف النفس بھرت کو تخت پر بٹھا دیا جو جب بھی کچھ کہتا تھا، معذرت کرتا تھا "آپ سوچتے ہیں میں آپ کا بادشاہ ہوں لیکن میں تو محض بادشاہ کا بھائی ہوں۔ میں گزرتا رہتا ہوں۔ تذبذب میں رہتا ہوں۔ کاش میرا بھائی یہاں ہوتا!" اس نے بھرت کی طرح اس ملک پر حکومت کی۔ تخت پر رکھی اپنے بھائی کی کھڑاوں کو پوجتا رہا۔

"بادشاہت ایک غیر شخصی اصول ہے جو زندگی اور موت کی طرح ہے اور جس کی کوئی حدیں نہیں ہیں۔ یہ وہ تاریخ ہے جس کی تجسیم کر دی گئی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے ٹیمز ندی ایک ایسا اصولِ آبی ہے جسے ٹھوس حقیقت کا روپ دے دیا گیا ہو۔ اور اگر کوئی بادشاہ اپنے بادشاہ ہونے کے لیے معذرت خواہ ہے تو وہ کوئی بادشاہ نہیں۔ وہ اپنے اندر ہی ایک دوئی پیدا کر لیتا ہے اس لیے وہ قوت اور اختیار سے عاری ہوتا ہے۔" بادشاہ کوئی غلطی نہیں کر سکتا!" وہ اس خیال کی دین ہے کہ اصول یا قانون کوئی غلطی نہیں کر سکتا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے کمیونسٹ کہتے ہیں کہ پارٹی کوئی غلطی نہیں کر سکتی۔ کچھ روز پہلے کیمبرج میں کمیونسٹوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے میں یہ کہنا بھول گیا تھا کہ کمیونزم کو بہر حال کامیاب ہونا چاہیے اور ہمارے لیے خوشی کی بات ہے کہ بعد میں اس کی جگہ بادشاہت لے لے گی۔ غور کیجیے ہٹلر اور اسٹالن میں کیا فرق ہے۔ مردِ آہن اسٹالن۔ کریملن کے پس پردہ وہ پراسرار وہ غیر شخصی وجود جس کے نزدیک اذیت، ترقی یا موت ایک تجریدی حساب کے ضروری عناصر ہیں۔ جس طرح کیتھولک لوگ بائبل میں شگون یا فال تلاش کرتے تھے اسی طرح اسٹالن، رہنمائی کے لیے غیر شخصی تواریخ کا سہارا لیتا تھا۔ اسٹالن تاریخ میں ہی بطور تاریخ جیتا ہے اور مرتا ہے۔ تاریخ سے باہر نہیں۔ دوسری طرف ہٹلر نیورمبرگ کے اپنے ڈرامائی مجمعوں میں جیا۔ وہ ٹھوس تھا۔ لوگ اسے دیکھ سکتے ہیں اس کی آواز حقیقی سے بھی انتہائی حقیقی تھی۔ منصوبے ذاتی تھے۔ شیطانی تھے۔ خبط نجومی نوعیت کے اور اس کی "تاریخ" ہٹلر کی اپنی تواریخ۔ آپ چاہیں تو اسے 'جرمینک' بھی کہہ سکتے ہیں وہ ہیرو کی طرح، فوق البشر کی طرح مرا۔ زرتشت، دوئی ثنویت لازمی طور پر انسان کو سورما بناتی ہے اس کی شخصیت کی نشوونما کرتی ہے اور اسے افتخار عطا کرتی ہے۔ قائل ثنویت انسان کو لازمی طور پر درویشانہ صفات کا انسان بن جانا چاہیے۔ اپنے اندر انکساری پیدا کرنی چاہیے کیونکہ اسے علم ہے کہ وہ بڑا عظیم، ذاتی شخصی اور سورما، اور ایسا شہنشاہ بن سکتا ہے جس کا مثلث نما چبوترا ہوگا اور اس پر اس کا مجسمہ!"

یہاں ساوتری خاموشی سے مجھے چیلسیا برج کی طرف لے گئی اور نیچے ندی میں جھانکتے

ہوئے میں نے اپنی بات جاری رکھی ۔ " لیکن غیر شخصی ہونا نہ تو منکسر ہوتا ہے اور نہ ہی مغرور ۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اسٹالن منکسر مزاج اور مغرور تھا ؟ لیکن ایک دوسرے کیتھار دوسرے پاکباز ٹراٹسکی کے بارے میں بہ آسانی اور کھلے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ مکمل طور پر ایمان دار اور سچا انقلابی مغرور تھا ۔ کامپودی کریما ' کے نیچے جلتی ہوئی آگ میں وہ مسکراتا ہوا یہ گیت گاتا ہوا خوشی خوشی کود سکتا تھا " میں ، میں ایمان دار ہوں ۔ میں غیر آلودہ اور پاک ہوں " ۔ اسٹالن ہزار سنتریوں ، کچھ ہزار جاسوسوں کی مدد سے کریملن کی حفاظت کر سکتا تھا اور اگر وہ ضرورت سے زیادہ جان جاتے یا ہوشیاری دکھاتے تو ان میں سے ہر ایک کو موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا ۔ پہلے یگودا کو پھر ززجوف کو ۔ اس کے خیال میں تاریخ نے انھیں موت کے گھاٹ اتارا ۔ ٹھیک اسی طرح جیسے ' انکا ' کے سربراہ کا اعتقاد تھا کہ قربانی کا مطالبہ خدا کرتا تھا نہ کہ خود وہ ۔ اسٹالن کی ٹراٹسکی کے ساتھ کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی کیونکہ یہی حقیقی تواریخ تھی ۔ اگر اسٹالن بطور انسان ' انقلاب کے شعلہ شفاف ٹراٹسکی سے حسد بھی کرتا تھا اور ممکن ہے وہ اس کا اعتراف بھی کر لیتا لیکن اسٹالن جو بذاتِ خود تاریخ تھا اسے بہرحال ٹراٹسکی کو قتل کرنا تھا جو اس کے خیال میں ' مخالف تاریخ ' تھا ۔ اس کی شخصیت کا کھرا پن اس کی انسان دوستی ، اور ایک شیخی باز رہنما کے طور پر اس کی ذاتی شخصیت کا جادو تاریخ کے سفر میں غیر مقدّس رکاوٹوں کی طرح تھے ۔ ٹھیک اسی طرح مارشل تخاچ وسکی کو بھی مرنا پڑا ۔ وہ جو غیر ذاتی ہے غیر شخصی ہے کسی انسان کو سورما کا ہیرو کا درجہ حاصل کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا ۔ اسٹالن کوئی سورما یا ہیرو نہیں تھا ۔ وہ تو بادشاہ تھا ، بھگوان تھا ، خدا تھا "

" تم کیا زوردار تقریر کرتے ہو ! " ساوتری نے میرا بازو کھینچتے ہوئے اور مجھے چڑاتے ہوئے کہا ۔ وہ چاہتی تھی میں ندی میں بہتی ہوئی کشتیوں کا نظارہ کروں یا پھر شفاف چاند کو دیکھوں جو بادلوں میں کھیل رہا تھا رہا تھا ۔ ساوتری اسے دیکھ کر بچّے کی طرح خوش ہو رہی تھی ۔

چندا ماما ، چندا ماما ! " میں کنڑ کا ایک بال گیت گانے لگا " چندا ماما ۔ چندا ماما " پھر ہم

تاریخ کی جانب لوٹ گئے۔

"فوق البشر ہمارا دشمن ہے۔ غور کیجئے ہندوستان میں کیا ہوا ؟ شری اربندو، شری شنکر کے ادویت میں سدھار کرنا چاہتے تھے۔ جو صفر کے عددی مرتبے میں سدھار کرنے کے مترادف تھا۔ صفر کا ہندسہ تمام اعداد بناتا ہے اسی لیے صفر ہی سے سب کچھ شروع ہوتا ہے۔ تمام ہندسے ممکن ہیں، اگر وہ صفر کے لیے آس پاس ہوں۔ ٹھیک اسی طرح ویدانت کے آس پاس تمام فلسفے امکانِ وجود میں آجاتے ہیں۔ نہ آپ ویدانت میں سدھار کر سکتے ہیں نہ صفر میں۔ صفر ہمیں پتہ ہے خلا ہے غیر شخصی ہے جبکہ ایک، دو، تین وغیرہ میں دوئی ہے۔ ثنویت ہے۔ ایک کا مطلب ہے کئی۔ لیکن صفر کا مطلب ہے عدم یعنی کچھ نہیں۔ میں ایک نہیں ہوں، میں دو نہیں ہوں۔ نہ میں ایک ہوں نہ دو 'اہم نرو کلپی نراکار روپی'۔ میں 'میں' ہوں۔ اس طرح شری آروبندو نے اپنے آپ کو پانڈی چری میں بند کر لیا اور ایک دنیا کی تعمیر شروع کر دی۔ اگر آپ ایک سہ منزلہ مکان بنا سکتے ہیں تو آپ پانچ، آٹھ، دس یا بارہ منزلوں والا مکان بھی بنا سکتے ہیں۔ آپ ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ یا پھر کسی بھی عمارت کی طرح اونچے سے اونچا جا سکتے ہیں۔ جیسا کہ ہوائی جہاز شروع شروع میں ۵۰ میل فی گھنٹے کی رفتار سے اڑتے تھے پھر ۸۰ میل کی رفتار سے پھر سو میل کی، پھر تین سو میل کی اور اب آواز کی رفتار سے بھی زیادہ رفتار سے اڑنے لگے ہیں۔ ٹھیک اسی ڈھنگ سے آپ لاتعداد دنیائیں بنا سکتے ہیں۔ ذہن بھی اور رفتار نفس بھی اس قدر چست اور طرار ہیں کہ آپ ایک کے بعد ایک نئی دنیا بناتے چلے جائیں گے لیکن آپ اپنی ذات سے اپنے غیر شخصی قانون سے ماورا نہیں جا سکتے۔ جس طرح اسٹالن کی مادہ پرستی نے اس کے تواریخ کے غیر شخصی تصور کے بجائے اس کی تواریخ کی مادی تشریح نے اسے مصریوں کی طرح ممی کی شکل میں محفوظ کر کے تاریخ کی طرح غیر فانی بنا دیا۔ ٹھیک اسی طرح آروبندو نے اس فانی، کیمیاوی، اس تاریخی جسم کو ناگ ارجن کے مطابق اٹھارہ میزانوں پر مشتمل اس جسم کو 'مستقل' بنانے کی کوشش کی۔ اخلاقیات، اور مادہ پرستی کو ساتھ ساتھ چلنا چاہیے۔ نہ مرنا ایک اخلاق

تصور ہے کیونکہ موت ایک حیاتیاتی عمل ہے۔ ایک زندگی دشمن عمل جو موالید کی نوعیت کے خلاف ہے۔ نہ مرنا آبِ حیات یعنی امرت پی لینا اخلاقی ہے۔ یہ منظہری حقیقت سے ماورا جانا ہے ٹھیک ویسے ہی جیسے تجرّد یعنی برہم چاری رہنا فطری اصول۔ کے ماورا جانے کے مترادف ہے۔ اس اخلاقی اصول کی انتہا مصری ممی سازی ہے 'پرانڈ' ہے۔

"میرے لیے سانس لینا دوبھر ہونے لگا ہے" ساوتری بولی۔ تم مجھے بہت دور اور بڑی تیزی سے لے جاتے ہو۔

"بس ذرا دیر اور" میں نے التجا کرتے ہوئے کہا، "میں جلد ہی اپنی بات ختم کرنے والا ہوں۔ فوق البشر انسان کا دشمن ہے۔ آپ اسے زرتشت کہیں یا شری آرو بندو یا اسٹالن یا فادر زوسیما"

"یہ تاریخ میں نئی شخصیت ہے" ساوتری نے ہنس کر کہا۔

"ہاں" میں نے اس کی خلل اندازی سے قدرے چڑ کر کہا "یہ دوستوسکی کا ایک درویشانہ کردار ہے۔ تعفن سے بھرا ہوا۔ جب وہ مرجاتا ہے تو اس کا جسم گل سڑ جاتا ہے۔ اور تقدس کی اس بو کو جو اس کے معجزوں کے باعث اس کے نام کے ساتھ وابستہ ہو گئی تھی درہم برہم کر دیتا ہے۔ جب شری آروبندو کی وفات ہوئی تو ان کے شاگردوں نے بھی ضرور ایسا ہی محسوس کیا ہوگا۔ وہ بے موت آقا جو اپنے جسم کو ایک مذہبی نوعیت عطا کرنا چاہتا تھا اسے دوام عطا کرنا چاہتا تھا، ایک عام انسان کی طرح مر گیا۔ اس کا سانس رُک گئی ہو گئی، اس کی آنکھیں اپنے کٹوروں میں پتھرا گئی ہوں گی لیکن یوگی ہونے کے ناطے ممکن ہے وہ کنول سمادھی میں بیٹھا ہوا ہو اور اس بات نے اسے حسن اور اعلیٰ وقار عطا کر دیا ہو۔

"اور اب؟" ساوتری نے التجا کی۔ ندی سے اُبھرنے والی نمی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ "میں ایک حیاتیاتی چیز ہوں۔ مجھے خوراک اور گرمی کی بہرحال ضرورت ہے۔" اور پھر ساڑھی کھینچ کر اپنی چھاتی ڈھانپتے ہوئے یوں بولی جیسے اسے خطرہ ہو کہ اس کے اپنے پھیپھڑوں کی تکلیف بڑھ جائے گی۔ "علاوہ ازیں مجھے تمہارے پھیپھڑوں کے بارے

میں بڑا ڈر لگتا ہے"۔ اس لیے میں نے اس کی بات مان لی اور ہم دھیرے دھیرے ندی کے پشتے کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔

"تم جانتی ہو" میں نے کہا "غالباً جولیٹا اس وقت 'سٹینگ' میں ہے"۔

"اچھا" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "تو تمہیں جغرافیہ اور سوانح ۔ دونوں یاد ہیں ہے نا!۔ آؤ چلیں"۔

"اوہ۔ کبھی نہیں، کبھی نہیں"۔ میں چلّایا۔ "تم ساوتری اور پب میں"۔

"پب ہو یا نہ ہو۔ مجھے کہیں بھی لے چلو، میرے پریتم"۔ اس نے اس قدر نرمی اور عقیدت سے اور میرے بازو پر کچھ ایسا دباؤ ڈالتے ہوئے کہا کہ ساری کائنات تازہ دم ہو کر میرے شعور میں اجاگر ہو گئی۔ "مجھے کہیں بھی لے چلو۔ مجھے گرمی عطا کرو۔ سکون اور راحت دو"۔ کیا یہ میں ہی تھا۔ ایک احمق اسکول ٹیچر، پانچ فٹ گیارہ انچ کا قابل رحم، بے ڈول کمزور بینائی والا برہمنی ضعف کا نمونہ جس کو مخاطب کرتے ہوئے ساوتری نے یہ دو پیار بھرے عام سے لیکن مکمل لفظ کہے تھے؟ اس نے پہلی بار یہ لفظ مجھ سے کہے تھے اور شاید اس سے پہلے اس نے آج تک یہ لفظ کسی سے نہیں کہے تھے۔ تاریخ اور میرا ذہن کہیں غائب ہو گئے اور میں نے اپنا بازو اس چھوٹے سے جاندار کے گرد حمائل کر دیا جو مشکل میرے کندھے تک پہنچتا تھا اور اسے گلیاروں، پارک کے راستوں، بس اسٹاپ، پل اور مرغابیوں کے پاس سے گزارتا ہوا ٹیکسی تک لے گیا۔

"آؤ ہم سوہو چلیں" میں نے کہا۔ اور اسے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لیے ۔ مجھے محسوس ہوا کہ ہم ایک دوسرے کے لیے کتنے حقیقی اور سچے تھے۔ ہم دونوں کے درمیان روشن آسمان تھا۔ ایک موجودگی تھی۔ یعنی بھگوان! "بھگوان انسانوں کے درمیان جلوہ گر ہے"۔ میں نے اسے ہنری فرینک کی نظم کا یہ مصرع سنایا۔

"ہاں یہ ایشور ہی ہے"۔ اس نے سرگوشی میں کہا اور ہم مصروف راہ گزاروں کی خاموشی میں کھو گئے۔ لمحہ بھر کے بعد اس نے پھر سرگوشی میں کہا۔ "مجھے اپنے ساتھ لے چلو، میرے پریتم!"

"تم چلوگی میرے ساتھ ساوتری!"
"میرے پریتم مجھے کہیں بھی لے چلو"
"آؤ" میں کہا "اس لمحے میں، ابھی"
"نہیں، میں نہیں چل سکتی، مجھے لوٹ جانا چاہیے۔ مجھے پرتاپ کے پاس لوٹ جانا چاہیے"
میں نے پیار سے اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ "چلو میں تمہیں لے چلوں" میں نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔
"بھگوان کے پاس" وہ بولی اور میری گود میں گر پڑی۔ میں نے اس کے ہونٹوں کو ایسے چھوا جیسے وہ روشنی، شہد اور کویتا کے گیت شبدوں کے بیچ کی وسعتوں سے بنے ہوئے تھے۔ میرے لیے لندن ایک شہر نہیں تھا۔ یہ نفس نفیس میں تھا۔ دنیا اب میرے لیے محض خلا یا آکاش نہیں تھی۔ وقت کا ایک لمحہ تھا۔ اور یہ ابھی تھا۔
باربی روبی میں میں نے کیانٹی کا آرڈر دیا اور یہ لفظ یوں زبان سے ادا کیے جیسے ان کا کوئی مفہوم تھا۔ "اور اب تمہیں اطالوی زبان سیکھنی چاہیے"
تمہیں اطالوی زبان سیکھنی چاہیے کیونکہ اس زبان میں بھگوان کی ساخت اس کی بناوٹ موجود ہے۔ بھگوان امیر اور مالدار ہے اور ٹسکن ہے اور آرنو پر ایک پل ہے جو باراتوں کے لیے بنایا گیا ہے۔
"الہ آباد میں بھی ایسا ہی ہے۔ اس نے کسی حد تک افسردہ دلی سے اضافہ کیا۔" اور مناسب طور پر اس کو ہنٹر برج کے نام سے پکارا جاتا ہے"
"کیا میں فوق البشر کے بارے میں اپنی گفتگو جاری رکھوں" میں نے التجا کی۔
"کیا خوب ہے یہ کیانٹی! احیاتیاتی احساس تمازت چونکہ مجھے دوبارہ حاصل ہو گئی ہے" وہ اپنا گلاس ہوا میں لہراتے ہوئے بولی۔ "اس لیے اب میں فکر کی پیچیدگی کو سمجھ سکتی ہوں۔ مجھے تاریخ کے بیچ میں آپ کے ساتھ شطرنج کھیلنا اچھا لگتا ہے!"
"وزیر فوق البشر ہے" میں نے بات شروع کرتے ہوئے کہا۔
"اور بادشاہ"

" رِشی ۔ ویدانتی جو ثنویت سے ماوراہے ثنویت اور غیر ثنویت کے توسّط سے اپنے آپ ہی میں براجمان ہے ۔"

کیا نٹی کے بعد یہ بہت مشکل ہے ۔ میں چاہتی ہوں رام ! کیا اب میں اس طرح پکار سکتی ہوں ؟ میں چاہتی ہوں تم مجھے کوئی گیت گا کر سناؤ اور میں تمہاری آغوش میں لیٹ جاؤں ۔ بہت دور جہاں نہ زمین ہو نہ سڑک ، نہ کوئی ندی نہ لوگ ۔ نہ باپ ، نہ منگیتر ، نہ زردوزی ، نہ محل نہ ہاتھی ۔ شاید صرف ماں ہوں ۔ اور کسی پربت پر ...."

" کیلاش پربت پر ۔"

" تم سمادھی لگا کر بیٹھو گے ۔"

" اور تم "

" میں پرارتھنا کروں گی کہ تم جاگ کر اپنی اس تیسری آنکھ سے جو تاریخ سے کھلواڑ کرتی ہے ، دنیا کو بھسم نہ کر ڈالو " وہ ہنسی ۔

" اور طوطے گائیں گے ، آم کے پتّے کومل ہوں گے اور صبح کی دھوپ میں تانبے کے رنگ کے ہوں گے ۔"

" اور میں تمہارے چاروں طرف تین بار ۔ ایک دو تین ۔ چکّر لگاؤں گی اور تمہارے خاکستر کے رنگ والے قدموں میں گر کر پرارتھنا کروں گی کہ سوامی مجھے اپنے اندر جذب کر لیں ۔ میں عورت ہوں " اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا " میں ایک ہند و عورت ۔"

" میرے تو گِر دھر گوپال
میرے گِر دھاری کرشن
اس کے سوا میرا کوئی سوامی نہیں ۔"

تواریخ ، اسٹالن اور فوق البشر سب غائب ہو چکے تھے ۔ تواریخ کا معمہ حل کرنے کی کوشش میں کسی داستانی ہیرو کی طرح مجھے میری دلہن مل گئی تھی ۔ بُدھ میکائے سے ایک شہزادی لیکن جیسے ہی میں نے سات بہنوں کی دنیا میں قدم رکھا وزیر اعظم کے بیٹے نے محل میں انقلاب برپا کر دیا ۔ دوسری چھ کو قید میں ڈال دیا ۔ ورہم دونوں کو

حراست میں لے لیا۔ ٹنٹاگل کا راجہ مارک اپنی اِسولٹ کے انتظار میں تھا۔ مجھے شہزادی کو اُسے سونپ دینا ہوگا لیکن گرین وال کا گھونٹ پینے کے بعد میں اسے جھرنوں کے پاس جنگلوں میں ملوں گا۔ اژدھے مجھے چیر پھاڑ کر رکھ دیں گے لیکن کسی روز ہم جنگل میں لیٹے ہوئے ہوں گے اور ہم دونوں کے بیچ تلوار ہوگی۔ کسی دن پیار اتنا طاقتور ہو جائے گا کہ چٹان کو چور چور کر کے رکھ دے گا اور ہم اپنی مرضی سے گھومنے کے لیے آزاد ہوں گے اور اگر ہمارا جی چاہے گا تو اپنے لیے ایک سلطنت بنالیں گے۔

"اور ہمارا ایک بچہ ہوگا" اس نے کہا اور ہنس پڑی۔ جیسے میرے من کی بات کو سمجھ گئی ہو۔

"دو"، میں نے اضافہ کیا۔ "ایک گنیش اور دوسرا کمار۔"

"اور ہم کوہستانی مہتاب کی چاندنی میں ہولی کے تیوہار پر ایک دوسرے پر رنگ پھینکیں گے۔ ہمارا ہندوستانی کام دیو پشپ بان سے وار کرتا ہے۔ اسے جلا کر بھسم کیوں کریں۔

"کیوں نہیں؟" میں نے پوچھا "جب کشش ختم ہو جاتی ہے تو تیسری آنکھ کھلتی ہے۔ مجھے امید ہے تم میری کشش نہیں محسوس کرتی ہو۔"

"اوہ، نہیں"، اگر میں کشش کی کشش محسوس کرتی تو حسین جیسا کوئی دوسرا اور نہیں تھا۔ وہ مغل مصوّری کے کسی مرد کا سا لگتا ہے۔ خوبصورت۔ ابرو کی لمبی قوس، پتلی کمر، لمبے کومل ملائم ہاتھ اور یہاں اندر"، وہ اپنے سر کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ "بالکل خالی۔ اس کا دل چاول کی کھیلوں سے بھرا ہوا۔ لچھے دار، سفید اور الگ الگ۔ مسلمان عورت کو خوش کرنا خوب جانتے ہیں۔" اس نے بڑی اداسی سے اپنی بات کو ختم کیا۔

"اور ہندو"

"ایک ہندو عورت جانتی ہے کہ اسے اپنے کرشن، اپنے سوامی کی پوجا ارادھنا کس طرح کرنی ہے۔ جب جمنا ندی پر چاندنی بکھر جاتی ہے اور گھروں میں چراغ روشن کر دیے جاتے ہیں۔ گایوں کا دودھ دُوہ لیا جاتا ہے تو برندابن میں جمنا ندی کے تٹ پر یشودھا نندن

راس رچاتا ہے۔ مویشی اپنی رسّیاں تڑا کر بھاگتے ہیں۔ ہرن جنگلوں سے نکل کر اُچھلتے کودتے پیڑوں کے جھنڈوں کی جانب آتے ہیں۔ مور اشوک کے پیڑ کی شاخوں پر بیٹھے ہوتے ہیں۔ یہی وہ وقت ہے جب کرشن سرخ دھرتی پر رقص کرتا ہے۔ کون گوپی ہوگی میرے سوامی جو اس جشنِ محبت میں شامل نہیں ہوگی۔ عورتیں اپنی شرم و حیا تج دیتی ہیں اور مرد اپنا غصّہ کیونکہ برندابن میں بھگوان کرشن نرتیہ لیلا کر رہے ہیں۔ ہم عورتیں، اس دعوت میں مدعو ہیں۔ آؤ۔"
اس نے اس انداز سے کہا جیسے یہ شدید جذبہ اس کی قوتِ برداشت سے باہر تھا۔

جیسے ہی ہم سڑکوں پر گھومتے ہوئے آگے نکلے۔ رنگ برنگی روشنیوں والی پکا ڈِلّی، ٹیوب تک پہنچنے کے راستوں اور بس کے منتظر لوگوں کی قطاروں نے حقیقت کا احساس کرایا۔ آخر میں مَیں اسے گاور اسٹریٹ سے پرے ایک عورتوں کے ہوسٹل میں لے گیا جہاں ہمیشہ اس کے لیے ایک کمرہ ریزرو رہتا تھا اور جہاں اس جیسی ہی "گول مٹول لیکن باتونی اور اس کا خیال رکھنے والی اس کی حیدرآباد کی سہیلی گوری اس کی دیکھ بھال کے لیے موجود تھی۔ مجھے ہمیشہ ساوتری کے کھو جانے کا ڈر لگا رہتا تھا۔ مسئلہ اس کا چشمہ یا قلم اس کو لاکر دینے کا نہیں تھا۔ بلکہ ہمیشہ یہ محسوس ہوتا تھا کہ ساوتری کو لاکر ساوتری کو لوٹانا ہے۔

"آہ! میں حقیقی ہوں"، اس نے احتجاج کرتے ہوئے کہا "کل ہی تم دیکھو گے کہ بس پکڑنے میں کتنی ہوشیار ہوں۔ میں ٹوٹنہم کورٹ پر ۱۴ نمبر کی بس پکڑوں گی اور ٹھیک دس بجے کے نِنگٹن پہنچ جاؤں گی" جب میں نے اسے چھوڑا تو اس نے وعدہ کرتے ہوئے کہا۔ میں جانتا تھا کہ دس بجے وہ گوری کے ساتھ کسی بلاوز کے ڈیزائن کے بارے میں! دہلی میں ہونے والی کسی کی شادی کی باتیں کر رہی ہوگی۔ میں یہ جانتا تھا کہ مجھے اس سے یہ پوچھنے کے لیے ٹیلی فون کرنا پڑے گا کہ اسے پتہ بھی ہے کیا وقت ہوگیا ہے "میں تم سے وعدہ کرتی ہوں تمہیں ٹیلی فون کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کل میں بگ بین' کی طرح وقت کی پابند رہوں گی"۔ ساوتری کے یہاں گمبھیر اور عام سطحی قسم کی باتیں ساتھ ساتھ چلتی تھیں۔

دروازے پر میں نے اس کا ہاتھ چھوا یہ جاننے کے لیے کہ میں اسے چھو سکتا تھا۔ اور یہ احساس اپنے ساتھ گھر تک لے گیا۔ یہ کسی خیال کو چھونے جیسی بات تھی۔ محض کسی پانی کے جگ کا، یا تکیے یا گھوڑے کا خیال نہیں۔ بلکہ کچھ ایسا خیال جو لپک کر اس لمحے میں نمودار ہوتا ہے۔ جب خیال اپنے آپ کو اس طرح روشن کر دیتا ہے جیسے دُم دار ستارہ اپنی دُم کو۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ دودھ کا، سچ کا، خوشی کا مادہ تھا جوہر تھا جو میرے اپنے روپ میں دکھائی دے رہا تھا

اگلے روز جب میں نہا دھو کر پوجا پاٹھ، دھیان دھارنا اور آرام بھی کر چکا۔ میں ململ کی دھوتی اور کرتا پہنے ہوئے تھا۔ تب بھی دس بجے یا دس بج کر بیس منٹ تک ساوتری کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد وہ جنوبی ہندوستان کی وہ ساڑھی پہنے ہوئے داخل ہوئی جسے ہم میسور میں آسمانی رنگ کی ساڑھی کہتے ہیں اس نے مور کے سے نیلے سنہرے رنگ کی چولی پہن رکھی تھی اور ماتھے پر قُم قُم کی بڑی سی بندی لگا رکھی تھی۔ وہ اپنے آپ سے ڈری ڈری سی لگ رہی تھی اور عقیدت اور تعظیم سے معمور تھی۔ جیسے ہی میں اسے چھونے کے لیے آگے بڑھا میں رک گیا۔ اس کی چال میں کچھ عجیب و غریب بات تھی۔

"میں پرارتھنا کر رہی تھی"

"کس سے"

"شِو سے" اس نے سرگوشی میں کہا۔ پھر اس نے اپنا بیگ کھولا اور اندر سے صندل کی ایک اگر بتی نکالی۔ اس کے اندر عالمانہ خاموشیوں سے وضع کیے ہوئے تھے۔

"مہربانی کر کے آپ میرے لیے جلا دیجیے" اس نے التجا کی۔

میں جب تک غسل خانے میں جا کر اگر بتی جلا کر لوٹا وہ پوجا ارچنا کی چیزیں اپنے اردگرد پھیلا چکی تھی۔ چاندی کی ایک چھوٹی سی دھوپ دانی میں کافور تھا۔ چاندی ہی کی قُم قُم کی ڈبیا تھی۔ اس کے پاس گلاب کے کچھ پھول بھی تھے: تازہ جن سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

"اس میں میرے لیے تھوڑا سا گنگا جل لاؤ"

میں نے اس کی چاندی کی پلیٹ میں تھوڑا سا سادہ پانی ڈال دیا۔ اس نے پانی میں قُم قُم ملایا۔

"کیا تم مجھے اجازت دو گے؟" اس نے پوچھا۔ "اس کی عورت کے اس کام کی؟"

"ارے نہیں"

"لیکن یہ تمہیں تھے جس نے مجھے بتایا تھا کہ گھر میں مرد عورت کا حکم بجالاتا ہے۔ یہی ہندو دھرم ہے"

"میں حکم بجالاتا ہوں" میں نے کہا۔

پھر وہ میرے سامنے جھک گئی۔ ایک ایک کر کے میرے سلیپر اور میرے موزے اُتارے اور انھیں بڑے آرام سے ایک طرف تھوڑی دور رکھ دیا۔ ہاتھ میں پھول اور قُم قُم لیا اور کوئی گیت بڑبڑاتے ہوئے میرے پیروں میں پوجا کے لیے یہ سب چڑھا دیا۔ اب اس نے کافور جلایا اور دھوپ دانی کو قُم قُم کے پانی کے بیچ رکھ کر اس نے جیوتی کو میرے چہرے کے سامنے آرتی کے مقصد سے ایک بار، دو بار، تین بار گھمایا۔ اس کے بعد اس نے جل سے میرے پیروں کو چھوا اور پھر پانی کو اپنے سر پر چھڑکا۔ دوبارہ دو زانو ہو کر اور اپنا سر میرے قدموں میں رکھ کر وہ دیر تک، بہت دیر تک اسی حالت میں رہی۔ اس کی سانس مدھم مدھم سسکیوں میں بدل گیا۔ اس کے بعد اس نے آہستہ سے اپنے آپ کو اُوپر اُٹھایا۔ ڈبیا سے قُم قُم لے کر میں نے اس کے ماتھے پر اس کی مانگ میں اس کے سینے پر لگایا جہاں پریم واس کرتا ہے۔ میں اس سے زیادہ اسے نہیں چھو سکا اور نہ ہی وہ مجھے چھو سکی۔ اور کچھ لمحوں کے لیے ہم عالم تنہائی میں کھڑے رہے۔ تب اچانک مجھے اپنی ماں کے بچھوے یاد آئے۔

"تم جہاں ہو، لمحہ بھر کے لیے وہیں رُک جاؤ" میں نے التجا کی۔

"میں کہیں نہیں جا سکتی" اس نے جواب دیا "میں تمہاری ہوں"

"دھیرے دھیرے جیسے میں کسی مندر کے گلیاروں میں کھو گیا تھا میں نے اپنے

کمرے میں اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد اپنا ٹرنک کھولا چیزوں کو ڈھانپنے کے لیے ان پر پھیلایا گیا اخبار اٹھایا۔ پھر ناریل، سپاری اور قُم قُم۔ یہ سب چیزیں نکالیں جو چھوٹی ماں نے اپنی بہو کے لیے لے کر رکھی تھیں۔ "میں بھی آج کی صبح کے لیے تیار ہو کر آیا تھا۔" میں نے کہا۔

"سچ!" وہ مسکرائی کیونکہ اسے میری کسی بات سے تعجب نہیں ہوتا تھا۔

"ہاں! لیکن یہ سب تیاری بہت عرصہ پہلے کر لی گئی تھی۔ بہت بہت پہلے ساوتری۔ ایک جنم نہیں، دس جنم نہیں بلکہ جنم جنمانتر پہلے۔"

"ہاں!" وہ بولی۔ جو کیمبرج کی یہ انڈر گریجویٹ جو جپسی کی طرح دُھواں اُگلتی اور وحشیانہ جاز کی دُھن پر ناچتی ہے۔ تمہارے رو برو اقرار کرتی ہے: میں اپنے سوامی کو ہزار جنموں سے جانتی ہوں۔ جنم جنمانتر سے اپنے کرشن کو جانتی ہوں..."

اور سوامی اپنے آپ کو اس لیے جانتا ہے کیونکہ رادھا ہے ورنہ وہ ہمالیہ پربت پر بیٹھا تپسیا کر رہا ہوتا۔ جمنا ندی بہتی ہے اور اس کے نکٹ پر مور کے پنکھ ہیں کیونکہ رادھا کی مسکان لتاؤں اور یکشنیوں کو موہ لیتی ہے، ان پر جادو کر دیتی ہے رادھا سانجھے سمے کا سنگیت ہے۔ سرخ دھرتی کی رات کے معنی و مفہوم کی نغمگی ہے۔ اور یہ سب میری پیاری، میری پتنی!" میں نے سرگوشی میں کہا۔ "میرے گھر سے ہے۔ یہ ناریل۔ یہ سپاری ہے، یہ قُم قُم ہے، یہ بچھوے جو میری ماں پہنتی تھی اور میری پتنی کے لیے چھوڑ گئی تھی۔" میں نے دھیرے دھیرے اسے اپنے گھر کا قُم قُم لگایا۔ ناریل اور سپاری بھینٹ کی، گول گول، آٹھ مبارک سپاریاں تھیں۔ "اور اب میں تمہارے پاؤں میں بچھوے پہناؤں گا۔"

"کبھی نہیں" اس نے غصّے سے کہا "بھلے ہی تم برہمن ہو۔ میں جانتی ہوں لیکن کیا تم نے کبھی ایسی ہندو عورت کے بارے میں سُنا ہے جس نے اپنے سوامی کو اپنے پیر چھونے کی اجازت دی ہو؟"

"کیسی بیوقوف عورت ہو تم!" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"صرف اسی بات سے تم ثابت کرتی ہو کہ تم سب کو راجہ، رانی، کسان اور بیوپاری کو

شگنشا دینے کے لیے برہمن کیوں ضروری ہے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ بیاہ کرنے کے بعد پتی پتنی دونوں الوہیت (یعنی دیوتیو) اختیار کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو بیاہ شادی میں شادی شدہ مرد عورت گرو اور صرف گرو کے چرنوں میں ہی گر کر پرنام کر سکتے ہیں۔ کیونکہ گرو کا درجہ بھگوان سے بھی اونچا ہے۔ اس لیے اب میں تمہارے پیروں میں بچھوے پہنا سکتا ہوں۔"

اتنے سارے دھرم گیان نے اسے پریشان بھی کر دیا اور اسے یقین بھی دلا دیا اور اس نے دونوں پیروں کی دوسری انگلی میں ایک دائیں اور دوسری بائیں کی۔ مجھے بچھوے پہنانے کی اجازت دے دی۔ بچھوؤں کے چھوٹے چھوٹے گھنگھرو تیزی سے حرکت میں آئے اور گنگنا اٹھے۔ مجھے ساوتری کے پاؤں چھو کر خوشی ہوئی۔

بچھوے ٹھیک ساوتری کے پیروں کی انگلیوں کے ناپ کے تھے۔ چھوٹی ماں کی بات صحیح تھی۔ میڈلین کے لیے یہ بہت بڑے ہوتے۔

ساوتری میرے بستر پر بیٹھ گئی۔ اور جیسے ہی وہ میرا کا بھجن گانے لگی دھوپ جو ایک مبارک موجودگی کا روپ اختیار کر گئی تھی اس کے شفاف راجپوتی چہرے پر پھیل گئی۔

جوگی مت جا۔ جوگی مت جا
جوگی مت جا۔ جوگی مت جا
میرے لیے چتا سجا اور جب میں جل جاؤں
میری بھسم اپنے ماتھے پر لگا لینا
جوگی مت جا۔ جوگی مت جا

نو بجے تک ہم وکٹوریہ پہنچ گئے۔ ہم بیک وقت اس قدر خوش تھے اور اس قدر اداس جیسے نہ تو ہمیں ایک دوسرے سے کوئی الگ کر سکتا تھا اور نہ ہی دوبارہ ہمارا بیاہ کر سکتا تھا۔ ہمیں احساس ہوا ہماری شادی آج کی صبح نہیں ہوئی تھی ہم تو ہمیشہ ہمیشہ سے بیاہ کے بندھن میں بندھے ہوئے تھے ورنہ ہم ایک دوسرے کے سکوت مکمل علم ایک دوسرے کی مکمل پہچان کو کیسے سمجھ سکتے؟

"میرے پیارے، میرے پیارے، میرے پیارے، میرے پیارے۔" یہ الفاظ وہ اس طرح دہرانے لگی جیسے کوئی منتر ہو۔ "میرے پیارے، میرے سوامی!"

"اور اٹلی؟ آرنو پر پل اور بچّہ؟" میں نے پوچھا۔

اس نے ٹرین کی کھڑکی سے اپنا سر باہر نکال لیا اور میں نے پہلی بار دیکھا کہ آنسوؤں نے اس کی آنکھوں کا کاجل اس کے رخساروں اور چہرے پر پھیلا دیا تھا۔

"میں تمہارے ساتھ ایک وعدہ کرتی ہوں" وہ بولی۔

"میری شہزادی۔ وہ کیا ہے؟" میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"پاروتی کہتی ہے کہ وہ اپنے شو کے پاس اس وقت آئے گی جب شو اس قدر دھیان مگن ہوں گے کہ اگر انھوں نے اپنی آنکھیں کھول دیں تو تینوں لوک بھسم ہو جائیں گے۔"

"مطلب؟" میں اس قدر ڈر گیا کہ میری آواز گڈ مڈ اور کھوکھلی ہو گئی۔

"میں تمہارے پاس اس وقت آؤں گی جب تمہیں میری ضرورت نہیں ہو گی جب تم میرے بغیر رہ سکو گے۔ میرے جوگی!" میں اس کا مکمل مفہوم، اس کی پوری حقیقت جانتا تھا۔ سادوتری سرگوشی میں بھی، یہاں تک کہ مذاق کے طور پر بھی سچ اور پورے سچ کے علاوہ کبھی کچھ بول ہی نہیں سکتی تھی لیکن یہ ہمیشہ ایک پوتر پاٹھ کی طرح ہوتا تھا ایک پر اسرار رمزیہ بات کی طرح جس کے شعور کی مختلف سطحوں پر مختلف معنی ہوتے ہیں۔

"میں اس بات کو سمجھ رہا ہوں اور اسے قبول کرتا ہوں" میں نے واضح صاف اور یقینی طور پر ناف کی گہرائی سے اٹھتی ہوئی آواز میں کہا۔ میں آج بھی اپنے آپ کو یہ کہتے ہوئے سن سکتا ہوں۔

"اٹلی ہے" اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "جب شو ہم شو ہم سچ ہے۔"

"اس دوران میں؟"

اس دوران میں الہ آباد چلی جاؤں گی اور مسز پرتاپ سنگھ بن جاؤں گی۔

"اور نئے گورنر کا گھر چلاؤں گی" میں نے اپنی جانکاری اور اپنا درد چھپانے کے لیے

اضافہ کرتے ہوئے کہا کیونکہ اب تک پرتاپ کسی ہندوستانی صوبے کے عالی جناب گورنر کا پرائیویٹ سیکرٹری بن چکا تھا۔" محل اور گورنمنٹ ہاؤس۔ برابر بھی اور مخالف بھی" میں نے ہنس کر کہا۔

"اور یہ عالم و فاضل تاریخ دان کیا کرے گا؟" اس نے پوچھا۔

"کیتھاروں کی تاریخ مکمل کرے گا۔ اور پھر خوب شادی شدہ اور دوبار شادی شدہ یہ شخص کسی ہندوستانی یونیورسٹی میں قرونِ وسطیٰ کی پوری تاریخ کا پروفیسر بن جائے گا۔ ہندوستان بہت بڑا ہے اور رنگا رنگ ہے۔" میں نے دلیل سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"میں ہمیشہ اچھی طالب علم رہوں گی" اس نے مذاق میں کہا۔ ٹرین نے سیٹی دی اور اسے لے کر چل پڑی۔

میں نے ٹیکسی لی اور واپس شٹنگ یا بنچ آف گریپس پہنچ گیا۔ اب مجھے ٹھیک سے یاد نہیں ہے۔ اور وہاں میں نے تجریدی آرٹ کی باتیں کرنے والے ایک خوش شکل داڑھی والے مصوّر کی شراب کا بل ادا کیا۔ اگر کوئی شخص خود پوتّر ہوتا ہے تو شراب خانہ بھی پوتّر ہو جاتا ہے۔

میرا خیال ہے مقدر نفسیاتی گانٹھوں کے ایک سلسلے کے علاوہ کچھ نہیں جو ہم اپنے خدشوں
کے ساتھ باندھ لیتے ہیں۔ 'ستارے' صرف ایسی کوششیں ہیں جو غیر یقینی بنا دی گئی ہیں، عمل پیرا
ہونے کا، اس لیے مطلب ہے اپنے لیے ممنوع قرار دیا جانا۔ آزادی کا مفہوم ہے اپنے آپ
کا کچھ بھی باہر نہ رہنے دیا جائے۔ کسی واقعہ کا مکمل پن دیدۂ حیات ہے اور ابدیت
'میں'! ابدیت سے کبھی فرار ممکن نہیں ہے کیونکہ 'میں' سے کبھی فرار ممکن نہیں ہے۔ جب
آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ کر سکتے ہیں تو یہ 'میں' ہوتا ہے جو یہ بات کہتا ہے۔ کیا 'میں'
کوئی بات کہہ سکتا ہے؟ نہیں 'میں' نہیں کہہ سکتا اور نہ ہی ابدیت کو حدود وقت میں
دیکھا جا سکتا ہے۔ وقت کا خود کو دیکھنا ہی ابدیت ہے ٹھیک اسی طرح جیسے لہر کا اپنے
آپ کو دیکھنا پانی ہے۔ اس دوران میں ہوائیں اوپر اٹھتی ہیں اور تیز دائی چلتی ہے
اور ننھی منی موجوں کے سفید گالے لہراتے ہوئے اٹھتے ہیں، ٹکراتے ہیں اور منظاہرہ
کرتے ہیں۔ پانی میں جھال پر جھال اٹھتی ہے اور دستے جلوس کی شکل میں ساحل
تک پہنچ جاتے ہیں۔ وہ ننھی منی موج ہو یا پانی کی جھال بنا ہے جھاگ کے باعث
وہ کیسے ہی ہانپ رہی ہو زندگی نہیں ہے۔ پانی ہی زندگی کا مفہوم ہے بلکہ زندگی کا
مفہوم ہے 'لیلا' یعنی 'کھیل'۔

یہ کار نمایاں نہیں بلکہ خود شناسی ہے جو خالص اہمیت کی حامل ہے۔ عمل کے
خارج بین شریک کاروں کو بہرحال ترک جانا چاہیے۔ صرف اسی صورت میں ہم اپنے
تحفظ اور قطعِ امید کی اپنی صورتِ حال تک پھلانگ کر پہنچ جاتے ہیں۔ اس طرح تمام
گانٹھیں کھل جاتی ہیں اور بے کوشش سمندر بحرہ روم کی طرح پُرسکون ہو جاتا ہے۔

سفرِ دروں ہی سچا جنم ہے۔ وہی سچا برہم ہے جو جھال کا کلغی کا رخ اندر کی طرف
موڑ دیتا ہے۔ بھلے ہی آپ جگن ناتھ بھٹ کے پائے کے بڑے پنڈت ہوں یا کپیل اچاریہ کے

درجے کے ماہر منطق ہوں، سچی زندگی، سچی برہمنیت کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب دوام کے تعلق سے اپنے آپ کو پہچان لیتے ہیں۔ کسی نہ کسی مقام پر آپ کو بہر حال زندگی کو روک کر اس کے اندر جھانکنے کی ضرورت ہے۔ شادی بیاہ، زچگی، درد یا کامیابی کی قربت پیار۔ ممکن ہے یہ سب آپ کو اپنے آپ میں ڈبو دیں۔ اور جوں جوں آپ اپنے اندر کی گنگا میں یہ گنگناتے ہوئے ڈوبتے ابھرتے رہیں گے۔ آپ اپنی گتھیاں سلجھا لیں گے۔

کاشی کشیتر م شریرم

تربھون، جننی، دیاپنی، گیان گنگا

میری کایا، پاون ستھلی، وارانسی ہے

میرے اندر گیان کی طرح پھیلی ہوئی ہے گنگا

تینوں لوکوں کی ماں!

اسی کارن بنارس پوتر ہے اور گنگا میا پاپوں سے مکتی دلانے والی۔ یہ سوچنا پاپ ہے، عمل کرتے ہوئے یہ سوچنا کہ تم کردار ہو پاپ ہے۔ آزادی اس بات کو ماننے میں ہے کہ تم کسی بھی عمل کے نہ تو کرنے والے ہو سکتے ہو اور نہ ہی اس سے آنند حاصل کرنے والے۔ ایسے جیون کی گنگا میں مقدر تحلیل ہو جاتا ہے اور تم بہتے ہوئے اپنے ساگر سے جا ملتے ہو...

کشتی چڑ پڑ کرتی۔ شور مچاتی انگلش چینل سے گزر رہی تھی۔ آکاش کی نیلاہٹ موجوں کی جھالوں سے لے کر کنارے تک پھیلی ہوئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا۔ یہاں اس طرف انگلستان کی اپنے آپ میں الگ مقدس سلطنت ہے۔ اور دوسری طرف سبز پانیوں اور موجوں سے پرے مضطرب متصادم انسانوں کا وسیع سمندر ہے۔ انقلاب کا فرانس، انسانی حقوق کا فرانس، غلامی کے علاوہ رومانی دھماکہ۔ ذات پات اور اعتراف کا الجھاو۔ فرانس جہاں بھگوان چورا ہے پر بیٹھا، آگ پر ہاتھ تاپ رہا ہے۔

ہے پربھو! میں تمہارے بھگتوں کے ذریعے تمہاری رسموں میں

شامل کیے جانے پر فخر محسوس کرتا ہوں؛

جب میں ڈیک پر بیٹھا ہوا تھا۔ میرے سر کے اوپر بحری بگلے محوِ پرواز تھے اور ہوا کی نمکین مہک میرے پھیپھڑوں کو گہرائی عطا کر رہی تھی۔ میں نے جان بوجھ کر آہستہ آہستہ اپنی چٹھیوں کو ایک ایک کر کے کھولا۔ میری ڈاک کلک کے دفتر میں آتی تھی اور میں برکلے اسٹریٹ کلک کے دفتر میں چھ دن سے جا نہیں سکا تھا اس لیے میں نے اپنی ساری ڈاک گاڑی پکڑنے کے لیے اِدھر آتے ہوئے آج ہی وہاں سے اٹھائی تھی۔ اس صبح جب میری ٹیکسی پکاڈلی کے لیے اِدھر سے نکلی تو گرین پارک بڑا خوبصورت لگ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنے آپ سے کیے گئے اپنے ہی کسی تخیلی سمجھوتے میں کھوئی ہوئی ہے۔ اور کچھ اس انداز سے وسعتیں ندیاں اور محل سامنے لا رہی تھی جیسے ہمیشہ سے انگلستان کا کوئی ہتھیلی بھر علاقہ ایسا تھا جو میرا تھا، میرا اپنا، میرے نام لگا، ریلنگ والا اور پوتّر، مقدّس۔ وہ شخص جس کے پاس انگلستان میں رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ باغیچہ نہیں ہے۔ اسے آج تک وہاں کی برادری میں اس کے تیوہاروں میں شامل نہیں کیا جاتا۔ انگلستان کے لہلہاتے زندہ پیڑوں میں ڈروئڈ لوگ اپنے خاموش محیط کی کچھ خصوصیات چھوڑ گئے ہیں۔

چار چٹھیاں تھیں۔ میں اپنے آپ میں اس قدر آزاد محسوس کر رہا تھا کہ مجھے محسوس ہوا کہ میں پاؤں پاؤں چل کر سمندر تک پہنچ سکتا ہوں، پانیوں کے اوپر سے پھلانگ سکتا ہوں یا اڑ کر آسمان کی محراب کے پار جا سکتا ہوں یا سنگیت کی لَے کی طرح شفاف اور پاک ہو سکتا ہوں۔ دنیا میں کہیں کچھ بھی ہوتا رہے میں اس سے بے خبر تھا۔ میرا کیا واسطہ تھا۔ میں اپنے مائل مرکز وجود میں سچا اور قائم و برقرار تھا۔

پہلا خط جو میں نے کھولا سروجا کا تھا۔ اداسی بھرا تھا اور صاف لفظوں میں تھا۔ اس نے ان محرومیوں ناکامیوں کے بارے میں لکھا تھا جن کا سامنا اسے ہر روز کرنا پڑتا تھا۔ میڈیکل کالج نے اسے داخلہ دینے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ آخری مرحلے پر یونیورسٹی کو پتہ چلا کہ وہ برہمن تھی۔ اور پھر ان ہزاروں، لاکھوں ناخوشگواریوں میں سے کچھ ایک کا ذکر تھا جو اس ماں کے ساتھ رہنے میں پیدا ہو جاتی ہیں جو اپنی نہ ہو اور ہر عورت کی زندگی میں محل ہو سکتی ہیں۔ اسے مسخ کر سکتی ہیں اور بالآخر اس پر مسلّط ہو سکتی ہیں۔" میں صبح و

شام بستر پر پڑی اپنے باپ کے بارے میں سوچتی رہتی ہوں جو اب زندہ نہیں ہے اور اس پیارے بھائی کے متعلق جو دور بہت دور ہے۔ میں زندگی کی جنگ اکیلے نہیں لڑ سکتی میرے پیارے بھائی۔ اور نہ ہی میں تمہاری طرح سخت ہوں۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں شادی کر لوں گی۔ وہ مرد جو میں نے اپنے لیے چنا ہے ویسا نہیں ہے جیسا تم میرے لیے چنتے۔ وہ بڑا اچھا آدمی ہے۔ بڑا فراخدل، پُرخلوص اور قابل لیکن وہ قطعی طور پر میرے لیے بنا ہی نہیں ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ اگر میں کنڑا بولوں تو وہ نیپالی بولے گا۔ یا اگر وہ گولف کھیلے تو میں شطرنج کھیلوں گی لیکن اس کی آمدنی اچھی ہے۔ وہ وفادار اور مخلص رہے گا کیونکہ وہ کہتا ہے کہ وہ مجھ سے اس وقت سے بیاہ کرنے کی آرزو رکھتا ہے جب میں پانچ سال کی بچّی تھی۔ میرے بھائی! مجھے اشیرواد دو۔"

تو بمبئی کے سمندر کے ساحل پر چھوٹی ماں کے ساتھ وعدہ کرنے کے بعد میں نے اپنی ذمہ داری اس طرح نبھائی تھی!

ہندوستان سے آئے ہوئے دوسرے دو خط کاروباری کاغذات تھے جن پر میرے دستخط درکار تھے۔ کچھ کا تعلق تو پتاجی کے انشورنس کے پیسوں سے تھا۔ کچھ اس جائداد کے کاغذات تھے جو میں اپنی چھوٹی ماں کے نام منتقل کر رہا تھا۔ کچھ پتاجی کی کار اور مکان کی ملکیت کی تبدیلی کے بارے میں تھے۔ میں چونکہ سکماری کا گارڈین بھی تھا اس لیے اسکول میں اس کے کام کی رفتار کے بارے میں مجھے سہ ماہی رپورٹ بھیجی گئی۔ اس بعد دوپہر میں چاہے جتنا بھی چاہتا کہ میں سارا آسمان اپنا بنا لوں اور اپنے نتھنوں میں سمندر کی سی آزادی بسالوں مجھے بہرحال یاد دلایا گیا تھا کہ میں ایک بھائی ہوں۔ ایک بیٹا ہوں اور گھر کا واحد کرتا دھرتا ہوں۔

لیکن میڈلین کا خط جو میں نے ان گانٹھوں کے کارن سب سے آخر میں کھولا جو میرے اندر خوف نے باندھ رکھی تھیں بڑا کھلا آزاد اور گہری اداسی بھرا تھا۔ اس کے ساتھ بھی کچھ ہوا تھا۔ اس نے لکھا کہ میری غیر موجودگی میں ہاتھی اسے ہمیشہ ہر بات بتاتا ہے۔ اس کے انداز میں پُرسکون ناامیدی تھی۔ پہلے جیسا کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ میرے حلق میں دکھ کی پھانس

اٹک کر رہ گئی۔ میڈلین۔ او میڈلین۔ اس نے لکھا تھا" میں تم سے کچھ بھی تو نہیں مانگ سکتی کیونکہ تم کہتے ہو کہ مانگنے کی سطح وہ ہوتی ہے جہاں کبھی کچھ حاصل ہو ہی نہیں سکتا۔ کون مانگتا ہے اور کس کو ملتا ہے ؟ تم اور میں جانتی ہوں تم وہاں ہو۔ تم نہیں ہو لیکن میں پھر بھی جانتی ہوں کہ تم ہو۔ میں تمہیں کھو دیتی ہوں۔ میں جانتی ہوں میں تمہیں کھو دوں گی۔ اور میں تمہارے سوا جا بھی سکتی ہوں کہاں ؟"

بولون کریہہ المنظر لگ رہا تھا ۔۔ اپنی چمنیوں، ان ڈھلے گھروں، چھوٹی سرایوں اور بے ڈھنگی بارش کے باعث۔ گاڑی میں میں نے گرم کافی پی کر اپنے جسم کو گرمی پہنچائی اور رات نے حرکت اور اکیلے پن کی چادر مجھ پر ڈال دی۔ دُکھ میں کوئی چیز معاون نہیں ثابت ہوتی جتنی کرنے یا تال پر رقصاں چکر کا متوازن گھماؤ یا انجن کی آواز۔ اختیار کی گئی صورت حال کے انہدام سے سکون ملتا ہے۔ آپ نیندیں کھو سکتے ہیں اور پیرس پہنچ کر بیدار رہو سکتے ہیں۔

پیرس جو غیر دلچسپ ہے۔ خالی ہے۔ اور ایفل ٹاور کے ساتھ لمبائی میں پھیلا ہوا ہے میرا ہوٹل ایوی نیو میکموہن میں تھا۔ اس طرح کا پرانا فرنیچر، پرائیویٹ کمرے، پینسل دار الماریاں اور لوئی پندرھویں کے زمانے کی کرسیاں سب کسی دوسری دنیا سے آئی لگتی تھیں۔ میں نے سوچا اگر میں ان کو چھوؤں گا تو جیتی جاگتی موت کو چھوؤں گا۔ پھر بھی میں کپڑے اتارے اور غسل کیا اور تب نیند نہ آنے کے باعث میں نے دوبارہ کپڑے پہن لیے شاں زے ایلزے میں گھومنے یہ سوچ کر نکل پڑا کہ کتابوں کی دکانیں کھلی ہوں گی لیکن کتابوں کے تعلق سے میں غلط علاقے میں تھا۔ چست درست۔ قد کاٹھ والی سرو قامت گول مٹول یا دُبلی پتلی لڑکیوں کو دیکھ کر ایسا لگا جیسے عورت کی پوترتا کے چیتھڑے اڑا دیئے گئے تھے۔ مجھ پر اداسی چھا گئی۔ کاش میں اس لڑکی کی مسکراہٹ کے جواب میں مسکرا سکتا ہے جو مجھے فُوکے کے باہر ملی تھی۔ اسے اپنے پہلو میں لٹا سکتا اور اس سے میٹھی میٹھی باتیں کر سکتا۔ میری پوترتا تو برقرار اور محفوظ تھی لیکن میرے دُکھ نے اس کو چھلنی کر کے رکھ دیا اور مجھے مطالبات میں مجتمع کر دیا۔

اپنی ہوس میں مرد ناقابلِ بیان انداز میں کمزور ہوتا ہے اور پیرس کی دوشیزہ کا دکھ

کسی نہ کسی طرح آپ کے اپنے دُکھ کو مفہوم عطا کر دیتا ہے۔ آپ کی اپنے آپ سے قربت ظاہر کرنے کے لیے، اور غالباً شاعری کی نوعیت عیاں کرنے کے لیے بھی۔ کیونکہ تمام عورتوں کی کوکھ میں شاعری نہاں ہے۔ اور یہ ہم ہی ہیں جو گوشت یا جسم کی اپنی سالمیت کی بازیافت پر مبنی خواہشات کی تسکین تلاش کرتے ہیں اور اس طرح اپنی آزادی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ شِو کی نگری بنارس میں داشتائیں، ویشیائیں گنگا ندی کو پسی ہوئی ہلدی اور سونا ارپن کرتی ہیں۔ ندی میں اشنان کرنے کے لیے غوطہ لگاتی ہیں اور جب پانی سے باہر آتی ہیں تو ان کی چھاتیاں بے قرار ہاتھوں کے لمس کے لیے تیار ہو جاتی ہیں اور ان کے جسم انگور کی بیل کی طرح کومل اور مائل ارتباط ہو جاتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر آپ اپنے آپ میں اُچھل پڑتے ہیں اس احساس کے ساتھ کہ گیان اپنے آپ وجود میں آیا ہے اور یہ کہ گیان کا گیان اتھاہ ہے۔ اس کا نام نہیں رکھا جا سکتا لیکن اس کے ہونٹوں پر تازہ کافور کی مہک ہے جو یوں بول اُٹھتی ہے: "میرے چاند، میرے جواہر، میرے گورو، میرے افتخار!"

ایسی مختلف قسم کی تہذیب کی (میں نے اپنے آپ سے کہا)۔ یہ کوئی بہت بڑی خوبی نہیں تھی کہ اس کے زیر سایہ ضرورت سے زیادہ گیان کے کارن کنوارا پن تلف ہو جاتا تھا اور عورت اُس پُراسرار گریزاں رازداری، دریوزہ گرانہ شرم و حیا کو جن سے وہ اپنے سچ کو چھپا لیتی ہے، تیاگ دینے کے بعد اپنے حقوق سے محروم ہو گئی تھی۔ عورت کو جاننا چاہیے نہ کہ اسے سمجھنا کیونکہ اگر آپ اس کو سمجھ جاتے ہیں تو آپ گیان مارگ کے یاتری نہیں رہتے۔ عورتیں، تمام عورتیں کوتا یعنی شاعری کی زبان میں بات کرتی ہیں۔ چاہے وہ مکانوں کا ذکر کر رہی ہوں یا ایلومینیم کے برتنوں کا، یا کسی بیمار بچے کے پوتڑے کا یا اوڈیلس کے ڈیوک کی بیوی کے گھر کے استقبالیہ کا۔ سب نام رکھنے کی بات ہے۔ چونکہ عورت بھلے ہی وہ ویشیا ہو، چیزوں کو نام دے سکتی ہے اس لیے ہم عورت کے متلاشی رہتے ہیں اور اسے اپنے پہلو میں لٹا لیتے ہیں۔ شاید ایک منٹ کے لیے اس سے پیار کرتے ہیں ایک وجدانی کیفیت، ایک احساس تکمیل، ایک تابانی میں ڈوب میں مرتے ہیں اور اپنے آپ میں بھی۔

میں اپنے ہوٹل تک اکیلا پیدل لوٹ آیا۔ میری خواہشات قدیم، بنیادی اور ناگزیر تھیں۔ پھر بھی میں برہمن تھا۔ پیرس کی وہ ویشیا ممکن ہے کوئی گمراہ عورت ہو۔ ایک بورژوا، اس لڑکی جیسی جس میں ایک بار کلیچی کے کیفے میں ملا تھا۔ جب میں نے شراب پلاکر اسے بے تکلف کر دیا تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ اطالوی تھی اور ایک ایسے معزز مرد کی معزز بیوی تھی جو اسے چھوڑ کر کسی بری عورت کے ساتھ چلا گیا تھا اس لیے وہ ایمانداری سے ایک معزز مرد سے دوسرے معزز مرد کے پاس پہنچتی گئی۔ اور پھر اسے پتہ بھی نہ چلا کہ کب بڑھتی ہوئی عمر نے اسے آدبوچ لیا ہے: "میں خوب اچھی طرح گھر کی دیکھ بھال کر سکتی ہوں۔ کپڑے دھو سکتی ہوں۔ جرابوں کی مرمت کر سکتی ہوں۔ مجھے صرف ایک فلیٹ اور کپڑے استری کرنے کی مشین چاہیے۔ آپ دیکھیں گے آپ کے کپڑے کیسے صاف ستھرے رہیں گے۔ میں فضول خرچ نہیں ہوں۔ میں کم خرچی کا دھیان رکھوں گی..." میں نے اسے کچھ پیسے دیئے۔ اس سے اس کے گھر کا پتہ لیا یہ دکھانے کے لیے کہ میں کس قدر سنجیدہ تھا۔ بلا شبہ میں اس سے ملنے کبھی نہیں گیا۔ مجھے کافور کی مہک اور اس کے انگوں پہ لگی ہلدی کی زردی درکار تھی۔

نہیں یہ سب غیر واضح اور احمقانہ تھا۔ شاں زے الزے کے پیرس میں ایک سرد رات کو ایک مسافر کے ذہن میں ابھرنے والے خیالات۔ کاش میں نے لیٹن کوارٹر کے کسی ہوٹل میں کمرہ لیا ہوتا جہاں سے بیں دے ماگو میں جاکر آرٹ کے نقّاد ہنری بادون سے مل سکتا تھا۔ وہ اپنی کتابیں اور اپنے مضامین ریو جیکب میں لکھتا تھا اور ٹھیک آدھی رات کو دے ماگو میں جانے کے لیے باہر نکلتا تھا۔ دبلا پتلا ویٹر جس کا نام ژاں تھا اس سے کہتا تھا "آداب! مسٹر ہنری حالانکہ ابھی فروری کا مہینہ چل رہا ہے لیکن موسم کیا عجیب ہے" اور چھوٹی چھوٹی مونچھوں والا وہاں کا مالک آکر کہتا۔ آداب مسٹر ہنری! کیا آپ نے اپنا آرڈر دے دیا ہے؟" "ہاں چاکلیٹ، تھوڑا گرم پانی اور بن" ژاں جواب میں کہتا۔ "میں بلا شبہ جانتا تھا" بھلا وہ نہیں جانے گا تو اور کون جانے گا؟

ہاں مجھے ہوٹل ایٹ لین ٹائٹد روئے دے سینن میں کمرہ لینا چاہیے تھا بہت بڑھیا رہتا۔ مجھے یکایک احساس ہوا کہ رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ساوتری اس وقت

یک سوچکی ہو گی ممکن ہے اس نے آنکھیں کھول رکھی ہوں اور اس کی آنکھوں کا کاجل اس کے آنسوؤں کے ساتھ اس کے رخساروں پر بہہ رہا ہو۔" انھیں رہنے دو" وہ کہے گی۔" کیونکہ جب میں انھیں دیکھتی ہوں مجھے پتہ چل جاتا ہے میں تمہارے لیے روئی ہوں "میں تمہیں ایک بڑی بھیانک بات بتاتی ہوں۔" جس صبح میں رخصت ہو رہا تھا اس نے مجھ سے ٹیلی فون پر کہا۔" تمہیں ایک بات بتاؤں رام، میں نے ایت وار سے لے کر اب تک منہ نہیں دھویا۔ میں نے اپنی عادت کے مطابق کھانا کھانے کے بعد کُلّا بھی نہیں کیا۔ ممکن ہے میرے منہ سے بدبو آرہی ہو لیکن تمہارے انگلستان سے جانے تک میں چاہتی ہوں کہ تمہاری خوشبو میرے منہ کو مہکاتی رہے، آخر میں ایک ہندو عورت ٹھہری۔ میرے سوامی!"

جی ہاں اسی صبح اس نے یہ سب مجھ سے کہا تھا۔ پھر بھی زمین سمندر اور جمع کیے گئے وقت کے کیسے فاصلے ہمارے درمیان حائل ہو گئے تھے۔ شاں نے ایلزے پر چلتی ہوئی کسی ویشیا کی ایک نگاہ تک میں ساوتری کی موجودگی کے لمس جیسا کچھ تھا۔ اس کی آواز، اسی کی چال، اسی کے انداز، اسی کی نسوانیت مرد کے لیے عورت بے نام ہوتی ہے وہ صاف ستھری ہو یا گندی۔ میں نے اپنے تمام تر خیالات ساوتری کو نذر کر دیئے۔ اپنا منہ صاف کیا اور بستر پر دراز ہو گیا اور خوب اچھی طرح سویا۔

اگلے کچھ روز میں نے اپنے آپ کو روے دے رشالیے اور سوربون کے درمیان مصروف رکھا۔ اپنے نوٹس کو ترتیب دینے میں، یہاں وہاں کچھ حوالے دیکھتے ہیں۔ آدی نونے کے پی اد بودل کے بارے میں دفونڈز ڈوٹ کی قومی لائبریری میں) یا بے زی لے کے کیتھیڈرل کو خوفناک طریقے سے نذر آتش کیے جانے کے کسی گمنام واقعہ کے بارے میں۔ مثال کے طور پر اس عورت کے بارے میں جس نے التجا کی تھی اسے نکل جانے دیا جائے کیونکہ وہ حاملہ تھی لیکن آبے دے رستو نے اُس سے یہ کہا تھا" اس طرح ایک اور لاندہبی مارا جائے گا" اور اسے واپس ڈھلوان راستے پر دھکیل دیا تھا۔

میں اپنے پروفیسر سے ملنے سوربون بھی گیا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو بڑے ملنسار میلے،

غلیظ، عالم، سنگدل، بے دم، نکتہ رس اور آفاقی ہوتے ہیں۔ میں پروفیسر روبیاں بے سے ای آنک کے ساتھ ہمیشہ خوش رہتا تھا کیونکہ انھیں تو ارتخ کی شعریت کا گہرا احساس تھا۔ ان کے نزدیک مابعد الطبعیات تہذیب کا ایک کھیل تھا۔ اور تاریخ کا فلسفہ جس تناسب سے اقوالِ محال وضع کرتا تھا اسی تناسب سے زیادہ باوقار ہو جاتا تھا۔ ان کا ایک خیال یہ بھی تھا کہ بودھیوں کی منی (جواہر) ہی مانی واد کا روپ اختیار کر گئی تھی۔ ایران سے گزرتے ہوئے اسے مزید تقویت حاصل ہو گئی تھی۔ اور یورپی بننے کے لیے اور تاریخ میں دوئی کا احساس قائم کرنے کے لیے مانی واد دور تک بلگاریہ میں سرایت کر گیا تھا۔ ان کا کہنا تھا " یہ خصوصیت یورپ کے لیے انوکھی ہے کیونکہ یورپ نسوانی ہے، اس کے برعکس ہندوستان میں ہیلن کی خاطر لڑنے کے لیے کوئی بھی میدان میں نہیں اترتا بلکہ رام نے اپنی وفادار بیوی سیتا کو اس لیے جنگل میں بھیج دیا تاکہ غیر شخصی بادشاہت پر کوئی کلنک نہ لگ جائے۔ اگر دھوبی کی پھیلائی ہوئی یہ من گھڑت بات سچی تھی کہ ایودھیا کی رانی سیتا چونکہ راکشس راون کی قید میں رہی تھی اس لیے اس کا باعصمت ہونا مشکوک ہو گیا تھا تو۔ یہ کلیہ بے تکا اور غیر منطقی تھا اگرچہ لوگ اس پر اعتبار کرنے لگے تھے۔ ان سب باتوں کے باوجود کیا کشتری رام کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ اپنی رانی کو بن میں بھیج دیتا۔ اس سے صرف ایک غیر شخصی مردانہ اصول کی تصدیق ہوتی ہے"۔ اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے پروفیسر روبیاں بے سے ای آنک نے مزید کہا " اور اس سلسلے میں تمہیں مشلے کی نوعِ انسان کی بائبل میں رامائن والا حصہ ضرور پڑھنا چاہیے۔ کیسی قوت اور شدت ہے، کیسا فنکارانہ اسلوب ہے اور کیسا بچگانہ پن ہے۔ لیکن یہ معاملہ انیسویں صدی کا تھا۔ وکٹر ہیوگو، لامارتین اور وہ سب! سب کچھ نسوانی تھا۔ تم نے دیکھا ہوگا۔ یہ سب خیالات انقلاب کی رومانیت کے باعث پیدا ہوئے تھے۔ انسانیت کے نام پر بندوق اور تلوار کے زور سے میرے ساتھ کام کرنے والے میرے ایک ہوشیار ساتھی کا کہنا ہے " اس طرح کی انسان دوستی ایک طرح کا مسخ کرنے کا عمل ہے"۔ بچگانہ طور پر احمقانہ! کیا تلوار اور نیزے سے بھی کبھی انسانیت کا سدھار ہوا ہے۔ یہ ٹھیک ویسے ہی ہے جیسے یہ تسلیم کر لینا کہ

مسٹر بنڈا کی دانشورانہ دعائے خاص نے کلرکوں میں انقلاب پیدا کر دیا ہو۔ یا پھر سارتر کی خفیف چکناہٹ ہمیں زیادہ فلسفیانہ بنا دے گی کیا سّتی پرودھوم نے ہمیں زیادہ شاعرانہ بنا دیا تھا؟

"میں کہتا ہوں یورپ خیالات و افکار کی منڈی ہے" انھوں نے اپنی بات جاری رکھی "ہم اپنا مال بیچتے ہیں، ہندوستان اور چین کی طرح نہیں جہاں آپ اپنے کاریگر اجداد یا اپنے برہمن گرو کے خاندان کا دو تین یا پانچ ہزار سال تک پتہ لگا سکتے ہیں۔ ہم اس عہد تک، عہد آہن میں تھے اور اس سے کچھ ہی وقت پہلے تک ہمارے اجداد ڈارڈان کے غاروں میں ارنے بھینسے کی تصویریں بنا رہے تھے۔ تمہارا مال اس لیے بک رہا ہے کیونکہ ہماری مصنوعات بالکل نئی ہیں، دورِ جدید کی ہیں اور تازہ ترین ہیں اور طبع زاد ہیں۔ میرے دوست یورپ فائیٹ اور ڈالیور کا بنا ہوا ہے۔ اپنے جسم کا پچھلا حصہ دکھاتے ہوئے اور اسے اکائی کہتے ہوئے لب نٹز کا بنا ہوا ہے۔ اور رنیاں اور تین کا بنا ہوا ہے جو تواریخ کی اپنی تھیوری ثابت کرنے کے لیے سیب کے کیمیاوی عناصر کا سہارا لیتے ہیں"۔

"مجھے خدشہ ہے یورپ کے سلسلے میں آپ کا رویّہ ضرورت سے زیادہ جارحانہ ہے" میں نے اپنے یورپ کے حق میں دخل دیتے ہوئے کہا لیکن وہ جب تاریخ کی رو میں اپنے گنگا کے انداز کے سفر پر نکل پڑتے تھے تو کسی کی نہیں سنتے تھے۔

"ہندوستان سے آنے والے تم پہلے شخص تھے جس نے اس بات کی طرف میری توجہ کرائی"، وہ کہتے گئے "کہ یہ اس وجہ سے نہیں تھا کہ عمارات بنانے کا تعمیراتی سامان بدل گیا تھا یا عیسائیت کے ہزاروں سال کے سفر کے بعد ہم چاہتے تھے کہ ہمارے ہر کیتھیڈرل میں زیادہ روشنی ہو کر رومینسک آرٹ فروغ حاصل کر کے گاتھک محراب کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ یا یہ کوئی ابے لارڈ، پیٹر ابے لارڈ، خصّی شہزادۂ فکر تھا جس نے کسی ٹگیہ وتکیہ یا ناگ ارجن کی طرح ہماری بدبودار مذہبی کونسلوں کی کھڑکیاں کھولیں اور مدرسیت قائم کی۔ (شاید۔ اور کیوں نہیں؟ ہیلائس کے کارن) اور روشنی مزید روشنی کے لیے آواز بلند کی۔ تم شاید اس سے بھی آگے بڑھ کر علم ارتقائے انسان کی مدد سے یہ ثابت کر سکو کہ ہیلائس اور ابے لارڈ کے مردہ اور

دفنائے ہوئے ناجائز بچے نے امتناع یا خلاقی سرداب بننے کے بعد اب لارڈ کے دل میں آرزوئے نور، آرزوئے وسعت، آرزوئے فراخدلی اور امیدِ حق پیدا کر دی۔

"اگر تم مجھ سے پوچھو کہ ویزے لے اور ناتر دام میں کیا فرق ہے تو میں کہوں گا کہ ایک دُکھ ہے، زمینی اور محیط ہے جبکہ دوسرا ہدیۂ پاک ہے۔ وہ خارج جو دورانِ ذات کی پرستش کرتا ہے۔ ہولی گریل کی پردگی ہے تاکہ روشنی آسمان کی وسعتوں میں پھیل جائے۔ تم نیس تورین شہیدوں کے نغمے کا بجا طور پر حوالہ دیتے ہو اور کہتے ہو "وہ لوگ سکھی ہیں وہ ملک شاداں و مسرور ہے جہاں تمہاری ہڈیاں خزانوں کے طور پر دفن ہیں۔ کیونکہ جب دھوپ ڈھل جائے گی تو تمہاری ہڈیوں کی روشنی چمک اٹھے گی" ہاں! تمہاری یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔

"لیکن ہمارے ایرے غیرے تاریخ دان یہ ثابت کریں گے کہ فلاں فلاں تاریخ کو کسی بوڑھے میونسپل کلرک نے اپنے کھاتے میں یہ اندراج کیا تھا۔ سی ار مرو تر نے سینس کے کیتھیڈرل کو دو اشرفیاں اس لیے دی تھیں کیونکہ اس کا باپ جہادِ ملّت میں شامل ہونے کے لیے گیا تھا اور لوٹ کر نہیں آیا؛ اس لیے اس کا پوتا گیوم دے مروتر دوسرے جہاد شامل ہو گیا اور لوٹتے ہوئے اپنے ساتھ قسطنطنیہ یا سیریا سے ایک نیا اسلوب لے کر آیا (تمہیں صرف لفظ 'شاید' کا اضافہ کرنا ہوگا اور خاتمہ نشان استفہام کے ساتھ کرنا ہوگا ورنہ تمہاری تھیوری کو کوئی علمی امتیاز حاصل نہیں ہوگا) ہا۔ہا۔ہا۔ہا۔

"تم بھی صحیح ہو میرے دوست۔ جب تم کہتے ہو کہ مذہبی جنگوں کے ہیرو اور ابے لارڈ سینٹ برنارڈ کے دشمن کلیسائی عہدے دار سینٹ ڈینس نے مضحک گاتھک برنالوں کی مذمت کی تو وہ اپنی حقیقت پسندی کا ثبوت دے رہا تھا۔ اشیا کو جوہر عطا کرنے کے عمل میں نظریۂ تصورات نے اشیا کی حقیقت کو ہی غارت کر دیا اور اس طرح پتھر اور انسان کو ہلکا پن دے دیا اور ناتر دام کے کیتھیڈرل کی گنبد نما چھت تیار کر دی۔ حقیقی بدعتی جیسا کہ چرچ اچھی طرح جانتا تھا ابے لارڈ تھا۔ وہ گال کا سقراط تھا ۔۔ لوگ اس کے بارے میں کہتے تھے۔ نہ کہ مانٹ سے گر سکا کوئی راہب۔ اسی لیے اسے خصّی کر دیا گیا۔ لیکن

جوں جوں کیتھارازم پھیلتا گیا۔ اور چرواہوں، سینٹ ڈومنک اور سموں دے موں فورٹ کی پاکبازی کے توسط سے ہماری ثقافت کا واقعتاً حصہ بن گیا، گاتھک تصور بھی اسی طرح پھیلتا گیا اور زندگیوں کو متوثر کرتا گیا یہاں تک کہ جب قسطنطنیہ کو شکست ہوئی تو ہمیں بدبودار، چمگادڑوں بھری رومنیسک کوٹھڑیوں میں نہیں بیٹھنا پڑا بلکہ ہمیں سکلوں میں پناہ مل گئی۔" پروفیسر روبیاں بے سے اسی آہنگ نے ریودے ایکل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

جدیدیت کا آغاز آپ کہہ سکتے ہیں۔ ابے لارڈ کے ساتھ ہوا اور غالباً ابے لارڈ مانویوں سے ناواقف نہیں تھا۔ ہم یقینی طور پر جانتے ہیں کہ اس نے نیس تورین ادعائیت کے بارے میں خوب اچھی طرح مطالعہ کر رکھا تھا لیکن ہمارے۔ عالم بیچارے یہ سوچتے ہیں ہمارے پاس چونکہ وائرلیس ہے، ہوائی جہاز ہے اس لیے ہم تاریخ کے بارے میں زیادہ جانتے بلکہ واقعتاً تاریخ ساز بھی ہیں۔ حالانکہ نہ تو ہم تاریخ ساز ہیں اور نہ ہی ابابیل موسم گل کی موجب ہے۔ طلبا اور تاجر تمام دنیا سے خیالات لے کر آئے اور ماضی میں چونکہ لوگ عقل و دانش کے بارے میں زیادہ سنجیدہ تھے اور چونکہ ان کے پاس نہ تو اخبارات تھے اور نہ ہی مسٹر دن سینٹ آوری ادل کی تقریریں اس لیے وہ اس بات کو جلدی سمجھ جاتے تھے وہ کانوں سے سنتے تھے نہ کہ اس بات کو جسے وہ پڑھتے تھے۔ کیا تم نے نہیں کہا ہندوستان میں 'استاد' یا گرو کا مطلب وہ شخص ہے 'جس سے ہم سنتے ہیں' وہ سچی تعلیم تھی۔ ذہانت کی سچی تربیت تھی۔ نہ کہ آج کی طرح گبرٹ لائبریری کی جانب جینیز کے بارے میں تازہ ترین تصنیف حاصل کرنے کے لیے دوڑنا۔ الفاظ ہمارے اندر زہر بھرتے ہیں ہم فرانسیسیوں کے اندر" انھوں نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا اور مجھے اس احساس کے ساتھ گھر بھیجا کہ روشنی میں ان کے لیے لایا تھا نہ کہ وہ میرے لیے۔

"کیا چاہتے ہو تم؟" انھوں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا جب وہ سال گزو کی جانب مڑے، "تمہارے پاس صدیوں کا خزانۂ دانش ہے۔ تم ہماری طرح وحشی نہیں ہو۔" انھیں پڑھانے کے لیے کلاس میں جانا تھا اس لیے انھوں نے مجھے ساتھ آنے سے منع کر دیا۔

"آج میں ہنری چہارم کے بارے میں بولوں گا۔ کیونکہ بہت جلد اس کی چوتھی برسی آنے والی ہے اور ہماری یونیورسٹی کا خیال ہے کہ ہر اچھے فرانسیسی کو اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ جاننا چاہیے۔ کہنے کو ہنری چہارم غیر نفیس، بہادر اور ذہنی طور پر الجھا ہوا تھا لیکن ہم اس کا موازنہ اکبر سے کرتے ہیں۔ الوداع میرے دوست خوب ڈٹ کر کام کرو۔ اپنی بیوی کو میرا سلام دینا۔ الوداع اور جب ایکس میں سورج طلوع ہو تو میرے لیے دعا کرنا۔" وہ ہنسے اپنے ہی پیروں پر گھوم گئے اور چلے گئے۔

ایسی والہانہ فراخدلی نے مجھے حیران و ششدر کر کے رکھ دیا۔ میں نے سوچا یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی کہ وسعتِ فکر کے باعث کیتھیڈرل تعمیر ہو گئے۔ روڈن صحیح تھا جب اس نے کہا تھا "ہمارے پاس بھلے ہی شیکسپیر نہیں ہے دانتے بھی نہیں ہے شاید لیکن ہم فرانسیسیوں کے پاس کیتھیڈرل ہیں۔"

کیتھیڈرل

ہم تمہیں اپنے کانپتے ہاتھوں سے تعمیر کرتے ہیں
ایک ٹکڑے کو دوسرے کے ساتھ جوڑ کر
لیکن کون مکمل کر سکتا ہے تمہیں؟
ہم تمہیں شام کے جھٹپٹے میں تنہا چھوڑ دیتے ہیں
اور تمہارا حسین و باوقار پیکر
شفق کی طرح دکھائی دیتا ہے۔
ہے پربھو! تم عظیم ہو۔

چچا چارلس ریویاں سے مجھ ملنے کے لیے آئے۔ وہ اپنے بھتیجے سے مل کر میرا جی خوش ہو گیا۔" انھوں نے کہا کچھ اس انداز سے جیسے اپنے آپ سے کہہ رہے ہوں۔ وہ ہمیشہ گار منیار ناس کے قریب کے بڑے ہوٹلوں میں سے کسی ایک میں ٹھہرا کرتے تھے اور اس بار وہ اپنی کار میں آئے تھے تاکہ ہم آسانی سے اِدھر اُدھر گھوم سکیں۔ وہ پیرس میں میرے ساتھ اس قدر خوش بچوں کی طرح بے پناہ خوش نظر آ رہے تھے جیسے میرا عمر میں ان سے چھوٹا ہونا ان پہ

کسی نئی اور تحیر انگیز چیز کا انکشاف کر دے گا۔ لیکن میں بھلا پیرس کے بارے میں کیا جانتا تھا؟

"کھانا کھانے کے لیے ہم پرِی گرُودِن چلیں گے" انھوں نے فیصلہ کیا۔ رات کو منمارت میں اور رات کو صبح تڑکے ہلاس میں" انھوں نے جونہی بات پوری کی میں نے ہاں کہہ دی۔ وہ لگاتار ہنس رہے تھے اور ہر چیز سے بہت خوش تھے۔

پیرس آنے پر تمہارے ساتھ ہونا ویسا ہی ہے۔ جیساکہ جب ہم فوج کی ملازمت کر رہے تھے اور اس شہر میں آتے تھے۔ یہ باتیں کہنے کی نہیں ہیں لیکن جنگ سے پہلے کی زندگی بہت اچھی تھی۔ میرے باپ نے مجھے کافی دولت دی تھی۔ میری ماں مر چکی تھی اور ان دنوں پورے فرانس میں ہم سب لوگ بڑے جذباتی ہو رہے تھے۔ ساری دنیا اکلوتے بیٹے کے قدموں پر تھی۔ نیک والدین نے یہ کہتے ہوئے سب کچھ دے دیا تھا۔ "یہ لو۔ یہ لو۔ یہ سب تمہارا ہے۔ ایک دن بوڑھے ہو جاؤ گے اور تب دوسری زیادہ سنجیدہ باتوں کے لیے وقت ہوگا۔ تم ابھی چھوٹے ہو اور پوئیں کارے دریے لید اور موریس بریز کے فرانس کو نہیں سمجھ سکتے۔ زندگی بڑی سادہ، خوشیوں بھری اور بھر پور تھی۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی جنگ ہوتی رہتی۔ کہیں بہت دُور۔ روسیوں کی طرح نہیں جو ہمارے دروازے پر ہی آ بیٹھے ہیں۔ پھر بھی قیصر کے ایک بار کھانسنے یا چھینکنے سے ہی ہم سب بیرکوں میں لوٹ آتے تھے۔

"ہمیں بیرکوں کی زندگی پسند تھی۔ اس نے ہمیں وطن پرست اور ایک دوسرے کا ساتھی بنا دیا تھا۔ ہم بڑے جذباتی انداز میں اپنی ماؤں اور بہنوں کی بات کرتے تھے اور دس میں سے نو موقعوں پر اپنے کسی کامریڈ کی بہن سے ہی شادی کرتے تھے۔ ہمارا ایک دوست اپنے کسی دوست کے کنٹری ہاؤس میں اس سے ملنے گیا۔ شیمپین پی اور سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی کے بارے میں اتنا کچھ جان لیا کہ اسے محسوس ہونے لگا۔ کوئی دوسری لڑکی، شریک حیات کے طور پر اس لڑکی سے بہتر ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لیے اس نے لڑکی کے باپ کے سامنے شادی کی تجویز پیش کر دی۔ باپ ہمیشہ مان جاتا تھا کیونکہ رضامندی کی توقع کے بغیر کوئی شخص شادی کی تجویز رکھتا ہی نہیں تھا۔ ہم لوگ عام طور پر وردی

ہیں ہوتے تھے۔ اور وردی میں ہم ممتاز لگتے تھے۔ تب ہم ایک نائٹ کلب سے دوسرے نائٹ کلب میں موج مستی کے لیے جاتے کیونکہ شادی بیاہ کا معاملہ بڑا سنجیدہ معاملہ ہے۔ اور پھر ہوتا تھا بیاہ۔ نئے نئے ملبوسات کی خوشبو، عطرات کی مہک، ہیٹ، دعوت نامے، رقص اور کورسیکا میں ہنی مون۔ ٹھیک اسی طرح میں نے اپنی پہلی بیوی، کیتھرین کی ماں سے بیاہ کیا تھا۔ وہ بڑی نیک عورت تھی۔ میں متواتر اس کے ساتھ بے وفائی کرتا رہا اور وہ یہ سب جانتی تھی۔ جیسا کہ ہوتا تھا اسے اس کی مہک آجاتی تھی لیکن منہ سے ایک لفظ نہیں کہتی تھی۔ مغموم اور کم و بیش شکوے کا ایک لفظ کہے بغیر وہ دوسرے بچّے کے وقت ہی مر گئی۔ ان دنوں بہت سی عورتیں زچگی میں مر جاتی تھیں۔ آج ایسا نہیں ہے بچہ پیدا کرنے کے لیے لوگ اب ایسے جاتے ہیں جیسے بیاریتز جا رہے ہوں۔ لیکن میں تمہیں ایک بات بتاتا ہوں جیسا کہ میں زوبی کو ہمیشہ بتاتا ہوں۔ نئی نسل زیادہ ایمان دار، زیادہ سچی ہے۔ اور بہت کم بجواس برداشت کرتی ہے۔ ہم تو دُکھ سہنے کے لیے قربان ہونے کے لیے تھے۔"

وہ اپنے آپ ہنسے اور پھر خاموش ہو گئے۔ کھوئے کھوئے لگنے لگے۔

ہم لاکاپولا د پر تھے۔ انھوں نے بلوارسیاں ی شیل اور لکشمبرگ کی آتی جاتی بھیڑ کی طرف دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "یہ فرانس، یہ فرانس پہلے سے زیادہ صحت مند، کہیں بہتر فرانس ہے۔ لیکن تم کیا چاہتے ہو؟ لیکن کوئی شخص چاہنے بھر سے نوجوان نہیں ہو جاتا۔ آپ زیادہ سے زیادہ اپنے بال کٹوا سکتے ہیں یا میری طرح ان کو خضاب لگا کر ان کا رنگ بدل سکتے ہیں۔ مجھے دادا، نانا دکھنا سخت ناپسند ہے۔ مجھے اس خیال سے نفرت ہے کہ ممکن ہے کیتھرین بہت جلد بچّے کی ماں بن جائے۔ اچھا ذرا تو بتاؤ۔ تمہارا دوست جارجز خوش بارتیف کیسا آدمی ہے۔ اوہ بولنے میں کسا کٹھن نام ہے۔ لیکن تم جانتے ہو کہ پیشتر اس کے کہ تم کچھ کہو میں تمہیں بتاتا ہوں۔ ورنہ مجھے غیر ملکیوں پر کوئی اعتبار نہیں۔"

انھوں نے کہا اور دوبارہ ہنس دیئے۔ "تم بہر حال غیر ملکی نہیں ہو تم تو میڈلین کے شوہر ہو۔ ہمارے رام جیسا کہ زوبی ہمیشہ کہتی ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے میں تمہیں ہمیشہ سے

جاتا ہوں۔ ہمیشہ سے۔"

"جارجز" میں نے جواب دیتے ہوئے کہا۔" ایک سمجھ دار، ہوشیار، وفادار اور نیک آدمی ہے۔ خانقاہ سے باہر شاذ و نادر ہی ایسا آدمی ملے گا جو چرچ اور خدا سے اس انداز میں پیار کرتا ہوں جس طرح وہ کرتا ہے۔ جارجز تو کچھ سنت جیسا ہے۔" میں نے پورے اعتقاد کے ساتھ یہ سب کہا۔ لیکن تلافی کے طور پر یہ بھی اضافہ کر دیا۔"کیتھرین کے لیے وہ بڑا اچھا شوہر ثابت ہوگا۔ ان کو ایک ساتھ دیکھنا خوشی میں یقین کرنے کے مترادف ہے۔"

"اوہ۔ یہ سب تمہارے کارن ہے۔ تم اور میڈلین اس قدر خوش ہو اس کا اثر چاروں طرف پڑتا ہے۔ جب ہم تمہارے ساتھ ہوتے ہیں تو زوبی اور میں بھی ایک دوسرے کے تئیں کس قدر پیار بھرے اور حساس ہو جاتے ہیں۔ وہ بڑی رومانی ہے۔ زوبی۔ ہاں وہ واقعی ہے۔ اس سے پہلے وہ میڈلین کی اتنی پروا نہیں کرتی تھی اگرچہ وہ کیتھرین کو کبھی اتنا پسند نہیں کرتی تھی جتنا کہ وہ میڈلین کو کرتی تھی۔ زوبی کی فطرت خاص طور پر پیار کرنے کی نہیں ہے۔ عورت سے زیادہ وہ مرد کی طرح ہے۔ جسے خیالات و افکار، شاعری اور موسیقی پسند ہیں۔ دراصل وہ تمہاری طرح ہے۔ وہ بس تم سے پیار کرتی ہے اور تمہاری عزت کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے یا تو تم احمق ہو یا کافی قابلِ تعریف کہ تم کسی بھی عورت سے ایسا سلوک کرتے ہو جیسا کہ تم میڈلین سے کرتے ہو۔"

"بالکل بکواس" میں نے احتجاج کیا۔" اس کے علاوہ چچا چارلس" میں نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔" اگر آپ منمارتر جانا چاہتے ہیں اور چونکہ ہمارے پاس ٹکٹ بھی نہیں ہیں آپ کیا سوچتے ہیں ہمارا وہاں جلد ہی پہنچنا بہتر نہیں ہوگا؟"

"خوب! بہت خوب! یہ سوچنا اچھا لگتا ہے کہ تم ایسی جگہوں پر جانا پسند کرتے ہو۔ میرا خیال تھا تم سنیاسی ہو۔ تم جانتے ہو۔ ہم لوگ میرا مطلب ہے ہم مرد لوگ جہاں تک عورتوں کا تعلق ایک دوسرے کے ساتھ پُرخلوص نہیں ہو سکتے۔ عورتوں میں۔ عورت میں کچھ ہے جو اس قدر گنجلک ہے پیچیدہ ہے کہ میرے خیال میں وہ صرف بچے پیدا کرنے کے لیے

ہی ٹھیک ہے۔ اور کسی کام کے لیے نہیں۔ کیا تم ایسا نہیں سوچتے ؟"

میں نے جو کچھ کہا اس میں ان کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جب ہم لا پری گردن کی پہلی منزل سے نیچے آئے انھوں نے اپنی نکٹائی ٹھیک کرنے کی کوشش کی اور اپنے شام کے ہیٹ کو رگڑ کر اس پر سے کچھ دھول اڑائی۔ نیچے پہنچ کر انھوں نے سب میزوں اور بار کا جائزہ لیا یہ سوچتے ہوئے کہ شاید وہاں کوئی شناسا مل جائے یا پھر کوئی ایسا شخص جو ان کو پہچان لے۔ پیرس میں اپنے ہم وطنوں سے ملنا اچھا لگتا ہے آپ اپنے آپ کو نوجوان محسوس کرنے لگتے ہیں۔ رویاں کے روسیاں دومنیق کے مقابلے میں پیرس میں میاترے فوربلیس سال چھوٹا لگتا ہے۔ اور وکیل چارلس ہب لوٹ کی تو ند رویاں پیلیس دے جسٹس کے مقابلے میں پیرس میں کم مضحکہ خیز لگتی ہے۔"

"رویاں کے مقابلے میں یہاں سین ندی زیادہ خوبصورت ہے" انھوں نے اپنی بات پوری کرتے ہوئے کہا جب ہم کار میں بیٹھ گئے۔

اس شام جب ہم منماترے لوٹے تو انھوں نے کئی بار مجھے آنکھ ماری، مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ گیتوں یعنی فحش گیتوں کا اثر تھا یا کونیاک کا یا شیمپین کا نیم برہنہ یا مکمل طور پر برہنہ عورتوں کے ماحول کا اثر لیکن ایک تھکے ہوئے گھوڑے کی طرح جانے پہچانے راستوں کی جانب مڑ کر انھوں نے پیلیس کلیچی کے کئی چکر کاٹے۔ انھوں نے دو ایک ایڈریس بھی دیکھے اور کہنے لگے: "آہ، زندگی! زندگی!" مکان میں رہنے والے بدل گئے ہیں۔ انھوں نے کہا۔ وہ یا تو اس طرح کی زندگی سے اکتا چکے تھے یا کار چلاتے چلاتے تھک گئے اس لیے انھوں نے مجھے پوں سیانت مشیل کے پاس کار سے اُتار دیا اور میں ٹیکسی کر کے اپنے ہوٹل چلا گیا۔

اگلی صبح دس بجے انھوں نے فون کر کے مجھے بتایا کہ ان کے سر میں سخت درد ہے۔ لیکن ہم ایک بجے اوپر شیز دے بر میں مل سکتے ہیں۔" ہم ہلکا پھلکا سا لنچ کر سکتے ہیں۔ کل رات کی برگنڈی کی شمبوک اور کاک آوِن کے بعد کچھ بھی ٹھیک رہے گا۔ سادہ سلاد بھی۔ وہیں میں سبزیاں ترکاریاں بہت اچھی بنتی ہیں۔"

میں عام طور پر چونکہ پلیس دے لا میڈلین میں کُگس کے دفتر سے اپنی ڈاک لینے جایا کرتا تھا اس لیے آس پاس کی جگہ پر کھانا کھانے میں مجھے سہولت تھی۔ صبح سویرے ریو دے رشال یے ہمیشہ غیر دلچسپ اور گرم گرم ہوتا تھا۔ اور دھواں کے کارن میرے لیے سانس لینا دشوار ہو جاتا تھا۔ لیکن یہ سوچ کر خوشی ہوتی تھی کہ وکٹر ہیوگو لیمارٹین بادلیر، سیاں دیاو، بزو، ٹین، رینن، رینر ماریا رلکے جیسی عظیم شخصیتیں۔ سب ان میزوں پر کام کر چکی تھیں۔ جیسا کہ میں نے کہا تھا حال کی افہام و تفہیم کے لیے ماضی کا میرے ساتھ ہم کلام ہونا ضروری تھا۔

لنچ بے مزا رہا۔ سوائے اس بات کے چچا چارلس نے ٹیلی فون تو مجھ سے اپنے گھر ٹیلی فون کیا اور میں نے کیتھرین سے بات کی۔ اس کی آواز بھرپور تھی۔ نغمگی لیے ہوئے تھی اور خوشی سے بھری ہوئی تھی۔ بہت جلد اس کی شادی ہونے والی تھی۔ اور اس کی زندگی کو معنی و مقصد حاصل ہونے والا تھا۔ آپ میرے سُکھ کے دھرم پتا ہیں،" وہ کہنے لگی" اور جب صحیح موقعہ آئے گا تو آپ کا موقعے پر موجود ہونا ضروری ہوگا۔"

"میری بہن کی بھی شادی ہو رہی ہے۔ کیتھرین! اور گھر کے حالات بہت اچھے نہیں ہیں۔ اور میں چونکہ ٹھہرا سب سے بڑا بیٹا اس لیے غالباً چند مہینوں کے لیے مجھے ہوائی جہاز سے گھر جانا پڑے۔"

"تو کیا تم میڈلین کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ گے؟" وہ پوچھنے لگی "اگر تم میں سے ایک وہاں نہ ہوا تو میں تمہارے لوٹنے سے پہلے شادی نہیں کروں گی۔"

"اچھا! ہم تمہاری خوشی کو ایک دن کے لیے بھی ملتوی نہیں کریں گے،" میں نے وعدہ کیا "میں امید کرتا ہوں اس وقت تک میڈلین کم سے کم چلنے پھرنے کے لائق تو رہے گی ہی!"

"بے شک یہ سچ ہے۔ میں نے اس کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ عجیب بات ہے عورت ہوتے ہوئے بھی مجھے ایسی بات یاد نہیں رہی۔ رام تم جانتے ہو محبت میں انسان کیا انانیت پسند بن جاتا ہے۔"

"یہ تم کس سے کہہ رہی ہو؟" میں نے جواب دیا۔ جیسے وہ میرے جواب سے میری بات

کا مطلب سمجھ جائے گی۔

"مجھے امید ہے میری شادی بھی کچھ کچھ تمہاری شادی جیسی ہی ہوگی۔ تانت زوبی کہتی ہے کہ میں اپنی پسند کے معاملے میں جغرافیائی نقطۂ نظر سے بہت دور تک نہیں گئی۔ یہ صحیح ہے کہ میں مشرق کی جانب ضرور گئی ہوں۔ روس کی جانب لیکن بہت زیادہ دور نہیں گئی۔ اسے اچھا لگتا اگر میں کسی ہندوستانی سے شادی کرتی۔

" روپاں میں سولسٹر کون بنے گا؟ میں سمت یار سیاں مدارد اور کووی رسلیاں کو یاد کرکے ہنس پڑا۔

" نہیں میں ایسا نہیں مانتی۔ میں پروفیسر رہ کر خوش رہوں گی۔ جیسا کہ تمہاری ملازمہ جینی کہتی ہے۔ جی ہاں! میں مادام پروفیسر بنوں گی "

الوداع، ننھی کیتھرین" میں چلّایا۔ اس وقت چچا چارلس اپنی ران کھجا رہے تھے اور ٹیلی فون کا بل ادا کر رہے تھے۔ انھوں نے کسی چیز کے بارے میں مذاق کیا اور ٹیلی فون والی لڑکی کو خوب ہنسایا۔

" الوداع " وہ مسکرائی۔ " ہم جلد ملیں گے "

چچا چارلس بعد دوپہر چلے گئے۔ انھوں نے الوداع کہتے ہوئے مجھے گلے لگایا اور حالانکہ میرا کام پورا ہو چکا تھا میں بغیر مقصد کے پیرس میں اِدھر اُدھر گھومتا رہا اور معلق اور اداس۔ ایسے موقعوں پر ہی انسان ماں یا باپ کی کمی محسوس کرتا ہے۔ کچھ ایسا جس کی شفقت یقینی ہو۔ حیاتیاتی سطح پر جس طرح موسمِ بہار میں پیڑوں کے لیے ان کا رس ہوتا ہے۔ گھاٹ کے اطراف میں بے مقصد گھومتے ہوئے میں کچھ پرانی کتابوں میں سر کھپانے لگا۔ سسٹر شین مت کی کوئی تاریخ یا ہندوستانیوں کو اچھے عیسائی بنانے کے مقصد سے کسی ریورینڈ فادر کی شائع کردہ ہندوستانی کوّوں کی سمجھداری کی تفصیل۔ یہ شاتوبریاں اور رانالا کا عہد تھا۔ اور سلطنتوں کی فتح کا، درباری ادیبوں کا، جیسا کہ تبادے نے شاتوبریاں، ہیوگو، لیمارتین اور بالزاک کے پورے گروہ کے بارے میں کہا ہے۔ برہنہ عورتوں پر لکھی ہوئی کتابوں سے مجھے گھن آتی تھی۔ میں حیران ہوتا تھا۔ بھلے ہی وہ حقیقی کیوں نہ ہو کون دیکھتا ہوگا۔ اس دھرتی

پر اس عامیانہ پن کو۔ کیا جسم اس قدر اہم تھا اور اس کی مانگ ایسی متواتر اور مسلسل تھی کہ انسان اس ابے لارڈ کو فراموش کر بیٹھا جس نے دریا کے اس پار تصوریت کا پرچار کیا تھا؟ ہیلائس اور ابے لارڈ ساتھ ساتھ کتنی بار پلیوں پر سے گھومتے ہوئے گزرے ہوں گے۔ ان جوان جوڑوں کی طرح سین کے پانی میں جھانکتے ہوئے اپنے ساکت چہرے ساتھ ساتھ دیکھنے کے لیے۔

پیار سدا بہار ہوتا ہے۔ رفعت انگیز۔ ناتر دام کے پشتوں کی طرح پاک، تیز طرّار، اچھلتا کودتا ہوا۔ گنبد نما عمارتوں کے رنگین شیشوں کے رنگ میں نہایا۔ میں پیار کر سکتا تھا۔ جی ہاں میں کر سکتا تھا۔ میں گرفتارِ محبت تھا۔ جی ہاں میں عشق کر رہا تھا۔ پیار سے واقف تھا اب میں۔ میں نے ساوتری کا نام لیا۔ پیار ناتر دام کے گلاب کی طرح گول مٹول تھا۔ رنگین اور بنفشئی تھا عشق۔ گلاب کی طرح کیمبرج میں رہتے ہوئے وہ دن بھی گزرے جب میں نے محسوس کیا میں اسے "تم" کہہ کر نہیں پکار سکتا۔ صرف "میں"۔ لیکن کیسا عجیب احساس تھا اور کیا احمقانہ لگتا تھا سب کچھ۔ رلکے نے صحیح کہا تھا کہ عشق کی نوعیت انسان عمر بڑھنے کے ساتھ ہی دریافت کرتا ہے۔ ۱۹ برس کی عمر میں کوئی شخص عشق کے بارے میں کیا جانتا ہے؟ میڈلین کی زلفوں میں یوڈی کلون کی تازہ مہک یا پھر اس کے پستان کی شرمیلی ادھوری نامکمل قوس کیا انسان صرف ہونٹوں سے یا شریر کے رنگوں سے پیار کر سکتا ہے۔ نہیں یہ پیار کبھی مکمل پیار نہیں ہوگا۔ یہ صرف پاپ ہوگا، گناہ ہوگا۔ پیار کچھ نہیں مانگتا۔ نہ ہی کچھ کہتا ہے۔ نہ ہی کچھ جانتا ہے۔ پیار اپنے آپ میں جیتا ہے سین ندی کی طرح۔ اس کے دونوں طرف بنی ہوئی بلند ہوتی عمارتوں، پارکوں اور کچھ اور آگے جا کر رینو فیکٹری کی موجودگی سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پیار کو کون چھین سکتا ہے؟ کون دے سکتا ہے؟ اور کون اسے پا سکتا ہے؟ میں کبھی یہ تک نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں ساوتری سے پیار کرتا ہوں۔ میرا یہ کہنا یہ کہنے کے مترادف تھا کہ میں اپنے آپ سے پیار کرتا ہوں یا پھر پیار پیار سے پیار کرتا ہے، "تکرار معنی، لامعنویت"۔ میں چلایا اور زیادہ حوصلے سے کتابوں میں عورتوں کی ننگی تصویریں دیکھنے لگا۔ آخر میں یہ سوچ کر کہ اس سے ساوتری کے لیے میرے دل میں تعظیم بڑھ جائے گی۔ میں نے بادلیر کے کلام کی ایک جلد۔ کم و بیش منمار تر جلد۔ خریدی کی جس کے سرورق پر بڑے بڑے پستان تھے اور مڑے ہوئے بازو کمر کے گرد

حائل تھے۔ وہ پُراسرار شہوانیت جو چچا چارلس کو بڑی پُرکشش لگتی تھی۔

مجھے یقین تھا کہ چچا چارلس کے سر درد کا کارن شیمپین اور کونیاک کے علاوہ کوئی اور تھا۔ جوانی کی بازیافت کی کوشش میں وہ ضرور کچھ پرانے پتوں پر گئے ہوں گے۔ غالباً وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ کوئی پرانی آشنا ان کو پہچان لیتی۔ کوئی ایسی لڑکی جو حوصلے سے اپنا توازن برقرار رکھ سکتی لیکن ضرور انھیں صدمہ پہنچا ہوگا۔ عمر ایک حقیقت واقعتاً ایک حقیقت ہے خاص طور پر جب کوئی شخص پچاس سے اوپر کا ہو چکا ہو۔ اس عمر کے بعد آپ عشق کرنے کے دوسرے کمیاب غیر فطری ذرائع کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ آپ جو چاہیں پیرس میں آپ کو مل سکتا ہے۔ لیکن بیرکوں والی یہ ذہنیت ہی یورپ کی بدقسمتی ہے۔ اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ سارتر بوگس جنگ کے دوران مشہور ہو گیا۔ اگر آپ کے پاس سامنا کرنے کے لیے کوئی شیطان نہ ہو تو شیطان دلچسپ بن جاتا ہے۔ قرون وسطیٰ میں ابلیس بلندی تک پہنچ گئے۔ چھتوں پر چڑھ گئے اور خونخوار پرنالے بن گئے۔ جن کے خلاف پاکباز سینٹ برنارڈ نے شدید غصے کا اظہار کیا۔ اور بادلیر، وہ تو کبھی تصور پرست بن ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ مذہبی جنگوں کے سلسلے میں اٹلی تک جانے میں نیک دل سینٹ برنارڈ کے ساتھ ہوتا اپنے لیے اپنی آزادی لے کر آتا اور ایک پشیمان اور نادم دین دار راہب کی موت مرتا۔ ورلین نے بادلیر کے خفیہ مقدر کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جیسا کہ ولاں نے معکوس انداز میں رون سرڈ کے ساتھ کیا ہوگا۔

ہمارے بعد زندہ رہنے والے انسانو! دوستو!

ہمارے تئیں سخت دل مت بنو

کیونکہ اگر ہمارے لیے اپنے دل میں ہمدردی رکھو گے

تو آپ کے اوپر خدا کی نظر کرم ہو گی

ایکس کو جاتی ہوئی گاڑی کچھ ایسی لے میں جھول رہی تھی کہ یہ مجھے میری ذہانت اور احساس واپس لوٹاتی ہوئی لگی۔ ایس کلارمند بے شک جنم لے گی۔ کیسی سندر ہوگی وہ۔ اس کے بالوں میں میڈلین کے بالوں کا سنہراپن ہوگا۔ اور آنکھیں شاید میرے جیسی ہوں گی۔ میں نے تصور ہی تصور میں اسے ایک ایسی بڑی اور لمبے قد والی لڑکی کے روپ

میں دیکھا جو خوبصورت عورت کے پیکر میں ڈھل رہی تھی اور پیار کے درد کی پہلی ٹیس محسوس کر رہی تھی۔ اس میں سروجا کے شرمیلے پن، اس کی فطری ذہانت اور اس کی گہری سنجیدگی کا امتزاج ہوگا۔ جی ہاں! ممکن ہے وہ سروجا جیسی ہو۔ کیوں نہیں۔ شاید میں جب اسے چھوؤں گا تو اپنی انگلیوں میں کچھ ایسا محسوس کروں گا کہ میں کسی حقیقی شے چھو رہا ہوں کچھ لبعید اور ذاتی ۔ پر نفیس نفیس سچ!

ہم اپنی اولاد میں اپنی گم شدہ امیدوں کی تجسیم تلاش کرتے ہیں۔ ہم اپنی بیویوں کو زنا بالجبر کے وہ تحفے دیتے ہیں جو دراصل پیار کرتے ہوئے ہم اپنی محبوبہ کو دیں گے۔ ہم ناجائز اولاد پیدا کرتے ہیں کیونکہ ہم میں حوصلے کی کمی ہے۔ ہم ایک دوسرے کے پہلو میں ایک دوسرے کے بازوؤں میں جکڑے ہوئے بستر میں لیٹے ہوتے ہیں۔ ہماری سانسیں ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو چوستے چوستے چاٹتے ہیں۔ جیسے سچائی لمحۂ ہم بستری میں مضمر ہے۔ ایک دوسرے سے پیار بھری باتیں کرتے ہیں۔ ممکن ہے ہم سالوں سال جنم جنم تک یہ سلسلہ جاری رکھیں لیکن ہمارا انت ممکن ہے کسی ندی کے تٹ پر ہو۔ زندہ لہلہاتی گھاس کے کسی سبز ٹکڑے پر یا نارمن محراب، بائیسکلوں اور کلیر کے پل پر! عورت صرف ایک ہوتی ہے۔ صرف ایک جنم کے لیے نہیں۔ جنم جنم کے لیے۔ دھرتی کو پیڑوں، ندیوں، سمندروں، کشتیوں، عمارتوں، کتابوں، میناروں اور ہوائی جہازوں سمیت اس لیے تخلیق کیا گیا تھا تاکہ ہم اس عورت کو پا سکیں اور سینٹ برناڈ ڈر کے اذیت دینے والے عمل کے اثر سے آزاد ہو سکیں۔ بیچارہ چارلس بادلیر۔

اسٹیشن پر میڈلین اپنی بھرپور نسوانیت میں ایسی خوبصورت اور اداس لگ رہی تھی کہ میں نے بڑی گرمجوشی یقین اور پرخلوص عقیدت سے اس کو چوم لیا۔ وہ میرے گھر کی عبادت گاہ تھی۔ ابھی مجھے روح القدس کو خلق کرنا تھا۔

باقی کہانی آسانی سے سنائی جا سکتی ہے۔ کسی کلاسیکی ناول میں ممکن ہے یہ کہانی کسی محل میں اور پالکی اور ہودے میں یا ہمالیہ کی بلندی پر ختم ہوتی لیکن یہاں میں کوئی کہانی سنا ہی نہیں رہا ہوں۔ میں تو ایک زندگی، اپنی زندگی کی مغموم غیر ہموار سرگذشت لکھ رہا ہوں۔ بغیر فنی لوازمات کے اور تزئین کاری کے بلکہ "تاریخی سائنس" کی "معروضیت" اور نظم و ضبط کے ساتھ کیونکہ ذوق اور روایت کے اعتبار سے میں محض ایک تاریخ داں ہوں۔

تاریخ میں بھی کیتھرین ڈ برگنزا چارلس دوم سے شادی کرتی ہے اور اس طرح بمبئی کا شہر وجود میں آجاتا ہے۔ یا میری مدد لیسی ہنری چہارم سے شادی کرتی ہے۔ بیوہ ہو جاتی ہے اور پھر یہ بیوقوف پکے ارادے والی عورت کارڈینل رشیلے کے خلاف لڑتی ہے اور جلاوطنی میں کولون میں وفات پا جاتی ہے۔ یا پھر انڈیا دترا ولیسن کسی سے شادی کرلیتا ہے۔ ترک اسے قیدی بنا لیتے ہیں اور پھر وہ پہلے نورالدین کی زوجہ بنتی ہے اور پھر سلطان کی۔ یا پھر ایلی نرکی ایکوٹین کی شادی اور بیوگی پر غور کیجیے جس کے بغیر نہ تو قرونِ وسطیٰ کے نغمہ سرا ہوتے نہ ہی شاید جدید طرز کا پیار! (مشہور فرانسیسی تاریخ داں چارلس سی اوبو کے قول کے مطابق پیار بارھویں صدی کی ایجاد تھا) اس کا مطلب یہ ہوا کہ ممکن ہے میں کبھی میڈلین سے ملتا ہی نہ یا اس کے ساتھ شادی نہ کرتا۔ بلکہ پرانی نسل کے ایک اچھے برہمن کی طرح میں سویرے شام پوجا پاٹ کرتا رہتا۔ ہر برس اپنا یگیوپویت بدلتا۔ ایکس اَن پروانس میں بھی اگرچہ آپ بیپل کی لکڑی کا الاؤ تو روشن نہیں کر سکتے ہیں لیکن زیتون کی لکڑی کی آگ ضرور جلا سکتے ہیں۔ دیوار پر سواستک بنا سکتے ہیں، پوجا استھان کو منڈلوں سے سجا سکتے ہیں۔ یگیہ اگنی جلا سکتے ہیں اور اس آگ کے گرد پھیرے لے سکتے ہیں، چھڑکاؤ اور آچمن کے لیے ہر ہفتے ہوائی جہاز سے گنگا جل منگوا سکتے ہیں۔

گھر لوٹ کر اگنی کے سات پھیرے لے کر میں نے کسی وینکٹ لکشما کے ساتھ بڑے آرام سے بیاہ کر لیا ہوتا جو میرا جانشین اور میری چتا کو آگ دکھانے والا پیدا کرتی۔ اور آخر میں ضرور اس بیل یا گائے کی دم پکڑ لیتا جو میرے اگلے سفر کے لیے میرے بیٹے نے دان کی ہوتی اور اس طرح میری کہانی ختم ہو گئی ہوتی۔ میڈلین نے رویاں کے کسی ڈاکٹر یا تولون کے کسی نیول کیڈیٹ سے شادی کر لی ہوتی۔ اس کے دو یا ممکن ہے تین بچوں کو جنم دیا ہوتا۔ یہاں ہندوستان کی طرح بچوں کی تعداد کا انحصار ستاروں کی گردش پر نہیں تھا۔ یہاں اس تعداد کا تعلق بینک کے ریاضیاتی اعداد و شمار اور کیاس دے پارتے پر منحصر ہے اور یقیناً اس رو جر مار بلاں یا کلاڈ گیری لان نے سیاں سے داد میں ایک محفوظ تاریخی مقام قبول کر لیا ہوتا۔ لیکن میڈلین نے تو شادی میرے ساتھ کر لی۔ اور یہی اس کہانی کا تکلیف دہ پہلو ہے۔ زندگی واقعتاً بہر حال دکھ بھری ہے چاہے آپ اسے نیچے سے دیکھیں یا پیچھے مڑ کر دیکھیں یا کسی طرف سے بھی۔ ہم اپنی زندگیاں واقعات کے ساتھ چلاتے رہتے ہیں اور لمحۂ آخر تک اپنے آپ کو تاریخ، مرتبے اور حیثیت سے ڈھانپتے رہتے ہیں۔ ہم چاہے گھوڑے کی بگھی میں چلیں یا لاہور کے اس مشہور لکھ پتی کی طرح جو۔ اپنی گاڑی میں نو پنکھ لگا کر گورو ارجن دیو سے ملنے آیا تھا کیونکہ اس کے پاس نو لاکھ چاندی کی مہریں تھیں۔ گرو ارجن دیو نے شرارتاً اسے وہ سوئی دی جس سے وہ اپنے کپڑے سی رہا تھا اور اس سے کہا وہ اس سوئی کو اپنے اگلے جنم میں ساتھ لے جائے۔ چاہے ہم ربن، میڈل، ایگیو یویت پہنیں یا سر پر چوٹی رکھیں۔ یا یورُوبا لوگوں کی طرح جب کسی دوسرے کا سر کاٹیں تو بہادری کے ثبوت کے طور پر اپنے چہرے پر لکیریں کھینچ لیں۔ یا چاہے ہم استالن امن اعزاز حاصل کریں اور تمام سوویت اخباروں میں اپنی تصویریں چھپوا لیں کیونکہ میں تاریخ داں کہتا ہوں وہ بیک وقت ایک جیسی چیزیں سب جگہ چھاپتے ہیں۔ اور وہ بھی تاموُق، ازبیک اور بلند آذربائیجان سمیت ۱۸ یا اس سے بھی زیادہ ریاستوں کی ہر زبان میں چھاپتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی صورت حال ہو لیکن جب ہمیں بیل کی دُم کو پکڑنا ہوگا تو ہم سب ایک ہی انداز میں پکڑیں گے چاہے ہمارے کسی جانشین نے بنارس میں ہمارے لیے کوئی بیل

چھوڑا ہو یا نہیں۔ شادیاں اس لیے ہیں کیونکہ موت ناگزیز ہے۔ انجام کا مطلب ہے آغاز۔ انہدام کا خوف ہی مباشرت یعنی سمبھوگ کی بنیادی وجہ ہے۔ ہم سمبھوگ اس لیے کرتے ہیں تاکہ ہمارا جانشین پیدا ہو۔ بیٹا جو ہماری چتا کو آگ دے گا۔ اسٹالن کا بھی ایک بیٹا ہے اور اطمینان رکھیئے جب اس کی آخری گھڑی آپہنچے گی تو اس کا بیٹا بھی اپنا فرض بجا لائے گا۔ کیونکہ آخری گھڑی کو تو بہر حال آنا ہی ہے اسٹالن کے لیے بھی۔ یہ میں تاریخ داں کہتا ہوں۔ اس لیے شادی بیاہ ہیں اور انھیں ہونا بھی چاہیے۔ دگر نہ آٹھویں آردِس ساں کی میری کے محرر پی ار بویاسی اے یا یاں کار فور کے بیوی بچے (یاداشتہ اور بچوں) کا کیا ہو گا جسے قومی مردم شماری کا کام سونپا گیا ہے۔ آپ اس کے پاس جائیے اور کہئے مسٹر یہ میرے کاغذ ہیں۔ سفارت خانے کی طرف سے دیئے گئے کسٹم کے یہ میرے کاغذ۔ یہ میری پیدائش کا سرٹیفکیٹ نہیں ہوتا) اور یہ میری دلہن کا۔ کیا میں انتہائی انکساری اور مودبانہ شائستگی کے ساتھ آپ کے عظیم اور دلفریب کرم کے لیے آپ کی خدمت میں بیس ہزار فرینک پیش کر سکتا ہوں۔ کیونکہ آپ کی مدد کے بغیر میڈلین روسلیاں میری دلہن، میری بیوی میرے جانشین کی ماں نہیں بن سکتی۔" اس طرح پی ار بویاسی اے یا یاں کار فور جانشین کی دستاویز تیار کرتا ہے۔ تین ہزار فرینک سے اس کا گلا اور بستر دونوں گرم ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر سب لوگ کیتھار ہو جائیں اور جسم کی آلودگی اور زنا جیسے گناہ اور جنم کی خوفناکی کی باتیں کرنے لگیں تو اس کا کیا ہو گا؟ اگر ہر شخص کسی دوسرے پاکباز اور ایماندار شخص کے پاس پہنچ جائے۔ ڈھارس حاصل کرے اور اس وقت تک اور ولیک کے کسی غار میں فاقہ کشی کرے جب تک خوشیوں بھری اگلی دنیا کی مہربان پیام بر مرگِ شیریں فاختہ کی طرح آکر اسے وہاں لے نہ جائے۔ تو اس صورت میں جنازے کے اخراجات تک ادا کرنے کے لیے کوئی تیار نہیں۔ کیونکہ اگلی دنیا میں نہ تو آپ کو کسی بیل کی ضرورت ہے نہ کسی گائے کی۔ وہاں تو خوبصورت سے خوبصورت آتشیں طائر ہیں، کبوتر ہیں اور بلبلیں ہیں۔ آپ کو ہر گز پی ار بویاسی یا یاں کار فور کو بھوکا نہیں مارنا چاہیے۔

بنارس کے کسی غریب برہمن کو بھی اپنے بچے تک کو گنگا گھاٹ لے جانے کی اجازت

نہیں ہونی چاہیے۔ کیونکہ وہ وہاں کچھ بھی ادا نہیں کرے گا۔ ارتھی اُٹھانے والے چار کندھوں کا کرایہ تک نہیں دے گا کیونکہ وہ کہے گا مرنے والا ایک بچہ ہی تو ہے اس کے لیے اس کے بازو ہی کافی ہیں۔ چاہے جو کچھ بھی ہو۔ گنگا ہمیشہ پوتر رہتی ہے۔ اور گنگا کے گھاٹ کے راستے میں شور وغل مچاتے۔ ان سب بدمعاشوں سے لکڑی خریدنے کے لیے اس کے پاس پیسے بھی نہیں ہیں: "او پنڈت جی میرے پاس ترائی سے خوب تازہ اور سوکھی لکڑی آئی ہے اور میں سڑک پار کے بدمعاش کے مقابلے میں دو آنے فی من کم قیمت پر بیچوں گا۔" "او پنڈت جی آپ مجھے جانتے ہیں۔ آپ کے پتاجی مجھے جانتے ہیں۔" دوسرا جواب میں کہتا ہے "کیا میں نے کبھی آپ کو خراب لکڑی بیچی ہے۔ نہیں کبھی نہیں۔ ذرا گلی میں جھاڑو دینے والے اس پن ہن سے پوچھیے۔ کل کیا ہوا تھا۔ اس کمبخت کی بیچی ہوئی لکڑی سے لاش جلتی ہی نہیں تھی۔ اس لیے وہ لوگ دوڑے میرے پاس آئے۔ اس دیودار کو دیکھئے۔ سونے کی طرح بھاری ہے..." لیکن اسے نہ یہ لکڑی چاہیے نہ وہ کیونکہ اس کے پاس کسی کے لیے بھی پیسے نہیں ہیں اس لیے وہ بچے کو لے کر اسے اپنے کندھے پر ڈالتے ہوئے انگوچھے میں لپیٹ لیتا ہے اور کچھ منتروں کا اُچارن کرتا ہوا پانی میں اتر کر بچے کو ندی میں بہا دیتا ہے۔ بہتے جاؤ۔ بہتے جاؤ۔ ہم تمہیں شال اور چتا بھی نہیں دے سکتے۔ بیٹے! ہم تمہاری چھوٹی سی زندگی کے لیے کچھ بھی نہ کر سکے..." گنگا پر پانی برس رہا ہے۔ دھیمی ٹپ ٹپ برستی بارش پھولوں جیسے دائرے بنا رہی ہے اور اس کی آنکھ میں آنسو کا ایک قطرہ تک نہیں۔ اور رو بھی کون سکتا ہے؟ رونا کیا اور پھر اتنے سارے مرنے والوں کے لیے! اس بیچارے برہمن بھٹ کا کیا ہوگا۔ اگر ہمارے بڑے بوڑھے نہ مرتے اور ہیں ان کی استھیاں بنارس نہ لے جانا پڑتا۔ موت اور جنم موسمیاتی عمل ہیں۔ ہم کاٹتے ہیں اور بوتے ہیں۔ ہم پودے لگاتے ہیں اور ان کو کھاد دیتے ہیں جب آسمان میں بارش کے آثار ہوتے ہیں تو ہم مسکراتے ہیں۔ جب اولے پڑتے ہیں تو ہم دکھی ہو جاتے ہیں۔ سب کچھ ہمارے پیٹ میں پہنچ ختم ہو جاتا ہے۔ ہے بھگوان کوئی تو راستہ ہوگا نجات کا۔ زندگی کے اس چکر سے نکلنے کا۔ بارش، دھوپ، پت جھڑ، برف، گرمی

اور ایک پھر بارش، پھولوں جیسی لہروں کے روپ میں گنگا پر برستی ہوئی بارش!
چھوٹی ماں نے لکھا تھا کہ سروجا نے سبرامنیا شاستری سے شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔
"وہ بڑا اچھا آدمی ہے رام! اور اس کی پوترتا، سنجیدگی اور باادب طور طریقوں کے باعث اس کی عزت کرنے کے علاوہ کچھ کیا ہی نہیں جاسکتا۔ لیکن وہ سروج کے لیے بنایا ہی نہیں گیا۔ سروج جو اس قدر سندر ہے۔ اس قدر حساس ہے، اور اس قدر اداس سی! عورت کر کیا سکتی ہے رام؟۔ صرف تم ہی کچھ کرسکتے تھے اگر تم یہاں ہوتے اب کچھ کہنا، کچھ کرنا حماقت ہوگی۔ وہ لوگ ابھی سے اسے اپنا ماننے لگے ہیں۔ دعوت نامے، سونا، ہار، ہیرے کے جھلے اور شام کی سیر! اور نہ جانے اور کیا کیا۔ لیکن اس سب سے میرا من بڑا دکھی ہوتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کیوں؟ سروجا سوچتی ہے اور یہ اس کی عمر کی لڑکی کے لیے سوچنا ٹھیک بھی ہے۔ وہ لڑکی ہے اور میں اس سوتیلی ماں ہوں۔ میں اس کی دشمن ہوں۔ رام میں نے ہر ایک کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرنے کی کوشش کی ہے لیکن کیا بالآخر تم اپنے بیٹے جیسے ہو؟ اس کے باوجود میرا تم پر کیا اعتماد ہے۔ کاش سروجا کی شادی تم جیسے کسی شخص کے ساتھ ہوتی رام! جلدی آجاؤ۔ ہمیں تمہاری ضرورت ہے۔ تمہارے لیے اور میری بہو کے لیے میرا آشیرواد!"
کیسی مدھرتا تھی جو چھوٹی ماں سے مجھ تک پہنچی تھی وہ مجھ سے کتنا پیار کرتی تھیں، ایسا لگتا تھا وہ میرا عزیز ترین مرکز ہیں، میری زندگی کا آئینہ ہیں۔ بغیر ایک لفظ یا بعض اوقات محض ایک لفظ سے وہ میری خاموشیوں اور میرے خیالات کے آتار چڑھاؤ کو سمجھ جاتی تھیں۔ ایسا لگتا تھا انھوں نے مجھے جنم دیئے بغیر ہی مجھے جنم دیا ہے۔ اور اپنے آپ میں کہیں میں جانتا تھا کہ وہ میرے لیے دکھی ہوتی ہیں اور اس کرب کو محسوس کرتی ہیں جس کے کارن میری راتوں کا دم گھٹنے لگتا ہے۔
اکثر میں لیٹا ہوتا تھا اور چاندنی میری کھڑکی کے راستے اندر آرہی ہوتی تھی۔ میرا بستر کمرے کے دوسرے سرے پہ تھا۔ کم وبیش کھڑکی کے قریب اور میڈلین کا دیوار کے ساتھ کیونکہ روشنی سے اس کی نیند میں خلل پڑتا تھا۔ اس عالم میں میں زیتون کے پیڑوں کی بیداری کی کیفیت، شاخوں پر انجیروں کا پکنا اور ابابیلوں کے انتظار میں ڈوبے گھونسلے،

یہ سب محسوس کرتا تھا۔ میں مارسیلز کو جانے والی لمبی سفید شاہراہ کو چشمِ تصور سے دیکھ سکتا تھا جس پر زرد روشنیوں والی کاریں اب بھی رواں ہوں گی۔ اور سیاں شارل اور وی اے پورسے پرے آپ قدم بہ قدم نا تر دام دے لاگارد کی چوٹی تک چڑھ سکتے تھے، کیتھیڈرل کے گرد گھوم سکتے تھے اور بحرہ روم کے پھیلاؤ کا نظارہ کر سکتے تھے: "سمندر، سمندر ہمیشہ نیا سمندر"، طویل خاموشی کے وقفے کے بعد میں میڈلین کی طرف دیکھا۔ اندرونی حیاتیاتی تبدیلیوں اور نشوونما کے باعث اس کے رخسار بھرے بھرے لگنے لگے تھے اور اس کے طول چہرے کو توازن، افسردگی اور ایک خاص قسم کا افتخار حاصل ہو گیا تھا۔ میں اس کے پاس جھک کر، اس کا ہاتھ تھام کر، اپنے ہونٹوں سے اسے چوم سکتا تھا اور سرگوشیوں میں بہت سی غیر متعلق، جھوٹی باتیں اس سے کہہ سکتا تھا۔

بعض اوقات کسی لبد دوپہر کو وہ اپنی شفاف خاموشی توڑ کر کہنے لگتی: "رام میرے ساتھ باتیں کرو۔ مجھ سے کچھ کہو۔" اور وہ اپنی جانب اس طرح دیکھتی جیسے وہ کوئی پوتر بار کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو۔ کوئی عزیز آلودگی۔ میں اپنا بھاری بھرکم چشمہ اتار کر رکھ دیتا اور اس سے یوں گویا ہوتا" او میڈلین مجھے یقین ہے چھوٹی ماں تم سے مل کر بہت خوش ہو گی۔ الیس کلامندر اتنی سندر ہو گی۔ بالکل سرد جا کی طرح۔" وہ اپنی بنائی (کیونکہ گھونسلہ بنانے کی طرح بُننا بھی ایک حیاتیاتی عمل ہے) روک کر کہتی: "رام کچھ اپنے بارے میں کہو۔" اور میں کچھ نہ کہہ پاتا کیونکہ کوئی شخص حاملہ ماں کے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ وہ پوتر ہوتی ہے کسی ایقان کی علامت سائنس کی طرح۔ پربت کی طرح یا ندی کے سکوت کی طرح۔ میں اس کا سر بازوؤں میں لے لیتا۔ اس کے سنہرے بالوں کے سونے سے کھیلتا۔ اور اس کے سر کو چومتا۔ وہ میری نہیں تھی۔ ماں بننے کے عمل نے اسے کوئی دوسرا یا غیر بنا دیا تھا۔ وہ بڑی پُراسرار لگتی تھی۔ مکمل اور ترسیل سے پرے۔ اس کے نزدیک لفظوں کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا وہ ہمیشہ اکیلی اور اپنے آپ سے باتیں کرتی تھی۔ کاش! میں اس کے لیے ہزار پتیوں والے چمبیلی کے پھولوں کا گجرا لا کر اس کے بالوں میں سجا دیتا۔ اور پھر ساری رات ان پھولوں کی خوشبو سونگھتا رہتا۔ ایسا لگتا تھا دوسری

عورتوں کی طرح میڈلین میں حاملہ عورتوں جیسی خواہشیں نہیں تھیں۔ میں نے کبھی اسے مال گوا آم یا سرخ انگور کی غیر متوقع اور ناقابلِ برداشت خواہش کا اظہار کرتے نہیں دیکھا۔ وہ اچھے تیز یوڈی کلون تک کی فرمائش بھی نہیں کرتی تھی۔ اس کے جذبے نے کوئی دوسرا رخ اختیار کر لیا تھا۔ وہ ہر وقت پڑھتی رہتی تھی۔ ڈھیروں تحریریں حالانکہ ڈاکٹروں نے اسے احتیاط کرنے کی ہدایت دے رکھی تھی۔ اس نے پالی پڑھنا جاری رکھا تھا اور وہ بدھ مت پر ملنے والی ہر کتاب کا مطالعہ کرتی تھی۔ وہ لائبریری گئی اور وہاں سے رینن سینارٹ اور الیگ زینڈر ڈیوڈ نیل کی کتابیں لے کر آئی۔ اس نے انگلستان سے ایسٹ سیریز کی 'سیکرڈ بکس' آرڈر دے کر منگوائیں۔ اسے سٹرز کے بھجن اس قدر پسند تھے کہ وہ خود ان کا ترجمہ کرنے لگ گئی۔ ایک کہانی نے اسے خاص طور سے پریشان کر دیا۔ ایک شام کو جب میں اپنی لمبی اکیلے کی سیر سے گھر لوٹا تو میں نے اسے آنسوؤں میں شرابور دیکھا۔ مجھے ہمیشہ یہ خیال آتا تھا کہ ساری اداسی اور دکھ کا واحد منبع اگر کوئی ہو سکتا تھا تو وہ میں تھا۔ میں سوچتا تھا کہ آخر میں نے کیا کیا تھا۔ تب وہ آہستہ آہستہ اپنا سر میری گود میں رکھ دیتی اور مجھے وستا اور پربھو کی کتھا سنانے لگتی۔

"جاؤ، ماں جاؤ۔ مغموم اور اداس ماں جاؤ۔ کوئی ایسا گھر ڈھونڈو جہاں سرسوں کے بیج ہوں۔ اور جلدی یہ بیج لے کر میرے پاس آؤ۔ میں بچے کو جگا دوں گی وستا اور وہ بدھ کا روپ لیے ہوئے ہوگا۔ صرف یہ یاد رکھنا وستا دہلیز پار کرتے ہوئے "بھیا کیا اس گھر میں کبھی کسی کی مرتیو ہوئی ہے؟ اور اگر وہ کہیں 'کبھی نہیں۔ نہیں کبھی نہیں' تو پھر سرسوں کا ایک دانہ وہاں سے لینے آنا۔" وستا اپنے بچے کو بازوؤں میں تھامے ہر گھر کے دروازے پر گئی اور وہاں جا کر یہ پوچھا "کیا اس گھر میں کبھی کسی کی مرتیو ہوئی ہے؟" اور سب جگہ سے یہ جواب ملا "ہاں بہن ہاں، ہاں ماں۔ ہاں۔" تب وہ لوٹ کر بھگوان کے پاس آئی اور بولی "بھگوان کیا یہ ماں کی فطرت اور پہچان نہیں ہے کہ وہ جس کسی کو بھی جنم دیتی ہے اُسے بالآخر ہمیشہ مرنا ہی ہو۔ جس طرح ہم مر جائیں گے۔ ہم جو اٹھارہ عناصر کی مرکباتی میزان ہیں۔" "چھوٹی ماں تم بالکل سچ کہہ رہی ہو کیونکہ ہر وہ شے جو پیدا ہوتی اسے

لازماً مرنا ہی ہے۔ آمیزے کو تحلیل ہونا ہی ہے۔ وجود میں تکمیلِ انجام" اس پر وستابولی دیے بھگوان اپنی شرن میں لے لو"

"سوامی" میڈلین بڑبڑائی میرے لیے "سوامی مجھے اپنی شرن میں لے لو"

عورت کا دکھ درحقیقت مرد کا بنجر پن ہے۔

معمول کے مطابق جارجز ہر شام کو ہمارے گھر آتا تھا۔ اب وہ پہلے سے زیادہ آزاد، زیادہ سادہ اور خوش طبع ہو گیا تھا۔ مذاق کرتا تھا۔ خود بھی ہنستا تھا اور ہمیں بھی ہنساتا تھا۔ اور چونکہ اس نے واقعی خوش رہنا شروع کر دیا تھا اس لیے بھلا ہو اس کے نئے اعتماد اور اس کی خوشی کا کہ اس کے کارن ہمارے گھر پر چھائی ہوئی اداسی رفتہ رفتہ چھٹنے لگی۔ میں نے اپنے کمرے میں اسے ایک چھوٹی سی میز دے دی تھی۔ اور جب میں اپنے تواریخ کے کام میں مصروف ہوتا وہ اپنے کاغذات کی تصحیح کرتا رہتا اور بیچ بیچ میں کچھ مزاحیہ جملے بھی پھینکتا رہا۔

"دیکھو دیکھو۔ انسانیت کی کیا حالت ہو رہی ہے" اس نے ایک روز کہا۔ "چھٹی جماعت کے ایک بچے سے جب میں نے پوچھا کہ 'فرض' کیا ہوتا ہے تو اس نے جواب دیا 'فرض وہ کام ہے جسے جلدی سے جلدی کر دیا جاتا ہے' اور میرا اندازہ ہے بعد میں اس کے بارے میں سب کچھ فراموش کر دیا جاتا ہے۔ ایک اور ہوشیار نوجوان لڑکے نے جواب دیا۔ 'اگر فرض کوئی آفاقی شے ہوتی تو یہ عجیب سی بات ہے لوگ کہتے ہیں کہ تبت میں ایک عورت کے پانچ شوہر ہوتے ہیں اور اسلام میں کم از کم چار بیویاں جائز ہیں (مثال کے طور پر مراکو کا سلطان)۔ آگسٹ کامٹے غالباً یہ کہنے میں صحیح تھا کہ فرض وجود اعلیٰ کا قانون ہے جو ترقی افروز نوع انسان کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ آپ کا فرض ہے اپنے اردگرد کی دنیا کو سکیٹر دیں۔ قرون وسطیٰ کے غلام کا فرض اپنے آقا کے لیے تھا۔ بورژوا کا شہر کی کونسل کے تئیں۔ اور سوویت روس میں پارٹی کے لیے۔ فرض کی تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ فرض چلن کا وہ نظام ہے جو انسان کو زیادہ سے زیادہ خوشی دے سکے اور دوسروں کو کم سے کم دکھ اور تکلیف" "کیا خوب تعریف ہے فرض کی" جارجز نے بات جاری رکھتے ہوئے

کہا ۔" اور ذرا سوچو یہ ذہین لڑکا کمیونسٹ ہے، افسوس ، اور پھر وہ اگلا پرچہ جانچنے لگا۔
اس دوران میں ہفتے میں تین دن ۔منگل وار ، برہسپت وار اور سنیچر وار کو میڈلین نے لیزو سے پڑھنا جاری رکھا۔ جب میں نے اسے پُونا میں دیکھا تھا اس کے مقابلے میں اب وہ بہت بدل گیا تھا۔ یا تو اس نے میڈلین کے دکھ کو محسوس کر لیا تھا کیونکہ وہ اس کا بہت خیال رکھتا تھا یا پھر جارجز نے اسے کھری کھری سنائی تھی یا پھر ممکن ہے کہ وہ اب زندگی کو بہتر سمجھنے لگا تھا۔ بہرحال وہ بہت بدل گیا تھا۔
بعد میں مجھے پتہ چلا جب میں لندن میں تھا جارجز ایک روز نہیں آیا۔ اس پر ہمیشہ کی طرح ملیریا بخار کا حملہ ہوا تھا اور وہ بری طرح کانپ کر بستر سے لگ گیا تھا۔ یہ مزاحمت کے دنوں کی کسی چھوٹ کا نتیجہ تھا۔ بہرحال جارجز نہیں آیا تھا اور میڈلین پالی پڑھنے میں مصروف تھی۔ معمول کے مطابق کام ختم کرنے کے بعد میڈلین لیزو کے لیے اچھی اور تازہ کافی بنانے کے لیے کچن میں گئی ۔ بیچارہ وہ کس قدر تنہا ہے۔ جب ایسا ہاتھ تنگ ہو تو کیسا محسوس ہوتا ہوگا اور پھر بورڈنگ ہاؤس میں رہنے کے اخراجات ۔" اور جب وہ دونوں ہاتھوں میں کافی کا ایک ایک پیالہ تھامے ڈرائنگ روم میں آئی تو اس نے دیکھا لیزو وہاں نہیں تھا۔ بیشتر اس کے کہ وہ جان سکتی کہ کیا ہوا ہوگا وہ پچھلی طرف سے اندر آ گیا۔ وہ اسکول کے ایک بچے کی طرح دروازے کی اوٹ میں چھپا ہوا تھا۔ پیچھے سے آیا اور اس نے میڈلین کی آنکھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے اور پھر اپنے ہاتھوں کو نیچے سرکانے کی کوشش کی۔ میڈلین نے اپنے تمارن تیز غصّے میں پیالے اس کے منہ پر دے مارے اس کو تھپڑ مارے اور اس کے پیٹ میں لات جما دی ۔" میں طیش میں تھی ۔ بے پناہ طیش میں" اس نے بتایا ۔" وہ فرش پر گر گیا ۔ اور معافی مانگنے لگا۔ گڑ بڑا کر معافی مانگنے لگا ۔ اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا
" میرے اجداد شاید وحشی تھے ۔ مجھے معاف کر دو ۔"
" ایسے بیوقوف کو معاف کرنے کے علاوہ کوئی کر بھی کیا سکتا ہے ۔؟" میڈلین بولی" اور اس کے بعد وہ کتے کی طرح اطاعت شعار ہو گیا۔ بعض اوقات میں اس سے کہتی ہوں" یورپ کے طور طریقے مت اپناؤ۔" اور وہ مسکرا دیتا ہے ۔ رام! اب کوئی ڈر نہیں تم کوم پر کورن ٹن

جا سکتے ہو۔ لیزو اب وفادار کتے کی طرح رہے گا!"

"تم کیا توقع رکھ سکتے ہو اس سے!" جارجز نے ایک روز کہا" وہ رہتا بھی تو ایک درزن کے ساتھ ہے!"

"کیا واقعی وہ ایک درزن کے ساتھ رہتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ میں نے تمہیں بتایا نہیں۔ ایک روز وہ اسکولی بچّوں کی طرح اپنے دیہاتی۔ جی ہاں دیہاتی کارناموں کی ڈینگ مار رہا تھا: تم پیدائشی پاکباز ہو جیسے کہ کسی کے بارے میں کہا جاتا ہے۔ تم پیدا ہی ادھیڑ ہوئے تھے اور کبھی اپنی عمر کم نہیں کر سکو گے اور نہ ہی نوجوان بن سکو گے۔ تم، جارجز بنے ہی کلیسا کے محتسب اور نارِ جہنم کے لیے ہو۔" اس نے کہا " میں گرم ملک اسپین کا رہنے والا ہوں۔ بوگو رودزا۔ بوگو رودزا۔ چلّانے والے ان سلاو لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کنواری مریم کے سامنے آنسو بہاتے رہتے ہیں۔ ذرا تم مجھے روز کے ساتھ دیکھو۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ درزن ہے لیکن کیا گول مٹول گرم گرم اور اندر سے کیسی شاندار ہے وہ!" میں اس کے الفاظ دہرا رہا ہوں "تذلیل" جارجز نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔" بڑی خراب چیز ہے۔ آپ جب یونیورسٹی کے پروفیسر رہ چکے ہوں، اچھی تنخواہ پاتے رہے ہوں۔ اپنی زبان، مادری زبان کی حمایت میں چاہے وہ کے ٹے لین ہو یا سَرو، بال گاچے ہو ایک پرزور تقریر کرنے کے جرم میں اپنے ملک کو چھوڑنے پر مجبور کر دیئے گئے ہوں۔ ماں باپ، بھائی، بہن اور اپنے چرچ سے بھی دور پردیس میں بچّوں کو پڑھا کر گزر بسر کر رہے ہوں تو..." وہ لمحہ بھر کے لیے چپ ہو گیا اور پھر کہنے لگا "اس صورت میں آپ کے ساتھ اور کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن میڈلین کا اس پر بڑا اچھا اثر پڑ رہا ہے۔ شاید بدھ مت بھی کچھ لوگوں کے لیے اچھا ہے!" اس نے اعلان کیا اور ہنس پڑا۔

مجھے جارجز کی یہ نئی، آزادانہ کھلی ہنسی اچھی لگی۔ کیتھرین صرف پچھ لگّو ہو کر ہی نہیں رہ جائے گی۔ وہ اس سلاو کے دُکھی دل کو کچھ خوشی بھی عطا کرے گی۔ الیوشا کرامازوف کو خوشی ملنے کا کافی امکان ہے...

اس طرح میڈلین کا پالی سیکھنا جاری رہا۔ اس کی سنجیدگی اور بھی گہری ہو گئی۔ میرا خیال ہے کہ جزوی طور پر اس کی اپنی زچگی کے باعث کیونکہ عورت جب اپنے اندر ایک بچے کی نشوونما کر رہی ہوتی ہے تو وہ اپنے آپ کو کچھ زیادہ ہی سنجیدہ اور ذمہ دار یہاں تک کہ ذہنی طور پر بوجھل محسوس کرتی ہے۔ اور جزوی طور پر اس کی اپنی فطری افسردگی کے باعث۔ ایسا لگتا تھا ہم اب آپس میں خوب گھل مِل گئے تھے کیونکہ اب ہم لفظوں اور اشاروں میں گفتگو کم کرتے تھے اور خاموشیوں کے توسّط سے زیادہ کچھ ایسا جانتی تھی جو وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔ شاید ہاتھی یا بیل نے یہ سب اسے بتایا تھا۔ وہ اکثر کچھ بتاتا رہتا تھا ایک خاص قسم کی خستہ تھرتھراہٹ کے ساتھ۔ ایک قسم کے ٹیلی گرافک کوڈ میں۔ جو ہر وقت اندر اندر گنگناتا ہوا لگتا تھا۔ اور جونہی آپ اسے چھوتے تھے، سہلاتے تھے اور اس کو محسوس کرنے کے لیے تک اپنا ہاتھ اس پر رکھے رہتے تھے تو پیغام آپ تک پہنچ جاتا تھا اور آپ کو اس کا پتہ چل جاتا تھا۔ بیل میڈلین کو بھی یہ پیغامات دیتا تھا جیسے میری چھٹی کب آئے گی کیونکہ میں صرف کبھی کبھی لکھتا تھا۔ یا پھر اس کا انسپکٹر جنرل کب اس کے کالج میں آئے گا۔ بعض اوقات بیل اسے خوشخبری بھی دیتا ہے۔ مثال کے طور پر کہ اس کے ہاں بیٹا ہو گا۔ یہ پی ار کے بارے میں تھا۔ یا لڑکی ہو گی جو ایکس کلار مند کے بارے میں تھا۔ کبھی کبھی یہ بُری خبریں بھی دیتا تھا۔ یہ بیل یہ سندی میرے مقابلے میں میڈلین کا زیادہ گہرا دوست تھا۔ اس سے زیادہ کھل کر باتیں کرتا تھا۔ اور پھر سندی تھا بھی تو پاروتی کا ساتھی۔ شِو کی تو وہ محض سواری تھا۔

مجھے یاد ہے، جیسے کل ہی مجھے بتائی گئی ہو کہ سامنے والے پلاٹ کے مالک نے جو دولت مند بننا چاہتا تھا اور جس نے اپنے پلاٹ کو اقتصادی مندے کے ختم ہونے تک خالی پڑا رہنے دیا کیونکہ کوریا کی جنگ کے کارن زمین کے بھاؤ گر گئے تھے ایک روز منافع کمانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ ایک بے اولاد ریٹائرڈ ٹالوی فروٹ مرچنٹ تھا اور جب تک وہ کچھ کر سکتا تھا۔ ایسے کرتے رہنا بہتر سمجھتا تھا، اس لیے مسٹر سکار لیٹی نے اپنے آپ سے کہا" مجھے اس پتھر کو کاٹ کر صاف کر دینا چاہیے۔ ممکن ہے میں اس پلاٹ کو اس انگریز عورت کے ہاتھ

بیچ سکوں جس نے ابھی ابھی سامنے کا وِلا ٹھہر بے خرید اہے"۔ میڈلین نے بتایا کہ جب اس نے پتھر پر اپنی چھینی رکھی اور ہتھوڑا چلانا شروع کیا تو کس طرح دو پرندے، دو چڑیاں "انگلیوں جیسی بڑی اور گہری دھاریوں والی دو چڑیاں" چوں چوں کرتی شور مچاتی کھڑکی تک آگئیں اور اس وقت تک وہاں سے نہیں اٹھیں جب تک میں اٹھ کر کھڑکی تک نہیں گئی۔ میں نے دیکھا۔ وہ وہاں تھا۔ مسٹر سکارلیٹی اور مسلسل ہتھوڑا چلاتا جا رہا تھا۔" میرا دل لہولہان ہو گیا"۔ میڈلین نے بتایا۔" مجھے لگا کوئی بڑی بھیانک خوفناک بات ہونے والی ہے"۔ لمحہ بھر کے توقف کے بغیر وہ دوڑ کر مسٹر سکارلیٹی کے پاس گئی اور اس سے کہنے لگی "آپ جانتے ہیں یہ بھاری بھرکم بڑا سا پتھر یہیں ہائے دروازے پر اچھا لگتا ہے۔ آپ اسے ایسے ہی رہنے دیں۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا۔ ذرا دیکھئے اس کی شکل کتنی اچھی لگتی ہے"۔ "مادام راماسوامی" اس نے جواب دیا۔ "میں خالی آدمی ہوں۔ میں نے سوچا کیوں نہ اس انگریز عورت کو یہ پتھر بیچ کر پیسہ کمایا جائے۔ لیکن چونکہ آپ کہہ رہی ہیں میں اسے چھوڑ دیتا ہوں ویسے بھی اس قسم کے پتھر توڑنے کی میری عمر بھی نہیں رہی۔ میں کافی بوڑھا ہو گیا ہوں۔ دیکھئے، دیکھئے آدھ گھنٹہ پسینہ بہا کر میں نے کیا کیا ہے۔ ان ہاتھوں کو دیکھئے آپ"۔

"کیا آپ کے پتی واپس آ گئے۔ مادام راماسوامی!" بعد میں اس نے پوچھا۔

"نہیں ابھی نہیں"۔ میڈلین نے کہا "آپ کو پتہ ہے ان کے پتاجی کا دیہانت ہو گیا"۔

"ہاں مجھے پوسٹ مین نے بتایا تھا۔ آپ کے پتی بڑے اچھے آدمی ہیں۔ ہمیشہ سب پڑوسیوں سے دعا سلام کرتے ہیں۔ گھر میں کبھی ان کی آواز سنائی نہیں دیتی"۔

"آہ"۔ میڈلین نے احتجاج کیا۔ "آپ نے انھیں گاتے نہیں سنا۔ جب وہ غسل خانے میں گا رہے ہوتے ہیں تو ایسا لگتا ہے چھت اُڑ کر ان کے اپنے ملک میں پہنچ جائے گی"۔

"کیوں نہ ہوش ہوں وہ!" میری بیوی کہتی۔ "وہاں رہنے والے میاں بیوی بڑے اچھے لوگ ہیں اور کس قدر پڑھے لکھے ہیں۔ ان کے یہاں آنے والے لوگ بھی کس قدر دلچسپ ہوتے ہیں۔ اور وہ چونکہ اطالوی ہے اس لیے اسے غیر ملکی زبان سننا اچھا لگتا ہے۔ جب آپ انگریزی میں بات کرتے ہوئے ہماری کھڑکی کے پاس سے گزرتے ہیں تو

اسے گھر جیسا لگتا ہے۔"

"وشکریہ! مسٹر سکار لیٹی"

"شکریہ۔ شکریہ۔ مادام: کبھی آپ کو کچھ کھودنا ہو۔ کوئی پودا لگانا یا چنبیلی کی کاٹ چھانٹ کرنی ہو تو اپنے آپ سے کہئے۔" وہ رہا ہمارا پڑوسی، سکار لیٹی، مادام راما سوامی میں مادام ثریاں سے کہہ رہا تھا کہ آپ کو چنبیلی کی تھوڑی چھٹائی کر دینی چاہیے۔ تاکہ بہار کے موسم تک یہ بڑی ہو جائے اور گرمیاں شروع ہونے تک آپ کے لیے 'کنج' بن جائے۔ بہرحال آپ سے بات کر کے بڑا اچھا لگا۔ مادام۔ جب آپ اپنے پتی کو خط لکھیں تو ہماری طرف سے بھی آداب کہیں۔"

مادام سکار لیٹی انھیں کھڑکی سے دیکھ کر چلائی تھی "آداب مادام کیا سہانا موسم ہے۔ ابابیلیں اڑ رہی ہیں ہوا میں۔"

میڈلین نے آکاش کی طرف دیکھا اور اسے یہ دنیا بڑی خوبصورت لگی۔ بیل بچ گیا تھا۔ اس کے سر پر چوٹ آئی تھی اور میڈلین نے بتایا اس نے اسی رات چھید میں زیتون کا تیل ڈال دیا تھا تاکہ پتھر اس کو جذب کرلے اور کالا ہو جائے۔ میں جب ہندوستان سے لوٹا تو پتھر کا چھید ابھی باقی تھا لیکن بسوّنا بیل پر مخصوص ذات کے نشان کے طور پر مبارک لگ رہا تھا میں نے شو مندروں میں نندی کو ان گنت بار دیکھا ہوگا اور اس بیل کو بھی اپنے ہندوستانی جیسا دکھنا ضرور اچھا لگتا ہوگا۔ کیا ہندوستانی بیل پروان سل بیل میں کوئی فرق ہے۔ ہمارے بیل نے بسوّنا بیل کی طرح سر ہلایا اور بولا "نہیں۔"

اس طرح سکھ دکھ کی خبریں میڈلین کو نیک دل بیل کے توسط سے ملتی تھیں۔ وہ ان کو سمجھ لیتی تھی جیسی جیسی عورتیں اپنے کارڈ پڑھ لیتی ہیں۔ کسی پچھلے جنم میں میڈلین ضرور ایک ہندوستانی عورت رہی ہوگی۔ اس بات میں کوئی شک نہیں۔ اس بات میں اس کا پکا وشواس تھا اس لیے ہماری شادی کی سچائی اور اس کے امر ہونے میں اس کا اور بھی گہرا وشواس تھا۔ ورنہ وہ کہتی تھی کوئی وجہ نہیں کہ ریاست میسور کے مقام ہری ہر پورا سے ایک آدمی آئے اور رویاں۔ سیاں تراں کی ایک ایسی لڑکی سے شادی

نے شادی کرلے جو انجنیئر کی یتیم بیٹی ہے۔ اور سیاں تزاں کے سولسٹر اور میونسپل کونسلر کی بھتیجی ہے۔ بلاشبہہ میں خود تپنر جنم میں یقین رکھتا تھا۔ کیسے نہ رکھتا لیکن اس سے میری ہر بات واضح نہ ہوتی تھی۔ کوئی وقت آئے گا جب میں انگلستان میں ایلم کا پیڑ بن جاؤں گا۔

میں مکمل ایمانداری سے کام لوں گا۔ اس کے برعکس کچھ کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔ موسم بہار کے شروع شروع کے دنوں میں جب پرندے لوٹ رہے تھے۔ میرے پتاجی کو مرے ابھی ایک برس ہوا تھا تو میں نے کم وبیش محسوس کیا کہ دھرتی نے کس طرح خوشی سے آگے بڑھ کر پیڑوں میں پھیلتے ہوئے رس اور چمکیلی شفاف اور عظیم دھوپ کی واپسی کا سواگت کیا۔ مجھے اپنے سامنے پھیلی ہوئی بے پناہ وسعتوں اور ہندوستان کے اپنے سفر کا خیال آیا اور میرا دل کسی بے نام افسردگی سے معمور ہوگیا۔ سارے کا سارا آسمان اور ایک خوشیوں بھری دھرتی مل کر دکھوں کی ایک سلطنت کی طرح تھے۔ جیسے کہیں دھرتی کو ایک ایسے ڈرامے کے طور پر تصور کیا گیا ہو جسے کسی الگ تھلگ سرنگوں، بغیر وقوع آسمانی صحیفے میں کھیلا گیا ہو۔ وہ سب کچھ جو آپ کو بہت عزیز تھا آپ کے دل کے سب سے زیادہ قریب تھا، جو اپنے سانسوں میں آپ سے گفتگو کرتا تھا۔ جو آپ کے زخموں کے لیے مرہم تھا۔ آپ کا بوجھ اٹھانے والا تھا آپ کی بات سنتا تھا۔ آپ کے دکھوں کو اپنا لیتا تھا۔ وہ سب اب بے اثر ہو چکا تھا۔ مر چکا تھا۔ ان دنوں راتوں کو میں میڈلین کو ایسی گرمجوشی اور ملائمت سے اپنے سینے کے ساتھ لگاتا جیسے ماں اپنے بچے کو لگاتی ہے۔ اگر ممکن ہوتا تو میں اسے اپنی چھاتیوں سے دودھ بھی پلا دیتا۔ اب یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ حاملہ بیویوں کو ان کے مائکے میں ان کی ماؤں کے پاس کیوں بھیج دیا جاتا ہے۔ جس طرح بوتل میں بھری ہوئی شیمپین کو اپنی جوانی کے دن یاد ہوتے ہیں اسی طرح ہونے والی دادی نانی بھی ممتا کے ایک نئے تجربے سے گزرتی ہے اور اپنے بچے کو درد سے چھٹکارا دلاتی ہے۔ وہ اپنی موٹی گول مٹول بیٹی کو کاجو اور بیر کیا، بنگالی چنے کا بیاسن، اور املی کی تیکھی مزیدار چٹنی کھلاتی ہے۔ شام کے لیے مراٹھی 'مکل'، دھنیا اور الائچی والی بینگن کی ترکاری بناتی ہے اور تین دن میں ایک بار پیاز کا سالن جس کی مہک رسوئی گھر میں بجھائی

چٹائی تک پھیل جاتی ہے۔ حاملہ بیٹی جہاں لیٹی یا بیٹھی ہوتی ہے، عام طور پر وہ وہیں سب کچھ کھاتی پیتی ہے اور جب اسے زچگی کے لیے لے جاتے ہیں تو نوزائیدہ بچّے کا رونا کتنا بھلا لگتا ہے۔ ایک لمبی ٹوٹے کانچ جیسی آواز لیکن مسرور، نئی اور زندگی بخش۔ ہاتھ پاؤں نو بہ نو، تازہ بہ تازہ اور مکمل ہو جاتے ہیں۔ پیٹ میں خالی پن محسوس ہوتا ہے اور نتھنوں میں لہسن اور سپاری کی مہک بھر جاتی ہے۔ کاش میڈلین کی ٹانگیں دبانے والا میں ہوتا، کاش میں اپنی مرضی کے مطابق اس کی دیکھ بھال کر سکتا۔

بہرحال پیار اور دُکھ انسان میں ایسا کھلاپن ایسی قربت پیدا کر دیتے ہیں کہ ایک سطح پر ایک جیسے لگنے لگتے ہیں۔ یعنی اگر میڈلین مجھ سے پوچھتی جیسا کہ وہ اکثر کرتی تھی اپنی گہری نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے "رام مجھے بتاؤ، ہاں مجھے بتاؤ کیا تم مجھ سے پیار کرتے ہو؟" تو میں جواب میں کہتا "میری پیاری، میری جان۔ دیکھ نہیں رہی ہو تم میں تمہارے کس قدر قریب ہوں۔ جو کچھ تمہارے اندر پل رہا ہے وہ میرا ہے۔ میں جو اپنا ہوں اور تم میڈلین۔ سچائی کا حقیقت کا ٹکڑا ہو۔ ٹھیک اسی طرح جیسے سورج چاند اور ستاروں کی وسعت ہوتی ہے۔" ایسا کہنا بالکل صحیح ہوتا اور ایسا کہہ کر میں نے کسی کو دھوکا بھی نہیں دیا ہوتا۔

میڈلین کے ساتھ لیٹے ہوئے ساوتری کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے کسی قسم کا پچھتاوا، کسی قسم کی پابندی یا ممانعت کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ نہ ہی میں یہ محسوس کرتا تھا کہ ساوتری کے بارے میں سوچتے ہوئے میں اپنے ہی دکھ میں گھلتا جا رہا ہوں۔ ساوتری وہاں تھی۔ مجھ میں نہیں بلکہ میرے ہی روپ میں! وہ کچھ ایسی چیز نہیں تھی جو مجھ سے دور، غیر حقیقی اور مدوّر خلا کی سرزمین کی رہنے والی تھی بلکہ وہ تو مجھے کبھی دھندلی نہ ہونے والی روشنی کی طرح لگتی تھی۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ اسے کہاں جانا ہے۔ وہ اسی متواتر اور مسلسل آواز کی طرح تھی جس کا ذکر شاستروں میں آتا ہے اور جو چیزوں کے سکوت، اولین لرزش، ابتدائی تکلّم میں ہوتی ہے۔ پرنو اوم خود بخود ظاہر ہوتا ہے جس سے ساری کائنات تخلیق ہوتی ہے۔ ساوتری ارتھ کا ارتھ تھی۔ شبد ارتھ تھی اور ہر چیز اسی سے سمجھی جاتی تھی کیونکہ وہ تھی۔ وہ ہے۔ وہ ہوگی۔

لیکن ہمارا زندگیوں کا تانا بانا۔ میری اور میڈلین کی زندگیوں کا تانا بانا اس تنظیم کے ساتھ ایک دوسرے کے لیے بُنا گیا تھا کہ ایک بھی غلط کام ایک بھی جذباتی لفظ ہمیں بدحواس کر کے رکھ دیتا۔ میڈلین کو مارنے کے لیے مجھے صرف ایک جھوٹ بولنے کی ضرورت تھی۔ ایسا لگتا تھا ہم کسی ایسے طلسماتی وجود میں داخل ہو گئے ہیں جو نیلے اور خالص شیشے کا بنا ہوا ہے اور ہم اس کے اندر سانس لے رہے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے روبرو ایسے سانس لیتے تھے جیسے سانس لینے کے عمل میں ہم جتنا بھی آسکتے تھے ایک دوسرے کے قریب آجاتے تھے۔ میڈلین کے ساتھ سانس لیتے ہوئے کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں اس پر کسی دوسرے کا سانس چھوڑ رہا ہوں۔ ایک جانی پہچانی موجودگی۔ ساوتری کا نرم، رحم دل ہاتھ غالباً وہاں موجود ہوتا تھا۔ اور میں وہاں اجنبی تھا۔ احتیاط سے آہستہ سے جب میں اپنا ہاتھ ہٹا کر اپنے بستر میں آنے کی کوشش کرتا تو ساوتری بڑی نرمی سے مجھے اس طرح دباتی، بھینچتی جیسے کہہ رہی ہو: "میرے پیارے۔ میرے پیارے مت جاؤ۔"

ایک روز بیٹھ کر میں نے کیتھرین کو خط لکھا۔ میں نے اسے آنے کے لیے کہا۔ میں نے سوچا وہ یہاں آئے گی تو اچھا لگے گا۔ وہ بھی مجھے یقین تھا جارجز سے دوبارہ مل کر خوش ہو گی۔ پیار میں دن اور خالی پن بڑے درد و کرب میں گزرتے ہیں۔ میں نے میڈلین سے اس خط کا ذکر نہیں کیا اور کیتھرین ایسا لگتا تھا چچا چارلس کو یہاں آنے کے بارے میں رضامند کرنے میں کچھ دقت محسوس کر رہی ہے۔

ایک ہفتے کے بعد جب کیتھرین آئی تو اس نے بتایا: "ہم ہندوستانی نہیں ہیں۔ چچا چارلس کا کہنا ہے کہ تم ہر وقت اپنی کزن کے یہاں جا کر نہیں رہ سکتیں۔ یاد رکھو تم اس کے یہاں ایک مہینہ پہلے ہی رہ چکی ہو۔ وہ کوئی لکھ پتی نہیں ہیں میری بیٹی۔"

مہمان نوازی کے بارے میں یہ رویّہ میری سمجھ میں آگیا تھا۔ لیکن اس کے کارن مجھے بہت دُکھ اٹھانا پڑا۔ پتاجی کہا کرتے تھے: "جو مہمان آئیں گے وہ دال بھات کھائیں گے اگر ہم انھیں بہتر کھانا مہیا نہ کر سکے اور اگر ہم ان کو ڈنلوپ کا بستر نہ دے سکے تو وہ چٹائی پر سو جائیں گے۔" کیتھرین جوان تھی اور وہ میرے حقیقی جذبات سے واقف تھی۔ یوں بھی یہ فطری تھا کہ وہ جارجز کے پاس واپس آجاتی۔ ایسٹر کے کچھ دنوں بعد ہی بہار کے

موسم میں ان کی شادی ہونے والی تھی۔ عارضی طور پر یہ فیصلہ کیا جا چکا تھا کہ تاکہ جارجز کے بوڑھے پتاجی بھی میونخ سے آسکیں۔

کیتھرین کہنے لگی "اور تم رام، میرے دھرم پتا اور جارجز کے اکلوتے بھائی کے روپ میں یہاں نہیں ہوگے۔"

"او کیتھرین" میں نے جواب دیا۔ "تم جانتی ہو پتاجی کی وفات کے بعد میری بہن کی شادی، ہمارے خاندان میں پہلی شادی ہے۔ اس کے علاوہ مجھے اب بھی دھندلی سی امید ہے کہ ممکن ہے اب بھی سروجا کو غلطی کرنے سے روک سکوں۔" لیکن یہ کہتے ہوئے بھی میں دل ہی دل میں جانتا تھا کہ جو تھا وہ تھا۔ اور سروجا غلط قدم اٹھا کر پیچھے نہیں ہٹے گی۔ یہ برا اشگن ہوگا۔

کیتھرین کار میں ہم سب کو میری نین ہوائی اڈے تک لے گئی۔ میڈلین پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی اپنی وسیع، حقیقی اور مغموم موجودگی کے ساتھ۔ جارجز اس کی بغل میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ لیزو، نیک لیز پہلے سے بھی زیادہ ایک اسکولی لڑکے کی طرح لگ رہا تھا۔ "آہ" وہ کہنے لگا۔ "کاش میں شمالی ہندوستانی جاکر بھوٹانی زبان سیکھ سکتا۔ اس زبان پر بہت کم کام ہوا ہے۔ صرف ریورنڈ فادر ٹیمپل سٹن کی چھوٹی سی ایک گرامر ہے جو ۱۸۸۲ء میں شائع ہوئی تھی۔" جارجز کو مجھ سے بچھڑنے کا واقعی دکھ ہو رہا تھا۔ میڈلین کچھ ایسے لگ رہی تھی جیسے نشے میں ہو یا پھر مالا پھیرنے والی کوئی نیک پاکباز عورت۔ بدھ مت نے اسے اپنے اندر جھانکنے کی ایک مخصوص بصیرت عطا کی تھی۔ ایک تحفظ دیا تھا بدبودار، باہر کی اور دوسری چیزوں سے ایک قدم شعوری قدم اٹھانے کی طاقت دی تھی ہندوستان میں جگہ بنانے کے لیے۔

جارجز اور جارجز کے لیے وہ جو بھی اہمیت رکھتی تھی اس سے اس کے وجود میں میری موجودگی کی تصدیق ہوتی ہے۔ ایئرپورٹ پہنچ کر جب ہم وہاں کے معمول سے گزر رہے تھے تو جارجز کہنے لگا "یہاں میں اس کا پورا خیال رکھوں گا۔" "ٹھیک ہے نا! ڈارلنگ" اس نے کیتھرین سے پوچھا جیسے یہ خیال اس کو کچھ دیر بعد آیا ہو۔ "میڈلین خوشخبری کے لیے

تیار رہے گی اور ہم بھی اچھی اچھی باتیں سوچیں گے "، کیتھرین نے سرگوشی میں کہا اور میڈلین کے پھولے ہوئے رخسار کو چوم لیا۔ زچگی چاہے کتنی ہی پوتر کیوں نہ ہو، تہذیب نے اسے بدنما بنادیا ہے۔ حاملہ ہو کر کسان عورتیں اتنی موٹی نہیں ہوتیں۔ چھوٹی ماں برتن دھو چکی تھی اور وہ گیلی ساڑھیاں بانس کے ڈنڈوں پر پھیلا رہی تھی جب دردِ زہ شروع ہوا اور ایک گھنٹے کے اندر اندر بچہ پیدا ہو گیا۔ سری دھر دنیا میں آگیا۔ ٹھیک ایسا ہی ہونا چاہیے۔

"میڈلین میں بہت جلد لوٹ آؤں گا" میں نے اس کو دیر تک نمسکار کرتے ہوئے کہا۔ میں نے سب کے سامنے کسی کو چوم کر اسے الوداع کہنا نہیں سیکھا تھا۔ سب کے سامنے میڈلین کا بازو تھام لینا بھی مجھے بڑا خراب لگتا تھا۔ لیکن ساوتری کے ساتھ معاملہ دوسرا تھا۔ جب جنگلہ پار کر کے منتظر ہوائی جہاز کی جانب چلا تو میں سوچ رہا تھا کیوں ایسا کیوں ہے دراصل کیوں ہے؟

ہوائی جہاز کے دروازے جب بالآخر بند ہو گئے تو مجھے احساس تھا کہ اب پہلے جیسا کچھ نہیں رہے گا۔ میڈلین کے ساتھ، میرے ساتھ، دنیا کے ساتھ جو ہوا تھا وہ بہت بڑا تھا اور اپنے آپ میں مکمل تھا۔ روم ساگر خوبصورت تھا۔ ریشمی ساڑھی کی طرح سبز اور دنیا زردوزی جیسی دھوپ سے سجی ہوئی تھی۔

انسان گھٹیا اور اوچھا نہیں ہو سکتا اور نہ اسے ہونا چاہیے۔ مارکس آرے لی اس کی وسعت اور اس کی فطری فہم و دانش مستقل اور آفاقی تھیں۔ سقراط کے افکار بھی ہمیشہ زندہ رہنے والے تھے۔ میں سوچنے لگا کس طرح اسکندریہ نے انسان کو علم طب، جغرافیہ اور مشرقی دانش کا درس دیا اور کس طرح اسکندریہ کے مشہور لائبریرین نے ہندوستان کے بارے میں ایک انسائیکلو پیڈیا مرتب کیا تھا۔ بٹالمی فلاڈل فس نے خود ڈاایونی سی اس کو اپنے سفیر کے طور پر پاٹلی پتر بھیجا تھا۔ کیونکہ ہندوستانی علم و دانش کی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی اور ڈایونی سی اس ذاتی معائنے سے اس سچائی کا امتحان کرنا چاہتا تھا۔ کلوپترا اور اس کے غصے کو بھول جاؤ اور کار تھیج کے بارے میں سوچو میں نے اپنے آپ سے کہا۔ بال ظالم تھا اور سیمی رمیز بھی لیکن خلیج فارس سے پرے آکاش کتنا پوتر

کتنا روشن تھا۔ تاریکی ایک کوہ قامت، فلک بوس تاریکی۔ گرم تاریکی ہندوستان اور یونان کے درمیان حائل ہوگئی تھی۔ لیکن رودم ساگر ایک ہندوستانی ایک برہمنی سمندر ہے۔ کہیں نہ کہیں رون کو بھی گنگا میّا کے اسرار سے شناسائی حاصل کرہی لینی چاہیے۔ ہندوستان میرا وطن میرے لیے سدا سدا کے لیے پوتّر ہے۔ ایسی خوبصورت شکل والے ملک میں پیدا ہونے سے ہی تمہیں احساس افتخار احساسِ دانش اور احساسِ قدامت سے سرفراز ہوجانا چاہیے" ایک بار میڈلین نے مجھ سے کہا تھا اور میں اس سے بالکل متفق تھا۔

وہ براعظم جو
ساگر کے اُتّر میں ہے
اور عظیم برفانی چوٹیوں کے جنوب میں ہے
وہ بھارت کی پوتر دھرتی ہے
یہ وہ دھرتی ہے جہاں بھرت کے جانشین آباد ہیں
نو لیوجن لمبے
جہاں سب کرموں کا پھل ملتا ہے
ان کو جو مکتی کی کھوج میں ہیں۔

جب ہمارا جہاز سانتا کروز کے ہوائی اڈّے پر اترا تو میں گائتری منتر کا جاپ کر رہا تھا۔ میں نے لگ بھگ پچھلے بیس برس سے ہر روز بلا ناغہ گائتری منتر کا جاپ کیا تھا اور لاکھوں بار یہ شبد دہرائے ہوں گے: "اوم بھور بھوہ سوہ..." اے زریں روئے حق، دھند (لاعلمی کی) دھند ہٹا دے تاکہ میں تمہارے سامنے آکر تمہارا دیدار حاصل کر سکوں لیکن اس بار میں نے آہستہ سے بڑی ملائمت سے منتر کا جاپ اس طرح کیا جیسے کوئی کسی اپنے سے، کسی زندہ انسان سے کسی جان پہچان والے سے بات کرتا ہے۔ میں ہندوستان کو دیکھنا چاہتا تھا، میرے وجود دروں کے ہندوستان کو، ٹھیک اسی طرح جیسے میں اب انتر کاشی یعنی 'اندر کے بنارس' کے درشن کر سکتا تھا۔ ہندوستان اب میرے لیے محض دھرتی کا ایک ٹکڑا، پیڑ، سورج یا بورڑوا یا قلی کے پلی جیسے ہاتھ، پتلی پتلی ٹانگیں نہیں رہا تھا۔ نہ ہی میرے لیے اب وہ کسی باوردی ہندوستانی اہلکار کے نئے غرور وانتہا جیسا تھا جو لگ بھگ یہ کہتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ "آپ دیکھتے نہیں ہیں۔ میں ہندوستانی ہوں اب اور جمہوریۂ ہند کا نمائندہ ہوں۔" ہندوستان اب میرے لیے ایک مختلف چیز بن گیا تھا۔ زیادہ مرکز پذیر، زیادہ پھیلا ہوا، زیادہ منکسر، انکسار صفت۔ جیسے دیوتا خود آکر دھرتی پر بس گئے ہوں۔ جیسے پیڑوں نے ہمارے دیس میں جنگلات کا روپ لے لیا تھا۔ ندیاں رواں تھیں اور اس روانی میں انھوں نے اپنا اپنا نام رکھ لیا تھا۔ پرندے اڑ کر اوپر اور اوپر چلے جاتے تھے۔ بادلوں کو چھونے لگے تھے اور ان سے بھی پرے چلے گئے تھے۔ وادیوں کے اوپر سے ایک دوسرے کو نام لے کر پکارتے ہوئے۔ برہما۔ پرجاپتی، ورُون، متر اور آریہ مان، اندر، کرشن، شِو، پاروتی، رام، ہریش چندر اور یاگیہ ولکیہ کا ہندوستان۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ ہندوستان ایک تسلسل ہے۔ ماوراۓ زماں فضائے بسیط میں اس بادل کی طرح جو کسی میدان کے اوپر گھر کے آتا ہے اور کہتا ہے: "میں آگیا ہوں اور اب برسوں گا" اور پھر

برستا ہی چلا جاتا ہے۔ اس بارش کے پانی نے ہمارے ذہنوں اور دلوں کو زرخیزی عطا کی اور چونکہ وہ قید زماں سے آزاد ہیں اس لیے ہمیشہ موجود ہیں۔ شاید انہیں معنوں میں ہندوستان ماورائے تاریخ ہے۔ دھرتی کا ایک ٹکونہ ٹکڑا جس کے تین طرف سمندر ہے کس طرح ماورائے زماں کی معنویت کو سمجھ گیا اور اسے اس انداز سے استحکام عطا کیا کہ آپ سنہرے زریں دائرے کو دھرتی کے میلوں اوپر دیکھ سکتے ہیں۔ جیسے ہی ہوائی جہاز خلیج فارس کی تاریکی کو چیرتا ہوا نکلتا ہے۔ آپ ایک موجِ زرّیں، ایک مہربان آسمانی سبز رنگ کا فیض محسوس کرنے لگتے ہیں۔ جسے آپ چھونا چاہتے ہیں۔ چکھنا چاہتے ہیں۔ دل و جاں میں بسا لینا چاہتے ہیں۔ آپ ایسا محسوس ہوتا ہے۔ یہ سب آپ کا ہی ہے چاہے آپ ہندوستانی ہوں یا چینی۔ یا فرانسیسی یا الاسکا یا ہونڈرا کے رہنے والے۔ یہ کچھ ایسا ہے جسے تاریخ نے اپنے لیے محفوظ کر رکھا ہے جیسے انسان اپنے لیے اپنے وجود کا کوئی علاقہ محفوظ کر لیتا ہے۔ جو جانا پہچا تو ہوتا ہے لیکن جس کو استعمال میں نہیں لایا جاتا۔ اس کا وجود کچھ ایسا ہے جو صرف مخصوص کمیاب لمحوں کے لیے ہوتا ہے۔ شفق کی سادگی میں شعر کے تنفس میں، ابعد از مرگ سکوت ہیں۔ عشق کی وسعت میں، گہری نیند کے اثبات میں۔ ایک غیر زمانی ایسا خطّ جہاں آپ اپنے آپ کو روبرو دیکھ سکتے ہیں۔

یہ وہ ہندوستان تھا جس کی ایک جھلک مجھے نظر آئی۔ لیکن کسٹم والوں کی آوازوں اور قلیوں کے شور میں سب کھو گیا۔ بمبئی کی بدصورتی سے مجھے ٹھیک اسی طرح تکلیف ہوئی جیسے غیر شخصی جھوٹ سے ہوتی ہے۔ لیکن میں نے تاج پہنچ کر جلدی جلدی غسل کیا اور ایک بار پھر سانتا کروز ہوائی اڈّے کی طرف روانہ ہو گیا۔ جہاں ہوائی اڈّے کے سبزے پر میں ایک بار پھر ہندوستان کے وجدان میں شامل ہو گیا۔ حیدرآباد کے سارے راستے میں میں نیچے کی پہاڑیوں، ریل گاڑیوں، میدانوں اور گاؤں کو دیکھتا رہا۔ ان ندیوں اور سڑکوں کو دیکھتا رہا جو زرد، عنابی اور سبز دھاریوں کے درمیان نہ ختم ہونے والی سفید دھاریوں کے روپ میں پھیلی ہوئی تھیں۔ جلد ہی میں حیدرآباد پہنچ گیا۔

مجھے یاد آیا کہ اس شہر کی بنیاد کیسے رکھی گئی تھی۔ اس کی کہانی یہ ہے کہ گولکنڈہ کا

بادشاہ بیمار تھا اور اپنے مشہور ہیرے جواہرات کے باوجود مفلس تھا۔ اس کا برہمن وزیراعظم ریاست کی مالی حالت کے بارے میں بڑا فکر مند تھا۔ چاروں طرف دشمن تھے۔ ایک طرف مغل تھے دوسری طرف مرہٹے۔ ایک رات جب وزیر اعظم عالم تشویش میں لیٹا ہوا تھا، بے چین اور اپنے بادشاہ کے بارے میں فکر مند تو اس نے سبز اور مور کے سے نیلے رنگ کی آسمانی رنگ کی روشنی کو پھیلتے ہوئے دیکھا۔ اس نے دیکھا ہیرے جواہرات سے سجی دیوی کا جلوس آسمان میں جا رہا تھا: "ہے دیوی، ہے منگل مئی مبارک دیوی آپ کون ہیں؟ اور آپ کہاں جا رہی ہیں؟" اس نے پوچھا "میں لکشمی ہوں" اس نے جواب دیا "میری منزل ہمالیہ پربت ہے، میں وہاں جا رہی ہوں، برہما کے پاس"۔ "ہے دیوی! کیا آپ ایک پل کے لیے، لمحہ بھر کے لیے، پلک جھپکنے تک کے لیے رُک سکتی ہیں تاکہ میں اپنے راجہ کو اپنے آقا کو بلا سکوں کہ وہ آپ کے سندر روپ کے درشن کر لیں"۔ "تم سنجیدہ ہو اور سچے ہو، تمہاری پرارتھنا سویکار ہوئی"۔ اس نے کہا۔ اس لیے وہ برہمن، پگڑی، کمر بند اور چست پاجامہ پہنے بھاگتا ہوا پہاڑی پر اپنے بادشاہ کے سامنے جا پہنچا۔ رات لامحدود اور خوب روشن تھی۔ "وہ وہاں کھڑی ہے۔ ندی کے پار۔ وہ ہمارا انتظار انتظار کر رہی ہے۔ میرے آقا۔ میرے سوامی آیئے تشریف لایئے"۔ حسن قطب شاہ اندر گیا اور جلد ہی کپڑے پہن کر ہاتھ میں تلوار اور ڈھال لیے باہر آ گیا۔ اس نے اپنے اونچے گول قلعے سے چمکتے ہوئے آسمان کی جانب اور ندی کے پار کے خطے کی طرف دیکھا جونہی برہمن اپنے آقا کو راستہ دکھانے کے لیے نیچے جھکا بادشاہ نے تلوار سے اس کے دو ٹکڑے کر دیئے تاکہ دھن دولت کی دیوی لکشمی اس کی سلطنت میں براجمان رہے۔ وہ اپنے سفید گھوڑے پر چڑھ کر دیوی کے پاس آیا اور یوں گویا ہوا۔ "ہے دیوی! ہے لکشمی میرا وزیر اعظم کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ میں نے اسے قتل کر دیا ہے تاکہ آپ سدا یہیں رہیں"۔ اور حسن قطب شاہ نے دیوی کے چار میناروں والا مندر بنوایا جو مسجد جیسا لگتا تھا اور وہ ہمارے ساتھ رہتی۔ دیوی آج تک ہمارے سکوں پر اس کا چہرہ جگمگاتا ہے۔ جی ہاں لکشمی کا۔ وہ بھاگیہ وتی ہے۔ اسی لیے ہم اپنے شہر کو بھاگیہ نگر کہتے ہیں۔ سندر

دھن دولت کا شہر۔ حیدرآباد تو محض ایک بھدّا ہم نام ہے۔

میں نے چھوٹی ماں کو اپنے پہنچنے کا دن اور وقت نہیں بتایا تھا۔ میں اچانک پہنچ کر سب کو حیرت میں ڈال دینا چاہتا تھا۔ اس خیال سے کہ ایسا کرنے سے ان کے دل سے فاصلے اور دوری کا اجنبیت کا، پرائے پن کا احساس مٹ جائے گا۔ میں لگ بھگ دوپہر کے وقت گھر پہنچا۔ گیٹ بند تھا۔ اور جب میں نے دروازہ کھولا تو کتّے ٹائیگر نے کافی غصّے کا اظہار کیا اور پھر وہ میرے سامنے بے یارو مددگار چت لیٹ گیا۔ معافی مانگنے لگا۔ "گھر کا مالک لوٹ آیا تھا"۔ میں نے دیکھا باغیچے کی ٹونٹی کی مرمت کروانا اب بھی باقی تھا اور جیسے ہی میں زینہ چڑھ کر اوپر گیا اور میں نے گھر کے اندر جھانکا گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر پوجا گھر سے چھوٹی ماں کی آواز آئی۔ "کون ہے؟" ان کی آواز سے میں جان گیا کہ وہ پوجا کر رہی تھیں۔ "تمہارا بیٹا گھر لوٹ آیا ہے!" میں نے چلّا کر جواب دیا۔ اور آپ چھوٹی ماں کی سسکیوں کی آواز دروازے کے پاس کھڑے بھی سن سکتے تھے۔

"تم آ گئے" وہ بولیں اور اس وقت وہ چونکہ پوجا کے لباس میں تھیں اس لیے انھوں نے مجھے چھوا نہیں۔ میں اپنا سامان اندر لے آیا کیونکہ گھر کے ملازم دوپہر کے کھانے کے بعد آرام کر رہے تھے۔ میں نے ٹیکسی کو لوٹا دیا اور نہانے کے لیے گھر کے جانے پہچانے گرم کائی بھری دیواروں والے غسل خانے کی طرف چل دیا۔ میں نے دیکھا ہمیشہ کی بھرتیلی چھپکلیاں سامان رکھنے کے کمروں میں ہر جگہ موجود تھیں۔ میں نے یہ دیکھنے کے لیے پچھواڑے کے صحن میں جھانکا کہ پپیتے اور امرود کے پیڑوں پر پھل آئے ہیں یا نہیں۔ میں نے غسل خانے کا بڑا کلسا اٹھایا اور "گنگا، جمنا، سرسوتی" کہتے ہوئے اپنے اوپر پانی ڈالا اس کے بعد دھوتی پہن کر میں پوجا گھر میں چلا گیا۔ چھوٹی ماں اب بھی پاٹھ کر رہی تھیں ٹھاکر جی پھولوں کے ڈھیر سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ٹھاکر جی کی صندوقچی وہی تھی جو دادا کنٹّا بنارس سے لائے تھے۔ اور اس میں سے چھوٹی ماں نے مجھے دینے کے لیے خاندانی کھلونے نکالے تھے۔ اپنے پتاجی والی چوکی کھینچ کر میں چھوٹی ماں کے پاس بیٹھ گیا اور نانا رمنّا کے بارے میں سوچنے لگا جن سے مجھے شو پاروتی کے تئیں بھگتی اور اوتاروں

کی پوجا اپاسنا ملی تھی۔ جنھوں نے سب سے پہلے میرے کان میں گائتری منتر پھونکا تھا۔

"ادم بھوُر، بھوہ سوہ..."

سری دھر جاگ گیا۔ میں نے چھوٹی ماں سے کہا کہ وہ اپنا پوجا پاٹھ جاری رکھیں اور میں سری دھر کا پالنا جھلانے لگا۔ مجھے پیاری سی ایک لوری یاد آگئی جسے گاکر میں سرو جا کو سلایا کرتا تھا اور میں وہی لوری سری دھر کے لیے گانے لگا۔

بچّے! ہنس پالنا جھلا رہا ہے
دھیرے دھیرے کہہ رہا ہے "میں وہ ہوں، میں وہ ہوں"
وہ اچھی طرح جھلا رہا ہے
سب کام چھوڑ کر، گھنٹوں گھنٹوں!

سری دھر کو اس بارے میں کوئی شک نہیں تھا کہ پالنے کے پاس کون تھا جو بھی تھا وہ اس کی ماں تو نہیں تھی۔ وہ چلّانے لگا اور جب تک چھوٹی ماں نے آکر اسے چپ نہیں کرایا وہ چلّاتا رہا۔ گھر میں ایک بار پھر دوپہر کا سنّاٹا چھا گیا۔ "آج سنیچر وار ہے اور تم رام کتھا کے لیے بالکل ٹھیک وقت پر پہنچے ہو،" چھوٹی ماں بولیں اور مجھے اپنے پاس بٹھا کر انھوں نے ایک بار پھر مجھے رام کتھا سنائی۔

"ایک دفعہ ایک برہمن تھا۔ اس نے اپنے آپ سے کہا "اومیں بوڑھا ہو رہا ہوں، میں بنارس جانا چاہتا ہوں۔" اس نے اپنے بیٹے کو بلایا اور کہنے لگا:

"بیٹا برہم بھٹ۔ میں بوڑھا ہو رہا ہوں، میرے بال سفید ہو چلے ہیں اور میرا جسم کیلے کے چھلکے کی طرح سوکھ گیا ہے۔ اب مجھے بنارس جانا چاہیے۔ اپنی ماں اور گھر کے مویشیوں کا خیال رکھنا اور میں تمھارے لیے دس کھمبوں والا یہ مکان، زرخیز کھیت اور اور اپنی نیک نامی چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ بیٹا۔ بارہ برس تک ان کی دیکھ بھال کرنا۔"

برہم بھٹ نے کہا "جیسا پتا جی کا حکم ہے ویسا ہی ہوگا۔" برہمن نے اپنی بیٹی بھاگیرتھی کی طرف مڑکر کہا "میری پیاری میں ہو آتا ہوں۔" بیٹی روئی اس نے بہت سی نیک التجائیں کیں اور کہا "ٹھیک ہے لیکن اس بیٹی کا کیا ہوگا؟ پتا جی بولے۔" اسے مجھے دے دو میں راستے

میں اس کا بیاہ کر دوں گا۔" انھوں نے اپنی بیٹی کو کندھے پر بٹھایا۔ وہ صرف سات برس کی تھی۔ آگے آگے سنگیت تھا اور وہ بانسری کی دھن اور گھر کے بزرگوں کے ساتھ گاؤں کے دروازے تک آیا۔ گاؤں کے لوگ روئے اور انھوں نے الوداعی رسمیں ادا کیں۔ پتنی اپنے سوامی کے پیروں میں گر پڑی اور کہنے لگی "میرے سوامی بنارس جا رہے ہیں۔ اجداد کی روحوں کو سکون دینے کے لیے" پھر پوچھنے لگی "اس بیچ ہم کیا کریں؟" برہمن بولا "میری پیاری، میری اردھانگی، گھر کو صاف ستھرا اور پوتر رکھنا۔ بیٹا گھر کی اور مویشیوں کی دیکھ بھال کرے گا۔ اور جب سنیچر کا دن آئے تو رام کتھا کا پاٹھ کرنا۔" اور بیٹا اپنے پتا ایشور بھٹ کے قدموں میں گر پڑا اور کہنے لگا "ہاں ایسا ہی ہوگا پتا جی!" وہ سب گاؤں کے دوار پر کھڑے تھے جہاں سڑک وسنت رتو میں جھولنے والے جھولے کے مندر اور آم کے دیوقامت پیڑ کے پاس مڑ گئی تھی۔ پھر ایشور بھٹ چلا گیا۔ پہاڑیوں اور ندیوں کے پار چلا چلا گیا۔ بنارس جانے کے لیے۔

"جب ایشور بھٹ بنارس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ برہم بھٹ نے اپنی بھاگیرتھی سے کہا "جب سنیچر کا دن آئے گا تو ماں ہم رام کتھا کا پاٹھ کریں گے۔" اس نے چاروں طرف دیکھا۔ گھر برتنوں اور سجاوٹوں سے جگ مگ کر رہا تھا اور مویشی باڑے میں ڈکرا رہے تھے۔ کسان آ جا رہے ہیں۔ کچھ دھان تول رہے تھے۔ دوسرے کونپلیں اور بیلیں کاٹ چھانٹ رہے تھے۔ کچھ پانی کھینچ رہے تھے اور دوسرے ہل کے پھل تیز کر رہے تھے۔ نوکرانیاں گوبر سے فرش پوت رہی تھیں۔ بھاگیرتھی دہلیز پر سندور چھڑک رہی تھی اور گھر کے بڑے دروازے کے سامنے کنول کے پھولوں اور منڈلوں کے کئی کئی اور بڑے اور بھرپور شمس کی شکل کے زائچے بنا رہی تھی۔

"یاتری اپنی یاترا پر جا چکا تھا۔ جب کچھ کوس چل چکا تو ستانے کے لیے رک گیا۔ اس نے کھانا پکایا۔ پرارتھنا کی۔ کھانا کھایا۔ اپنی بیٹی کو کھلایا اور جب شام ہوئی تو وہ سندھیا وندنا ئیں کرنے لگا اور پھر اپنا بستر بچھا کر، بھگوان کا نام لیا اور سو گیا۔ صبح اٹھ کر وہ کانپتا ہوا ندی تک گیا۔ نہایا۔ بیٹی کو نہلایا اور پھر اسے مندر لے گیا۔ اور سورج نکلنے

سے پہلے ہی وہ دوبارہ اپنی یاترا پر چل پڑا۔

وہ کوس پر کوس طے کرتا گیا۔ ایک ایک کر کے دن گزرتے گئے۔ دن ہفتوں میں اور اور ہفتے مہینوں میں بدلتے گئے۔ جب وہ نربدا ندی کے کنارے پر پہنچا تو اس نے ایک سنیاسی کو سمادھی میں دھیان مگن دیکھا۔ وہ سنیاسی کے پاس گیا۔ اس کے قدموں میں بار بار سجدے کیے اور پھر ایشور بھٹ کہنے لگا "آپ قابلِ پرستش ہیں۔ پوجا کے یوگیہ ہیں شریمان۔ لیکن آپ بالکل اکیلے ہیں۔ میری ایک لڑکی ہے بیاہ کے لائق۔ کرپا کر کے آپ میرا داماد بننا قبول کیجیے۔" جواب میں وہ قابلِ پرستش سنیاسی بولا "میں پتنی کا کیا کروں گا؟ مجھے تو ابھی اپنی پانچوں تپسیائیں کرنی ہیں۔" اس کے جواب میں ایشور بھٹ بولا "نہیں شریمان ہر شخص کے لیے شادی کرنا اور گھر گرہستی بسانا ضروری ہے تاکہ یگیہ تو پورا ہو جائے۔ شریمان ایک گرہستی کے فرائض پورا کیجیے۔" اس پر سنیاسی بولا "تتھاستو، تتھاستو۔" یہ سن کر ایشور بھٹ نے ہتھیلی میں تلسی کے پتے اور جل لے کر پوجنیہ سنیاسی کو بیٹی کا دان دے دیا۔ "اب میں جاتا ہوں" ایشور بھٹ بولا۔ بیٹی اور جمائی دونوں سدا سکھی رہو۔" اور ڈوبتے ہوئے سورج کی طرف دوڑتا ہوا وہ چلا گیا۔ دور بہت دور۔

"اس طرح چلتا ہوا وہ ایک اکیلے مکان پر پہنچا اور دروازہ کھٹکھٹا کر بولا میں ایک یاتری ہوں دیوی! ایک تیرتھ یاتری" اور گھر میں رہنے والی عورت نے جواب دیا "او کیسی شبھ بات ہے یہ۔ گھر کے سوامی تیرتھ یاترا پر نکلے ہوئے ہیں۔ بارہ باس یا اس سے بھی زیادہ مدت ہو گئی لیکن اب تک لوٹے نہیں اور میں روتی رہتی ہوں" اور وہ رونے لگی۔ "روؤ مت دیوی۔ روؤ مت۔" ایشور بھٹ بولا اور جب کھا پی آرام کر چکا تو اس نے اسے بلا کر رام کتھا سنائی اور پھر وہ اس طرف چل پڑا۔ جہاں سورج غروب ہوتا ہے جی ہاں! ایشور بھٹ ٹھیک اسی سمت چل پڑا۔

جب وہ میلوں میل چل چکا تو دن میں گرمی کی تپش اور رات میں ٹھنڈک بڑھ گئی لیکن وہ پھر بھی چلتا رہا۔ بنارس کی طرف چلتا ہی رہا۔

"جب وہ دور بہت دور جا چکا تو گیہوں کے ایک کھیت میں پہنچا۔ ایک آواز آئی "یاتری رک جا!" وہ رک گیا۔ کھیت کا مالک ایک بوڑھا آدمی تھا اور وہ اندھا تھا۔ اس کا بیٹا ایک سفر پر نکلا ہوا تھا اور کئی مہینوں سے اس کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ اس کی بیوی اور اس کا باپ اس کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ اس بیچ میں کھیتوں میں جھاڑ جھنکاڑ اُگ آئے تھے اور طوطوں نے کھیتوں پر قبضہ کر رکھا تھا۔ طوطے تعداد میں بھی بہت زیادہ تھے۔ "بوڑھا باپ مچان پر بیٹھ کر شور مچاتا رہتا ہے،" بہو نے بتایا "لیکن طوطے ایسے چالاک ہیں کہ چاروں طرف سے دھاوا بول دیتے ہیں اور پتاجی دیکھ نہیں سکتے۔" ایشور بھٹ وہیں بیٹھ گیا اور انھیں رام کتھا سنائی "رام! رام ہمیں دولت عطا کرو شان و شوکت دو۔ ہمیں آٹھوں مبارک خوشحالیاں دو، ہمیں جانشین دو، گھر دو، ایک محفوظ جگہ، زمین اور باغ دو، جو دور دلیس کو گئے ہیں وہ لوٹ آئیں۔ جسم مضبوط ہو اور معصوم نردوش ہو۔ اندھے کو آنکھیں، لنگڑے کو ٹانگیں اور گونگے کو زبان دے رام! ہے سری رام۔ ہمیں درشن دو اور ہمیں آشیرواد دو" اور بہو کو مخاطب کرتے ہوئے ایشور بھٹ بولا "بیٹی! ہر سنیچر وار کو رام کتھا کا پاٹھ کرو۔ اس سے تمہارا کلیان ہوگا" ان کے بہت سے اور کئی قسم کے تعریفی کلمات کے بعد وہ وہاں سے چل دیا۔

جب وہ دور، بہت دور چلا گیا تو جنگل میں ایک کھلی چراگاہ میں پہنچا۔ جب وہ وہاں بجلی کی چمک اور بادلوں کی گرج، گڑگڑاہٹ کے درمیان وہ دکھائی دیے۔ وہ کھڑے تھے۔ رام، سیتا، لکشمن، بھرت، شتروگھن۔ اور ان سب کے پیچھے کھڑا تھا رام بھگت ہنومان۔ سارے ماحول میں سنگیت تھا۔ اور بھگوان رام کے چہرے پر پوتر روشنی براجمان تھی۔ ہوا میں پھول اور پنکھڑیاں اُڑ اُڑ کر زمین پر برس رہی تھیں۔ ایشور بھٹ نے ڈنڈوت پرنام کیا اور اٹھا۔ جب وہ کھڑا ہوا تو کرپا ندھان نے اسے آشیرواد دیا اور کہا "تمہاری تیرتھ یاترا پوری ہوئی۔ اب تیرتھ یاتری کو اپنی گھر گرہستی میں لوٹ جانا چاہیے" تب بھگوان کے درشن کا دھیان کرتے ہوئے ایشور بھٹ جنوب کی طرف مڑا۔ دل میں بھگوان کی دیا سموئے ہوئے اور اسے ساری دنیا۔ پوترتا اور روشنی اور شرافت سے معمور نظر آئی۔

"اب جب واپس لوٹتے ہوئے وہ اندھے کسان اور اس کے کھیتوں کے پاس پہنچا۔ اسے دیکھ کر بہو بولی "، ہے شریمان برہمن، ہے شریمان برہمن! آپ کے درشن دوبارہ کرنا کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ آپ کے مکھ پر کیسی پوِتر تا ہے۔ جیسے ہی رام کتھا سنا کر آپ گئے تبھی سے میرے سسر جو پچھلے برس سے اندھے تھے ان کی آنکھوں کی روشنی لوٹ آئی۔" وہ رہے، وہ رہے طوطے!" اُس نے کہا۔ اب وہ طوطوں پر غلیل چلاتے ہیں اور طوطے اڑ جاتے ہیں۔ شریمان ہم نے اُتر اور پچھم کی سمت سنتری کھڑے کر رکھے تھے تاکہ جونہی تیرتھ یاتری واپسی پر ادھر سے گزرے تو اسے معزز مہمان کی طرح گھر لایا جائے۔" آیئے براجیے۔ آسن گرہن کیجیے۔" اور بہو نے پتّے بچھا کر چاندی کے برتنوں میں اس کے سامنے کھانا پروس دیا۔" ایشور بھٹ یہ سب دیکھ کر بولا "عمدہ، بہت عمدہ"، جب وہ کھا چکا اور ہاتھ دھو چکا تو برآمدے میں بیٹھ کر اس نے ایک بار پھر اپنی رام کتھا سنائی۔ اس نے کتھا ختم ہی کی تھی کہ بوڑھے کا بیٹا ہاتھ میں جھولا ڈنڈا لیے، ننگے پاؤں، اپنے جیتھڑوں کو زمین پر گھسیٹتے ہوئے۔ لمبے سفر کے بعد گھر لوٹ آیا۔ جیسے ہی وہ گھر کے اندر داخل ہوا اس نے کہا "پتاجی آپ دیکھ سکتے ہیں"۔ پتا نے جواب دیا "ہاں اب میں دیکھ سکتا ہوں، کیونکہ میں رام کتھا سنی ہے۔" ایشور بھٹ نے رام کتھا ایک بار پھر سنائی اور کتھا سنا کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

چلتے چلتے ایشور بھٹ جنگلوں، ندیوں اور ان بھیانک سنسان علاقوں کو پار کر کے جن کو دیکھ کر لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے ہیں۔ کئی راتوں کے سفر کے بعد وہاں پہنچا جہاں وہ اکیلی عورت رہتی تھی۔ وہ عورت بولی "ہے ودوان اور شوبھاکاری برہمن جیسے آپ اتر کی جانب مڑے میرے پتی پچھم کی طرف سے واپس آ گئے۔" وہ دونوں ایشور بھٹ کے پاس کھڑے ہو گئے۔ اس عورت نے طرح طرح سے لذیذ کھانے، مٹھائیاں اور پکوان اس کے سامنے پروس دیئے۔ جب وہ کھانا کھا رہا تھا تو اس عورت کا پتی پنکھے سے اسے ہوا کی راحت دے رہا تھا۔ جب وہ کھانا کھا کر ہاتھ دھو چکا اور پرساد اور تحفے تحائف لے چکا تو جانے سے پہلے اس نے پھر اس پتی پتنی کے جوڑے کو رام کتھا سنائی۔" رام۔ رام۔"

تب وہ وہاں سے چل پڑا۔ ساون رت آگئی۔ اس نے بنوں میں نئی نئی بیلیں، تازہ دھلے ہوئے پروں والے پرندے اور لہلہاتی فصلوں والے کھیت دیکھے۔ وہ گھر کے قریب تر آگیا تھا۔ جب وہ اپنے داماد کے آشرم میں داخل ہوا تو اس کی بیٹی اور نواسے، نواسیوں سے گھر چہک رہا تھا۔ بیٹی اور داماد کے نذرانے قبول کرتے اور بچوں کو آشیرواد دینے کے بعد جب جانے کے لیے اٹھا تو بیٹی بولی "میری ظالم ماں سے کہنا میں خوش ہوں" اور اس نے کہا "نہیں ایسا نہیں بولتے۔ آخر کار اس نے تمھیں جنم دیا تھا بیٹی اور وہ ماں جو جنم دیتی ہے اس کے بارے میں برا نہیں کہتے۔ بیٹی بولی "جیسا آپ کہیں پتاجی!" وہ آشرم کے تالاب کے پاس بیٹھ گیا اور اس نے رام کتھا سنائی۔ "رام رام" جلد بہت جلد وہ اپنے گھر پہنچ جائے گا اور انھیں آنکھوں سے جن سے اس نے بھگوان رام کے درشن کیے تھے وہ برہم بھٹ کو اپنی پتنی کو، مویشیوں کو اور جگ مگ کرتے نو کھمبوں والے گھر کو دیکھے گا۔

لیکن گھر پر یاتری کے چلے جانے کے بعد سوم وار، منگل وار اور بدھ وار آئے اور پھر برہسپت وار اور عورتوں کا مبارک منگل کاری دن شکر وار! سنیچر وار کو برہم بھٹ نے کہا۔ "ماں آؤ آج سنیچر وار ہے اور ہم رام کتھا کا پاٹھ کریں گے" لیکن اس کی ماں نے کہا "بیٹا تھوڑی دیر رکو میں مویشیوں کو چاول کا پانی دے دوں۔ کوٹنے کے لیے دھان تول دوں" اور اسی طرح یہ کام وہ کام کرتے ہوئے صبح کا وقت نکل گیا۔ شام ہوگئی اور رام کتھا کا پاٹھ نہیں ہوا۔ اگلے دن ایت وار تھا اور پھر سوم وار، منگل وار، بدھ وار، برہسپت وار... آئے۔ اور سنیچر وار کو ماں نے کہا "بیٹا آؤ، آج سنیچر وار ہے اور رام کتھا کا پاٹھ کرنا چاہیے" بیٹا بولا "ماں مجھے کھیتوں میں جانا ہے۔ بوائی، کھاد ڈالنے اور نالیوں کی مرمت کا کام دیکھنا ہے" دن نکل گیا شام ہوئی اور بیٹا کھیتوں سے نہیں لوٹا۔ جب وہ لوٹا تو بہت تھکا ہوا تھا۔ اس کا سانس پھول رہا تھا اور چہرہ دھول پسینے سے لت پت تھا۔ برہم بھٹ منہ ہاتھ دھو کر رسوئی گھر میں آیا "بیچارہ بچہ کتنا تھک گیا ہے" ماں نے کہا اور رام کتھا پھر نہیں سنی گئی۔

سنیچر وار نکل گیا اور ایت وار، سوم وار بھی۔ اور جب پھر سنیچر وار آیا تو رام کتھا نہیں سنائی گئی۔ ہفتوں پر ہفتے گزرتے گئے اور ہمیشہ کبھی پشوؤں کی دیکھ بھال کرنی ہوتی تھی کبھی بوائی کا کام ہوتا تھا۔ گئو شالہ کی چھت اور گھر کے کھمبے گرنے شروع ہو گئے۔ دیواروں میں دراڑیں پڑ گئیں۔ کھیت بنجر ہو گئے۔ پھر بھی رام کتھا نہیں کہی سنائی گئی۔ بیماری اور اور بڑھاپے نے آگھیرا، مکان گر گیا۔ زمین بک گئی۔ بیماریوں سے مویشیوں مر گئے۔ بیٹے کے چہرے پر ڈاڑھی خشخشی ہو گئی اور پتا جی نہیں لوٹے۔

ایک روز بہر حال ادھر سے گزرتے ہوئے مسافر یہ خبر لائے کہ یاتری گاؤں واپس آ رہا ہے۔ سب لوگ بانسری، پگڑی اور پھولوں کے ہار، اور عطر اور چھتری لے کر گاؤں کے دوار پر گئے۔ وہاں وہ تھا۔ واپس آیا ہوا یاتری جس نے بھگوان رام کے درشن کیے تھے۔ ایشور بھٹ کے چہرے پر سو سورجوں کا نور تھا، تیج تھا۔ وہ نہ تو بوڑھا ہوا تھا اور نہ ہی جوان۔ اس کی نگاہیں متوازن تھیں اور آنکھیں رحمت سے، دیا سے بھری ہوئی تھیں۔ جب بھاگیرتھی اس کے قدموں میں گر کر اٹھی تو اس نے کہا۔" دیوی! آپ کون ہیں؟" کیونکہ وہ پریشان حال تھی۔ اور جب برہم بھٹ نے اپنے پتا کے قدموں میں گر کر ڈنڈوت پرنام کیا اور اٹھا تو لوٹنے والے یاتری نے پوچھا" شریمان آپ کون ہیں؟" کیونکہ اس کے چہرے کی ڈاڑھی بڑھی ہوئی اور کسی قدر خشخشی ہو چکی تھی۔ بہت سے دانت بھی ٹوٹ چکے تھے اور وہ بہت کمزور لگ رہا تھا۔" پتا جی! میں آپ کا بیٹا ہوں"! ایشور بھٹ اتنا دکھی ہوا کہ وہ رو پڑا اور اس سے پوچھنے لگا" بیٹا! یہ سب کیسے ہو گیا؟" تب انھوں نے اسے سب کچھ بتایا۔" اسے گھر کے سوامی یہ ایسے ہوا۔ یہ ایسے ہے" اور گھر کے سوامی نے کہا" مجھے بڑی تکلیف پہنچی ہے۔ کیا تم سنیچر وار کو رام کتھا سناتے تھے؟" برہم بھٹ بولا" نہیں پتا جی۔ جب میں ماں کے پاس جاتا تھا تو یہ رسوئی کے کام میں مصروف ہوتی تھیں۔ اور جب یہ میرے پاس آکر کہتی تھیں" بیٹا آج سنیچر وار ہے۔ رام کتھا کا دن ہے تو مجھے سامان اکٹھا کرنے کے لیے کھیتوں میں جانا ہوتا تھا۔ چاہے یہ شخص تھا یا وہ۔ ہفتوں پر ہفتے بیت گئے" اور ماں بولی" نو کھمبوں والا گھر گر رہا ہے اور گھر کے پشو سب مر گئے ہیں" ایشور بھٹ نے کہا:" چھی چھی

پاپیو!" اور انھیں اسی وقت رام کتھا سنائی"۔ رام ۔ رام"۔
جیسے ہی اس نے رام کتھا سنانا شروع کیا مکان اپنے کھمبوں پر کھڑا ہو گیا۔ اور اناج کے کوٹھے کی چاروں دیواریں اُٹھ گئیں۔ چمکتی، لال گئو شالہ میں پشو رنبھانے لگے۔ نوکر چاکر کار ندے تھے۔ گاڑی گھر میں گاڑیاں اور رتھ تھے۔ گاؤں کے دوار پر چار سفید گھوڑوں والا ایک رتھ کھڑا تھا۔ اور گاؤں کے لوگ باجے گاجے کے ساتھ جلوس کی شکل میں لوٹنے والے کو اس کے گھر تک لے کر آئے۔ بیٹا نوجوان دکھائی دے رہا تھا۔ اور پتنی کے چہرے پر قابلِ تعظیم شان شوکت کے سارے شبہ اور مبارک نشان لوٹ آئے تھے۔ تب وہ کہنے لگی "میری بیٹی کیسی ہے؟" اور وہ بولا " وہ سب بڑے سکھی ہیں۔ میں نے ایک اچھے اور لائق سنیاسی کے ساتھ اس کا بیاہ کر دیا تھا۔ ان کے کئی بچے ہیں اور شاندار گھر ہے"۔ باجا گاجا اور سفید گھوڑے اب گھر کے دروازے پر کھڑے تھے۔ اس طرح منتروں اور سواگت کی رسموں کے ساتھ الیشور بھٹ جس نے شری رام کے درشن کیے تھے اپنے نو کھمبوں والے گھر لوٹ آیا۔

"رام، رام! شری رام! ہمیں دھن دولت دے۔ شان و شوکت دے۔ آٹھوں مبارک دولت مندیاں دے۔ ہمیں جانشین دے، گھر دے اور جائے پناہ دے۔ زمین دے۔ باغ دے اور وہ جو پردیس گئے ہوں وہ گھر لوٹ آئیں۔ جسم مضبوط اور تندرست ہو۔ اندھے کو آنکھیں، لنگڑے کو ٹانگیں اور گونگے کو زبان دے۔ رام، رام، شری رام ہمیں اپنے پاون درشن دو"۔

چھوٹی ماں نے ابھی کتھا ختم کی ہی تھی کہ دروازے پر ایک کار رُکی۔ "ضرور یہ سروجا ہو گی" چھوٹی ماں سرگوشی میں بولیں۔ وہ دروازہ کھولنے گئیں اور کہنے لگیں۔ "سروجا۔ اب میں تمہیں ایسا رتن دوں گی جو تمہاری شادی کے رتنوں میں سب سے اچھا ہوگا۔ وہ واحد رتن جو سچا اور کھرا ہے"۔ جب سروجا اندر آئی اور مجھے دیکھا تو اس کے گالوں پر آنسو بہنے لگے۔ کیونکہ اس نے پتاجی کے بارے میں سوچا تھا۔ میرے بارے میں نہیں "تم مجھے اشیرواد دینے آئے ہو"۔ بچے کی طرح۔ ڈری ہوئی ہرنی کی طرح وہ سکڑ کر وہ میرے گھٹنے

کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ چھوٹی ماں نے پرشاد میں چینی اور بنگالی چنے بانٹے اور ہم چپ چاپ کھانا کھانے بیٹھ گئے۔

وہ بڑے دکھ درد کے دن تھے۔ ایک روشن بے نام دکھ درد کے دن جس میں ظلم کا کوئی پہلو نہیں تھا۔ مرد عورتیں باہر اندر یہ فیصلہ کرنے کے لیے آتے کہ یہ ساڑھی اچھی تھی یا وہ۔ مور کے سے نیلے رنگ والی۔ لڑکے والوں کو دھرماورم ساڑھیاں دی جائیں یا صرف کانجی کی سوتی ساڑھیاں۔ "اور سونے کی اشرفی سے باقی کمی پوری ہو جائے گی" موٹے پیٹ والے ٹوکا کرتے۔ زیورات پہنے باورچی ہاتھ میں نسوار اور دانت میں پیسے ٹھونسے پوچھنے آتے کہ لڈو ایک ہزار چاہئیں یا ایک ہزار دو سو اور یہ بھی کہ لڈو دوسرے دن چاہئیں یا تیسرے دن اور کیا کھیر کے لیے دودھ، کیسر، بادام اور چینی کے لیے کہہ دیا گیا ہے۔ پاپڑ بنانے والے پڑوسیوں سے آہستہ آہستہ گھر بھرنے لگا۔ برہمن آتے اور اپنی بتیسی نکالے کیونکہ وہ جانتے تھے گھر کا مالک لوٹ آیا تھا۔ "اور وہ بھی لندن سے" اور آپس میں باتیں کرتے کہ اب پیسے دان سمان میں کوئی کمی نہیں رہے گی۔ پنڈال کے لیے بانس بھی آئے۔ گھر کا ملازم بالیگا پوچھ رہا تھا "ماں ان بانسوں کو کہاں رکھا جائے؟" "ارے احمق، یہاں نہیں۔ کیا یہاں پنڈال بنانے کے لیے جگہ ہے تم انھیں انجنیئر شنکورام کے گھر لے جاؤ۔ وہاں تم کو ضرورت کے سب آدمی مل جائیں گے۔"

بلاشبہ چچا سیتا رامو وہیں تھے اور میری چچیری بہنیں سیتا، پاروتی، پاپا، لکشمی دیوی، ننجا، کاویری، آنندی، وینکٹ لکشمی، بھاگیرتھی اور ساوتری بھی وہاں تھیں۔ یہ ساوتری دبلی پتلی اور مریل سی تھی۔ اس کے ہر برس ایک کے بعد ایک چار بچے ہوئے تھے۔ اس کا پیٹ گول مٹول تھا اور چھاتیاں ڈھیلی ڈھالی تھیں۔ پتاجی کے چچیرے بھائی رام چندر اور لکشمی نارائن بھی وہاں تھے اور ہنسی مذاق اور بے ساختہ جملے بازی سے بڑے خوش تھے۔ سنسکرت، کنڑا، اردو، تیلگو اور انگریزی میں بہت سے ذومعنی الفاظ ہیں۔ اس لیے کسی زبان کے ایک لفظ کا مفہوم میرے لیے کچھ اور تھا اور آپ کے لیے کچھ اور اس لیے آپ ہنس پڑتے تھے۔ جب مزدور لوگ تاڑ کے پتوں سے چھت

بنا رہے تھے اور کھمبوں کی سجاوٹ کے لیے رسیاں باندھی جارہی تھیں تو کئی فحش کہانیاں بھی کہی سنی جارہی تھیں۔ بانسوں کو سفید سوسن کے پھولوں والے سبز کپڑے سے ڈھانپا جارہا تھا اور دیش بھگتی کے جوش میں کسی نے دیش پتا کے لیے اپنی شردھا اور عقیدت دکھانے کے لیے کاغذی پھولوں کی مالا وغیرہ کے ساتھ مہاتما گاندھی کی بھونڈی سی تصویر بھی لٹکا دی تھی۔ کسی میں اس تصویر کو ہٹانے کی ہمت نہیں تھی اس لیے ہم ہر قسم کی تنقید سے محفوظ تھے۔ ریشمی کپڑوں میں سجی سنوری عورتیں گھر میں آجا رہی تھیں اور ان کی تڑک بھڑک اور ہڑبڑاہٹ بڑی دلچسپ تھی۔ ان معاملوں میں مرد کسی کام کے نہیں تھے۔ وہ سیدھے رسوئی گھر میں جاتے تھے چھوٹی ماں سے باتیں کرنے کے لیے چاہے وہ پوجا کر رہی ہوں یا بچے کو دودھ پلا رہی ہوں یا غسل خانے میں نہا رہی ہوں یا باغ میں اور کسی نہ بتائی جانے والی جگہ پر ہوں۔ خوش قسمتی سے اس بار چھوٹی ماں کی ماہواری جلدی ہوگئی تھی اور چونکہ وہ رسوئی گھر میں نہیں جاسکتی تھیں اس لیے وہ ہر وقت ہر کسی کو مل سکتی تھیں اور اس طرح کام جلدی جلدی ہو رہا تھا۔

لوگ ریل گاڑی سے آنے لگے تھے۔ میرے چچیرے بھائی رگھو یا چندو (وہ آل انڈیا ریڈیو میں کام کرتا تھا) انھیں لینے کے لیے جاتے۔ مہمانوں کو سنجویا یا فائننس ڈیپارٹمنٹ کے شنکر نارائن ایئر کے یہاں ٹھہرایا جارہا تھا۔ اب چونکہ امتحانات ختم ہوچکے تھے۔ بچوں کے خوب مزے تھے۔ اگر آپ سروجا کو نہ جانتے ہوں تو سوچیں گے۔ سروجا خوشی سے پھولی نہیں سما رہی ہوگی۔ لیکن وہ میرے پاس بیٹھا کرتی تھی اور میں اپنے کمرے میں لیٹا اسے میڈلین کے اور اپنے بارے میں یا جارجز اور کیتھرین کے ساتھ ہونے اس کی شادی کے بارے میں بتاتا رہتا تھا۔ وہ سوچتی کاش وہ یورپی عورت ہوتی۔ اس سے اسے کتنی آزادی کتنی خوشی ملتی۔

"کیسی آزادی؟" میں نے حیران ہوکر پوچھا "بیوقوفی کرنے کی آزادی؟ سروجا تمہارے خیال میں کیتھرین یا میڈلین تم سے کس طرح بہتر ہیں؟"

"وہ پیار کرنا جانتی ہیں۔"

"اور تم"

"اور ہم جانتی ہیں کہ بچے کیسے پیدا کیے جاتے ہیں۔ ہم موٹر کار یا بینک کی پاس بک کی طرح ہیں۔ یا اس سے بھی بڑھ کر ہم مہربان اور لازوال ودائم انگریزی سرکار کی دی ہوئی آرام دہ تنخواہ کی طرح ہیں۔ ہماری خوشی خزانے کی رسید ہے۔

"او، سب ٹھیک ہو جائے گا سروجا، وقت اور تجربہ سب چیزوں کو ملائم کر دیتا ہے۔"

"لیکن ساس ساس ہی ہوتی ہے اور وہ تمہیں تو تو آنسو رُلا سکتی ہے اور نندیں اور دیور۔"

"وقت بدل چکا ہے، سروجا۔"

"فی الحال ہندوستان میں نہیں۔ اور یقیناً برہمنوں میں تو بالکل نہیں۔ بہتر ہوگا تم میرے سسرال والوں سے ملنے تک کا انتظار کرو۔ وہ ابھی سے سوچتے ہیں میں ان کی دُھلائی کی ٹوکری کا ایک میلا کپڑا ہوں۔ وہ ابھی سے سوچتے ہیں کہ مجھے دودھ کی طرح اجلا بنانے کے لیے پتھر پر کب بیٹنا چاہیے۔ ہم لڑکیوں کو دوسرے کنبوں میں اس طرح پٹک دیا جاتا ہے کہ جیسے سنیچر وار کی صبح کو ہمارے اندر پہنے جانے والے پرائیویٹ کپڑے دھوبی کے سامنے پٹک دیئے جاتے ہیں۔ ہم لڑکیاں ضرور کپاس کی طرح کپاس کے پودوں پر پلی بڑھی ہوں گی...."

ان باتوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ لیکن تبھی ایک سنار سروجا کی ہتھیلی یا انگلی یا کلائی کا ناپ یا ان کی چھاپ لینے آگیا۔ یا وہ کوئی پھول والا تھا جو یہ پوچھنے آیا تھا کہ کیا اسے دوسرے دن سویرے چنبیلی اور شام کو گلاب کے پھول چاہئیں۔

"اپنے پھول موسا ندی میں پھینک دو اور بعد میں ایک پیالہ گرم دودھ پی لو" سروجا نے چڑ کر کہا۔

"نامبارک لفظ مت بولو" چھوٹی ماں نے اندر والے آنگن سے ڈانٹ لگائی۔

دیواروں پر چھپکلیاں خوش تھیں کیونکہ آج مکھیاں بہت تھیں۔ اس کا کارن یہ تھا کہ جگہ جگہ چاول، گڑ، کیلے اور لڈو کے لیے بیسن کے ڈھیر لگے ہوئے تھے اور چھت پر پاپڑ سوکھ رہے تھے۔ ہماری نوکرانی مُنّا کا پانچ سال کا لڑکا کہیں بیٹھا ہوا "ہوئے ہوئے"

کر کے کوّے اور مکھیاں اُڑا رہا تھا۔ جب مکھیاں اپنی کسی دریافت کا مزا لینے کے لیے دیواروں پر پھر سے آ بیٹھتیں تو چھپکلیاں آہستہ سے بغیر کوشش کے ان کو ڈھونڈ لیتیں۔ شادی کے موقع پر سب کو اپنا اپنا حصّہ ملنا چاہیے۔

پیڑوں پر امرود پک کر لال ہو گئے تھے۔ اور چنبیلی کے جھاڑ پر کبھی اتنے سارے پھول نہیں نہیں آئے تھے۔ چھوٹی ماں نے کہا "گھر میں شادی ہونے سے کوئیں کا پانی بھی دھرتی کی سطح تک چڑھ جاتا ہے۔"

"جنازہ اور شادی بیاہ" سروجا بولی "دونوں ایک جیسے ہیں۔ دونوں میں برہمن آ کر منتر پڑھتے ہیں۔ چاہے وہ بنارس میں ہو یا یہاں، کچھ فرق نہیں پڑتا۔ دونوں میں پہلے پنڈال بنتا ہے پھر باجے گاجے اور پھولوں کا چمکیلے شال دشالے اور آگ کا انتظام کیا جاتا ہے، فرق صرف یہ ہے کہ بیاہ میں آپ دو ہوتے ہیں اور موت میں آپ اکیلے ہوتے ہیں۔" سروجا پتا جی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ کہتی گئی۔ "آپ وہاں دیکھتے ہیں۔ لوگ آم کے پتّے لا رہے ہیں اور اب پنڈال تیار کریں گے۔" چھوٹی ماں نے یہ سب سنا لیکن کچھ کہا نہیں۔ انھوں نے مدد کے لیے میری طرف دیکھا۔

جب سروجا اپنی بے چینی میں اُٹھ کر کہیں اور چلی گئی تب انھوں نے کہا "بھگوان جانتا ہے، ایشور جانتا ہے، رام! وہ سبرامنیا بڑا اچھا آدمی ہے۔ میں اس کی تعریف اس لیے نہیں کر رہی ہوں کہ وہ میرے ہی چچیرے بھائی کا بیٹا ہے اور نہ اس لیے کہ وہ بھارت سرکار میں آڈٹ افیسر کے عہدے پر فائز ہے بلکہ اس لیے کہ وہ بڑا مہذب اور شائستہ ہے اور صاف سچّا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ تم لوگوں کی طرح نفیس نہیں ہے لیکن سبھی قسم کے لوگوں کے ہونے سے ہی دنیا بنتی ہے۔ اگر تمھارے دادا نے مجھے اور میری تعلیم کو دیکھا ہوتا تو کیا انھوں نے مجھے تمھارے پتا کے تیسرے بیاہ کے لیے بھی چنا ہوتا۔ عورت کو بیاہ کرنا ہی پڑتا ہے چاہے وہ اندھی، گونگی، بہری یا تپ دق کی مریض ہی کیوں نہ ہو۔ اس کی کوکھ ہی اس کی زندگی ہے۔ ہم عورتیں اپنا شوہر اپنے آپ نہیں چن سکتیں۔ یہ سچ ہے کہ دنیا کے تمھارے حصّے میں، یورپ میں، لوگ کہتے ہیں عورتیں اپنا خاوند خود چنتی

میں. اور میں نے یہ سب سنیما میں دیکھا بھی ہے۔ لیکن ہم یورپی نہیں ہیں۔ ہم اس دیس کے ہیں، ہم برہمن ہیں۔ تمہارا مقدر بہرحال انوکھا تھا، شاندار تھا۔ ہم پر سدا دیوتا مہربان رہے رام! جب تم آئے اور پوجا گھر میں کھڑے ہوئے تو کیسے شہزادے جیسے لگ رہے تھے۔ رام تم اس ہماری دھرتی کے نہیں ہو۔"

"تب میں کہاں کا ہوں؟ چھوٹی ماں"، میں ہنس پڑا۔

"یہ تو میں نہیں جانتی لیکن تم اوروں سے الگ ہو۔ تم جیسا کوئی لائق اور قابل لڑکا یورپ میں جاکر یونیورسٹی کی بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کرسکتا ہے۔ تم نہ تو شراب پیتے ہو، نہ گوشت کھاتے ہو، نہ سگریٹ پیتے ہو اور نہ: تم نے ویلور کرشنا کے تیسرے بیٹے یا مودی وینکٹ رمیّا کے داماد کی طرح پھوہڑ طور طریقے اپنائے ہیں جب وہ واپس لوٹے تو ان کے منہ میں بھدّے بدنما پائپ تھے اور وہ اپنی ماؤں سے ایسے بات کر رہے تھے جیسے وہ گھر میں جھاڑو پوچھا کرنے والی نوکرانیاں ہوں۔ جلد ہی انھیں میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا کھانا پڑے گا اور گھر میں یورپی کپڑے پہننے ہوں گے۔" دیوار پر لگی میری ماں کی بڑی سی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا "یہ تمہاری ماں ہی ہوگی، وہ مہان پوتر استری جس نے تمہیں ایسا بنایا ہوگا،" کچھ دیر کے لیے ایک بے بس سی خاموشی چھاگئی۔ پھر اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے چھوٹی ماں بولیں" رام! اس بار تم ہمیں چھوڑ کر نہیں جاؤگے۔ اگنی بھی جانتی ہے تم یہاں ہو۔ جس دن سے تم آئے یہ بڑی پراسرار آواز کے ساتھ جل رہی ہے۔ گھر میں مرد کا ہونا مندر میں دیوتا کے ہونے جیسا ہے۔" چھوٹی ماں کے لیے کسی کہاوت کا مفہوم ہمیشہ کسی ناقابلِ تردید سچ کی طرح ہوتا تھا۔ لمحہ بھر کے توقف کے بعد وہ بولیں "تم سراسمنیا کو پسند کروگے۔ سروجا جیسی چلبلی لڑکی کو قابو میں رکھنے کے لیے وہ ہی مناسب مرد ہے۔۔۔"

دوپہر بعد میں اکیلا اپنے بستر میں لیٹا رہتا اس انتظار میں کہ کچھ ہوگا۔ کچھ بھی۔ ایک دن بعد دوپہر۔ یہ بیاہ سے کوئی دو تین دن پہلے کی بات ہوگی کہ پوسٹ مین نے کھڑکی سے ایک خط اندر پھینکا۔ یہ میڈلین کا خط تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

رام، میرے دوست۔

میں محسوس کرتی ہوں کہ وسیع اور متنوع وسعتوں کی کشادگی میں خوشی کے لیے ہمیشہ کوئی نہ کوئی جگہ ہوتی ہے۔ ہمارے دکھ کا کارن یہ ہے کہ ہم یہ نہیں جانتے کہ ہمیں کیا چننا چاہیے اور کب چننا چاہیے۔ زندگی کالی مرچ پیسنے کی چکیوں سے بھی بھری ہو سکتی ہے۔ پورے کے پورے خط استوا کے ساتھ لکڑی اور لوہے کی بے تکی کلوں کی قطار ہو سکتی ہے۔ سلاد اور ابلے ہوئے آلوؤں پر سیاہ سفوف چھڑکنے کے لیے۔ لیکن انسان چنبیلی یا گلاب کے پھول کے سامنے بھی تو رک سکتا ہے۔ (ویسا گلاب جو تم نے پچھلے برس خزاں میں لگایا تھا اور جس پر اب خوبصورت گلاب کے پھول آرہے ہیں)۔ یہ جان سکتا ہے کہ سب کچھ سب جگہ۔ خوشی بس ایک لمحے میں بھی موجود ہے۔ جارجز جسے بھگوان کہتا ہے وہ ضرور یہیں کہیں ہوگا۔ باغ میں شاید مٹر کے پودوں کی قطاروں کے درمیان۔ جب میں دروازے کے پاس والے سرو کے پانی کا پائپ کھولتی ہوں تو پہلے پانی گڑگڑاہٹ کے ساتھ نکلتا ہے اور پھر سکون سے متوازن انداز میں بہتا ہوا مٹر، چنبیلی اور گلاب کی کیاریوں تک پہنچ جاتا ہے۔

یہ صرف تمہیں بتانے کے لیے ہے کہ اگرچہ میں اداس ہوں پھر بھی تمہارے بارے میں بہت سوچتی ہوں۔ اور بہت سی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے تعلق سے تمہیں یاد کرتی ہوں۔ مثال کے طور پر جب غسل خانے میں پانی کے چھینٹے نہیں ہوتے یا تمہاری میز پر پڑی پنسل ٹوٹی نہیں ہوتی تو تم مجھے بہت یاد آتے ہو۔ عورتیں بھلے ہی اپنے شوہروں کی طرف سے پوری توجہ نہ دیے جانے کی شکایت کریں۔ یا پھر دوسری باتوں کے سلسلے میں ایسی ہی شکایت کریں لیکن ہم عورتوں کا شکایت کرنا بھی ایک طرح کا ہمارا پیار ہی ہے۔ ذرا ہیلائس اور ابے لارڈ کے خطوں پر دھیان دو جو بستر میں پڑے اپنے آقا اور عیسیٰ میں نہاں اپنے آقا کے بارے میں شکایتوں سے بھرے پڑے ہیں۔ عورت کو شکوہ شکایت کرنا ہی چاہیے۔ مرد کی طاقت کے سامنے یہ اس کی حیاتیاتی دفاع ہے۔ میں تمہاری کتابوں کے آگے پھول چڑھاتی ہوں اور تمہاری میز پر آگے بتی جلاتی ہوں۔

میں سوچتی ہوں ہندوستان میں اپنے خاندان میں واپس جانے پر تمہیں کیسا لگ رہا

ہو گا۔ ہم لوگ جو یورپ میں پلے بڑھے ہیں، خاص طور پر حال ہی میں ژید کا یہ قول" میرے خاندان میں تم سے نفرت کرتا ہوں" منتر کی طرح پڑھتے ہوئے/ایک منتر کی طرح گاتے ہوئے، ہمارے لیے اپنے سگے بھائی یا سگی بہن کے علاوہ ہر شخص ایک دشمن ہے۔ سارتر کا یہ کہنا کہ "دشمن ہی اجنبی ہے باہر کا آدمی ہے" ژید کے قول کا تسلسل ہے۔ میں جانتی ہوں تمہارے پتاجی کی تمہارے لیے کوئی اہمیت نہیں تھی لیکن تمہارے خاندان کی۔ میرے خیال میں بہرحال ہے۔ جب میں کہا کرتی تھی کہ ہندستان سے سروجا کا خط ہے تو میں نے دیکھا ہے تمہارا چہرہ خوشی سے کھل اٹھتا تھا۔ میری طرف سے انھیں پیار دینا کیونکہ میں تمہارے سوا کسی اور کو پیار کر ہی نہیں سکتی۔

میں بستر میں لیٹی اپنے احساس اور لمس کے سہارے وہ سب محسوس کرتے ہوئے جو تم نے میرے اندر پیدا کیا ہے اور جس کی پرورش کر رہی ہوں۔ منزل تکمیل تک پہنچا رہی ہوں۔ اکثر پوچھتی ہوں کہ وہ کیا چیز تھی جو ہمیں ایک دوسرے کے قریب لائی تھی اور وہ کیا شے ہو گی جو ہمیں ایک ساتھ رکھے گی۔ پیار وہ چیز ہے جس کی تعریف متعین نہیں کی جا سکتی اگرچہ ہم چرب زبان یورپی اکثر اس لفظ کا استعمال کرتے ہیں۔ کوئی بھی فرد شاید جسم سے پیار نہیں کر سکتا۔ (اٹھارہ دھاتوؤں، اٹھارہ عناصر سے بنے جسم کو جیسا کہ بودھی ناگ سین نے یونانی راجہ مینندر سے کہا تھا)۔ کوئی بھی شخص ہزار پہلوؤں والے اس آئینے سے جسے ہم ذہن یا من کہتے ہیں پیار نہیں کر سکتا۔ من بو اسی سے نفرت کرنے لگتا ہے جس کی کبھی وہ پرستش کرتا تھا اور اسی سے ڈرنے لگتا ہے جو اسے کبھی بہت عزیز تھا جسم اور من سے پرے ممکن ہے دل ہے لیکن اس کا کیا ہے؟ کیا یہ وہی پمپنگ مشین ہے جو ہماری رگوں میں سُرخ لہو بھیجتی ہے۔ کیا خون کے سرخ خلیے پیار کا ثبوت ہیں؟ ہم کتنے جاہل لوگ ہیں۔ ہر لفظ معقول پرستی یا تکرار معنی کا غماز لگتا ہے۔ میں اکثر جارجز کا مذاق اڑاتی ہوں جو لیب نتز کی 'موناڈ' یعنی اکائی یا سپی نوزا کے عقلی پیار کے بارے میں بڑی سنجیدگی سے ایسے بات کرتا ہے جیسے یہ جاودانی حقیقتیں ہوں ٹھیک اسی انداز میں جس طرح لے وائے زیر ار آکسیجن اور ہائیڈروجن کو کسی صحیفۂ خدا میں حدود وقت سا ماورا پہلے سے طے شدہ بنیادی عناصر سمجھتا تھا۔ لیکن جیسے آئنسٹائن نے آکر ہمارے

اجداد کی باترتیب، منظم، ٹھوس۔ مسٹر ہومائی کی کائنات کو درہم برہم کر دیا تھا۔ ٹھیک اسی طرح ممکن ہے۔ ہندوستان بھی جارجز خوش بر تیف کی سیان سپلائس کو درہم برہم کر کے رکھ دے۔ ہمالیہ کی جے ہو!

کیا میں تمہیں پیار کرتی ہوں۔ میں تو اپنے آپ سے پوچھتی ہوں۔ جب میں یہ کہتی ہوں کہ میں واقعی پیار کرتی ہوں تو کیا میں تم سے ویسے ہی پیار کرتی ہوں جیسے مہاتما بدھ آنند سے کرتے تھے۔ آنند، پیارے آنند۔ رنج مت کرو کہ بدھ جو تمہارے لیے باپ کی طرح تھا چلا گیا ہے، بلکہ یہ کہو کہ "میں شعلے کی طرح اپنی روشنی آپ بنوں گا اور چمکوں گا"۔ دوسروں کی ان کے ہونے میں مدد کرنا، پھول کو پھول ہونے دینا، پانی کو بہنے دینا۔ جنم مرن کے چکّر کو قبول کر لینا کسی حقیقت کی تصدیق ہے۔ پیار کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ پیار کو سچ سے مختلف نہیں ہونا چاہیے لیکن کیا پیار وہ جگہ لے سکتا ہے جو صرف سچ کی ہے؟ کیا سورج کومل ہو سکتا ہے؟ یا کیا آواز شیریں اور حلیم ہو سکتی ہے؟ کوملتا اور حلیمی، اور مٹھاس ہم ہی بناتے ہیں۔ میرے رام مجھ پر روشنی پھیلاؤ۔ تم دیکھ رہے ہو میں کیسی اچھی بیوی بن رہی ہوں۔

—— مادو

پسِ نوشت: مجھے ڈاکٹروں کی باتوں سے تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن ڈاکٹر کانترو کا کہنا ہے۔ اگرچہ سچی بات یہ ہے کہ وہ فکر مند نہیں ہیں کیونکہ میرے ردِعمل نارمل ہیں لیکن میرا ایکس رے فوٹو کہیں کہیں کچھ دھندلا ہے۔ میں بہت موٹی ہو گئی ہوں رام! اور شارن تیز کی طرح گلابی۔ مجھے خوشی ہے کہ مجھے دیکھنے کے لیے تم یہاں نہیں ہو۔ مجھے یہی بہتر لگتا ہے۔ مجھے اگلے ہفتے پھر ڈاکٹر کانترو سے ملنے جانا ہے۔ میں تمہیں خط لکھوں گی۔ تم جانتے ہو گھر میں ہنس مکھ کیتھرین کا ہونا کتنا اچھا ہے۔ لیکن تم مجھے بہت یاد آتے ہو۔ جلدی سے واپس آجاؤ اور دھوپ میں زیادہ مت نکلنا۔ مجھے کالا شوہر پسند نہیں ہے۔ اپنے بال کٹوا لینا تاکہ وہ میڈیکل کالج کے طلبا کے بالوں جیسے نہ لگیں۔ آخر میں مقامی کالج میں پڑھاتی ہوں اور ان چیزوں کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ "یہ استانی صاحبہ کے شوہر ہیں، وغیرہ"۔ اور مجھ بور ترو اکو معاف کر دینا۔ سروجا کے لیے پیار۔

—— م

کسی کارن سے میں ناراض تھا لیکن اپنی ناراضگی کو کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔ شاید میں سروجا کے کارن ناراض تھا۔

دو روز بعد میں پہلی بار دولہا اور چچا چچیوں اور بڑے بھائی سے ملنے گیا۔ بالآخر وہ آ گئے تھے۔ اور میرا غصہ اور بھی زیادہ، خاموش اور پکا ہو گیا تھا۔ میں گھر پہنچا تو میرے نام کا ایک تار آیا ہوا تھا۔ یہ ساوتری کا تھا، کیمبرج سے۔ اس میں لکھا تھا "میرے لیے خوش رہو۔ تمہاری خوشی میں ہی میری آزادی ہے۔ سروجا کو بدھائی!"

میں مطلب سمجھ گیا۔ مجھے اس شادی کو بہر حال کامیاب بنانا چاہیے۔ مجھے کوشش کرنی چاہیے۔ پرارتھنا کرنی چاہیے۔ اپنے آپ کو خوش رکھنا چاہیے اور دوسروں کو بھی خوشی دینی چاہیے۔ میری خوشی تو کھو گئی تھی لیکن دوسروں کو خوشی کا نذرانہ دینے سے مجھے کون روک سکتا تھا۔ چھوٹی ماں، سروجا اور سروجا کے لفٹیننٹ نما بھدّے بھاری بھرکم خشک مزاج شوہر کو خوشی دینے سے مجھے کون روک سکتا تھا۔ وہ بالکل فوجی لگتا تھا۔ حکومتوں کو بہر حال لوگوں کو ذمہ دار، سنجیدہ اور تحمکانہ بنانا چاہیے۔ ہاں میں سبرامنیا کو ضرور سکھی بناؤں گا۔ میں ساری دنیا کو سکھی بناؤں گا۔

میں خود بھی خوش ہونے والا تھا۔ سنگیت شروع ہو چکا تھا اور الفونزے کے سروں میں مجھے خوشی ملی۔ میں دعوت نامے بانٹنے گیا۔ برہمنوں پر چلّایا۔ مخصوص مہمانوں کے آنے کے پروگرام کے تعلق سے مخصوص گاڑیوں کے اوقات کے مطابق مہمانوں کو لانے کاریں اسٹیشن بھجوانے کا انتظام کیا۔ گھوڑی، بڑھیا سفید عربی گھوڑی کو دیکھا جس پر چڑھ کر دولہے کو پنڈال میں آنا تھا۔ میں نے گھر میں منتروں کا پاٹھ کیا اور سات بجے سروجا کو گھمانے مندر لے گیا۔ بارات چڑھنے کا وقت ۹ بجے رات تھا۔ "ایسی مبارک شام کو یہ بھی کرنے کا کوئی کام ہے؟" چھوٹی ماں شکائتاً بڑبڑائی۔ لیکن میں اپنے آپ کو اور سروجا کو، باتوں کو کسی حد تک سمجھنے اور سچ کا کچھ بیان کرنے کے لیے آخری موقعہ دینا چاہتا تھا۔ میں دل پر بوجھ لیے لیکن تیزی سے چل رہا تھا۔ میرے ساتھ چلتی ہوئی سروجا ایسے لگتی تھی جیسی بچھڑی ہتھنی اپنی ماں ہتھنی کے اردگرد ناچ رہی ہو۔ "بھیّا میں کیا کروں، میں کیا کروں؟"

"کس بارے میں سروجا؟"

"اوہ بھیا میں بھاگ جانا چاہتی ہوں، میں بھاگ جانا چاہتی ہوں کہیں بھی، میں اس سے شادی نہیں کر سکتی۔ مجھے ہرگز اس سے شادی نہیں کرنی چاہیے۔ یہ میری خودغرضی ہوگی اگر میں اس شخص سے شادی کر لوں جس سے میں سخت نفرت کرتی ہوں۔ جسے میں حقارت سے دیکھتی ہوں۔ میرا خیال ہے میں صرف اس کی کار، اس کے رُتبے کو پسند کرتی ہوں اور اس لیے بھی کہ وہ پتاجی جیسا لگتا ہے۔ بھیا، جب سے تم آئے ہو میں چیزوں کو کچھ بہتر سمجھنے لگی ہوں۔ بھیا۔ بھیا مجھے کہیں دور لے چلو۔"

یہ موقعہ بزدلی دکھانے کا نہیں تھا۔ میں خاندان کا بڑا ہوتے ہوئے بزدل بن سکتا تھا۔ میں دنیا میں کسی کو مایوس نہیں کر سکتا تھا، اور نہ ہی مجھے ایسا کرنا چاہیے تھا۔ یہ میرا دھرم تھا۔ ہم ہنومان مندر پہنچ گئے تھے۔ میں نے ایک ناریل، پان کے پتے، کافور اور صندل کی اگربتیاں — یہ سب خریدا اور پوجا کے لیے دے دیا۔ ہنومان جی اپنے پربھو، اپنے سوامی شری رام کی بھگتی میں بڑے خوش، پرسکون اور ثابت قدم لگ رہے تھے۔ ہم نے پردکشنا کی اور کچھ دیر کے لیے چٹانوں پر بیٹھ گئے۔ سروجا بلاشبہ خوش رہے گی۔ ہم اپنا سکھ خود بناتے ہیں ہاں میڈلین خون کے سرخ خلیے خوشی کا جواز پیدا کرتے ہیں۔ میڈلین میں تمہیں خوشی دوں گا۔ سروجا شادی کے بعد تم اکیس آؤ گی اور ہمارے ساتھ رہو گی" سروجا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے اسے دھوکا دیا تھا۔ پھر اٹھتے ہوئے وہ بولی۔ "بہرحال مردہ جسم کو جب وہ شمشان جاتا ہے خوش ہونا ہی چاہیے۔ وہ یہ نہیں کہتا۔ نہیں، میں واپس چلا جاؤں۔ جی وہاں میں واپس چلا جاؤں گا اور بھوت پریت بن جاؤں گا۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ میرے پاس پھول ہیں، باجا گاجا ہے سنگیت ہے۔ چاروں طرف لوگوں کی بھیڑ ہے۔ اور میرا بیاہ ہو گا۔"

ہم چپ چاپ پہاڑی سے نیچے اترے دولہے کے گھر پر سازندوں نے سنگیت شروع کر دیا تھا۔ گلیوں میں کاریں تیزی سے آ جا رہی تھیں اور لائٹ کے ہنڈے آگئے تھے۔ ایک ایک کر کے جیسے اپنی گنتی کروانا چاہتے ہوں۔ میں یہ دیکھنے کے لیے اِدھر اُدھر آ جا رہا تھا کہ سب کام ٹھیک ٹھاک ہو رہا ہے یا نہیں۔ زیورات، ہار، سنہری بازوؤں سے سجی،

گردن میں پیلا سکارف پہنے گھوڑی دروازے کے پیچھے گھڑی تھی اور سائس پان چبا رہا تھا۔
گھر میں کسی مرد کے زور زور سے شور مچانے کی آوازیں آرہی تھیں جسے شاید یقین تھا کہ وہ خوشی پیدا کر سکتا ہے۔ میں نے سوچا اگر یوگی اپنی قوّتِ ارادی سے اپنے آپ کو دھرتی سے اوپر اٹھا سکتے ہیں تو خوشی بھی پیدا کی جا سکتی ہے۔ خون کے سرخ خلیوں میں آخر کیا خرابی ہے۔ وہ دیکھنے میں سندر تھے۔ یاقوت کی طرح۔ مرد بالآخر عورت کو اپنے بستر پر لے جاتا ہے اور اسے خوشی دیتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ میں بانسوں کے کھمبوں سے بندھے، پنڈال میں لٹکتے ہوئے ناریلوں میں سے ایک کو لے کر سیدھا برامنیا کے سر پر مار سکتا تھا۔ قتل بھی پُر لطف ہو سکتا تھا۔ خون کے سرخ خلیوں کا کوئی اخلاقی معیار نہیں ہے۔ ان کے لیے ایک مخصوص لَے کے ساتھ دل میں داخل ہونا ہی خوشی ہے۔ کاش میں شٹیگ جا سکتا اور جولیٹا کے ساتھ کسی بھی موضوع پر بات کر سکتا۔ کیا ٹیمز ندی اب بھی بہہ رہی تھی۔ کیا ارسطو نے کوئی دلچسپ بات سنائی تھی۔ کیا کوئی برٹش میوزیم ایسا بھی ہے جس کے سر پر چیپل کی طرح گنبد ہو۔ اچانک مجھے کیمبرج کسی ضخیم تاریخ میں پڑھا ہوا ایک اقتباس یاد آگیا جس پر برٹش میوزیم میں حادثۃً میری نظر پڑ گئی تھی۔ متعلقہ عہدے داروں نے کیم ندی پر پل بنانے کی اجازت اس لیے دے دی تھی کیونکہ کلے ار ہال کے راہب اپنے گھوڑوں کو چرانے کے لیے ندی کے پار لے جانا چاہتے تھے۔

"درخواست کار بڑے انکسار و ادب کے ساتھ گذارش کرتے ہیں کہ انھیں اپنے ہی خرچ پر ندی پر پل تعمیر کرنے اور اس پر سے ندی پار کرنے کی اجازت دی جائے۔ ندی پار کے کھیت درخواست کاروں کے لیے بڑے فائدے کے ہیں خاص طور پر چھوت کی بیماریوں کے دنوں میں کینگز کالج کے چیپل سے ہو کر جانے کے علاوہ ان کھیتوں تک پہنچنے کا کوئی اور راستہ نہیں ہے اور کالج کا گیٹ خطرے کی حالت میں بند ہو جاتا ہے..."

سروجا سب سے اوپر کی منزل کے اپنے کمرے میں گئی اور دروازہ بند کر لیا۔ میں نے

دروازہ کھٹکھٹایا۔ خوب کھٹکھٹایا تو اس نے کہا " بھیّا مجھے کچھ دیر کے لیے اکیلا چھوڑ دو" چھوٹی ماں آئیں اور بولیں " رام ساڑھے سات ہو گئے ہیں اور نو بجے بارات ہمارے گھر کے سامنے سے گزرے گی۔ میں بتاتی ہوں۔ کیا کرنا چاہیے۔ ادھر آؤ بیٹا۔" میں نے جلدی جلدی ہاتھ منہ دھویا اور چوڑی دار پائجامہ اور اورنگ آبادی ساٹن کا کرتا پہن کر اپنے بالوں میں کنگھی کر لی۔ مجھے میڈلین کی دی ہوئی ہدایتیں یاد تھیں۔ سب عورتیں پنڈال میں جمع تھیں اور ماحول میں کافور، لکھنوی عطر اور پان کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ سفید دانتوں کی چمک۔ سیاہ اور سنہری ساڑھیوں کی شان و شوکت، کانوں کی بالیوں، گلے کے ہاروں نتھوں اور ماتھے پر ہیرے کے ٹیکوں کی آن بان نے ایسی معصوم خوشی کا ماحول بنا دیا تھا جسے دیکھ کر احساس ہوتا تھا انسان کو فطری خوشی کے لیے ہی بنایا گیا تھا۔ جونہی میں چاندی کے تھال میں ریشمی اور ململ کے ملبوسات، عطر کی بوتلیں، اگربتیاں اور پھول لیے سیڑھیوں سے نیچے اترا عورتیں چپ ہو گئیں۔ پھر سب لوگ ہنس پڑے۔ "گھر کا بڑا لگتا سفید بالوں والا ہے"، چچی سیتا بولی۔ "دوسرے کے مقابلے میں یہ بہتر دولہا لگتا ہے" چھوٹی ماں نے اسے غصّے سے گھور کر دیکھا۔

سنگیت شروع ہو گیا۔ دوسری گلی میں بندوق داغی گئی۔ بے سُرے بینڈ نے فوجی مارچ کی کوئی دھن بجانا شروع کر دیا۔ بیچ بیچ میں اور بعد ہندوستانی سنگیت بھی شامل ہو گیا۔ جب بارات ہماری گلی میں مڑی تو میں دولہا کا سواگت کرنے کے انتظار میں پنڈال میں کھڑا تھا۔ میں نے اوپر گھر کی جانب دیکھا۔ وہاں مکمل خاموشی تھی۔ سرو جا کی کھڑکی بند تھی۔ اب برہمنوں کی آوازیں اونچی ہو گئی تھیں۔ ان کے منتروں میں قوت تھی اور جادو تھا۔ میں نے بڑی مدّت سے انھیں نہیں سنا تھا۔ میں نے دولہا پر پھول برسائے اس کے کپڑوں پر بھینی بھینی مہک والے عطر لگائے چکھنے کے لیے اسے شہد، دودھ اور پگھلا ہوا مکھن پیش کیا۔ میں نے چنبیلی کے پھول کو چاندی کے پیالوں میں ڈبو کر اس کی باہر نکلی ہوئی زبان پر رکھ دیا۔ اس پر گلاب جل چھڑکا اور اسے قُم قُم ہلدی کا تلک لگایا۔ برہمنوں کے کہے کو لفظ بہ لفظ شیریں آہنگ مدھر سنسکرت میں دہراتے ہوئے اس سے پرارتھنا کی کہ

وہ میری بہن سے بیاہ کرے اور گھر گرہستی بسائے۔" اس نے گھوڑی پر بیٹھے بیٹھے، بڑی فراخدلی سے رضامندی کا اظہار کیا اور عورتوں نے خوشیوں کے وجے گیت گائے۔

کیوں۔ اے برندابن کے سوامی، اے کرشن

کیوں تم دردمندی کا احساس لیے بھٹک کر ہمارے درمیان آگئے؟

اے جانکی پتر!

اے سندر رادھا کے پریتم!

گھوڑی بڑی شاندار تھی۔ ایسا لگتا تھا وہ کنڑا کے گیت اور سنسکرت کے بھجن ــــ سب سمجھ رہی ہے۔ سنگیت چلتا رہا۔ میں بارات کے آگے آگے چل رہا تھا۔ اور بارات شام کی دھول میں سے اور چھڑکاؤ سے ٹھنڈی کی ہوئی گرم موسم کی گلیوں میں سے، حیدر علی روڈ، محمد باغ، ریزیڈنسی کارنر، مہاتما گاندھی مین روڈ، کلاک ٹاور سے ہوتی ہوئی ہنومان مندر کی طرف چلنے لگی۔ میری طبیعت اچھی نہیں تھی۔ میں مندر تک نہیں گیا۔

"چچا سیتا رامو،" میں نے کہا "میرے سینے میں تکلیف ہو رہی ہے۔ میں اگر یہاں سے کھسک جاؤں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟ یہ سب بتا کر کسی کو ڈرایئے نہیں۔ کہہ دیجیے میں کوئی چیز لینے گھر گیا ہوں۔"

"او، ایسی بات نہیں کہی جا سکتی۔ ایسا کرنا اشبھ ہوگا۔"

"تب چچا سیتا رامو میں ان کھڑی کاروں میں سے ایک میں بیٹھ جاتا ہوں۔"

میں ڈاکٹر سندرم کی کار میں گھس گیا۔ بوڑھی عورتیں اور حاملہ عورتیں ایک دوسرے کے ساتھ سٹ کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ لیکن پھر بھی انھوں نے میرے لیے جگہ بنائی۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔ خون کے سرخ خلیوں کے بہر حال اپنے قوانین ہیں لیکن میں تو خاندان کا بڑا تھا، پریوار کا مکھیا تھا۔ چھوٹی ماں بڑی خوش دکھائی دے رہی تھیں۔ سنکماری بھی خوش تھی اور مہک رہی تھی۔

بارات کے پہاڑی سے نیچے آنے تک ایسا لگا جیسے ایک یگ بیت گیا ہے "تمہارے لیے یہ تھوڑی سی کافی ہے۔" چچا سیتا رامو بھی مجھے حوصلہ دینے کے لیے اندر آگئے۔ "سب کے

سامنے میں تمہیں اس سے زیادہ کوئی اور چیز نہیں دے سکتا۔" مجھے اس سے زیادہ تیز چیز کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کافی نے میرے جسم میں جان ڈال دی۔ بارات پھر چلنے لگی۔ لوگ، عام لوگ ہمیں وہاں سے جاتے ہوئے دیکھنے کے لیے سڑک کے دونوں طرف جمع ہو گئے تھے۔ نہ جانے کتنی عورتوں نے بڑی حسد بھری نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔ وہ یہ سب کچھ جانتی تھیں اور جلد ہی ان کی بیٹیاں بھی ان سب باتوں سے واقف ہونے والی تھیں۔ بھوری سبز اچکن پہنے اور سینے پر ہیروں کا ہار سجائے دولہا شہزادہ لگ رہا تھا۔ وہ دو تیوں چونیوں کی بوچھار کر رہا تھا جو اس کا بڑا بھائی اسے دے رہا تھا۔ یہ سب بڑا بھائی باپ کی جگہ کر رہا تھا کیونکہ پتا جی کی وفات ہو چکی تھی۔ گلیوں میں چاروں طرف پھولوں کی مہک تھی۔ جب بارات دولہے کی گلی میں مڑی تو چچا سیتا رامو بولے۔" اب تم کھسک سکتے ہو لیکن جلدی ہی آجانا۔" ساتھ کی چھوٹی گلی میں میرے لیے ایک کار کھڑی تھی۔ میں آچک کر اس میں بیٹھ گیا اور گھر چلا گیا۔ سارا باغ جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا اور ابھی تک پھولوں اور اگر بتیوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ گھر کے نوکر اور ٹائیگر دروازے پر کھڑے بارات کو واپس آتے ہوئے دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ جہاں تھے میں نے انھیں وہیں کھڑا رہنے کے لیے کہا اور اندر چلا گیا لیکن ٹائیگر میرے پیچھے پیچھے برآمدے میں آگیا۔ گھر بڑا سونا سونا اور اپنی ہی خانگی موجودگی سے بھرا بھرا لگ رہا تھا۔ پہلی بار پتا جی کے لیے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ٹائیگر بارات کو دیکھنے پھر واپس چلا گیا۔

ہاتھ منہ دھو کر اور کچھ آرام کرنے کے بعد میں آہستہ آہستہ زینہ چڑھ کر اوپر گیا

"سروجا" میں نے سرگوشی میں کہا "سروجا دروازہ کھولو۔"

"رمنّا۔ کیا تم ہو؟"

"ہاں، دروازہ کھولو" میں نے التجا کی۔ اس نے وہی ساڑھی پہن رکھی تھی جو وہ میرے وہاں سے جانے کے وقت پہنے ہوئے تھی۔ لیکن اس کے بالوں میں پھول نہیں تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ابھی ابھی نہائی ہے کیونکہ اس کے کنپٹیوں کے بال کنگھی سے سیدھے کیے ہوئے تھے اور گیلے تھے۔

"بھیا تمہیں کیا ہوا ہے۔ تم بڑے پیلے لگ رہے ہو!"

"کچھ نہیں۔ صرف تھوڑی سی طبیعت اچھی نہیں ہے"

"لیٹ جاؤ بھیا، اس نے بڑے پیار سے کہا اور مجھے اپنے بستر پر لیٹنے کے لیے رضا مند کر لیا۔ پنکھا لیا اور مجھ سے پنکھا کرنے لگی۔ جب میں لیٹا تو ٹھنڈک تھی۔

"یہ تم کیا پڑھ رہی ہو؟" تکیے پر اپنے چہرے کے پاس ایک اُدھ کھلی کتاب دیکھ کر میں نے اس سے پوچھا۔

"اوہ کچھ نہیں۔ میں 'دی میجک ماؤنٹین' پڑھ رہی تھی۔ آج تک میں نہیں سمجھ پایا کہ "یہ دی میجک ماؤنٹین" کا اثر تھا یا خون کے سرخ خلیے اپنی رہائی کے آرزومند تھے کہ میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور سروجا کی ساڑھی اور فرش پر اپنے خون کی قے کر دی۔ میرا منہ پونچھتے، صاف کرتے اور آرام سے بستر کی چادر بدلتے ہوئے مجھے وہ بڑی حوصلہ مند لگی۔ پھر وہ پتاجی کی الماری تک گئی کیونکہ یہ پتاجی کا کمرہ تھا اور مجھے وہ تھوڑی سی پرانی برانڈی لا کر دی جسے کبھی کسی نے چھوا بھی نہیں تھا۔ اس سے مجھے کچھ طاقت اور راحت ملی۔ اور جب چچا سیتا رامو آئے تو دیکھتے ہی سب سمجھ گئے۔

بیچارہ لڑکا۔ ماؤں کے باپ بیٹوں کے سر کیوں لگیں۔ انھوں نے میری پیشانی کو تھپتھپاتے ہوئے کہا "جب لوگوں نے مجھ سے پوچھا تو میں نے انھیں بتایا کہ تمہیں دمے کا ہلکا سا دورہ پڑا ہے۔ صبر رکھو میں انھیں بتا دوں گا کہ اب کچھ آرام ہے۔ سنگیت کا جوش و خروش بڑھ رہا ہے اور کافی دیر تک یہ ایسے ہی چلے گا۔ ایک راگ کو گھنٹوں تک کھینچا جا سکتا ہے میں آنند بائی کو کہوں گا کہ وہ اپنا بھرت ناٹیم تڑکے چار بجے تک ختم کر دے۔ کتنی اچھی لڑکی ہو تم سروجا۔ جو تمہیں ایسا بھائی ملا ہے۔ چچا سیتا رامو کچھ ایسے بولے جیسے وہ سب کچھ سمجھ رہے ہیں۔

میں کافی دیر سویا ہوں گا کیونکہ جب میں نے اپنی آنکھیں کھولیں تو میں نے چھوٹی ماں کو اپنے پاس بیٹھے پنکھا کرتے پایا۔ ہماری قسمت اچھی نہیں ہے۔ ہمارے خاندان کی ہی قسمت اچھی نہیں۔ تمہارے جیسا ذہین بیٹا ہونے پر بھی اس کے ساتھ یہ سب ہو جانا۔

تمہاری پچھلی بیماری کے بعد تمہارے پتا نے کہا تھا " یہ اپنی ماں سنا جیسا ہے بالکل اس جیسا۔ کیکر کے پھول کی طرح نرم و نازک "۔
رت نے مجھے پریشان نہیں کیا۔ لیکن سروجا کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ وہ بولی " بھیا وعدہ کرو کہ تم آکر میرے پاس رہو گے۔ میں تمہاری دیکھ بھال کروں گی "۔
میں نے کہا " میں وعدہ کرتا ہوں "۔ اس سے سب لوگ خوش ہو گئے۔ میرا خیال ہے اس سے میں بھی خوش ہوا کیونکہ میں قدرے آسانی سے سانس لینے لگا۔
چچا سیتا رامو بھاگے بھاگے اندر آئے اور بولے " تم فکر نہ کرو میں نے سب ٹھیک کر دیا ہے۔ میں نے کہا ہوائی جہاز کے سفر سے تم پریشان ہو گئے اور تمہیں دست لگ گئے ہیں۔ اس سے ساری بات ٹھیک ہو گئی ہے۔ کل تم سچ مچ نہ دست لگا بیٹھنا "۔ انھوں نے بھونڈے طریقے نے اپنی بات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا " ورنہ مجھے سب کے سامنے کموڈ دکھانا پڑے گا اور یہ بڑا مشکل کام ہے "۔ انھوں نے انگریزی میں کہا۔ چھوٹی ماں تو نہیں سمجھ سکیں لیکن ہم تینوں ہنس پڑے۔
" شادی والے گھر میں ایسے شاندار آدمی کا ہونا کتنا اچھا ہے "۔ میں نے سروجا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
" سب موقع پرست ہیں "، سروجا نے نفرت سے کہا " تمہیں یہاں دیکھ کر سبھی دودھ مسری ہو جاتے ہیں۔ لیکن جونہی تم نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہو سب لوگ آسمان کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ ہمیں آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے حالانکہ ہمارے بالکل سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔ پتاجی کی موت کے بعد ہم لوگوں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں رہا "۔ اس نے بات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ہم چپ ہو گئے۔
سروجا دوسرے کمرے سے بستر لائی اور فرش پر بچھا دیا۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ آج ساری رات مجھے پرارتھنا کرنی چاہیے۔ تمہاری دیکھ بھال کرنے سے بہتر اور کون سی پرارتھنا ہو گی۔ آؤ اب سو جائیں۔ اور جب ضرورت ہو مجھے جگا لینا۔ ضرور جگا لینا۔ چھوٹی ماں، آپ یہ کہہ دینا سروجا پوجا پرارتھنا میں مصروف ہے "۔

چھوٹی ماں بڑی اداس اور دکھی تھیں لیکن وہ ہمارے پاس سے چلی گئیں۔ وہ اس نئی، اپنے کے کہنے کے مطابق یونیورسٹیوں کی پیداکی ہوئی دنیا کو سمجھنے سے قاصر تھیں "انگریزی سیکھنا آسان ہے۔ یہ کچھ ہی برس میں سیکھی جاسکتی ہے لیکن 'سیتارام' کرشن گوبند کہنے میں جنم لگ جاتے ہیں۔ نوجوان پیڑھی یہ کبھی نہیں سمجھ سکے گی"۔ وہ اپنے آپ سے بڑبڑائیں اور چلی گئیں۔

دو ایک بار جب میں نے آنکھیں کھولیں سروجا کو تھامس مان پڑھنے میں مصروف پایا۔ اس نے چادر پر لگا ہوا خون دھوڈالا تھا۔ اور ہلکی سی روشنی میں میرے خیال میں بڑے دھیان سے پڑھ رہی تھی۔ میں ہار گیا تھا۔ مجھے نیند آگئی۔

اگلی صبح جب میری آنکھ کھلی دن کافی چڑھ آیا تھا۔ گھر میں خوب مبارک شور و غل تھا۔ سنگیت کار منگلاچرنم میں مصروف تھے اور عورتیں نہاتے ہوئے غسل خانے میں گیت گنگنا رہی تھیں۔ سروجا کو نو پانیوں سے نہلایا۔ چمکایا جارہا تھا اور اس کے نوجوان جسم کو اس کے حقیقی اساسی مقدر کے لیے تیار کیا جارہا تھا۔ سکھانے کے لیے آگ اور لوبان جل رہا ہوگا کیونکہ اوپر کی منزل میں بھی میں لوبان کی تیکھی مہک محسوس کرسکتا تھا۔

"بالیگا" میں نے زور سے آواز دی اور نوکر دوڑتا ہوا آیا۔

" مالک! آپ کی طبیعت کیسی ہے اب؟" اس نے پوچھا" مالکن یہ دیکھنے کے لیے کہ آپ جاگ گئے ہیں یا نہیں کئی بار اوپر آکر نیچے جاچکی ہیں۔ غسل خانے میں گرم پانی رکھا ہے۔ جب تک آپ اپنے دانت صاف کرنے سے فارغ ہوتے ہیں میں آپ کے لیے کافی لے آتا ہوں"۔

"چھوٹی ماں سے کہنا میں جاگ گیا ہوں اور پہلے سے بہتر ہوں" اور اندر کے آنگن جھانکنے کے لیے دروازے تک گیا۔ چاروں طرف ہری نیلی ساڑھیاں اور ہیرے، لعل، نیلم چمک رہے تھے۔ تلسی کے پاس آگ کی انگیٹھی پر سروجا اپنے پھیلے ہوئے بال سکھا رہی تھی۔ اور عورتیں اسے مہندی اور ہلدی کا اُبٹن لگا رہی تھیں۔ پورے برآمدے میں چاندی کے کلس اور آم کے پتے دکھائی دے رہے تھے۔ عورتیں یہ گاتے ہوئے بڑی خوش لگ رہی تھیں:

دوشیزہ ندی کے جل میں اشنان کرکے

اور پوتر پوشاک پہن کر
دھیرے دھیرے، خاموشی سے بھگوان شِو کی پوجا کرتے ہوئے
اے بہن! وہ پتنی بن گئی۔

خوشیوں میں نہائی ہوئی پاروتی کی
دھوپ دیپ، تم تم جل سے آرتی کرو
یہ پوتر خوشی، یہ پوتر سکھ
یہ شُبھ سوبھاگیہ
سدا سدا کے لیے بنا رہے
سفید جبا کسُم، چنبیلی کے پھولوں کی مالا
چندر رکھی کی مانگ میں بہن
موتی نچھاور کرو

میرا دل نہیں بلکہ میرا پیٹ خالی لگ رہا تھا۔ میں پھر قے کرنا چاہتا تھا۔ بچّے باہر زور زور سے چلّا رہے تھے اور ناریل کے پیڑوں پر بیٹھے کوّوں نے اپنی محفل ابھی سجائی ہوئی تھی۔ جلدی ہی دھوپ چڑھ جائے گی اور گیارہ بجے شادی کی رسم کا وقت تھا۔

جب میں ہاتھ منہ دھونے گیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں نے کتنا خون قے کرکے اُلٹا ہوگا۔ اس میں سے بہت سا میں نے سر وجا کے اوپر بھی گرایا ہوگا کیونکہ نہانے کے ٹب کے پیچھے پڑی اس کی ساڑھی پر گہرے لال دھبّے دکھائی دے رہے تھے میں نے کچھ سے ہاتھ منہ دھویا اور جب بستر واپس بستر پر آیا تو چھوٹی ماں کافی لیے ہوئے وہاں بیٹھی تھی۔

"رام مجھے خوشی ہے کہ تم ٹھیک ہو۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ تمہاری بہن کس قدر ٹیڑھی ہے۔ اس کو بٹھانے اُٹھانے کے لیے سینکڑوں عورتوں کو دلیل بازی کرنی پڑتی ہے۔ باربار تعریف اور اس کی چاپلوسی کرنی پڑتی ہے۔ اب بہت ہو گیا تھا۔ میں نے چچا سیتارامو کو کہلوایا اور وہ آکر کھڑے ہو گئے۔ ان کی زبان مندر کے گھنٹے کی طرح تیز ہے۔ چونکہ

وہ آگئے! اس لیے ہر کام ٹھیک ٹھاک ہو رہا ہے۔ گھر میں مردوں کے ہونے یا نہ ہونے سے بڑا فرق پڑتا ہے۔"

میں نے ابھی کافی کے دو گھونٹ بھی نہیں پیے تھے کہ چچا سیتا راموآ گئے۔ انھوں نے سنہری کناری دار چادر کے گرد لپیٹ رکھی تھی اور انگلیوں میں ہیرے کی انگوٹھیاں تھیں وہ بری طرح ہانپ رہے تھے۔

"بھیا اب اٹھ جاؤ اور آکر میری مدد کرو" انھوں نے کہا "ہم سب جانتے ہیں کہ تم بڑے نازک ہو اور پنجوں کے بل چلنے والے خاندان سے ہو لیکن مجھ سے اور خوشامد اور منت سماجت نہیں ہو سکتی۔ عورت، عورت ہی ہوتی ہے اور بھلے ہی اس کے پاس یونیورسٹی کی ڈگری ہو اسے بہر حال بات مان ہی لینی چاہیے۔ میں جو کچھ سروجا سے کہہ سکتا تھا کہہ چکا۔ اب تم یہ ذمہ سنبھال لو۔" انھوں نے التجا کی۔

میں قدرے مشکل سے اٹھا۔ بالیگا میرا شیو کا سامان اور نہانے کے لیے گرم پانی لے آیا۔ سنگیت کی آواز آرہی تھی۔ کاریں، گھوڑا گاڑیاں، سائیکلیں، اور سائیکل رکشا دروازے سے آجا رہے تھے۔ عورتیں بلند آوازمیں گا رہی تھیں۔

گوری آٹھ گنوں کا لباس پہنے ہوئے ہے
بڑی تپسیا، پرارتھنا کی ہے تاکہ پربھو اپنی آنکھیں کھولیں

میں سن سکتا تھا کوئی اندر آکر کہہ رہا تھا "ساڑھے نو بج گئے ہیں اور کوئی بھی اب تک تیار نہیں ہوا۔ گیارہ بج کر سترہ منٹ کا مہورت ہے۔" میں اٹھا اور اپنی گھڑی دیکھی۔ ابھی لگ بھگ نو بجے تھے۔ میں نے جلدی جلدی غسل کیا۔ اپنا بکس اوپر منگوایا اور لال سنہری کناری والی نئی دھوتی، لکھنوی واسکٹ اور وہ سندر شال پہن لی جو سروجا میرے لیے لائی تھی۔ اس میں نفیس سنہری دھاری کے ساتھ لال رنگ کی رُدراکشی بنی تھی۔ سکماری نے جو مجھے بلانے اوپر آئی تھی میرے بالوں میں کنگھی کی اور چلائی "رامنا تم کتنے پیلے لگ رہے ہو۔ لیکن ہو بالکل شہزادے جیسے!" بڑے فخر سے میرا ہاتھ پکڑ کر وہ دھیرے دھیرے مجھے سیڑھیوں سے نیچے لے آئی۔ وہ چاہتی تھی ساری دنیا مجھے دیکھے اور مجھے

اپنے اندر بسالے۔

لیکن اب سارا گھر خالی سا لگ رہا تھا۔ عورتیں دوسرے گھر گئی ہوئی تھیں۔ غالیچے بے ترتیبی کی حالت میں تھے۔ پھولوں کے ہار کونوں کھدروں میں پڑے مرجھا رہے تھے۔ بچّے ادھ کھلے بستروں پر سو رہے تھے اور لوبان اور بچّوں کے پیشاب کی ملی جلی مہک چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اسے سونگھنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ ٹائیگر نے بھی شادی کے پنڈال میں جانے، اسے سونگھنے اور پوتر برہمن کے درشن کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں اپنے کمرے میں جا کر بیٹھ گیا اور سکماری کہنے لگی "تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ سروجا کتنی خوش قسمت لگ رہی ہے۔ بھیا! وہ بڑی خوبصورت ہے۔ بڑی پیاری دلہن ہے۔ ذرا سوچو وہ نکّے لوگ اسے لے جائیں گے۔" پھر اچانک ہی وہ میرے پاس سے اُٹھ کر چلی گئی جیسے الفاظ اس کے گلے میں سوئیوں بھرے بورے کی طرح پھانس بن گئے تھے۔ جلد ہی میں اسے نیچے سرگوشیوں میں باتیں کرتے ہوئے سن سکتا تھا۔ شاید وہ سروجا سے باتیں کر رہی تھی کیونکہ میں جانتا تھا سروجا ضرور اس وقت پوجا گھر میں گوری پوجا کر رہی ہوگی۔ مجھے خدشہ تھا کوئی آ کر کہے گا "سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ آؤ رام۔ آؤ۔" لیکن کوئی نہیں آیا اور یہ سنّاٹا میری برداشت سے باہر تھا۔ میں دنیا کا چھوٹا بھائی تھا۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی میں خاندان کا مکھیا تھا۔ مجھے ہمت سے کام لینا چاہیے، مضبوط ہونا چاہیے۔ لیکن سروجا سے بچھڑنا تکلیف دہ تھا! وہ کبھی کبھی مجھ سے بھی زیادہ میرے جیسی لگتی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو سمیٹا، اپنے خیالات کو ان کے خانوں سے دھکیل باہر کیا اور اپنی عمیق ترین گہرائیوں میں ڈوب گیا جہاں اگر آپ تاروں کی روشنی میں باہر نکل کر کھلی آنکھوں سے دیکھنے کی ہمت کریں تو مچھلیوں، آبی بچھوؤں، سنگستانوں سمیت رات کی تاریکی میں بہتی ندی کی طرح سکون ہمیشہ موجود ہوتا ہے۔ میری علالت نے میرے خیالات کو بلاشبہ قوّت عطا کر دی تھی اور میں اپنی انتہاہ گہرائیوں میں اتر گیا ہوں گا کیونکہ جب میں جاگا تو میں نے دیکھا سروجا کا ہاتھ میرے سر پر تھا۔

"کیا بہت تکلیف ہے بھیّا؟" اس نے پوچھا "لیکن تمہاری سانس آج کافی بہتر لگ رہی ہے۔" اس کی آواز ہلکی پھلکی، صاف اور بچّے کی آواز کی طرح سادہ و معصوم تھی۔

وہ کافی دیر تک کھڑی میرے بالوں سے کھیلتی رہی۔ پھر اچانک جیسے اس کے دل میں حوصلہ پیدا ہوگیا تھا وہ میرے سامنے آگئی ۔ اس نے مور کے سے نیلے رنگ کی ساڑھی سونے کی سرپ کرپٹی ، ہیرے کے جھمکے ، چہرے پر ہلدی کا اُبٹن ، آم کی شکل کا سونے کا ہار۔ یہ سب اسے اہمیت کا کچھ ناگزیر کا احساس عطا کر رہے تھے ۔ اس کی آنکھیں لمبی اور گہری کالی تھیں لیکن انھیں اس نے بند کرلیا۔ ہاتھ جوڑ کر نیچے جھک گئی اور میرے پاؤں چھُو کر کہنے لگی " بھیّا مجھے آشیرواد دو۔ میں اپنے سر پر صرف تمہارا کومل ہاتھ ۔ تمہارا مضبوط محافظ ہاتھ چاہتی ہوں "

وہ کافی دیر تک اسی طرح رہی ۔ بے حرکت ایک سسکی تک نہیں لی اس نے ۔ پھر اُٹھ کر میرے سامنے کھڑی ہوگئی اس کے بچّوں جیسے چہرے پر کیسی پختگی آگئی ۔ وہ کچھ اس طرح مسکرائی جیسے وہ میں ہی تھا جس کے لیے وہ دکھی تھی ۔" بھیّا میں خاندان کے نام کو اونچا رکھوں گی ۔ فکرمند نہ ہونا " دھیرے دھیرے اور بڑے مودبانہ ڈھنگ سے وہ کمرے سے نکل کر پوجا گھر میں چلی گئی ۔

میں بمشکل اپنے آنسو پونچھ ہی پایا تھا کہ چچا سیتارامو دروازے سے ہی رام رام چلّاتے ہوئے آئے اور میں خوشی خوشی ان کے ساتھ دوسرے گھر چلا گیا۔ سُکماری اپنی بہن کے پاس ہی رک گئی ۔ کیسا شاندار اجتماع تھا یہ ! اس میں بزرگ ، وکیل ، وزیر صوبے کے سیکریٹریوں اور انڈر سکریٹریوں کی بیویاں اور راجہ صاحبان سب شامل تھے ۔ بڑا شاندار بیاہ ۔ مجھے ہون منڈپ میں اگنی کے سامنے جگہ دی گئی ۔ ذرا سا ایک طرف ہٹ کر میں دادا اکشنّا کے پُر تعظیم روشن چہرے کو دیکھنے کے لیے ترس گیا لیکن وہ اب دنیا میں کہاں تھے ۔ ہے بھگوان انسان کیسے جیتا ہے اور کیسے مرجاتا ہے ۔

برہمن مجھے دیکھ کر خوش ہوتے ۔ جونہی میں آیا ان کی آوازیں اور اونچی ہوگئیں ۔ میرے پتاجی کے پرانے دوست مجھے بدھائی دینے اور میرا حال چال پوچھنے آئے ۔ وہاں پگڑیاں ، وردی اور دیگر چیزوں سمیت ۔ پتاجی کے کچھ پرانے نوکر بھی تھے انھوں نے جھک کر مجھے پرنام کیا ۔ گیہ کی اگنی جلادی گئی ۔ اور اس میں گھی ڈالا گیا ۔ پھر دودھ ، دہی اور شہد ۔

"اگنے نموسواہ" اس سے میرے من کو کیسی پوِتر تا ملی۔ اس پوِترتا سے میں بھی پوِتر ہو گیا تھا۔ اس بیچ سکماری قُم قُم لائی اور میرے ماتھے پر ایک بڑا سا تلک لگا دیا۔ دولہا بڑی خوبیوں والا اور حکم ماننے والا لگ رہا تھا۔ اس کے کسی حد تک عام سے چہرے پر چمک تھی۔ اس کے خاندان کے لوگ بڑے خوش تھے۔ وہ ان کا سب سے زیادہ پڑھا لکھا بھائی اور بھتیجا تھا اور انھیں یقین تھا کہ یہ بہت اچھی جوڑی ہے۔ منتروں، بھجنوں کی آواز اور بھی اونچی اور شدید ہو گئی۔ چچا سیتا رامو غائب ہو گئے اور پھر پچھلے دروازے سے آئے۔ میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولے "وہ آگئی ہے۔" دولہا اب اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور سروجا میرے پیچھے سے نمودار ہوئی۔ گمبھیر، شبھ اور ثابت قدم۔ بیاہ کے پردے کا کپڑا اٹھا دیا گیا۔ اور سیتا رامو نے سروجا کو کمر کے پیچھے سے سہارا دیا۔ اس کی کانچ کی چوڑیاں اپنے ہی دباؤ سے ٹوٹ گئیں۔ ہمارے ہاتھوں میں رکھے قُم قُم لگے چاول گرم ہو گئے تھے سب کو پھول بانٹے جا رہے تھے۔

مرد یعنی پُرش کی ہزار آنکھیں ہیں
ہزار آنکھیں، ہزار پاؤں
دھرتی پر ہر طرف حکمراں
وہ دس انگلیوں کے برابر جگہ گھیرتا ہے
یہ مرد ہی ہے جو ہمیشہ سے سب کچھ تھا
اور سب کچھ ہوگا
دوام کا ابدّیت کا قانون

جب دیوتاؤں نے یگیہ کی تیاری کی
مرد یعنی پُرش کے ساتھ جوان کی اولاد تھا
اس کا گھی موسم بہار تھا
ہدیۂ مقدّس، خزاں
اور سمدھا یعنی لکڑی گرمی کا موسم!

سروجا نے سُبرامنیا کے گلے میں ورمالا ڈال دی۔ چھوٹی ماں ایک کونے میں کھڑی آنسو بہا رہی تھی۔ سُکماری بھی اس کے ساتھ شامل ہوگئی۔ پھر چچیاں، بڑی چچیاں، دادیاں بھی اپنے آنسو پونچھنے لگیں۔ میں نے بس اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ سروجا ہمارے گھر سے وداع ہو گئی۔

میں پُرش ہوں، مرد ہوں
تم عورت ہو
میں سنگیت ہوں
تم شبد ہو
میں آکاش ہوں
تم دھرتی ہو
آؤ ہم دونوں ایک ہو جائیں
آؤ ہم دونوں اولاد پیدا کریں

میں نے بھی دولہا دلہن پر پھول اور قُم قُم لگے چاول پھینکے۔ خوشی، پکّے ارادے کی بات ہے۔ آپ جب خوش ہونا چاہیں، خوش ہو سکتے ہیں۔ یہ خون کے سرخ خلیوں کا سوال ہے۔ شاید، خوشی شوہر میں ہے گھر میں اور بچّوں میں۔ آخر کار سروجا جائے گی کہاں؟

اس نے سات بار میرے اجداد، رام کرشنیا، رنگنّا، مادھو سوامی، سوم سندریا، سنجیویّا، رام چندریّا کے نام لے کر اگنی کے سات پھیرے لیے۔ سات بار اپنا نام بدلا تاکہ جہاں وہ جا رہی تھی وہاں کی ہو سکے۔ آگے چل رہی تھی۔ گھی کی آہوتی دی جا رہی تھی۔ تڑتڑ لپٹیں اٹھ رہی تھیں اور زیادہ گھی مانگ رہی تھیں۔ مہمانوں میں عطر بانٹا گیا۔ سب سے پہلے بزرگ، پھر بڑے اور پھر ہم سب 'تالی' کو چھو رہے تھے۔ دولہا نے اسے سروجا کے گلے کے گرد باندھ دیا۔ "سروجا بالکل لکشمی لگ رہی ہے،" منیک کرچچی نے مجھ سے کہا۔ سنگیت کی آواز کچھ اور تیز ہو گئی۔ بڑا شاندار سنگیت تھا۔ کیونکہ سنگیت کار رِدیا خاص

طور سے اس شادی کے لیے مدراس سے آیا تھا۔ جب ناریل بانٹا جا رہا تھا تو عورتیں آشیرواد
کے گیت گا رہی تھیں۔ سونے کے زیورات، ساڑھیاں۔ چاندی کی پلیٹیں چاندی کے
برتن جمع کرتی جا رہی تھی۔ ساتھ ساتھ سنسکرت منتروں کی لَے کے حساب سے دینے والوں
کے نام زیر و بم میں سے گزر رہے تھے۔ ماحول میں خوشی تھی۔ پنڈال میں بیٹھے لوگوں نے
سگریٹ پینا شروع کر دیا۔ مہمان ایک ایک کر کے مجھ سے ملنے اور مجھے بتانے آئے کہ میں اپنے
باپ کا کیسا ہونہار بیٹا ہوں۔ "جلد ہی تم ہمارے ساتھی بن جاؤ گے۔" کچھ پروفیسر کہنے لگے
"ہندوستان میں تم کتنے دن رہو گے؟" دوسروں نے پوچھا۔
مہمانوں کو لے جانے کے لیے کاریں آنے لگیں۔ پگڑیاں، گلوبند، دوشالے، کلائی
کی گھڑیاں، چھڑیاں، پمپ جوتے، رنگین رومال، پھولوں کے ہار سب غائب ہو گئے۔
بائیسکل رکشا اپنی غیر مقدس گھنٹیوں کا شور مچا رہے تھے۔ کہیں کوئی گھوڑا ہنہنایا۔ ٹائیگر
دروازے پر کھڑا تھا۔ جیسے وہ مہمانوں کی گنتی کر رہا تھا۔ اور پھر پرلوک میں جا کر پتاجی
کو سب کچھ بتائے گا۔ اس بیچ سنگیت کاروں کا بھگتان بھی کرنا تھا۔ ٹیکسی والے
زیادہ کام کے باعث زیادہ پیسے مانگ رہے تھے۔ کھیر کے لیے رکھا ہوا دودھ پھٹ گیا
تھا۔ شام کو نکلنے والی یاترا کا راستہ بدلنا پڑا۔ کسی کو اس بات کا خیال ہی نہیں آیا کہ
پہلے پہل جنوب کی سمت میں نہیں جانا چاہیے۔" ایسی نامبارک اَشبھ بات کا مشورہ جاہل
عورتوں نے دیا ہوگا۔" چچا سیتا رامو نے نتیجہ نکالا۔ میں تھک گیا تھا۔ میں آہستہ سے اُٹھا
اور اندر چلا گیا۔ شادی کی رسموں کے دوران دولہے کے لیٹنے کے لیے وہاں ایک دیوان
رکھا ہوا تھا۔ چچا سیتا رامو مجھے وہاں لے گئے اور لیٹنے کے لیے کہا۔ سکماری میرے پاس
کھڑی کھجور کے پتوں کے بنے ایک بڑے سے سجے سجائے پنکھے سے مجھے ہوا کر رہی تھی۔
یہاں ٹھنڈک تھی۔ سارے گھر سے صندل کے لیپ کی مہک آ رہی تھی۔ چنبیلی کے ہار
ٹھیک میرے پیچھے لٹکے ہوئے تھے۔ "ان کی مہک ضرورت سے زیادہ تیز ہے۔ کیا آپ
مہربانی کر کے انھیں یہاں سے ہٹا کر کہیں اور نہیں رکھ سکتے؟" میں نے پوچھا۔ پھول ہٹا
دیئے گئے۔ رسوئی گھر سے لڈو بنانے کا شور آنے لگا۔ ان کی خوشبو بڑی اچھی لگی۔

میری آنکھ لگ گئی ہو گی کیونکہ میں جاگا تو پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ سُکماری اب وہاں نہیں تھی۔ لیکن اب بالیکا میرے لیے پنکھے سے ہوا کر رہا تھا۔ چچا سیتا رامو اندر آئے۔ ان کے پیچھے پیچھے برہمن تھے۔ ناریل، پان کے پتے، دھوتی اور سونے کا سکّہ۔ سب چیزیں تیار تھیں۔ میں نے ہر ایک کے سامنے ایک پلیٹ رکھ دی اور ان کے چرنوں کو چھوا "بھگوان گرہستی کا، گئو دان اور سونا دان کرنے والے کا کلیان کریں" سنسکرت کے غلط تلفظ کے ساتھ وہ بڑبڑائے۔ سنسکرت کا غلط تلفظ کسی قدر کوفت پہنچا سکتا ہے۔ میں اپنے آپ سے کہنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں لڑھک کر ایک برہمن کے اوپر گر پڑا۔ ٹھوکر لگنے سے ناریل اور سپاری کمرے میں بکھر گئے۔ انھوں نے مجھے اٹھایا۔ چچا سیتا رامو بولے "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ہوائی جہاز کا سفر بڑا تھکا دینے والا ہوتا ہے۔" برہمن چچا سیتا رامو کی اس بات سے متفق تھے۔

دولہا آیا اور میرے پاس بیٹھ گیا۔ اپنے نئے سالے کے لیے اس کے دل میں پوری عزت اور پیار تھا۔ اسے سروجا پر فخر تھا اس نے بتایا کہ ہمارے خاندان کا فرد بننا اس کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا۔ "میرا ایک افسر فرانس کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔ وہ مونٹے کارلو پیرس اور فرانس کے جنوبی حصّے کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ اس کا بھائی اس سے چھوٹا یہ بتانے کے لیے اندر آیا کہ اس نے اپنے ڈگری کورس میں فرانسیسی لے رکھی ہے۔ وہ 'لیٹرز آف مو موئے' اور مولیر کا میلاڈی اِمے جی نر' پڑھ رہا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ سفیر بنے گا۔ کزن وشیشور کا لڑکا لکشما یہ بتانے آیا کہ مجھے دیکھ کر وہ کتنا خوش تھا۔ وہ حال ہی میں کارنل سے لوٹا تھا۔ اس نے ریڈیو انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ دنیا بڑی تھی اور خوشحال تھی۔ اس کمرے میں میرا دم گھٹنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔

چچا سیتا رامو چلائے "بے وقوفو! وہ تھکا ہوا ہے اور اسے ہوا کی ضرورت ہے اور تم لوگ اسے ایسے گھیرے ہوئے ہو جیسے یہ کوئی پوتر سونا کھودنے والا ہے۔" سب لوگ باہر چلے گئے۔ صرف دولہا اپنے ٹکٹ اپنے پسینے اور انگلیوں کی سونے کی انگوٹھیوں کے ساتھ وہاں رہ گیا۔ جب میں نے آنکھیں بند کیں تو وہ چلا گیا اور سروجا کو ساتھ لے کر

واپس آیا۔ سروجا میرے پیروں کے پاس بیٹھ کر میری ٹانگیں دبانے لگی۔ میں پھر سو گیا۔

شوبھا یاترا، لڈّو اور فینی والے رات کے کھانے اور لڑکے والوں کو سروجا کو لے جانے کے انداز کی تفصیل کا ذکر کرنا بے کار ہوگا۔ آدھی رات کے کافی بعد جب سروجا میرے بستر کے پاس بیٹھی چپ چاپ پنکھا کر رہی تھی تو دلہن کو لینے کار آگئی۔ عورتوں نے گھر بردھاوا بول دیا " دلہن دلہن " کی آوازیں آنے لگیں۔ سروجا بولی " بھیّا اب میرے جانے کا وقت ہو گیا ہے "۔ اس نے پنکھا میرے پاس رکھ دیا اور جانے لگی " میں جلدی آؤں گی، جلدی سے اچھے ہو جاؤ بھیا۔ اس بیچ میں گھر کا خیال رکھوں گی " اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور سیڑھیوں سے نیچے اتر گئی۔ اس میں اتنی گمبھیرتا، فیصلہ کرنے کی قوّت اور ذمہ داری پیدا ہو گئی تھی کہ وہ ابھی سے عورت لگنے لگی تھی۔

جب وہ نیچے آئی تو عورتوں نے سواگت گیت گائے اور خوب قہقہے لگائے۔ جب وہ دہلیز پار کرنے لگی تو اس سے اس کے پتی کا نام پوچھا " سروجا سے کچھ زیادہ نہیں کہنا پڑا " ببراسنیا شاستری " وہ اس انداز سے بولی جیسے یہ اس کے کسی پروفیسر کا نام تھا۔

ساری رات چھوٹی ماں بیٹھی مجھے پنکھا کرتی رہی۔ مجھے ایک بار پھر خون کی قے ہوئی لیکن خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ میں نے زور دے کر کہا کہ وہ دوسرے گھر جا کر ناچ دیکھیں اور گیت سنیں " یہاں بالنگا دیکھ لے گا " میں نے کہا۔ وہ چلی گئیں۔ کافی رات گئے میں نے ان کے واپس آنے کی آواز سنی۔

" وہ لوگ کیسے اچھوت لگ رہے تھے " چھوٹی ماں بولیں " ذرا سوچو ہم نے اپنے آنگن کا کیسا سندر پھول ان کو دے دیا "

سکماری نے اپنی طرف جوڑا " تالی بندھنے تک سب کچھ میٹھا ہی میٹھا ہے۔ بعد میں نیم کی کڑواہٹ ہی کڑواہٹ کا سلسلہ رہ جاتا ہے "

صبح جب میں بیٹھا کافی پی رہا تھا تو وہ آگئے، وہ چچا سیتا راموّ تھے۔ ان کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔ ارے رام اتنی اچھی لڑکی ایسے مردہ خور چنڈالوں کے حوالے کر دی ہم لوگوں نے۔ وہ رتبے کے لیے اپنی زبان تک بیچ دیں گے۔ اس سے زیادہ میں عورتوں کے سامنے کچھ نہیں

کہہ سکتا۔ ساری رات" انھوں نے میرے کانوں میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا" بہنیں اور بچیاں تائیاں سہاگ رات والے کمرے کے اردگرد گھوم گھوم کر فحش گیت گاتی رہیں اور تڑکے ابھی مرغے نے اذان بھی نہیں دی تھی کہ وہ دولہا دلہن کے کمرے میں گھس گئیں۔ ان پیدائشی بیواؤں نے یہ کیا۔ کیا ہم مسلمان ہیں۔ میں پوچھتا ہوں، کیا ہم مسلمان ہیں؟ سروجا ایک کونے میں بیٹھ کر رونے لگی۔ آہ قصائی کہیں کے۔ میں نے بھی انھیں خوب کھری کھری سنائیں" ہم اپنے گھروں میں گوشت نہیں بیچتے۔ سٹریان ہم اپنی لڑکیوں کا بیاہ کرتے ہیں" میں نے ان سے کہا۔

جو کچھ کہا گیا تھا چھوٹی ماں نے آدھا ہی سنا" شبو، شبو" انھوں نے بلند آواز میں کہا رسوئی گھر میں ہمارے لیے اور کافی لینے چلی گئیں۔

دو راتوں کے بعد سروجا اور سُبرامنیا ہم سے وداع لینے آئے۔ چھوٹی ماں نے اُسے دینے کے لیے سب کچھ تیار کر رکھا تھا۔ کڑہائیں، چادریں، برتن، بھگوان کی مورتیاں؛ ساڑھیاں، پتاجی کے اور میرے فوٹو۔ سروجا مسکراہٹوں میں نہائی ہوئی لگ رہی تھی۔ وہ گھر سے چلی تو خوش خوش اور احساسِ تکمیل سے سرشار نظر آرہی تھی۔ ایسا لگتا تھا شادی اسے اچھی لگی تھی۔" آؤ اور کم سے کم ایک ہفتہ دہلی میں ہمارے ساتھ رہو" اس نے التجا کی اور حمایت کے لیے اپنے پتی کی طرف دیکھا۔

" دہلی کی آب وہوا بڑی اچھی ہے۔ ٹانک کا کام کرتی ہے" سُبرامنیا نے کہا۔ سروجا کا سچ مچ بیاہ ہو گیا تھا۔

" وہ خوش لگتی ہے۔ رام۔ گھر اور پتی کے علاوہ آخر عورت کو اور کون سی خوشی چاہیے۔ مندر کو گھنٹی کی ضرورت ہوتی ہے،" چھوٹی ماں نے کسی کہاوت کا حوالہ دیتے ہوئے کہا" اور عورت کو پتی کی تاکہ گھر کی چاردیواری چہک اٹھے۔"

اسی بعد دوپہر ڈاکٹر پائی میرا معائنہ کرنے آئے۔ وہ زیادہ فکرمند نہیں تھے۔ لیکن فی الحال ہوائی سفر کا سوال ہی نہیں تھا۔ یورپ کی سرد آب وہوا کا بھی نہیں۔ جنوبی فرانس کا بھی نہیں۔ انھوں نے زور دے کر کہا۔ وہ دنیا کے اس حصّے سے بخوبی واقف تھے

"شاید گرمیوں میں، بعد میں تم جا سکو۔" انھوں نے کہا۔

"لیکن میری بیوی ہے اور اس کے بچّہ ہونے والا ہے۔" میں نے دلیل سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"تمہاری بیوی بلاشبہ چاہے گی کہ تم وہاں مرنے کے بجائے یہاں زندہ رہو۔"

اس بھونڈی بات سے چھوٹی ماں کو صدمہ پہنچا۔ انھوں نے اپنی کنپٹیوں پر دو ہتھڑ مارے۔ کیسی اشُبھ بات کہی ہے یہ!

"آج میڈیکل سائنس اتنی ترقی کر گئی ہے کہ تمہارے جیسے مریض کے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ میرا نہیں خیال کہ تمہارا کیس ایسا خراب کیس ہے۔ ایکس رے لینے کے بعد ہی پتہ چلے گا۔ فی الحال آرام کرو۔" پھر انھوں نے چھوٹی ماں کی طرف مڑ کر کہا "اور آپ دھیان رکھیں کہ لوگ آ کر اسے پریشان نہ کریں۔ یورپ میں لوگ مریضوں اور ان کی بیماریوں کے بارے میں بڑی سمجھ داری سے کام لیتے ہیں۔ یہاں ہم بیماری کو ٹرمینل امتحان کی طرح لیتے ہیں۔ چاہے آپ پاس ہو جائیں یا فیل۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اپنا خیال رکھو نوجوان! آخر کار اب جب تمہارے پتا نہیں ہیں تو تم ہی خاندان کا سہارا ہو۔ تمہیں بہرحال ٹھیک ہونا چاہیے۔"

میری طبیعت پہلے سے بہتر ہو گئی۔ ڈاکٹر بائی نے تین مہینے بنگلور میں رہنے کا مشورہ دیا۔ اس لیے چھوٹی ماں، سکماری، سری دھر میں اور باورچی بالنگا۔ ہم سب لوگ بنگلور چلے گئے۔ میں نے باسون گڈی کے اوپر والے علاقے میں ایک مکان کرائے پر لیا اور گھریلو سامان کے ساتھ ہم وہاں ٹک گئے۔ اپنے ہی کنبے کے قربت اور بے تکلفی کے ماحول میں جہاں ہر عمل، شخصی خصوصیت، ناک یا جسم کے تل کا تعلق کسی نہ کسی چچیرے بھائی، چچی یا دادی سے جوڑا جاتا ہے، جہاں اَن کہی باتوں کی ایسی لطیف سمجھ ہو یا فرد کے رتبے، عمر اور اس کے مرد یا عورت ہونے کے تعلق سے اس کے اعمال کو اچھا برا سمجھا جاتا ہو۔ ایک ایسا پیچیدہ احساس پیدا ہو جاتا ہے جس سے دمِ مرگ سے پہلے نجات ممکن نہیں ہے بلکہ موت کے بعد بھی ہو سکتا ہے آپ اگلے جنم میں پھر اسی احساس میں گرفتار ہو جائیں اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے جب تک آواگون کا چکر ختم نہیں ہو جاتا۔ "پتا جی اپنی ٹانگ کو بیچ کی انگلی سے پیروں کی قوس پر بالکل تمہاری طرح کھجایا کرتے تھے"! سکماری ایک شام کہنے لگی "رام دیکھو، اِدھر دیکھو ذرا" چھوٹی ماں بولیں "سری دھر کے دائیں بازو کے نیچے ٹھیک اسی جگہ ایک تل ہے جیسا تمہارے دائیں بازو کے نیچے۔۔"

ایک رات جب چھوٹی ماں مجھے کہانی سنا رہی تھیں تو میں "ہاں! ہاں! ہوں! ہوں کرتا ہوا سو گیا اور سب ہنس پڑے کیونکہ میں خراٹے لے رہا تھا" بالکل اپنے دادا کی طرح "ستا بُوا کہنے لگیں۔ وہ بھی ہمارے پاس آ گئی تھیں۔

بعد میں جب بارشیں شروع ہو گئیں ہم اپنی زمین دیکھنے ستا بُوا کے ساتھ مال نَد گئے اور ایک بار پھر ہم ودتی کے کنارے گھومے۔ چھوٹی ماں چھ سات برس سے ہری ہر اور وہ نہیں گئی تھیں۔ کسان لوگ بے ایمانی کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ستا بُوا نے شکایت کی۔ "میں بے سہارا بیوہ اپنی پچیس ۲۵ ایکڑ کھیتی کی زمین کی دیکھ بھال نہیں کر سکتی بھیّو،

ناپ تول میں بے ایمانی، ٹوٹی ہوئی گینتی، کھاد کا بہہ جانا۔ کیا کیا مصیبتیں ہیں۔ پرماتما ہی جانتا ہے کہ ان بے ایمان کسانوں کو قابو میں رکھنا عورت کے بس کا نہیں ہے، خاص طور پر اس بڑے پہاڑی علاقے میں۔ میں کہتی ہوں کنچن ہلی، ہیڈھ پورا، ہبلی، ہم گنگا اور کاتنا پورا تک اپنی کھیتی کی زمین اور سیتا پور تعلقہ کی اپنی سوکھی بنجر زمین کو بھول جاؤ۔ اپنی کافی اور الائچی کی فصل کو بھی بھول جاؤ۔ اور جہاں تک تمہارے ہوشیار چالاک سندریا کا تعلق ہے وہ جانتا ہے کہ تمہیں بہلانے پھسلانے والے خط کب لکھنے چاہئیں جن میں وہ کہتا ہے "میرے آقا، رنگو گنگا کے کونے والی زمین میں ہم دتی کا پانی گھس آیا ہے اور اس میں نہر کا بند وغیرہ سب بہہ گیا ہے۔ اور پندرہ ہاتھ زمین سیلاب کے پانی میں ڈوب گئی ہے" یا "اس سال کھاد بہت کم تھی۔ دہانٹی، لپنیا، مادھوری، کلا، نندی اور شنکری کی ایک نئی قسم کی مویشیوں کی پیچش سے موت ہو گئی ہے۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ اس نے ان سب مویشیوں کو بالا پورہ کے مویشی میلے میں فروخت کے لیے بھیج دیا ہے۔ ذرا یاد کرو اس نے جنگ کے زمانے میں تمہارے پتاجی کے ساتھ کیا کیا تھا۔ تمہارے جانور اس نے یورپی لوگوں کو بیچ دیئے تھے اور وہ بھی کٹنے کے لیے سمجھے! وہ شخص جو کٹنے کے لیے گائے بیچ سکتا ہے۔ وہ ایک روز آپ کو بھی بیچ ڈالے گا" چچی ستا کہتی گئیں "اور تم یہاں کے لوگوں کو نہیں جانتے۔ نہ ہی یہاں کے کسانوں کو۔ صرف ہاں یا نہ اور ہر چھینک یا کھرونچ کے لیے یہ لوگ تمہیں پوری رامائن سنا دیں گے اور تم ان سے زیادہ سوال کرو یا کہو۔ "یہاں جھاڑ جھنکار اُگ آئے ہیں" یا "جانور کچھ دبلے اور کمزور لگ رہے ہیں" یا "تم وسنت کا دھان کب دو گے، پہلے ہی تین مہینے اوپر ہو چکے ہیں۔ اور بارش ہونے والی ہے" تو تمہیں پتہ بھی نہیں چلے گا کہ کب ان کی درانتی تمہاری گردن پر ہو گی۔ کبھی نہیں، کبھی نہیں۔ ڈاکخانے کے وینکٹ نین کی یاد کرو۔ ستا بُوا نے بات ختم کرتے ہوئے کہا اور پھر بڑے بدشگونی انداز سے خاموش ہو گئیں۔

جب ہم وہاں پہنچے تو وہ لوگ ہاتھوں میں پودے لیے گھٹنے گھٹنے پانی میں کھڑے دھان لگا رہے تھے۔ جونہی ان لوگوں نے مجھے دیکھا لنگے گوڈا نے اپنا ہل روک دیا اور دوڑتا

ہوا ہاتھ جوڑے ہماری طرف آیا۔ "پنڈت جی آئے ہیں، پنڈت جی آئے ہیں کرشنپّا خاندان آیا ہے!" عورتیں بھی بھاگی آئیں۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگیں۔ "جیسا یہ بچپن میں لگتا تھا، ویسا ہی اب بھی لگتا ہے۔ راجکمار کی طرح خوبصورت" اور انھوں نے اپنی کنپٹیوں پر انگلیاں چٹخائیں۔ (تاکہ میرے راج کمار جیسے چہرے کو کسی کی نظر نہ لگے۔)

"ہم وتی کا پانی پینے کے بعد تم کبھی راج کمار کے علاوہ کچھ اور لگ ہی نہیں سکتے" موٹی بڑے بڑے کانوں والی بہری ساکمّا نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اعلان کیا: "یہ تو بالکل اپنے دادا جیسا دکھائی دیتا ہے جب انھوں نے دھان کی وہ رمل لگائی تھی جو کبھی چلی نہیں"۔ لنگے گوڑا نے کہا "اے رانگی کیا بزرگوں اور بڑے آدمیوں کا سواگت کرنے کا یہی طریقہ ہے؟ اری بھینس جاؤ اور دودھ لے کر آؤ" اس دوران میں گاؤں کے سب لوگ بھی آگئے۔ رامیّا، سندریّا، بودھیّا، گاڑی کے پہیئے جیسا شور رامنّا، ٹمّا، پٹّا، کرتی، تن جنّا اور ملّاح کلپّا۔ وہ سب اپنے چاندی کے کپڑے پہنے، ہاتھوں میں کوڑے اور کالے کمبل لیے آئے اور میرے قدموں میں گر پڑے۔ دودھ اور کیلے بھی آگئے۔ اور جب ہم آم کے بڑے پیڑ کے نیچے بیٹھے تو ہم اپنے ارونی کے کھیت کے پاس تھے نیلی ہم وتی مجھ سے کچھ دور نیچے بہہ رہی تھی۔ میلے کی گاڑیاں پانی میں سے گزر رہی تھیں۔ اور سڑے آموں اور گوبر کی بدبو ہم تک آرہی تھی۔ میں اس دھرتی کی کوملتا، زرخیزی اور ہریالی کے بارے میں سوچ رہا تھا جس نے مجھے گھڑا تھا۔

ہم گھر پہنچ گئے۔ اور اشنان دھیان اور کھانے کے بعد میں اوپر پرچھتی میں یہ دیکھنے گیا کہ پرانے مخطوطوں اور مسودوں کا کیا ہوا تھا۔ دادا جی کے تال کے پتوں پر تحریر کردہ بہت سے مسودے تھے جو نسل در نسل ہم تک پہنچے تھے۔ کبھی کبھی جب دادا جی کسی بچے کو ان میں سے کسی تال کے پتے سے شام کے وقت دیا جلاتے دیکھتے تو اس کی خوب پٹائی ہوتی تھی۔ وہ زور زور سے روتا تھا تاکہ ستا بوا یا رنگمّا دادی اسے گودی میں لے کر لوری گنگناتے ہوئے پیار سے تھپک کر سلادے۔ دادا رامنّا کو غصہ آتا بھی جلدی تھا اور ٹھنڈا بھی جلدی ہو جاتا تھا۔ اور سب بھول بھال جاتے تھے۔ اگلی صبح جب وہ کیلے

کپڑوں میں گیلے برتن ہاتھ میں اٹھائے ندی سے لوٹتے تو آتے ہی کہتے "ستا اس بیچارے یتیم کو ناشتہ دو۔ تم جانتی ہو یہ بالکل اپنے باپ پر گیا ہے۔ اپنے آپ کچھ نہیں مانگے گا۔"

کچھ مسودے اب بھی باقی تھے۔ میں نے انھیں جھاڑ پونچھ کر صاف کیا اور انھیں ادھر اُدھر سے پڑھنے کی کوشش کی۔ کچھ علم طب پر تھے کچھ ویدانت پر (ان میں سے بیشتر اپنشدوں پر تحریر کردہ گوڑپد اور شنکر کی تفسیریں تھیں یا بھرترک و ید تہتایا رامائن) اور کچھ ادھر اُدھر کے متفرق موضوعات پر۔ جیسے ایک کتاب ایسی بھی تھی جس میں گھر کے دیواروں پر رینگنے والی چھپکلی کی ٹک ٹک کی تشریح کی گئی (دوسری کتابوں کے برعکس یہ کتاب کنڑا میں تھی) ایک ٹک ٹک منحوس تھی دو کا مطلب تھا کامیابی اور چار اور پانچ کا مطلب دن کے مختلف حصّوں میں مختلف تھا۔ گھر کی تعمیر سے متعلق بھی سنسکرت زبان کے مسودے موجود تھے۔ جس میں غیر معمولی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا تھا کہ تاجر کے لیے کس قسم کا گھر بنانا چاہیے۔ اور برہمن گرہستی کے لیے کس قسم کا۔ سنگیت کے بارے میں سولھویں صدی کی ایک کتاب تھی اور نسوار کے بارے میں تال کے پتّوں کا ایک چھوٹا سا مسودہ بھی تھا جس میں لکھا تھا "بیماروں، لطف اندوزوں، آرائشی اور شہوانی مقاصد کے لیے موسم خزاں میں نسوار تیار کرنے کے اٹھّارہ اور اسے شمالی جنوبی، جنوب مشرقی اور مالاباری انداز میں خوشبودار بنانے کے گیارہ طریقوں سے متعلق اور مختلف اور متنوع فیشنوں کے ساتھ۔ اسے سکون اور خوشحالی حاصل کرنے کا ذریعہ بنانے سے متعلق۔ ایک تحریر: بمصنف طب اور دیگر سائنسی علوم کا عظیم ماہر لنگا شاستری میں نے مبارک تم تم، ہلدی اور پھولوں کے نشانات والے کپڑے میں بندھی تانبے کی پلیٹ باہر نکالی اور اس پر کندہ تحریر پوجا گھر کی متحرک روشنیوں میں چھوٹی ماں کو پڑھ کر سنائی۔

"سب خوش و خرم اور خوشحال رہیں۔ اس ترلوچن کی پوجا کریں جس کی جٹاؤں میں گنگا نواس کرتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔"

"آج کے دن، فتحیاب و کامران شالی واہن کے عہد کے ۱۶۱۵ (۱۶۹۳ عیسوی) کے سال میں جسے 'سری مکھ ورش' کہتے ہیں۔ پوس کے مہینے کے شکل پکش کے بارھویں دن۔ جب اس عظیم راجہ ویر بھدر نے جس نے پانڈوؤں کے ہتھیاروں سے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔ جو بہادر، نوجوان اور شمال کی جانب مڑتے ہوئے

نقطۂ اعتدالِ شب و روز کے نئے سورج کی طرح شاندار تھا۔ یادو خاندان سے تھا۔ ہمیشہ نیلگوں رہنے والی کرشنا ندی کے جنوب اور کاویری ندی کے شمال میں واقع مقدس سرزمین کا راجہ تھا۔ اٹھارہ سائنسی علوم کا ماہر، عالم و فاضل، سنگ دل، دریا دل، پریوار کے دیوتاؤں کا محافظ تھا۔ جو اپنی دیا کے اس لامحدود سمندر میں رہتا تھا۔ جس کا بھاگ نئے چاند جیسا ہے۔ جو قابلِ تعظیم تری ویدی، ذہین، مبارک، علم حاصل کرنے میں ہمالیہ جیسا تھا۔ سرسوتی جس کے گلے میں براجمان تھی۔ جو اپنے علم و دانش کی روشنی سورج کی طرح پھیلاتا تھا۔۔۔ یہ وش وے شوَر رام کرشن بھٹ تھا۔ جس کو عزت مآب۔ مکرم و محترم نے نذرانے کے طور پر عطا کیا تھا۔ ہستنا پور کا یہ گاؤں مکر سنکرانتی کے مبارک موقعے پر سیم وزر اور تمام رسموں کے ساتھ! اور اس گاؤں کی پوری ملکیت سے متعلق آٹھوں حقوق یعنی حال اور مستقبل۔ دونوں کا نفع، چھپے ہوئے خزانے، زمین دوز ذخیرے، چشمے، معدنیات، موجوات اور امکانات! یہ سب کچھ ان کی اولاد اور جانشینوں کو عطا کر دیا گیا۔ اس وقت تک کے لیے جب تک سورج اور چاند آکاش میں چمک رہے ہیں تاکہ وہ برہمن کے چاروں فرائض انجام دیتے رہیں۔ برہما کے مکھ کی طرح علم کا چراغ روشن رکھیں اور برہمن اور اس کے پوتے پڑپوتے آنے والی نسلوں تک سب دشمنوں اور ترکوں سے غیر منقسم جائداد کی حفاظت کریں۔ ہم وتی اپنی عظیم فراوانی کے ساتھ بہتی رہے۔ کیونکہ اگر یگیہ کی آگ روشن رہے گی تو خوشحالی اور نیکی بھی برقرار رہے گی۔ ہاتھی، گھوڑے اور رتھوں والے عظیم راجہ جس کی آوازیں شیر کی آواز جیسی گرج تھی، جس کے سائے سے بھی پاتال کے راکشس خوف زدہ ہو جاتے تھے، ایسے عزت مآب ویر بھدر نے مغربی سمندر کے پاس ہمالیہ کی طرح کھڑے شری گری پربت کی حلیم نیک، نرم مزاج اور ثمردار بیٹی ہم وتی کے جل میں پوتر اشنان کیا۔۔۔"

سری دھر نے یہ سب ایسے سنا جیسے وہ ایک ایک لفظ سمجھ رہا تھا اور جب ستا بوا نے پوجا گھر کے دیوں میں گھی ڈالا تو وہ دیوتاؤں کے سامنے لیٹ گیا۔ چھپکلیوں نے جان بوجھ کر کلک کلک کیا اور گائیں چاول کے مانڈ کے لیے آگئیں۔ مندر کا ہاتھی

کہیں چنگھاڑا۔ میں ہری ہر پور میں لوٹ آیا تھا۔

بعد دوپہر الور سری کانت شاستری آئے اور مجھے ندی پر لے گئے۔ ماں ہم وتی بڑی گمبھیر لگ رہی تھی لیکن اس نے مور کا سا نیلا کیسا شاندار لباس پہن رکھا تھا۔ ہم نے ہاتھ منہ دھویا چونکہ میں اشنان نہیں کر سکتا تھا۔ میں اِدھر اُدھر گھومتا ہوا سوچتا رہا کہ دادا رامنّا نے مجھے نروکت، ایش اپنشد اور کینا اپنشد کہاں پڑھائے تھے۔ سری کانت شاستری مجھے وہ جگہ یاد دلانے آئے جہاں دادا کا انتم سنسکار کیا گیا تھا۔ ماں ہم وتی نے بس آگ سرد ہونے تک انتظار کیا تھا پھر اس میں باڑھ آگئی تھی اور وہ دادا کی پوتر استھیاں اپنے ساتھ بہا کر لے گئی تھی۔

بٹّا اور رنگا ہمارے لیے سبزیاں لے کر آئے اور باورچی نے اس شام ہمیں بڑا کھانا کھلایا۔

میں نے کنچما مندر کی مرمت کے لیے پجاری رنگ ناتھ کو تین سو روپے دیئے۔ چھوٹی ماں نے اپنے صندوق سے پوجا کی ایک چھوٹی ساڑھی نکالی اور بولیں "یہ ساڑھی دیوی کے لیے ہے۔" جب مویشی گھر لوٹے تو میں بہت خوش ہوا۔ گوری ابھی زندہ تھی اور اپنی عمر کے حساب سے بھلی چنگی تھی۔ وہ گیارہ برس کی تھی "اس نے ایک برس پہلے یہ بچھڑا دیا تھا۔" ننجا نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ "اور یہ اب بھی تین لوٹے دودھ دیتی ہے۔" لالی اور سیتو پچھلے برس کھُر اور منہ کی وبا میں مر گئی تھیں۔

دن ڈھلنے پر گاؤں کے بڑے بوڑھے ہمیں شام کی پوجا کے لیے بلانے آئے۔ گول مٹول سی ہری آنکھوں والی ماں بڑی شاندار لگ رہی تھی۔ اس نے سانپ کی شکل کی وہ کرپٹی پہن رکھی تھی جو لوگ کہتے تھے۔ میری پیدائش کے موقعے پر دادا نے دیوی ماں کو چڑھائی تھی جب پرکشنا کرنے کے بعد ہم گھر آئے تو حد بندی کے کچھ مسئلوں کے بارے میں بات کرنے آم کی شراب میں دھت رہنے والا سنّا آیا۔ کونے کے مکان والے لوگوں نے ہمارے کھیت کے کھیت پر قبضہ کر لیا تھا اور وہ باتوں سے ماننے والے لوگ نہیں تھے "کوئی بھی سوال کرنے پر وہ تمہیں ہم وتی میں پھینک دیں گے لیکن ہم ان کے باپ داداؤں کو بھی

ٹھیک کرنا جانتے ہیں۔" پٹنا بولا۔ حالانکہ چھوٹی ماں یہاں ایک ہی بار آئی تھی لیکن وہ زمینوں کے بارے میں ایک ایک بات جانتی تھی۔ چچا سیتا راموں نے انھیں ساری بات تفصیل سے سمجھائی تھی۔

سب نے سروجا کے بیاہ کے بارے میں پوچھا۔ "کیسا شاندار خاندان تھا۔ ایک بیٹا لندن میں تھا اور بیٹی دہلی میں" کارندے سبیا نے کہا "اب چونکہ سب سے چھوٹے لڑکے نے ماں ہم وتی کا ہرا جل پی لیا ہے۔ یہ بچہ بھی دیکشا اور بیاہ کے لیے لوٹ کر ہمارے پاس آئے گا۔" پٹادو پٹیل سدّ لنگیا نے اعلان کیا۔ رات کو بستر پر لیٹا ہوا جب میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ ہم وتی گھاٹی کا دور تک پھیلا ہوا علاقہ جس نے سالوں سال دھان اور گنّے سے ہماری پرورش کی تھی اور اس کے پرے وہ پہاڑیاں جنھوں نے کئی دہائیوں بلکہ سینکڑوں برس سے ہمیں کافی، کٹھل، الائچی اور شہد جیسی نعمتیں کھلائی تھیں تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ سب چھوٹی ماں، سنگماری، سری دھر اور میرے مقابلے میں ایک منفرد وجود رکھتے تھے۔ ایک جاری وساری مستقل وجود۔

ہری ہر پور میں رہنے کے بعد ہم لوگ خوش اور تروتازہ ہو کر بنگلور لوٹے۔

ایک ہفتے کے بعد سروجا بھی آگئی۔ اس کے شوہر کو کسی سرکاری کام سے لندن بھیج دیا گیا تھا اور وہ کچھ مہینوں کے لیے ہمارے ساتھ رہنے آئی تھی۔ میں زندگی بھر کبھی اتنا خوش نہیں ہوا تھا جتنا میں بنگلور میں اپنے چھ ہفتے کے اس قیام کے دوران ہوا۔ ہم لال باغ میں گھومنے جاتے۔ سٹی ہال میں منعقد ہونے والی سنگیت کی محفلوں میں شامل ہوتے۔ ہم اپنے رشتہ داروں سے بھی ملنے گئے۔ چھوٹی ماں سب کو جانتی تھیں اور پتا جی کی طرح وہ بھی صبح، دوپہر، بعد دوپہر، شام، دن میں کسی بھی وقت ان سب سے ملنا پسند کرتی تھیں۔ ہم گھر میں چوسر کھیلا کرتے تھے اور ہر وقت ہنستے رہتے تھے۔ سروجا میرے مقابلے میں ماں کو بہتر سمجھنے لگی تھی۔ اور اکثر جب میں آتا تو وہ گفتگو کا موضوع بدل لیتیں جیسے وہ مجھے پریشان نہ کرنا چاہتی ہوں۔ سروجا کہتی: "بھیا پہلے آپ ٹھیک ہو جایئے باقی کام میرا ہے۔" سنگماری بھی خوش تھی کیونکہ یہاں لوگوں کی پروا کیے بغیر وہ لڑکوں

سے گھل مل سکتی تھی۔

"بنگلور میں،" چھوٹی ماں بولیں "مسلم حیدر آباد کی طرح نہیں ہے۔ یہاں لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ آجا سکتی ہیں اور کوئی اس طرف دھیان نہیں دیتا۔ آخر یہ برہمنوں کا شہر ہے۔" چھوٹی ماں نے اعلان کیا۔ وہ بھول گئیں کہ دریا دل کانگریس سرکار نے ذات پات کی تمیز ختم کر ڈالی تھی۔

بنگلور میں شام کو ہوا میں خنکی آجاتی ہے اور باسون گڈی میں ڈھلتی شام بڑی سحر انگیز ہوتی ہے جب نندی کے مندر کی گھنٹیاں خوب زور سے اور دیر تک بجتی رہتی ہیں جب میری سانس ٹھیک ٹھاک ہوتی تو ہم اکثر وہاں تک پیدل جاتے اور شام کو چٹانوں اور پہاڑوں کے کھو کھلے حصّوں کے آر پار اپنے اوپر اترتے ہوئے دیکھا کرتے۔ یکایک سب طرف بتّیاں جل اٹھتیں اور جب تک چمگادڑ پیڑوں پر لٹک رہے ہوتے۔ چھوٹی ماں اور سروجا مندر جاتیں اور وہاں سے پرشاد لاکر سب میں بانٹتیں۔ جب کافور کی مہک، چمپک کی خوشبو میں گھل مل جاتی تو ہم گھر لوٹتے۔ ہمارے نتھنوں میں خوشبو کی سرشاری آجاتی اور ہماری سانس پوتّر ہو جاتی۔ "شمبھو شنکر، شمبھو شنکر،" چھوٹی ماں دہرائیں جیسے ہم پھر بنارس پہنچ گئے ہوں۔

سروجا دہلی سے اپنا باورچی ساتھ لائی تھی۔ کیونکہ ہمارا اپنا باورچی کسی کام کا نہیں تھا۔ اپّو نائر بڑا لذیذ سال بڑ اور ادلی بنایا کرتا تھا۔ میں خوش تھا۔

ڈاکٹر میرے بارے میں پر امید ہونے لگے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ میری سبزی خوری کے باعث ہی یہ تکلیف ہوئی ہوگی۔

ڈاکٹر بھیم سین راؤ مجھ سے بولے "جیسا دیس ویسا بھیس۔ بڑی اچھی کہاوت ہے۔ چونکہ تمہارے دادا نہیں چاہتے تھے کہ تمہارے پتا عظیم ریاضی داں رامانجن کی طرح مریں اس لیے انھوں نے تمہارے پتا جی کو کبھی کیمبرج جانے کی اجازت نہیں دی۔ لیکن اب وقت بدل گیا ہے اور تم یورپ پہنچ گئے ہو۔ تمہیں گوشت کھانے اور شراب پینے سے کوئی پرہیز نہیں کرنا چاہیے۔" انھوں نے مشورہ دیا۔ "اگر یہ نہیں کر سکتے تو یورپی بیوی سے شادی کیوں کی؟"

میرے پاس کہنے کو تھا ہی کیا "میں یورپی برہمن ہوں" میں نے ہنس کر کہا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرے جواب سے اُن کی تسلّی ہو گئی۔ اس دن سے وہ اپنی نرسوں اور ایکس رے کے کام میں اپنے مددگاروں سے "یورپی برہمن" اور "فرانسیسی ویدانتی" کے طور پر میرا تعارف کرانے لگے۔ ہندوستان میں ہم ہمیشہ ہر بات پر ہنس دیتے ہیں چاہے وہ مبارک ہو یا غیر اہم۔ اس سے ضرور ہمارے پھیپھڑوں کو فائدہ پہنچتا ہوگا۔

زندگی کا کھیل اعلیٰ اور باوقار ہے اور تہذیب کا کاروبار کیمیاوی انداز سے غنودگی خیز ہے۔ جنم، مرن، بُننا، کاٹنا، سکھ اور دکھ کی ترسیل، اعداد و شمار کی بار یلیاں مجتوں کے نام، سفارتی فیصلے، مفروضے، بہانے، نقصانات، فتوحات، کسی ملکہ کی تاجپوشی، بادشاہ کی موت، ڈکٹیٹروں یا ان کے بے حس چہروں والے پٹھوؤں کا قتل، ایک کے بعد دوسرا ایک تسلسل میں یہ سب واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ یہ سب لال باغ میں میرے قدموں کے پاس سے گزرتی ہوئی چیونٹیوں کی اس شاندار قطار کی طرح ہے جسے اس بات کے علاوہ کوئی علم نہیں ہوتا کہ مون سون ہوا کے دو ریلوں کے درمیان دھوپ نکل آئی ہے۔ انھیں جوانی کے جوش اور خوشی میں اپنے سر ہلاتے ہوئے پیڑوں کا بھی کوئی پیشگی احساس نہیں ہوتا۔ نہ ہی اس بات کا کہ زمین کے اوپر ہوا میں منڈلاتے ہوئے ہوائی جہاز لوگوں کو اٹھائے آتے جاتے رہتے ہیں اور وہ بھی تمام ملکوں سے اور کرۂ ارض کے دُور دراز سے۔ یا اس بات کا کہ ٹیلی گراف کے وہ تار جو میرے قریب سے گزرے ہیں وہ برسوں سے اپنے اندر انسانوں کا مقدر لیے ہوئے ہیں۔ "شامو مر گیا"، "شبو امتحان میں کامیاب ہو گیا"، "لکشمن کا ملٹری ڈپو دہرہ دون میں تبادلہ ہو گیا"۔ اور ٹیلی گراف کے یہ تار اپنا یہ کام مزید کئی دہائیوں تک جاری رکھیں گے۔ اس وقت تک جب تک کہ تاروں اور اجتماعی حماقتوں سے جان چھڑانے کا کوئی دوسرا ذریعہ نہ پیدا ہو جائے تاکہ اہم خبروں کو سائیکل، نیلے کوٹ اور خالی بینٹ کی مدد سے ہم تک نہ پہنچانا پڑے اور مقدر کے آمیزے کو اینٹ کے رنگ کے لفافے میں بند نہ کرنا پڑے۔

متعلقہ سرکاری افسران کی مہربانی سے باہر آنے والے تاروں پر یہ لکھا ہوتا تھا۔

"کیبل انڈین اوورسیز سروس" اس لیے سمندری تار کا مطلب میرے لیے میڈلین کا تار تھا۔ اس دن صبح گھر لوٹنے کے بعد جو تار مجھے ملا۔ ٹیلی گراف کے تاروں کو دیر تک دیکھنے کے کارن مجھے اس کے ملنے پر واقعتاً کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ خاص طور پر اس لیے کہ چھوٹی ماں نے مجھے دیکھ کر ابھی ابھی کہا تھا "رام تم اچھے دکھائی دے رہے ہو۔ تمہاری آنکھوں میں شفاف چمک آگئی ہے۔" چھوٹی ماں اندر گئی ہی تھیں کہ ہرکارے نے مجھے تار پکڑا دیا۔ میں انار کے جھاڑ کے پاس پتھر کے بینچ پر بیٹھ گیا اور لفافہ کھولا۔ میری چھڑی پاس ہی گر گئی تھی۔ تار تانت زوبی نے بھیجا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ میڈلین کو اچانک ہی سیزرین آپریشن کے لیے ہسپتال لے جانا پڑا تھا۔ لڑکا جنم کے فوراً بعد مر گیا۔ "میڈلین خیریت سے ہے۔" آگے لکھا تھا "فکر نہ کرنا، ہم تمہاری بیوی کی دیکھ بھال کرتے رہیں گے۔ جلدی جلدی اچھے ہو جاؤ۔ شارلٹ کا پیار!..." میں سروجا کو برآمدے میں کپڑے گنواتا ہوا سن سکتا تھا۔ دھوبی آیا ہوا تھا۔ تین جبّے، چار ساڑھیاں، دس رومال، چار تولیے۔ میں نے تار اپنی جیب میں رکھ لیا۔ یہ چیونٹیوں کے لیے تھا۔

بعد میں غسل خانے میں میں جب پٹڑے پر بیٹھا تو ہنس پڑا۔ نہ مجھے دکھ تھا نہ آرام۔ میں دونوں سے ماورا تھا۔ اس بچّے کی طرح جو آسمان میں اڑتی پتنگ دیکھ رہا ہوتا ہے۔ مجھے جارج کا خیال آیا۔ اور میں لب نتز اور موناڈ اور دیگر متعلقہ باتوں پر ہنس دیا۔ مجھے پتنگ کے سفید اور زرد حصے نظر آئے اور اس کی سانپ جیسی پونچھ بھی جسے ہوا سورج کے سامنے قوسوں دائروں میں لہرا رہی تھی، اچھال رہی تھی، ہوا میں خنکی تھی، تازگی تھی۔ میں ایک بچے کی طرح ہنس رہا تھا۔ ہوا کی نزاکتوں سے کھیل رہا تھا۔ میں خوش تھا۔ کسی کے بھی رہنے کے لیے دنیا خوشی کی جگہ ہے۔ لال باغ کی چیونٹیوں کو دیکھیے۔ وِستا کو بھگوان کے چرنوں میں شانتی ملی تھی۔

میں پوری بعد دوپہر خوشی سے خوب کھل کر ہنستا رہا۔ چوسر کھیلتا رہا۔ پہلے چھوٹی ماں کے ساتھ پھر سروجا کے ساتھ۔ جب وہ دوپہر کے کھانے کے بعد آرام کر کے اٹھی شام کو میں سب کو سنیما دکھانے لے گیا۔

ساوتری کے بارے میں خبر بس کبھی کبھار ہی ملتی۔ جب چھٹیاں آتی تھیں تو بڑی مختصر اور انکسار بھری ہوتی تھیں۔ "یہ موٹی اور بے وقوف لڑکی"۔ "میں کس لائق ہوں۔ میں جو اس قدر جاہل اَن پڑھ ہوں" وغیرہ، وغیرہ۔ میں نے ان باتوں سے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ محض خوف تھا جو اعلیٰ مقاصد میں ڈھل گیا تھا۔

خون کے سرخ خلیوں کا ضرور خوشی سے کوئی نہ کوئی تعلق ہے کیونکہ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ میری صحت بتدریج اچھی ہو رہی تھی۔ برسات کا زور کم ہو گیا تھا اور 'سٹروان'، کی خوشگوار ہوا چلنے لگی تھی۔ زمین، دھان اور گنّے کے کشادہ زرد کھیتوں سے ڈھک گئی تھی اور تالاب نئے پانیوں سے سرخ ہو گئے تھے۔ چربی ڈھل جانے سے مویشی صاف ستھرے خوبصورت لگ رہے تھے۔ بازار میں پان کے نئے پتّے دکھائی دینے لگے تھے۔

سکماری کو بہت دن پہلے باورچی کی نگرانی میں حیدرآباد بھیج دیا گیا۔ کیونکہ کالج ہماری سہولت کے مطابق نہیں کھلتے تھے۔ سروجا کا شوہر یورپ کے بارے میں بڑے پُرجوش خط لکھتا تھا۔ غیر ملکوں کا اس کا یہ پہلا سفر تھا۔ اس نے لکھا تھا۔ "میری پوِتر پتنی تم میرے لیے خوش بختی لائی ہو۔ جب سے تم میرے گھر میں آئی ہو ایک کے بعد ایک معجزہ ہو رہا ہے۔ پہلے رفیوجی اور ری ہیبلی ٹیشن منسٹری سے میرا تبادلہ فائننشل سکریٹریٹ میں اور اس کے ایک مہینے کے بعد مجھے یورپ آنے کے لیے مدعو کیا گیا۔ اگلی بار ہم دونوں اکٹھے یہاں آئیں گے۔ میں تمہیں چاہتا ہوں یاد کرتا ہوں۔ جب میں آؤں گا تو تمہیں ساری باتیں بتاؤں گا" سروجا نے مجھے یہ خط ثبوت کے طور پر دکھایا کہ خوشی ممکن ہے۔

جس طرح مویشیوں کو پہلے سے پتہ چل جاتا ہے کہ کب بادل گھر کر آئیں گے اور شروع ہو جائے گی اور گنگی اور گوری اپنے کانوں کو اپنی گردنوں کے ساتھ چپکائے کب گھر کی جانب دوڑ پڑیں گی ٹھیک اسی طرح مجھے بھی مستقبل میں ہونے والے واقعات کا پیشگی ادراک ہو جاتا ہے۔ ساوتری نے ایک مہینے سے کوئی خط نہیں لکھا۔ لیکن مجھے پتہ تھا وہ واپس ہندوستان پہنچ چکی ہے۔ "ضرور کسی بادل نے

مجھے بتایا ہوگا۔" میں نے اسے لکھا۔

درد و کرب سے جلے ہوئے لوگوں کے لیے

تم آسودگی اور راحت ہو

اے نعمت باراں عطا کرنے والے

میری محبوبہ تک میرا پیغام لے جاؤ

دور بہت دور سوامی دھن پتی کے غیظ و غضب سے بچ کر

الکا پوری جانا

جہاں یکش لوگوں کی شہزادی رہتی ہے

آس پاس کے سبزہ زار میں خود شوناس کرتے ہیں، اور

مہادیو کے سر سے روشنی دینے والے

چاند کی چاندنی میں

محل جگمگاتے ہیں

اس نے لکھا تھا وہ اپنے پتاجی کے ساتھ دہلی میں ہے۔ ان لوگوں نے منی باغ میں ایک مکان لے لیا تھا۔ اور سورج پور کے راجہ صاحب۔ دیوتاؤں کی اس طرح خوشامد کرنے والے تھے جس طرح وہ انگریزوں کی کرتے تھے۔ پہلے سوال شیر کے شکار اور شراب کی محفلوں کا تھا اب صرف رقص و سرور کی محفلوں کا۔ شیر بالکل نہیں، جی ہاں! اداس تری تھکی تھکی اور دنیا سے اکتائی ہوئی لگ رہی تھی۔ " ناگزیر کے بارے میں میرا فیصلہ فی الحال باقی ہے"، اس نے لکھا تھا، " میرے ساتھ ناراض نہ ہونا۔ میں بڑی کمزور سی چیز ہوں۔ ڈبلیو۔ بی۔ ییٹس کی اس نظم کی طرح جو تم مجھے سنایا کرتے تھے۔ عورت زمین کی زمینی چیز ہے۔ کاش تم جان سکتے میں کیسی زمینی چیز ہوں۔ پرتاپ باقاعدگی سے ہمارے یہاں آتا ہے۔ وہ میرے ساتھ ٹھیک ویسا ہی سلوک کرتا ہے جیسے لوگ چڑیا گھر کے ہرن کے ساتھ کرتے ہیں۔ وہ مجھے مونگ پھلی کھلاتا ہے۔ ہری ہری گھاس پیش کرتا ہے۔ رام میں غزال نہیں ہوں کیونکہ میں اپنی ناک سے پرے تک بھی نہیں کود سکتی۔ لیکن ــ کیا میں تمہیں بتا دوں؟

"میں تم سے پیار کرتی ہوں۔ میں تم سے پیار کرتی ہوں۔ مجھے بچا لو۔"

جب میں لال باغ میں اس کے خط کو دوبارہ پڑھ رہا تھا تو اشوک کے پیڑوں پر ہوا کا زور بڑھ گیا۔ جھیل کے دوسرے کنارے پر پانچ چھ آدمی نہا رہے تھے۔ شام ڈھلنے والی تھی۔ وہ کسی کا آخری سنسکار کر کے شمشان سے لوٹے ہوں گے۔ شمشان سے آگے پاگل خانہ تھا۔ میرے دوست اپّا سوامی نے ایک بار مجھے بتایا کہ عالمِ وارفتگی میں وہاں کے کچھ لوگ غیر معمولی ہو جاتے تھے۔ وہاں ریاضی کا ایک پروفیسر تھا۔ پاگل خانے میں رہتے ہوئے وہ ایسے بہت سے سوال حل کر لیتا تھا جو اپنے آبائی قصبے ترچناپلی میں رہتے ہوئے نہیں کر سکا تھا۔ موت، پاگل پن، پرتاپ شادی بیاہ، خون کے سرخ خلیے، اور پھیلے ہوئے ٹیلی گراف کے تار اور ان سے پرے ستارے۔ آپ جہاں بھی ہیں بنارس وہیں موجود ہے۔ ایک مشہور ویدانتی صحیفے میں کہا گیا ہے۔ کپل وستو انسانیت کا اصلی گھر ہے ہم میں ہر ایک کے دروازے پر ایک کنتھک بیٹھا ہوا ہے۔ کیا ہم ماں کے ساتھ لیٹے ہوئے بچے کو چھوڑنے کی ہمت کر سکتے ہیں جس کا سر ماں کے مڑے ہوئے ہاتھ کے نیچے ہے اور سترہ سالہ ماں جس کے نوجوان چہرے پر روشنی چاندنی کی طرح مسلسل اور برقرار ہے۔ کیا فرشتے ہمارے وجود کی دراڑوں کو بند کر دیں گے تاکہ دنیا کو یہ پتہ نہ چل سکے کہ ہم کب جست لگا لیں گے۔

میں چھوٹی ماں کے تئیں بڑا حلیم اور پُرفہم ہو گیا تھا۔ وہ اپنے والدین کے سات بچوں میں پانچویں نمبر پر تھیں۔ ان کے پتا جی کچہری میں محرّر تھے۔ وہ ہمیشہ غصّے میں گھر لوٹتے۔ ہتھیلی میں نسوار اور جیب میں شاید اٹھنّی کا ایک سکّہ لیے۔ "اس کمبخت رعیت نے تین گھنٹے کی تعلم گھسائی کے بعد بس یہ دیا ہے۔ پیسہ پچھواڑے کے آم کے پیڑوں پر نہیں اُگتا۔" بچّے اپنے باپ سے خوف زدہ رہتے تھے۔ خاص طور پر چھوٹے بچّے۔ باپ کو بچّوں کی ضرورت نہیں تھی۔ انھیں تو اس کی بیوی نے پیدا کیا تھا۔ اس لیے ناریل کی ٹہنی اور بائیسکل کا پمپ ہی چھوٹی ماں کے اصلی استاد تھے۔ اگر کبھی غسل خانے میں پانی گرم نہ ہوتا یا بانس پر لٹکے کپڑے سوکھے نہ ہوتے تو چھوٹی ماں کے پتا چلّاتے "آوارہ بیوہ جب

تمہارا بیاہ ہوگا تو میں سیر بھر جھاگ والا گرما گرم دودھ پیوں گا۔"
"رام میرے لیے زندگی گھر کے دروازے کے باہر کے اس میونسپل کمیٹی کے نل کی طرح تھی جس میں سے رات بھر پانی ٹپ ٹپ ٹپکتا رہتا ہے۔ لیکن کم سے کم جب صبح سویرے عورتیں آتیں تو یہ نل بہر حال کسی نہ کسی کو گاتے ہوئے تو سن سکتا تھا۔ اس کے مقابلے میں میرے حصے میں صرف ٹھوکریں اور آنسو ہی آئے تھے۔۔" چھوٹی ماں شادی کے بعد کبھی اپنے مائکے لوٹ کر نہیں گئیں۔" میں تمہیں صرف پانچ یا چھ برسوں سے جانتی ہوں۔ تمہارے مقابلے میں وہ لوگ میرے لیے کہیں زیادہ اجنبی ہیں۔ لوگ دل کی بات کرتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا دل یا تو گائے کے گوبر کا بنا ہوا ہے یا پھر سڑی ہوئی بدبودار لسّی کا۔ اس میں کیڑے چل رہے ہیں۔ اُشنا!" سری دھر کو تھپکی دے کر سلایا جا رہا تھا۔ بعد میں رات کو سروجا جاگ گئی اور چھوٹی ماں سے پوچھنے لگی "چھوٹی ماں! کیا میں خواب میں بڑبڑا رہی تھی؟"

"سن میری بچّی۔ میں تو رام کے سامنے اپنی رامائن دہرا رہی تھی۔ آرام سے سو جاؤ۔ اور اپنے نئے گھر اور اپنے شاندار پتی کے سپنوں میں کھو جاؤ" رام کیسا اچھا آدمی ہے وہ۔ ہے نا!"

ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ اب میں کسی پہاڑی مقام پر جا سکتا تھا۔ شاید اوٹی یا کوڈائی کینال۔" وہاں کی تازہ خنک ہوا تمہاری صحت کے لیے بہت مفید رہے گی۔"

"بھیا۔ میرے ساتھ دلی چلو۔ وہاں سے ہم مسوری چلیں گے" سروجا بولی۔ لیکن میں کوڈائی کینال جانے پر تلا ہوا تھا۔ میں نے کوڈائی کینال دیکھا نہیں تھا۔ علاوہ ازیں وہاں کی آب و ہوا خشک تھی۔ میں وہاں کام کر سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا مجھے جلدی ہی اپنا تھیسس بھی مکمل کرنا تھا۔ مجھے ہندوستان لوٹنا تھا۔

سروجا دہلی جانے سے پہلے کچھ دن حیدرآباد میں گزارنا چاہتی تھی۔ جب سروجا اور چھوٹی ماں چلی گئیں تو میں کوڈائی کی خوبصورت پہاڑیوں میں چلا گیا۔ یہ پہاڑیاں سرسبز شاداب قدیم، تنہا اور سمندر جیسا متحرک سکوت لیے ہوئے تھیں۔ وہاں میں ایک بکری

کی طرح آبزرویٹری رج پر اِدھر اُدھر گھومتا تھا اور ڈاکٹر نتیجے کے بارے میں بہت خوش تھے۔ بوڑھے ڈاکٹر روبرٹ کا کہنا تھا "ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا کہ اونچائی پر رہنا صحت کے لیے مفید ثابت ہو"۔ وہ جرمن تھا۔ اور چالیس سال پہلے ۱۸-۱۹۱۴ء کی جنگ سے قبل وہاں آکر بس گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ کچھ ہی ہفتوں میں یورپ واپس جا سکوں گا "بڑے خوش قسمت ہو جو تمہیں فرانسیسی بیوی ملی ہے۔ پروانس میں رہتے ہو، اور بنے سنگرس اور پارسی خال پر تھیسس لکھ رہے ہو"۔ ان کی بیوی محترمہ روبرٹ پرسی لیوڈ کی مشہور ابتدائی دھن بڑے بے ڈھنگے انداز میں بجاتی تھیں۔ تامل بولنے والے نوکروں اور دروازے پر چنبیلی کی ہزاروں کلیوں کے درمیان چھٹکی ہوئی شفاف چاندنی میں اسے سننا کیسا عجیب لگتا تھا۔

تب مجھے یاد آیا کہ منی کی کہانی کا ماخذ ہندوستانی تھا۔ ایسا کیوں نہیں ہو سکتا تھا؛ لیکن ڈاکٹر روبرٹ کو یقین تھا کہ یہ کہانی ایشیا کے گھاس کے میدانوں سے چلی تھی اور بنیادی طور پر آریائی دیومالائی میتھ ہے۔ "اگر تم فرے زر کو پڑھو تو تمہیں پتہ چلے گا کہ غالباً یہ محض آریائی دیومالائی میتھ ہے لیکن یہ ٹولوگن جزیروں کے لوگوں میں بھی پایا جاتا ہے"۔

کوڈائی میں بڑا پرسکون تھا۔ مجھے محسوس ہوتا تھا جیسے ساری خوشی وہیں تھی۔ جھیل پر کہیں گہرائیوں سے ابھر کر کوئی کنول کھل اٹھے گا اور اس کے ساتھ لکشمی نمودار ہوگی۔ اور ترل ترنگوں والے پانیوں میں اپنی سونڈ میں مالا لیے دیوی کے پہلو میں ایک ہاتھی کھڑا ہوگا۔

سفید پیرہن میں اور
طرح طرح کے ہیرے جواہرات میں جگمگاتی
اے دیوی!
تم اس سنسار کو سنبھالے ہوئے ہو
تم ہی رچنا کرنے والی، جگ جننی ہو

دولت جائداد کی عظیم دیوی
یں تمہارے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے۔

میں نے یہ الفاظ اپنے آپ کے لیے دہرائے۔
دکھ سائے کی طرح انسان کے تعاقب میں رہتا ہے۔ پھر بھی وہ جھیل پر پھیلی ہوئی چاندنی کا نظارہ کر سکتا ہے اور اس روشنی سے روشناس ہو سکتا ہے جو انسان کی دونوں آنکھوں کے بیچ جگمگاتی ہے۔ اپنے آپ میں کھو جانا روحانی مسرت کے ادراک کے مترادف ہے۔

میڈلین میرے لیے بڑی فکر مند تھی۔ مجھے بہت سارے مشورے بھی دیتی تھی "بہت جلدی مت آنا" اس نے التجا کی تھی "میں اس قدر موٹی ہو گئی ہوں کہ میں تمہاری محترمہ روبرٹ کی طرح گول مٹول اور لال سرخ لگوں گی۔ تانت زوبی نے دھمکی دی ہے کہ اگر تم اس کے سامنے ایک بار بھی کھانسے تو وہ مجھے ہندوستان بھیج دیں گی۔ وہ کتنی مہربان ہوشیار شیطانی انداز میں چالاک اور ہوشیار اور بڑی دلاویز غیر اہم مخلوق ہیں۔ ان کے لیے خوشی ایک حیاتیاتی ضرورت ہے۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے آپ کہہ سکتے ہیں "اگر میں دن میں آدھ گھنٹہ نہ ہنسوں تو میں شارلٹ کا سر چبا کر کھا جاؤں گی" وہ ہنستے ہوئے کہتی ہیں۔ اور جب ان کے پاس کرنے کو کچھ نہیں ہوتا تو وہ مزاحیہ اشعار لکھنے لگتی ہیں۔ جنھیں وہ کھانے کی میز پر سناتی ہیں۔ چٹورے پن کے مقصد سے وہ اعلان کرتی ہیں۔ یہ اشعار کچھ ایسے برے بھی نہیں ہوتے اور ان پر پری ورٹ کی چھاپ ہوتی ہے: ایک دن جنگل نے مجھ سے کہا بھئی تمہیں دوزخ دکھاؤں گا۔ تب تم بڑی پیاز کو کالی مرچ کی طرح دیکھو گے کیونکہ سورگ چاروں طرف سے گھرا ہوا ہے! اب میں نیک دل رستا ہوں گی"

میڈلین کی چٹھیوں سے مجھے راحت ملی۔ ان میں ایک دانشِ نہاں شامل تھی۔ دُکھ کا کچھ ایسا لمس تھا جو ایک عظیم مدوّر، غیر شخصی احساس محبت سے منور ہو گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا اس نے ایسے نقطۂ شعور کو چھو لیا ہے جہاں پہنچ کر وہ اپنے آپ کو پورے طور پر دائرۂ وجود میں لا سکتی تھی اور غالباً یہ اعتماد حاصل کر سکتی تھی کہ اس انفرادی پہچان کو نہ تو کوئی

ختم کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کو آلودہ کر سکتا ہے۔ مجھے اپنے آپ پر شرم آئی۔ میں نے کوشش کی کہ مجھ میں زیادہ خود اعتمادی آجائے اور میں زیادہ دروں بین اور سنجیدہ ہو جاؤں۔

ساوتری کے خط اب پہلے کی نسبت اکثر آنے لگے تھے اس کی چٹھیوں میں موڈ کے حساب سے تبدیلیاں ہوتی رہتی تھیں۔ کبھی وہ ترائی کے اپنے کسی سفر کے بارے میں پرندے کی طرح چہچہانے لگتی۔ وہ کسی طرح گئے تھے اور تہری گڑھوال کے راجہ کے ہاں بطور مہمان ٹھہرے تھے۔ یا پھر وہ کسی سرکاری سازش کے بارے میں کوئی تکلیف دہ بری خبر لکھ بھیجتی۔

ساوتری میں یہی خاص بات ہے۔ وہ جہاں بھی ہوتی مکمل ہوتی سادہ و معصوم ہوتی۔ اس کے لیے صرف ایک ہی دنیا ہے۔ ایک مقام، ایک شخص بھی۔ اور یہ وہ ہوتا ہے جو اس کے سامنے ہوتا ہے۔ وہ بڑے غیر شخصی انداز میں اٹھ کر کچھ اس طرح اسے چینی کا ایک چمچ یا وہسکی کا گلاس پیش کرتی ہے۔ جیسے اس کا واحد مقصد بس اس شخص کی خوشی ہو۔ میرے سوا کوئی بھی اس کے نزدیک نہیں ہو سکتا میں نے اپنے آپ سے کہا کیونکہ وہ ہر جگہ موجود ہے اور تمہیں اس کے قریب ہونے کے لیے بہ نفس نفیس ساوتری بنا ہو گا۔

پرتاپ چاہتا تو اس کا شوہر ہو سکتا تھا لیکن وہ ملاقاتیوں کے کمرے میں ہی بیٹھ جاتا تھا اور اس کے پتاجی سے باتیں کرتا رہتا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو باہر چھت پر جا کر محل میں گارد کو بدلتے دیکھ سکتا تھا کیونکہ اب تک وہ سورج پور واپس جا چکے تھے یا پھر وہ بڑے دروازے پر بجتا ہوا ساتویں گھنٹے کا سنگیت سن سکتا تھا۔ شاہی ہاتھی ابھی آ ہی رہا ہو گا اور محمد علی اس کے کانوں کو چھیڑ رہا ہو گا "ہے ٹٹا۔ ٹا۔ ہے ٹا" جبکہ ساوتری دیوان پر بیٹھی برٹرینڈ رسل پڑھ رہی ہو گی یا سگریٹ پینے کے بعد بچا ہوا ٹکڑا پھینکنے کے بعد شام کے پورے ماحول کو اپنے اندر سمیٹنے کی کوشش کر رہی ہو گی۔ ایک بار پھر اس نے خاموشی اختیار کر لی ہو گی اور وہاں انتظار کر رہی ہو گی کیونکہ دیوکتھا کی شہزادی کی طرح وہ بھی اسی مرد سے بیاہ کرے گی جو اس کی پہیلی حل کر دے گا۔ یہ پہیلی نہ تو سنسکرت میں تھی نہ ہندی میں یہ تو کسی بھی سادہ سی زبان میں تھی اور اس طرح تھی۔

"میں یہ چاہتی ہوں ۔یہ ۔یہ یہ۔ اے شہزادے، اے عالم و فاضل بتاؤ مجھے بتاؤ میں کیا تلاش کر رہی ہوں ۔یہ رہی ورمالا۔ یہ رہا ہاتھی ہودے والا ہاتھی اور نوبت بھی شہزادے تم میری پہیلی حل کرو تو میں تمہارے ساتھ بیاہ کر لوں گی۔" وہ زندگی کا سفر اس طرح طے کر رہی تھی جیسے وہ دنیا کو دیکھنے کے بجائے صرف اپنے صاف اُبھرے ہوئے ماتھے کے قم قم کو دیکھ رہی ہو۔

اس نے سورج پور سے لکھا تھا:

"دہلی میں ایک نوجوان سفارتی افسر تھا جو میرے پیچھے اس طرح پڑا ہوا تھا جیسے میں کوئی دیوتاؤں کی ملکہ تھی۔ اسے یقین تھا کہ میں اس کے رتبے اور اس کے سرکاری فرائض کی شان بڑھا دوں گی۔ اور اس کے علاوہ اپنے ملک کے لیے مفید ثابت ہو سکوں گی۔ پتاجی کو بھی یہ ناپسند نہیں تھا۔ حالانکہ پرتاپ پر مہربان تھے۔ دہلی کا ایک سفارتی افسر ہندوستانی گورنر کے دو سکریٹریوں کے برابر ہوتا ہے۔ مجھے پتاجی پر ان کی بچگانہ خود غرضی پر ان کے غیر معمولی تکبّر پر ان کی وسیع لامحدود نیکی اور اچھائی پر ہنسی آتی تھی اگر ان کا بس چلتا تو وہ چاند سے کم کسی سے میری شادی کی بات تک نہ سوچتے۔ میں ہمیشہ انھیں خوش رکھتی ہوں۔ میں کیمبرج کی معزز خاتون ہونے کا ناٹک کرتی ہوں اور یہ بھی بڑا کامیاب رہا ہے۔ تمہیں یہ جان کر ہنسی آئے گی کہ دہلی جیم خانہ میں کس طرح میرے بھائی نے اور میں نے "بُوگی ووگی" ڈانس کیا۔ تمھیں کیا پتہ ہوگا یہ کیا ہے بہرحال یہ تمھیں چڑانے کے لیے ہے میں نے ایک انعام بھی جیتا۔

"رام، میرے پیارے تمہیں یہ خط لکھتے ہوئے میں شمالی سورج پور میں ایک جھیل کے کنارے لیٹی ہوئی ہوں۔ پتاجی اور دوسرے لوگ پک نک منانے کے لیے دور جھیل پر نکل گئے ہیں۔ میں سر درد کا بہانہ کر کے یہاں اس ریسٹ ہاؤس میں رک گئی ہوں۔ میرا خیال ہے میں تمہارے بارے میں سوچنا چاہتی تھی۔ یہاں کی ملازمہ ابھی ابھی میرے لیے قدیم طرز کا محلوں میں جلنے والا ایک لیمپ لائی ہے جس میں ارنڈی کا تیل اور کپڑے کی بتی استعمال ہوتی ہے۔ اور جو پانچ پتیوں والے پھول کی طرح کھل جاتا ہے۔ اس نے

معذرت کرتے ہوئے کہا " ہمیں افسوس ہے کہ میم صاحب کے لیے بجلی کا انتظام نہیں ہے۔" لوگ سمجھتے ہیں اب جبکہ میں کیمبرج ہو آئی ہوں میں صرف بجلی کی روشنی میں ہی دیکھ سکتی ہوں۔ یہ بیچاری پھوہڑ عورتیں نہیں جانتیں کہ میں اب پہلے سے کہیں زیادہ اچھی طرح اور صاف دیکھ سکتی ہوں کیونکہ اب میرے ماتھے پر روشنی ہے۔ کسی شریف النفس پُروقار سانپ کے پھن کا سایہ ہے جس کے سات سروں کا عطا کیا ہوا تحفّظ میرے تنفّس کو متوازن کر دیتا ہے اور مجھے عالمِ سکوت میں مستحکم کر دیتا ہے۔ "میری بچی" پتا جی کچھ دن ہوئے کہنے لگے "تمہارے اندر عجیب و غریب کشش پیدا ہو گئی ہے اب ٹھیک ویسی ہی کشش جیسی تمہاری ماں کے چہرے پر تھی۔ جب میں پہلے پہل اسے بیاہ کر لایا تھا وہ سترہ برس کی تھی اس وقت اور اس سے پہلے اس نے زنانہ کے باہر کبھی قدم نہیں رکھا تھا۔ لیکن پیاری بچی تم کیسی اُداس لگتی ہو۔ جیسے تم نے شفق کا سارا دکھ شام کی ساری اداسی سمیٹ کر اپنی ساری کے پلّو میں باندھ لی ہو۔ ہم ملازموں کے طبقے کے نہیں ہیں جو تم زندگی میں دکھ اُٹھاؤ" پتا جی کی یہی خوبی ہے۔ جب ہمارے دروازے پر ہاتھی ہوں تو پیں ہوں اور خود ان کی عظیم، تحفّظ عطا کرنے والی ذات ہو تو دکھی ہونے کا کوئی کارن ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ سچ ہے کہ ان کے انگریز دوست رخصت ہو چکے ہیں لیکن یہ دکھ تو عارضی تھا۔ بڑی تھوڑی سی مدت کا تھا۔ پتا جی بڑے عملی آدمی ہیں۔ "ہم راٹھوروں نے نے پہلے مغلوں کو نپٹایا تھا" انھوں نے اعلان کیا " اس کے بعد آئے انگریز صاحب. اب ہم برہمن یا بنیے سے بھی اتنی ہی اچھی طرح نپٹ سکتے ہیں۔ چاہے وہ دنیا کے سب سے چالاک لوگ ہی کیوں نہ ہوں لیکن ہیں تو ہمارے اپنے ہی۔ ہم ان کی چالیں جانتے ہیں اور وہ چونکہ اس کھیل میں نئے ہیں اس لیے فی الحال ہمارے لیے موقعہ ہے۔" سازش کا منصوبہ بنانا یا ہوائی قلعے بنانا پتا جی کے لیے شام کو شطرنج کھیلنے یا پک نک پر جانے کے مترادف ہے۔ ہمیشہ اس میں کوئی خود غرضانہ مقصد ہوتا ہے۔ اپنی بیٹی کو چھوڑ کر وہ کسی دوسرے کے لیے کبھی کوئی کام نہیں کریں گے جب تک انھیں بدلے میں کچھ ملنے کا یقین نہ ہو۔"

○ رام! اب شام ہو گئی ہے۔ جھیل کے پار والے مندر میں آرتی اُتاری جا رہی ہے۔

لیکن کیا تم آرتی میں میرے ساتھ کھڑے ہو سکو گے؟ میں مشعلوں کو روشن ہوتے دیکھ سکتی ہوں۔ سنگیت بھی سن سکتی ہوں۔ اور پھر باندھ کے پانی کو نگلنے والا لامحدود سناٹا ہے۔ اگر تم نے میرا ساتھ دیا تو میں تم سے ایک مشکل سوال پوچھوں گی۔ اگر میں کہوں تو کیا تم میرے ساتھ شادی کرو گے۔ بتاؤ کرو گے؟ پتا جی اعتراض کریں گے اور کہیں گے کہ تم تو محض پروفیسر ہو۔ لیکن ماں کی اقدار چونکہ زیادہ صحیح ہیں اس لیے وہ کہے گی "اچھا ایک برہمن" سوچیں گی ہمارے درمیان تمہاری موجودگی ممکن ہے مبارک، پوتر ثابت ہو لیکن میں بہت مفلس، بدحال ہوں۔ کوئی عورت جو واقعی عورت ہے اپنے مقدر کا فیصلہ نہیں کر سکتی۔ مرد ہی اس کے مقدر کا فیصلہ کرتے ہیں۔ عورت کے لیے فیصلہ کرنا اپنی حیاتیاتی نوعیت سے دغا کرنے کے مترادف ہے۔ مجھ سے کہو رام! مجھ سے سچ سچ کہو اور بھگوان کے سامنے کہو۔ "آؤ" اور میں چلی آؤں گی۔ آج کی رات کتنی مبارک رات ہے۔ کل گوکل اشٹمی ہے۔ بھگوان کرشن کا جنم ہوگا۔ ہم برت رکھیں گے، پوجا کریں گے۔ اور میں تمہارے بارے میں سوچوں گی۔ میرے سوامی!"

"کیا میں نے تمہیں بتایا تھا کہ سورج پور میں پورے محل میں میرے بچھڑوں کے گھنگھروؤں کی جھنکار سنائی دیتی ہے۔ میں نے ماں کو بتایا دکشن کے ایک ہندوستانی برہمن نے یہ تحفہ مجھے دیا تھا۔ ماں بہت خوش ہو گئیں۔ کہنے لگیں "اب ہم ایسی خوبصورت چیزیں یہاں نہیں بناتے۔ خوب اچھے لگیں گے۔ جب تمہارا بیاہ ہو جائے گا، میری بچی!"

"رام، جب راجپوتوں سے بدلہ لینے کے لیے ریگستانوں کے پار سے گھوڑوں پر سوار ہو کر مسلمان آئے۔ جب انھوں نے ہمارے قلعوں کا محاصرہ کر لیا، برہمن وزیروں کو رشوت دے کر اندر گھسنے کی کوشش کی۔ جب انھوں نے پانی بند کر دیا اور ہمیں پیاس سے ہاہاکار کرنے پر مجبور کر دیا تو ہمارے مرد اپنے ماتھے پر ہمارے خون کا تلک لگائے اچھل کر اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ اپنی بیویوں، بیٹیوں کو الوداع کہا۔ قلعوں کے دروازے یکایک کھل گئے۔ مردوں نے دشمن پر دھاوا بول دیا۔ عورتیں مہابھارت کا پاٹھ کرنے لگیں اور قلعوں کے اندر ہی آگ میں کود گئیں۔ کوئی ہندو عورت کبھی کسی ترک سے شادی نہیں کرے گی۔

میں گھر گئی ہوں۔ دروازے پر ترک آگھڑا ہوا ہے۔ میرے اس جنم کے اور جنم جنم کے دیوتا میرے سوامی چتا میں کودنے میں میری مدد کرو۔ ہاں میری مدد کرو"۔ ساوتری

اپنے نام کے نیچے اس نے اپنی آنکھوں کے کاجل سے کاغذ کو کالا کر دیا تھا اور اپنے ماتھے کے قُم قُم سے ایک نشان لگا دیا تھا۔ ہم ہندوستانی کس قدر جذباتی ہیں۔

بیشک ایک گھوڑا میرے انتظار میں تھا۔ یہ مجھے ترکوں کے پاس نہیں لے جائے گا۔ میں گنگا کے تٹ پر اپنی شاہی پوشاک بدلوں گا اور اسے تنبیہ کروں گا کہ وہ واپس جائے اور کپل وستو کو بتائے کہ وہ کنتھک اچھی نسل کا گھوڑا تھا جو شاکیہ گوتم کو گنگا تٹ تک لے گیا اور اس طرح اسے ایک ایسی تیرتھ یاترا پر روانہ کر دیا جہاں سے لوٹ کر آنا ممکن نہیں ہے۔ بودھی پیڑ کے لیے نرنجنا ندی کے تٹ پر جانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ کوڈائی جھیل کے کنارے بہت سے پیڑ تھے۔ وہ بڑے پرانے گول گول آنکھوں جیسے نشانات والے اور اپنے سایوں میں پناہ دینے والے پیڑ تھے۔ لیکن میں ابھی تیار نہیں تھا۔ میں جو واقعی ایک دغاباز تھا۔ ساوتری کا خط سچا تھا۔ ارنڈی کے تیل والے اس روشن چراغ کی طرح تھا جس کے پاس بیٹھ کر اس نے اسے لکھا تھا۔ اس کے لیے شام کے حوصلے اور دانش مندی کی ضرورت تھی۔ دن اور رات کے درمیان شام کے دھندلکے کا وقفہ ہوتا ہے۔ پلک جھپکنے کا وقفہ جو برہمن کے لیے روشنی لے کر آتا ہے۔ شام کو جیسے ہی گھر میں دیا بتی جلا دیئے جاتے تو چھوٹی ماں اُچارن کرتیں 'جیوتی میک پربرہم' یعنی صرف روشنی ہی پرم برہم ہے۔

آپ شادی تب کر سکتے ہیں جب آپ 'ایک' ہوں۔ یعنی آپ شادی تب کر سکتے ہیں جب دوسرے سے شادی کرنے والا کوئی نہ ہو۔ اصلی شادی 00 کی طرح ہے 010 کی طرح نہیں۔ جب انا مر جاتی ہے تو سچا بیاہ ہوتا ہے۔ میری انا کو کون مٹائے گا؟ "میرے پربھو! میرے گرو" میں رات کی خاموشی میں چلایا۔ جھیل کے پانی میں عکس انداز ہوتے ہوئے کوڈائی شہر کو دیکھتے ہوئے میں نے جوش اور گمبھیرتا سے شنکر کا یہ 'ستوتر' گایا۔

کائنات آئینے میں منعکس شہر کی طرح ہے

اپنے اندر دکھائی دیتی ہے لیکن ظاہر ہے
یہ مایا یعنی فریب سے جنمی ہے
نیند میں ہے
لیکن واقعتاً یہ درونِ ذات ہے، اس کی
وہ جو نقطۂ نور کو دیکھتا ہے
جو اس کے اندر ہے۔ منفرد ہے۔ ماورائے تغیّر ہے۔
اس کو جو پوتر گرو کے روپ میں مجسّم ہے
اس شری دکشنا مورتی کو میں پرنام کرتا ہوں

میں نے ساوتری کو کئی خط لکھے۔ میں اسے کیا کہہ سکتا تھا۔ اپنشد میں کہا گیا ہے "وہ جو آتما کے تئیں سچّا ہے اسے آتما آملتی ہے"، خشکی اور پانی انسانوں کو جدا نہیں کرتے خود وقت کرتا ہے۔ بذات خود میں جب ہونا، رک جائے گا تو میں ساوتری سے بیاہ کرلوں گا۔ پنڈال کہاں بنے گا؟ چچا سیتارامو اور ہاتھی کہاں ہوں گے۔

"سب دُلہنیں بنارس میں جنمی ہوں، میری پیاری، میری لکشمی" میں نے کہا میں جانتا تھا وہ سمجھ جائے گی۔

ڈاکٹر رُپرٹ میرے ایکس رے سے مطمئن تھے۔ "تم ایک آدرش مریض ہو۔ اس قدر حکم ماننے والے" انھوں نے میری پیٹھ پہ تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

"تمہارے ساتھ زندگی گزارنا بڑا آسان ہونا چاہیے۔ تم آدرش پتی ہو" محترمہ رُپرٹ بولیں۔

"سب پتی آدرش پتی ہوتے ہیں جب وہ تمہارے نہ ہوں" ڈاکٹر رپرٹ نے کسی شگفتہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

میں مدورائی گیا اور وہاں سندر میرے جواہرات سے لدی مہربان اور پُرسکون مینا کشی کی پوجا کی۔ میں نے ساوتری کے نام کی پوجا کے لیے تین روپے دیئے۔ پھر حیدرآباد چلا گیا۔ چھوٹی ماں مجھے صحت مند دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ "بنگلور کے بورے اب تک،

خون نہیں آیا" میں نے انھیں بتایا۔ میں نئے وزیر تعلیم سے ملنے گیا جو میرے پتا جی کے پرانے شاگرد تھے میں نے وعدہ کیا کہ میں سال بھر میں اپنا تھیسس مکمل کروں گا۔ اور واپس آجاؤں گا۔

"سکماری کے بیاہ ہونے تک واپس آجانا" چھوٹی ماں نے کہا۔

"او چھوٹی ماں" سکماری چلائی "آپ مجھے چکّی کے ہتھّے سے باندھ کر مجھ سے بھی چھٹکارا پانا چاہتی ہیں۔ مجھے اپنی ڈاکٹری کی پڑھائی پوری کرنے دو۔ مہربانی کرو میرے بھیّا"۔

"آنگن کے سفید لوتر پھول کے لیے" چھوٹی ماں نے اپنی ایک اور کہاوت دہراتے ہوئے کہا "ریتو کا سر ہی کیلاش ہے اور عورت کے لیے اس کے پتی کے پاؤں ہی اس کا سورگ ہیں"، کہاوت کے خلاف دلیل بازی کون کر سکتا ہے۔

میں نے بمبئی میں ایک ہفتہ گزارا۔ وہاں مجھے کوئی خاص کام نہیں تھا لیکن مجھے محسوس ہوا ستاروں کا چکر کچھ کرنے والا ہے۔ میں گھر سے میڈلین سے اور سب لوگوں سے دور رہنا چاہتا تھا۔ کیپٹن شام سندر نے مجھے اپنی مہمان نوازی کی پیش کش کی۔ میں اس سے لندن میں ملا تھا۔ اس نے کہا تھا "جب تم بمبئی آؤ تو مجھے مت بھولنا۔ اس کا کولابا والا فلیٹ سمندر کے بالکل قریب تھا۔ اس کے دو بچے تھے، بڑے ہوشیار اور بیوی لکشمی جو دیکھنے میں بڑی خوبصورت عورت تھی۔ کسی قدر گول مٹول مہربان اداس اداس اور خاطر تواضع کرنے والی۔ کیپٹن شام سندر کے میرے خیال میں کچھ دوسرے شوق بھی تھے۔ وہ رات کو دیر سے کلب سے لوٹتا تھا۔ ہر روز اس کا یہی معمول تھا۔ ایک بار اس نے ہنستے ہوئے مجھ سے کہا "یورپ سے لوٹنے کے بعد مجھے براؤن کے مقابلے میں سفید چمڑی زیادہ پسند آنے لگی ہے"۔ بڑا شاندار جملہ تھا یہ۔

میں اس کے بچوں کو گیٹ وے آف انڈیا یا مالابار ہل دکھانے لے گیا۔ لکشمی کی اداسی بڑی گہری تھی۔ جیسے اس نے کوئی ساڑھی بھگو کر اپنے پیروں میں دبالی ہو اور پھر صحن کے کسی کونے میں اسے گلنے سڑنے کے لیے چھوڑ کر بھول گئی ہو۔ دراصل اس کی عادتیں بھی کوئی خاص اچھی نہیں تھیں۔ اگرچہ وہ اچھی ہندو بیوی تھی۔ اسے مردوں سے سخت نفرت تھی۔ کوئی وجہ نہیں تھی کہ اس کی رائے میرے بارے میں بہتر ہو گی۔

"تمہیں بھی غالباً میرے شوہر کی طرح سفید چمڑی پسند ہے"۔
"جی ہاں، اسی لیے میں نے سفید چمڑی والی عورت سے شادی کی ہے"۔ میں نے جواب دیا۔ وہ میرے لیے اچھے اچھے کھانے پکاتی تھی اور مجھ سے سنیما لے چلنے کی فرمائش کرتی تھی۔ دو ایک بار وہ میرے قریب بھی آئی لیکن میں دور ہٹ گیا۔ اس کی جسمانی اہمیت سے خوف زدہ ہو کر۔ ایسا لگتا تھا اس میں کسی بھی مرد کی مردانگی کو نوچنے اور بد دعاؤں کے ساتھ اسے سمندر میں پھینک دینے کی ہمت تھی۔ لیکن میں کشمکش سے۔ لامختتم سڑکوں، ہوٹلوں، ہوائی جہازوں، بہنوں، شادیوں اور ایکس رے وغیرہ سے تھک چکا تھا اکتا چکا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے کسی ہندوستانی عورت کو کبھی اچھی طرح جانا بھی نہیں تھا۔ غالباً میرے خون کے سرخ خلیے بھی مجھے کھا گئے تھے۔ اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میری مردانگی بے اثر ہو کر رہ جائے۔ ساوتری کو بہر حال نہیں ہونا تھا۔ میں دھیرے دھیرے جان بوجھ کر لکشمی کے بستر میں گھس گیا۔
میرا خیال ہے کہ وہ میرے ساتھ خوش تھی۔ اس کے بچے اس لیے خوش تھے کہ وہ میرے ساتھ خوش تھی۔ اصل میں کچھ زیادہ ہوا بھی نہیں۔ اسے میری ضرورت نہیں۔ وہ صرف یہ محسوس کرنا چاہتی تھی کہ میں بھی سب مردوں جیسا ہوں۔ اس نے مجھے ساوتری کے بارے میں باتیں کرنے پر مجبور کر دیا۔ اور میں خوشی خوشی باتیں کرنے لگا کیونکہ کوئی دوسرا تھا ہی نہیں جس سے میں باتیں کر سکتا۔ اس کے بعد وہ زیادہ فخر محسوس کرنے لگی۔ "مرد بیکار ہوتے ہیں"۔ وہ اکثر کہا کرتی۔ "وہ بچوں سے بھی زیادہ سیدھے ہوتے ہیں۔ گوشت کا کوئی بھی ٹکڑا ان کے لیے چلے گا۔ جتنا گورا چٹا ہو اتنا ہی بہتر ہے"۔
شمالی ہندوستان سے آنے والے لوگوں کے ذریعے ساوتری کے بیاہ کی افواہ میرے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔ لکشمی ساوتری کو 'میری شمع میرے جانِ جاں' کہتی تھی! اس یہ خبر کیپٹن شام سندر کو بھی پہنچا دی تھی۔ بہر حال کرکٹ کلب میں ایسے بہت سے لوگ تھے جو بمبئی اور دہلی کے درمیان آتے جاتے رہتے تھے اور راجدھانی کے مہاپرشوں کے بارے میں کہنے کے لیے ان کے پاس ہمیشہ کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا تھا۔ اس لیے جب خبر واقعی آ گئی۔ سب سے پہلے اخباروں میں۔ تو میں حیران نہیں ہوا۔ اور پھر ساوتری نے خود ایک جملہ لکھ بھیجا۔ "سورج پور محل

آج شام چار بج کر سینتالیس منٹ پر میں ازدواجی زندگی میں داخل ہوگئی۔ آخر کار میں نے پرتاپ سے شادی کر دی۔ میں اس کی اچھی بیوی بنوں گی۔ مجھے آشیرواد دو۔"

ایک دو روز میں لکشمی میری آغوش میں آگئی۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا میں اچار کا مزا لے رہا تھا۔ میرے شب و روز خوب عیش اور تفریح میں گزرنے والے تھے۔ میں نے اپنی روانگی ایک ہفتے کے لیے ملتوی کر دی۔ خود کیپٹن سندر بھی خوش لگتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا یہ سب کیا تھا۔ لکشمی سر سے پاؤں تک جگمگا اٹھی تھی۔ جب کبھی مجھے ذرا سی کھانسی آجاتی تو وہ میری طرف ایسی مہربان ہوگئی تھی کہ میری بغل میں بیٹھ کر پنکھا کرنے لگتی۔ میرے ہاتھ پاؤں دبانے لگتی۔ اب وہ میری کچھ عزت بھی کرنے لگی تھی۔ اسے میں سچا سیدھا آدمی لگا۔ وہاں آنے جانے والے ان مردوں کی طرح نہیں جو گندے ہوتے ہیں۔ وہ کہتی تھی اس قدر گندے کہ "میں ان موٹے مچھندر بیوقوفوں کو، شام سندر کے ان دوستوں کو اپنے بائیں پیر سے بھی نہیں چھوؤں گی۔ وہ گوری چمڑی پسند کرتے ہیں تو کرنے دو انھیں۔" وہ ہندو دھرم کے شاستروں کے بارے میں مجھ سے سوال پوچھتی۔ اب تو اس نے مہابھارت اور گیتا بھی باقاعدہ پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ میرے ساتھ یورپ جانا چاہتی تھی۔ اپنے بچوں کی تعلیم کے بارے میں مجھ سے باتیں کرتی۔ اکثر اس کے پہلو میں لیٹا ہوا میں سوچتا کیا میں وہی رام تھا۔ سرجا کا چہیتا بھائی چھوٹی ماں کا سوتیلا بیٹا۔

پھر ایک روز مجھے کپل وستو کے کھلے منہ والی، سر سے پاؤں تک ننگی لیٹی عورتوں کی یاد آئی۔ کہانی کچھ اس طرح تھی۔ "گرمیوں کے موسم کے لیے چاندی کے محل تھے سردیوں کے لیے صندل کے اور جب موسم بہار آتا تھا تو اس کے لیے سونے کے محل تھے۔ سنگیت کار بھی وہاں تھے۔ کئی اور ہر قسم کے۔ اس لیے جب راجہ شدودھن نے بودھی ستو کو ان کے درمیان کھیلتے دیکھا تو اس نے سوچا کہ تم میرا جانشین ہوگا۔ گدی پر بیٹھے۔ راجہ بنے گا۔ وہ کبھی محل سے باہر نہیں جائے گا کسی روگی کی فریاد، موت کا دکھ۔ بڑھاپے کی لڑکھڑاہٹ، اور مفلسی اور غربت کی تکلیف نہیں دیکھے گا محلوں میں کڑا پہرہ تھا اور سلطنت میں ایک بھی لڑکی ایسی نہیں تھی جو جوانی کی خوشیوں کو پورا نہ کرسکے۔

میں نے کسی حد تک خفیہ طور پر چپ چاپ ہوائی جہاز کا ٹکٹ بک کر لیا کیونکہ میں بزدل بن گیا تھا۔ جس دن مجھے جانا تھا اس سے پہلے رات میں نے لکشمی کو بتایا۔ اس نے ایسا بکھیڑا کھڑا کر دیا۔ مجھے لگا ساری بلڈنگ کے لوگوں کو پتہ چل جائے گا۔

"تم ہجڑے" وہ چیخی۔ "ذلیل بزدل" مجھے لگا وہ مجھے پیٹ دے گی لیکن وہ اب بھی بڑی خوبصورت تھی۔ میں نے اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا اور اس کا غصہ ٹھنڈا کیا۔

"مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔ میرا کیا ہوگا" وہ سسکنے لگی۔ "میرے پاس لوٹ کر پھر آنا" اس نے التجا کی۔ اور جب میں اس کے اوپر لیٹا ہوا تھا تو ایسا لگتا تھا وہ اپنے دکھ اور جذبے کی شدّت کی گہرائیوں میں کھو گئی ہے۔ "میں ہمیشہ تمہاری شکر گزار رہوں گی" اس نے روتے ہوئے کہا۔ اور میرا چھوٹا سا سر اپنے بھرپور سینے پر رکھ کر کہنے لگی۔ "کیونکہ کم سے کم تم میرے ساتھ عزّت سے پیش آئے۔ میں جانتی ہوں جب بھی مجھے تمہاری ضرورت ہوگی تم میرے پاس ہوگے۔ اور تم جانتے ہو کہ اگر کبھی تمہیں میری ضرورت پڑی تو میں آوں گی اور تمہاری دیکھ بھال کروں گی۔ اگر میں تمہیں خوش رکھ سکوں تو شیام کو خوشی ہوگی۔ اس کا خیال ہے تم بے یار و مددگار ہو اور اچھے دوست ہو۔

حیرانی کی بات ہے کہ یہی لکشمی سانتا کروز ہوائی اڈّے پر مجھے الوداع کہنے کے لیے آئی۔ ہندوستان کی میری تیرتھ یاترا ختم ہو گئی تھی۔

میڈلین نے مکان میں منتقل ہوگئی تھی۔ ”میں دوبارہ کبھی ولاسیاں آن میں نہیں رہ سکتی تھی“ اس نے مجھے لکھا تھا۔ نیا مکان ولالے روشے تھا۔ کیونکہ ڈھلوان باغ میں جگہ جگہ سفید اور بھوری چٹانیں تھیں۔ یہ شہر سے تھوڑی دور تھا۔ اور مکان بھی پہلے والے مکان کی نسبت چھوٹا تھا لیکن گیٹ تک زینہ بر زینہ لگے ہوئے تھے۔ زیتون کے پیڑ مکان کو علیحدگی اور کشادگی کا احساس عطا کر رہے تھے۔ بہت دور صرف ”آ، پی ای دکھائی دیتا تھا اور کا مارگ پر کہیں سورج! میڈلین نے مکان کے بارے میں ٹھیک ویسے ہی فیصلہ کیا جیسے اس نے اپنی زندگی کے بارے میں کیا تھا۔ اب میرے ہندوستان جانے کا سوال ہی نہیں اٹھتا“ اس نے لکھا تھا۔ میں نے کبھی پوچھا بھی نہیں۔ کیوں؟

مرتب اور حلق سے ادا کی گئی آوازوں کے مقابلے اَن کہی آوازیں کتنی سچّی ہوتی ہیں۔ لفظوں کا استعمال صرف مکمل انسانوں اور دیوتاؤں کو کرنا چاہیے۔ گویائی کو فی الواقع فسوں خیز بنا دینا چاہیے۔ گویائی آواز ہے‘ آواز لرزش ہے اور لرزش تخلیق ہے۔ تخلیق کا مقصد یہ جاننا ہے کہ خالق کیا ہے۔ اپنے لیے خالق ہونے کا دعوہ کرنا درحقیقت عظیم سچائی کے خلاف گناہ ہے۔ یورپی کہتے ہیں خاموشی زرّیں ہے یعنی سائی لنس از گولڈن۔ نہیں۔ خاموشی تو سچّائی ہے۔ ”مون واکیہ پرکھتت پر برہم تت وم“ شری شنکر نے کہا تھا ”سچ کی اشاعت ہی خاموشی کی زبان ہے۔“

جس دن میں پہنچا وہ بڑا منحوس دن تھا۔ مجھے یاد ہے اس دن اکتوبر کی ۱۷ تاریخ تھی اور سمندر میں جوار تر نگ اٹھی تھی اور کےسس بیچ پر ایک گھوڑے اس کے سوار اور دو نہانے والوں کو ساتھ بہا کرلے گئی تھی۔ ہمارا ہوائی جہاز تین گھنٹے لیٹ تھا۔ بحرہ روم کی ہواؤں میں ہونے والے تغیرات کے باعث ہوائی اڈّے پر ہنری بھی موجود نہیں تھا۔ ہر جگہ زندگی بدل گئی تھی۔ میں مارسیلز تک بس میں گیا اور وہاں سے ٹیکسی لے کر

ایکس پہنچا۔ بعد دوپہر دعا کی طرح شفاف تھی۔ پہاڑیوں پر کہیں کہیں خزاں کا سنہرا پن بکھرا ہوا تھا۔ جب میں گھر میں داخل ہوا تو میڈلین ایک خط لکھنے میں مصروف تھی۔ پُرسکون، تازہ اور بڑی سی لگ رہی تھی۔ واقعی وہ بہت پھیل گئی تھی۔ وہ میرا سامان اُٹھا کر باغ کی سیڑھیوں سے اوپر لے گئی۔ جب وہ مجھے میرے نئے کمرے میں لے کر گئی تو مجھے محسوس ہوا اس نے بڑا اچھا مکان لیا تھا۔ میری کتابیں قرینے سے سجائی ہوئی تھیں۔ میری بڑی میز کھڑکی کے سامنے رکھی تھی اس نے اگر بتیاں جلائی تھیں۔ جونہی میں اندر آیا مجھے مہک محسوس ہوئی۔ میرے دیوان کے اوپر کی دیوار پر میری ماں کی تصویر لٹکی ہوئی تھی۔

"رام جلدی سے نہا لو۔ میں ایک دم کھانا پروس دوں گی" اس کی آواز کومل، با ارادہ اور کچھ عجیب سی تھی۔ اس بار میں نے جلدی جلدی ٹرنک کھولے۔ اپنے کپڑوں کو لٹکایا اور غسل خانے میں گھس گیا۔ یہ گی زر بڑا نرالا ہے۔ من موجی ہے۔ اپنی مرضی سے چلتا ہے" اس نے بتایا اور پانی کا نل کھول دیا۔ "جب تم اندر گھسو تو یاد سے گیس بند کر دینا۔ ورنہ یہ پھیل جائے گی۔ اور تمہیں رینگ کر باہر نکلنا پڑے گا جیسا کہ میں نے ایک رات کیا تھا۔ ہمیں پلمبر کو بلانا چاہیے" اس نے بات پوری کرتے ہوئے کہا اور واپس کچن میں چلی گئی۔

میں اس قدر تھکا ہوا تھا کہ کچھ بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔ اس لیے میں ٹب میں اُتر گیا۔ جب میں باہر نکلا تو غیر متوقع طور پر خود کو تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ شام ٹھنڈی تھی اور میں نے اپنے آپ کو جوان اور مکمل محسوس کیا۔ میری سانس کچھ کم بھاری محسوس ہو رہی تھی۔ میں گھر لوٹ آیا تھا۔

اس مکان میں ڈرائنگ روم بھی تھا۔ یہ نیچے کی منزل میں تھا اور باغ کی طرف کھلتا تھا۔ آپ گرمیوں کے موسم میں جھینگروں کی آواز سن سکتے تھے اور زیتون کے پیڑوں میں جگنو دیکھ سکتے تھے۔ ایک کنارے پر کچن تھا اور میں پھر سے چاول اور ٹماٹر کی خوشبو سونگھ سکتا تھا۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی رسوئی ہی تھا لیکن تھوڑا مختلف۔ اس بار اس میں کری پاؤڈر ڈال دیا تھا۔

"میں نے سوچا کچھ دن تک تمہیں تیز تیکھا مصالحے دار کھانا اچھا لگے گا" وہ بولی "تمہارے لیے کھانا بنانا مجھے آتا ہی نہیں۔ اور نہ ہی آئے گا"

میز لگا دی گئی اور وہ کھانا لے آئی۔ لکڑی کے جلے ہوئے ہینڈل والا وہی جانا پہچانا ساس پین تھا۔ چین کا وہی مربعوں، مثلثوں والا موم جامہ تھا۔ وہی مڑا تڑا کانٹا تھا ٹوٹی ہوئی نافرمابردار نوک والا۔ میں نے یکایک محسوس کیا کہ میز پر پلیٹ صرف ایک تھی۔ میں نے اٹھ کر ایک اور پلیٹ نکالی۔ اس دوران میں میڈلین نے کھانا میز پر رکھ دیا اور کہنے لگی۔

"رام، اگر میں نہ کھاؤں تو تم مجھے معاف کر دو گے نا! آج شکل پکش کی اشٹمی ہے اور میں نے برت رکھا ہوا ہے۔ میں بدھ مت کی اچھی پیروکار بننا چاہتی ہوں" وہ آہستہ سے غیر ڈرامائی انداز میں بولی "بیچارے بچّے! اتنے لمبے سفر کے بعد تمہیں خوب بھوک لگی ہوگی۔ رام جو چاہیے اپنے آپ لے لینا۔ میں ڈاک خانے ہو کر ابھی آتی ہوں۔ مجھے یہ خط آخری ڈاک نکلنے سے پہلے ڈال دینا چاہیے۔ یہ تانت زوبی کے لیے ہے"

وہ اپنے کمرے میں گئی اور پھر سیڑھیاں اتر کر باغ میں چلی گئی۔ شام بڑی خوبصورت اور کشادہ تھی۔ میرے سر کے اوپر آکاش میں تاروں کا جھرمٹ تھا۔ اور جنوب مغرب سے آتی ہوئی بحری ہوا میں زیتون کے پیڑ ہل رہے تھے۔ دروازے پر سیدھا کھڑا سرو کا بڑا سا پیڑ نجات دینے والے کی طرح لگ رہا تھا۔ شام کی فضا پرندوں، بکریوں اور بچّوں کی آوازوں سے معمور تھی۔ دوسری طرف دور پہاڑیوں پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

میں نے بیٹھ کر کھانا کھایا۔ میں نے کھانے پر توجہ مرکوز کر دی۔ میں نے تسلیم کیا مجھے بہرحال کھانا چاہیے تھا۔ خوراک بنی ہی کھانا کھانے کے لیے ہے۔ بلاشبہ یہی سچ ہے: ادم ادم، ادم لوم، ادم دیوو درّن۔ پرجاپتی، سوی ہنتم اہرت اِتی پی تے، اتم اہار، اہار، ادم اِتی' چاندوگیہ اپنشد میں کہا گیا ہے لیکن پھیپھڑوں کا اپنا ایک مزاج ہے۔ یکایک میرے تنفس میں دقت پیدا ہو گئی۔ میں نے کسی غیر معمولی شکایت کے اظہار سے بہرحال اپنے آپ کو روکے رکھا۔ میں تو نارمل راما سوامی تھا۔

ایکس کے بلسے دے جیونس فلیس میں تاریخ پڑھانے والی میڈلین کا شوہر۔ کسی بھی بات میں کچھ عجیب نہیں تھا۔ میں ہندوستان سے اپنے گھر آیا تھا اور اس سلسلے میں زمین، ہوا، زیتون کے پیڑوں یا ستاروں کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ میں پیرس یا لندن کی بجائے ہندوستان سے آیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ وقت، گھڑی کے گھنٹوں کے مطابق ہے۔ دِنوں کے مطابق جنھیں آپ گن سکتے ہیں۔ کچن میں لٹکے ہوئے کلینڈر پر بھی مارچ۔ اپریل وغیرہ ۔ اکتوبر تک ۔ پھیپھڑوں کی تکلیف بڑھ سکتی ہے۔ آپ جانتے ہیں اس لیے آپ ہندوستان میں رُکے رہے ۔ لیکن میڈلین تو میڈلین ہے ۔ وہی پرانی میڈلین ۔

"مجھے امید ہے کہ تم نے یہ بھولنے کی حماقت نہیں کی ہوگی کہ میں کدوکس کیا ہوا پنیر کچن میں چھوڑ جاؤں گی اورام!" اس نے بچّے کی طرح کہا۔ "اوہ تم ابھی بھی پہلے کی طرح احمق ہو،" اس نے بڑھیا کھانا اور خشک میوے میری طرف بڑھائے "تمہیں اور مضبوط ہونا چاہیے،، تمہیں غور سے دیکھ لوں ذرا ! یہ ضرور تمہارے کوڈائی کینال میں رہنے کے باعث ہے کہ تم پچھلی بار ہندوستان سے لوٹنے کے مقابلے میں اس بار کچھ کم کالے لگ رہے ہو۔" میں نے اسے ایکس رے اور بلڈ ٹسٹ کے بارے میں بتایا۔ وہ اُدھر گئی اور میری دوائیاں ڈھونڈ لائی۔ "تم آج ہاتھی کے پاس نہیں جاؤ گے،، اس نے فیصلہ کیا۔ "اس برس ابھی سے سردی شروع ہو گئی ہے۔ آؤ، میرے کمرے میں چلیں۔"

اس کا کمرہ میرے کمرے کی نسبت چھوٹا تھا لیکن میرے کمرے کی طرح باغ میں کھلتا تھا۔ سرو کا ایک پیڑ تو اس کی کھڑکی کو چھو رہا تھا اور آپ ستارے گنتے ہوئے اسے ہاتھ سے سہلا بھی سکتے تھے۔

"اس مکان میں ولاسیاں آں کی طرح گرمی پہنچانے کا کوئی مرکزی انتظام نہیں ہے۔ لیکن آتش دان بڑا شاندار ہے۔ یہ کافی کفایتی ہے اور ویسے بھی تم اس سال پیرس اور لندن میں زیادہ رہو گے۔ میں لا شارانت کی رہنے والی ہوں، میرے لیے۔ یہی کافی ہے۔"

میں نے کمرے پر نگاہ دوڑائی۔ دیواریں پیلے بھورے رنگ کی تھیں اور اس کے

بستر کے پاس کھمیر بدھ کا بڑا سا سر رکھا ہوا تھا۔

"میں نے اسے مسی گگے سے بھجوایا تھا۔ خوبصورت ہے نا!" دیواروں پر بدھ کے کئی سر آویزاں تھے۔ خاص طور پر بڑا سے آیا ہوا یونانی بدھ۔ اس کے پاس تنا کا بھی تھا جس میں خوفناک سر، شیر کے بازوؤں اور بھینس کے پاؤں والے عفریت تھے۔ دھیان مگن بدھ اور کنول کے پھول اور اس کے وسط میں نیلگوں حصے پر براجمان سمندر کی طرح پرسکون بودھی ستو۔

"چچا چارلس نے پیرس میں یہ میرے لیے خریدا تھا۔ تمہیں اپنا یہ الگ کمرہ بُرا تو نہیں لگے گا؟ یہاں تم کام بھی زیادہ سہولت سے کرسکتے ہو۔"

ہم سروجا کے بیاہ، حیدرآباد اور میرے کام کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

"ہمارا یہ سرد ملک تمہارے لیے مناسب نہیں ہے۔ مجھے خوشی ہے وہاں تمہارے لیے ملازمت محفوظ ہے۔ تمہیں اس سال اپنا تھی سس بہرحال مکمل کرلینا چاہیے۔ اب چونکہ گھر چھوٹا ہے اور سب لوگوں سے دور بھی ہے۔ میں تمہاری مدد کروں گی۔"

میں نے کیتھرین کے بارے میں پوچھا۔

"وہ گلاب کی طرح کھل رہی ہے۔ اسے دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ خوشی ممکن ہے۔ جارجز تو جیسے اس کی پوجا کرتا ہے۔ اور تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ ایک اسکولی لڑکے جیسے ہو گیا ہے۔ بوئی ریو مشیل انے کے پاس ان کا سندر سا فلیٹ ہے۔ دو کمروں کا فلیٹ رسوئی اور غسل خانے کے ساتھ۔ جارجز کے لیے لوئی۔ لیے۔ گرینڈ کچھ دور پڑتا ہے لیکن چچا چارلس نے انھیں ایک چھوٹی مورس خرید دی ہے۔ یہ کار انھوں نے اپنے ایک موکل کے توسط سے خریدی ہے جس کا انگلستان میں اپنا کاروبار ہے۔ یہ کیتھرین ہی ہے جو اپنے شوہر کو وہاں سے لے جاتی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اب ہمارے پاس کار نہیں ہے۔ یہ تمہارے پھیپھڑوں کے لیے اچھی نہیں ہے اور میں اتنی کمزور ہوں کہ کار چلا ہی نہیں سکتی۔ ویسے بھی کار کی ضرورت ہی کیا ہے؟ انکم ٹیکس جتنا کم دینا پڑے اتنا ہی اچھا ہے۔

"تم تھکے ہوئے لگتے ہو۔ میں گرم پانی کی بوتل لاتی ہوں۔ گرم پانی کی پوتر بوتل۔"

وہ ہنسی "اب تمہارے لیے سو جانا ہی بہتر ہے۔ تمہارے کمرے میں بجلی کا ہیٹر ہے اور میں نے اسے پوری دوپہر چالو رکھا ہے۔ جاؤ رام! کپڑے بدل لو" اس نے التجا کی۔

میں اپنے کمرے میں گیا۔ اپنی ماں کی تصویر دیکھ کر مجھے اس قدر دکھ ہوا کہ میرا جی چاہا کہ میں رو رو کر اپنا جی ہلکا کر لوں۔ لیکن میں نے احتیاط سے اپنی آنکھوں کو رگڑ کر صاف کیا۔ کپڑے تبدیل کیے اور ایک اسکولی لڑکے کی طرح بستر میں گھس گیا۔ میڈلین گرم پانی کی بوتل لے آئی۔ لیمپ میرے قریب کر دیا تاکہ میں پڑھ سکوں ــ جرنل آف دی ہسٹری آف رلیجنز کے حال کے سارے شمارے میز پر رکھ دیئے۔ اس نے میرے کام کے مضامین پر نشان بھی لگا دیئے تھے۔ اور پھر چادر کے پھندنوں سے کھیلتی ہوئی میرے پیروں کے پاس بیٹھ گئی۔

"ان دنوں میں لیز دے سے چینی اور تبتی زبان سیکھ رہی ہوں۔ تبتی زبان تو سنسکرت کا ہی ایک روپ ہے لیکن چینی بڑی مشکل ہے۔ میں چینی بدھ دھرم کے بارے میں مزید جاننا چاہتی ہوں۔ اس کے علاوہ بدھ دھرم سے متعلق کچھ اعلیٰ کتابیں تم جانتے ہو پالی زبان میں دستیاب بھی نہیں ہیں۔ مسلمان حملہ آوروں سے نالندہ اور وکرم شلا کو جلا کر انھیں غارت کر دیا تھا۔ بدھ دھرم کی دانشورانہ عظمت کا پوری دنیا میں کوئی جواب نہیں۔ بدھ دھرم کی کچھ کتابیں آلڈس ہکسلے کے ناولوں جیسی لگتی ہیں انوکھے انداز میں دانشورانہ اور کم و بیش کج نہاد۔ کسی یورپی کے لیے سچ صرف اس وقت پُرکشش ہو سکتا ہے جب وہ کج نہاد گم کردہ راہ ہو۔ تمہارا رو بیاں بے سیئی ناک ٹھیک کہتا ہے ہم چونکہ خدا کو قبول نہیں کر سکے اس لیے ہمیں 'مادرِ خدا' ایجاد کرنی پڑی۔ اس کو ہم نے کنواری مریم کا روپ دے دیا۔ اس کے بیٹے کو قبول کر لیا اور پھر یہ پتہ لگانے کی کوشش کی کہ اس کا جنم کیسے ہوا۔ اس کے مقابلے میں مہاتما بدھ کا جنم کتنا سادہ، فطری اور خوبصورت ہے۔ مایا دیوی نو مہینے سے حاملہ ہے۔ وہ اپنی ماں کے گھر جا رہی ہے۔ جونہی درد زہ اٹھتا ہے وہ رک جاتی ہے اور سہارے کے لیے پھلوں سے لدے آم کے ایک پیڑ کی ایک ٹہنی تھام لیتی ہے اور پھر عظیم بدھ کا جنم ہوتا ہے کسی بھی دوسرے بچے کی طرح نارمل جسمانی معمول کے مطابق۔ نارمل ہونا مکمل بننے کے مترادف

ہے۔" وہ بولی اور چپ ہو گئی۔

ہاتھی دانت کا بنا ہوا کاغذ کاٹنے والا ایک چاقو برسوں سے میرے پاس تھا، میں بھی اس وقت چاقو اور جرنل آف دی ہسٹری آف رِلی جنز کے ساتھ کھیل رہا تھا۔

"شاید تم اپنے یہ سب رسائل دیکھنا پسند کرو گے" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ کل کا پروگرام تھوڑا سا مختلف ہے۔ آج کل میں ایک اچھے 'بودھ' کی طرح صبح سویرے نہا دھو کر منتر پاٹھ کرتی ہوں۔ میرے بدھ بڑے مہربان ہیں۔ صبح سویرے کا دھیان بڑا اچھا لگتا ہے۔ میں اس کے بارے میں تم سے کل بات کروں گی۔"

وہ میرے پاس آئی اور جونہی اس نے میرے آرام کے لیے میرے بستر کے کپڑے ٹھیک ٹھاک کرنے کی کوشش کی تو میں اس کے ریشمی بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرنے لگا۔ یہ بال اب بھی سنہرے، سچے اور میرے اپنے تھے۔ لیکن اب ان میں لوڈی کولون کی خوشبو نہیں تھی۔ اس کا چہرہ بھی پاوڈر سے عاری تھا۔ میں نے پہلی بار اسے غور سے دیکھا یہاں تک کہ رُوژ بھی نہیں تھا۔ مجھے اپنی بے بسی کا احساس ہوا اور میں نے اپنی نظریں موڑ کر دوسری طرف گرم پانی کی بوتل کی جانب کر لیں۔

"شب بخیر رام" اس نے دروازے پر سے کہا "آرام سے سو و۔ چنتا من میں ہوتی ہے، بدھ کہتے ہیں چنتا نہ کرنا میرے دوست۔"

میں کچھ دیر کاغذ کاٹنے والے چاقو کے ساتھ کھیلتا رہا۔ اُٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا، تازہ ہوا میں سانس لی اور پھر اپنے بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ ساری رات میں چھوٹی ماں اور بنگلور والے گھر کے آنگن میں اس کے ساتھ کھیلتے ہوئے کتّے کے پلے کے خواب دیکھتا رہا۔ میں مون سون کی مہک محسوس کر رہا تھا۔ گھر کے لوگوں نے مجھے بستر پر لٹا دیا اور پینے کے لیے تھوڑی سی برانڈی دی۔ کچھ دیر بعد ایک ڈاکٹر آیا۔ موٹا اور غصیلا ڈاکٹر اور اس نے مجھے ایک انجکشن دیا۔ ایکس رے کے اوپر کچھ لکھا ہوا تھا۔ شاید چینی زبان میں۔ جاد جز اپنی میز پر کھڑا اپنی کلاس کو پروسیر و سمجھا رہا تھا۔ سب طالب علم ہنس پڑے۔ وہ سب کے سب ہندوستانی تھے انھوں نے سیاہ یا رنگین چشمے پہن رکھے تھے۔ ان کے

جسموں سے بدبو آرہی تھی لیکن وہ سب کے سب شہزادوں کے بیٹے لگتے تھے۔
پو پھٹتے ہی میں نے بڑی گمبھیر اور دیر تک آتی ہوئی آواز میں منتر سُنا" ادم دھو۔ ادم گھو ادم جرھ" مجھے لگا میں ہر دوار میں تھا اور گنگا میرے پاس سے بہہ رہی تھی۔ ہندوستانی ہونا، ہندوستان میں رہنا سندر ہے۔ سندر اور پوّتر!
اگلے کچھ مہینے بڑے سکون سے کام میں گزرے۔ میڈلین اور میں مل کر کام کرتے رہے۔ ہم نے ایسا کام ہاتھ میں لیا تھا جو میرے خیال میں اس کی دیوتاؤں کے خاندان کی روایت کو غارت کرنے والا تھا۔ بنی نوع انسان پر مرکوز تہذیب چاہے وہ پاکیزگی صفت (یا پروٹسٹنٹ) ہو، بدھ دھرم سے وابستہ ہو یا جین مت سے لازمی طور پر خود انہدامی ہے۔ سقراط کا یونان، اپنشدوں اور شنکر کا ہندوستان۔ کیتھولکزم (عیسائیت نہیں) اشالن ازم (لینن ازم، ٹراٹسکی ازم، انارکو سِنڈی کلزم ہیں) جیسی تہذیبیں جن کا مرکز انسان نہیں تھا زیادہ مستقل تھیں کیونکہ وہ قانون سے ہم آہنگ تھیں۔ انسان علیحدہ اور الگ ہے۔ اس کے اکیلے، تنہا اور الگ ہونے میں ہی کل کی ہم آہنگی ہے"۔ اگر آپ کل میں سے کل منہا کر دیں۔ پورنم۔ تو جو کچھ پیچھے بچتا ہے وہ 'کل' ہی ہے"۔ کام پُل بنانے کا ہے۔ پتھر اور لوہے کے پُل نہیں کیونکہ اس سے اشیا کا دوام ثابت ہوگا بلکہ رسّوں کے بنے ہوئے وہ پُل جو ہمالیہ کے پہاڑوں میں بنے ہوئے ہیں۔ سبز اور پُر شور خالی جگہ پر آپ عارضی طور پر لٹکایا جانے والا کچھ تعمیر کر دیتے ہیں۔ پہاڑ کو اپنے نتھنوں میں محسوس کیجئے اور بالآخر اس حقیقت کو سمجھ لیجئے کہ سکوت کے ہم سفر صرف آپ ہیں اور تنہا ہیں۔ موت ان معنوں میں ہماری دوست ہے کیونکہ موت ہمیں جنموں جنموں تک حقیقت کل کے روبرو رکھتی ہے۔ ہونا، اخلاقی صحت کے اعتراف کے مترادف ہے۔ جہاں اخلاق چاہے وہ نیوٹن کا ہو یا پاسکل کا خارجی دنیا کی حقیقت پر اصرار کرتا ہے۔ وہ سورما جس کا ذکر اپنشد کرتے ہیں۔ اپنی ذات میں داخل ہو جاتا ہے اور پھر یہ سمجھ لیتا ہے کہ وہ کبھی کہیں گیا ہی نہیں۔ جہاں کہیں دوسری جگہ کا نہ ہونا ہو وہاں کہیں دوسری جگہ جانا ہوتا ہی نہیں۔ افسوس یہ وہ خوبصورت سچائی ہے جسے انسان کو بہر حال سمجھ لینا چاہیے۔ یہ

خوبصورت ہے کیونکہ آپ اپنے آپ کو سچّے روپ میں دیکھتے ہیں۔

اسی لیے بدعت ہی حق کا اثبات ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے دنیا میرا اثبات ہے۔
بدھ مت و یدانت کو ثابت کرتا ہوں اور کبھی کبھار عیسیٰ کے گرجا گھر کو۔

ہمارا اشتراک بے نام تھا۔ ہم اپنے نقطۂ نظر کو ثابت کرنے کے لیے علامتوں اور اشاروں میں باتیں کرتے تھے۔ کسی بدعتی شرح کے دقیق متن پر گفتگو کرتے ہوئے ہم لوگ اکثر غصّے میں آ کر اُٹھ جاتے۔ مجھے چونکہ لاطینی کم آتی تھی اس لیے میڈلین کا پلڑا ہمیشہ بھاری رہتا تھا' کیا فادر اے ارسیارش ورول کے 'اوبم رے از' کا مفہوم علمِ صرف کے معنوں میں محض سایہ تھا جیسا کہ ژاں گیروکا خیال تھا یا اس کا وہی مفہوم تھا جو اصولِ مسلّمہ میں متعین کیا گیا تھا۔ ہم ان سوالات پر گھنٹوں کی پُرجوش بحث کی حالت میں پہنچ جاتے ہم نہ صرف لغات اور دینوی شرحوں اور تفسیروں کی بلکہ 'کا ڈیس سکر پٹورم اک لیاسٹی کورم لیٹی نورم' کی بھی مدد لیتے اور پھر لیز وہر وقت وہاں موجود تھا ہماری ضرورت کی کوئی بھی سفیر کرنے کے لیے۔ ظاہر ہے میڈلین کی بات ہی صحیح ثابت ہوتی۔ میڈلین بھی کبھی کبھی اور پچھلے کچھ دنوں سے ذرا سی بات پر بہت جلد غصّے میں آ جاتی تھی۔ ایسے ہی ایک موقعے پر وہ یوں پھٹ پڑی۔

"تمھارے اندر ہمارے جیسا تعلیمی نظم وضبط نہیں ہے۔ تمہاری یونیورسٹیوں کا معیار یقیناً بڑے نچلے درجے کا ہوگا کہ تم جیسا ذہین آدمی بھی ذہنی طور پر اُلجھ کر رہ گیا ہے۔ ہمارے اسکولوں میں پڑھنے والا نو سال کا بچّہ بھی ذہنی طور پر الجھا ہوا نہیں ہوگا۔"

میں نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا کہ نہ تو فرانسیسی اور نہ ہی انگریزی میری مادری زبان ہے۔ شاید میں لاطینی زبان کے مقابلے میں سنسکرت زبان کو بہتر طریقے پر محسوس کر سکتا ہوں۔

"تو پھر تمہیں ایک ایسے موضوع پر تھیسس لکھنا شروع ہی نہیں کرنا چاہیے تھا جو خاص طور پر فرانسیسی ہے اور لاطینی پر مبنی ہے۔"

"میں نے سوچا تم بھی دنیا پار کر گیا پرماتیت پنڈا دھ پر تھیسس لکھ رہی ہو۔" میں نے جوابی حملہ کیا۔

"میں کوئی بھی سیس نہیں لکھ رہی۔ میں اپنے روحانی مفاد کے لیے بدھ مت کا مطالعہ کر رہی ہوں۔"

"اور میں کیتھارازم کا یہ ثابت کرنے کے لیے کہ میں مابعد الطبعیاتی طور پر صحیح ہوں"

ان بحثوں کا ایک ہی انجام ہوتا عام طور پر اس وقت جب شام کی سیر کے لیے لیزو نیچے انتظار کر رہا ہوتا تھا۔ کبھی کبھی یا تو میڈلین مٹر چھیلنے کے لیے یا گری ئیر پنیر خریدنے کے لیے رک جایا کرتی تھی "صبح کالج سے واپس آتے ہوئے میں اس کے بارے میں بھول گئی تھی۔ تم دونوں سیر کو جاؤ۔ میں اچھی گرہستن کی طرح تمھارے لیے لذیر کرانی اور کالے زیتون بتاؤں گی۔"

مجموعی طور پر لیزو کو کٹر ادعائی باتوں سے متعلق یہ بحثیں قدرے اچھی لگتی تھیں کیونکہ ان میں اس کی لسانی مدد کی اکثر ضرورت پڑتی تھی۔ ہم اسے رکنے کے لیے التجا کرتے، خاص طور پر میڈلین۔ بارش والے، بے رنگ سنیچر کے روز جب بحث کے، بعد دوپہر تک جاری رہنے کا امکان ہوتا تھا اور ہم چاہتے تھے ہمیں کچھ ناشتہ، کچھ آرام ملتا رہے۔ اس کی موجودگی سے بحث کچھ زیادہ ہی سطحی ہو جاتی اور ہم کہیں بھی نہ پہنچ پاتے۔ ہمیں بالآخر ایسی ہی صورت حال درکار تھی۔ کھانے کے بعد میں پھر چرچ فادرز کی جانب لوٹ آتا۔ نیک دل، سنجیدہ لوگوں کی جانب جو حمدیں گا گا کر لوگوں کو نذرِ آتش کرتے تھے لیکن جو اس کے باوجود چرچ سے اپنے مذہب سے خوب محبت کرتے تھے۔ اگرچہ کبھی کبھی چرچ کے مقابلے میں وہ اپنے پیشے سے زیادہ محبت کرتے تھے۔ میڈلین ایک بار پھر پرگیا پارمتا کے مطالعے میں مصروف ہو جاتی۔ اس کے پاس ہمیشہ پالی یا سنسکرت کے کسی لفظ کے بارے میں پوچھنے کو کوئی نہ کوئی سوال ہوتا تھا۔ اور لیزو کسی ہندوستانی پنڈت کی مہارت سے اپنے پالی یا سنسکرت اور چینی کے علم کا مظاہرہ کیا کرتا تھا۔ (ستی ہوتے اس کا چینی میں ترجمہ کیا ہے۔ اور تبتی زبان میں یوں ہے۔ اور سنسکرت زبان میں اس کا مفہوم یہ ہے۔ وغیرہ وغیرہ)۔ میں اکثر مذاق میں لیزو کو لکشمن بھٹ کہا کرتا تھا۔ یہ اسے اچھا بھی لگتا تھا کیونکہ ہندوستانی گرنتھوں میں بہت زیادہ بھٹ نہیں تھے۔

"لیکن ہم برہمنوں کی گلیوں میں لاتعداد بھٹ ہیں"۔ ایک بار میں نے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "اور بنارس میں تو بھٹ بھرے ہوئے ہیں۔"

"آہ بنارس" وہ بولا "سارناتھ کے قریب جہاں ساکیہ منی نے 'دھرم چکر' کا آغاز کیا تھا۔ اور اس نے اپنے انوکھے یورپی لب و لہجے میں پورے کا پورا اگنی اپدیش سنا ڈالا "فادر چر نے 'چکر' کا ترجمہ 'پہیہ' کیا ہے لیکن اصل سنسکرت میں اس کا مفہوم سہارا ہے وجود کا مرکز ہے۔ مرکزِ دروں ہے جو بدھ کے تصورِ خلا کی دین ہے۔ چھید پہیے کے وسط میں ہے۔ ٹھیک اسی طرح خلا بھی انسان کے وسط میں ہے۔ عجیب ہیں یورپی "ماہرینِ مشرقیات" وہ کہتا گیا "مجھے بہر حال ہندوستان جاکر بدھ بھکشو کی طرح گھومنا پھرنا چاہیے تبھی میں بدھ دھرم کو سمجھ سکوں گا۔ اس سے پہلے نہیں۔ نہیں، اس سے پہلے نہیں۔"

"میں تبت جانا پسند کرتی ہوں" میڈلین نے بیچ میں کہا۔

"شیطان کی پوجا کرنے والوں اور شیطان رقاصوں کا ملک" لیزو نے چڑاتے ہوئے احتجاجاً کہا۔

"عورتیں شیطانوں کو پسند کرتی ہیں" میڈلین جواب میں غصّے سے بولی "وہ ہمیشہ انسانوں سے بہتر ہوتے ہیں" پھر یہ محسوس کرتے ہوئے کہ وہ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی کہہ گئی ہے وہ کچن میں اپنی مکرانی یا مٹر دیکھنے چلی گئی۔ لمحہ بھر بعد ہی واپس آگئی اور بولی "کھانا پکانا عورت کا حیاتیاتی فرض ہے۔ اس سے اس کے چھوٹے سے ذہن کو راحت ملتی ہے۔ اگر ہمارے دماغ کا سارا فاسفورس بحث و مباحثہ میں ہی ضائع ہو جائے تو مرد عورت کو آسانی سے بیوقوف بنا سکتا ہے۔ اس لیے اسے پیچھے رہ کر مکرانی پکانی چاہیے۔ مرد کے کپڑے دھونے چاہییں۔ اس طرح وہ اپنی کھوئی ہوئی طاقت بحال کر لیتی ہے۔ اگر تم عورتوں پر حکمرانی کرنا چاہتے ہو تو انھیں باتیں کرتے رہنے دو۔ وہ خود ہی بے ہوشی کے عالم میں پہنچ جائیں گی۔"

"فرینکو کی پولیس یہ بات خوب اچھی طرح جانتی تھی" لیزو نے کہا "قیدی عورت کو بس ہنسنے بولنے دیا جاتا ہے اور وہ جلد ہی تھک جاتی ہے۔ انھوں نے میری بہن کے

ساتھ یہی کیا تھا۔ انھوں نے اسے بات کرنے کی اجازت دے دی۔ جب وہ بول بول کر تھک گئی تو انھوں نے احتیاط سے کچھ سوال پوچھے اور میری بہن نے اسی احتیاط سے میرے بارے میں سب باتیں بتا دیں۔ اب وہ فرینکو کے ایک حمایتی سے شادی شدہ ہے۔ اب وہ پرانے یونیورسٹی قصبے برگاس میں انتظامیہ کا ڈپٹی کمشنر ہے۔ کیا تم یہ جانتے ہو؟" اس نے اچانک میری طرف مڑتے ہوئے پوچھا۔

"عورتیں" میڈلین نے دخل دیتے ہوئے کہا "صرف اپنی آوازیں سننا چاہتی ہیں۔ مردوں کی نہیں، چاہے وہ کتنے ہی عالم فاضل کیوں نہ ہوں۔" اور پھر اپنے مٹر دیکھنے چلی گئی۔

ڈاکٹر کی صلاح کے باوجود میں صرف ایک بار کھانا کھاتا تھا۔ میرے خیال میں کھانا چبانے اور ہضم کرنے کا کام انسانی عنصر کی بربادی تھی۔ جب میں چھوٹا تھا تو میں نے وہ جڑی بوٹیاں کھانے پر بھی غور کیا کرتا تھا جو یوگی کھاتے تھے۔ اور لوگ کہتے ہیں اس کے بعد انھیں چھ مہینے تک کچھ اور کھانے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ جب آدمی کا پیٹ پیٹھ کے ساتھ لگ جاتا ہے تو اس کی کارکردگی بنارس کے برہمن یا چچا چارلس کے مقابلے میں، جن کا موٹاپا ریڑھ کی ہڈی سے بہت آگے تک امڈ پڑتا ہے کہیں بہتر ہوتی ہے۔ اتنی بڑی حرارت پذیری کے لیے آلے کے طور پر سائفن کا استعمال ضروری ہونا چاہیئے۔

میں ہمیشہ سوچا کرتا تھا بڑی سی توند کے ساتھ مرنا کیسا ہوگا۔ اس وجہ سے ضرور آپ دوسری دنیا کے بارے میں غیر یقینی محسوس کریں گے۔ بیٹوین کسی کو بھی دوزخ میں پہنچا سکتا ہے۔

لیزو موٹا ہوتا جا رہا تھا۔ جس طرح وہ اپنی پینٹ کو کمر پر ٹھیک کرتا رہتا تھا سچ پوچھیے تو وہ کچھ بھدا لگنے لگا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک غریب آدمی کے لیے اپنے کپڑوں کا زیادہ سے زیادہ استعمال جائز ہے لیکن انسان کے لیے بدکاری بہرحال بری ہے۔ ایک راہبہ ہمارے یہاں یتیم خانے کے لیے چندہ اکٹھا کرنے آیا کرتی تھی اور

بڑی باتونی تھی۔ میڈلین کو اس کی زبانی پتہ چلا کے ڈرزن کے ہاں بچّہ ہونے والا تھا" اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اس کے ہونٹ بھی ماں کے ہونٹوں کی طرح موٹے بھدّے ہوں گے" سسٹر نے بیس فرینک لیتے ہوئے کہا۔" اگر انسان کو اچھے بُرے میں تمیز نہ ہو تو عالم فاضل ہونا بیکار ہے"۔

" یہ دنیا بڑی عجیب وغریب ہے" ایک شام میڈلین نے مجھ سے کہا" انسان کے کردار چال چلن کے بارے میں آپ پہلے سے کچھ نہیں کہہ سکتے، جیسے آپ ایک بلّی کی خوبیاں پہلے سے نہیں بتا سکتے۔ جب تم ہندوستان گئے ہوئے تھے" اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا اور یہ پہلی ذاتی گفتگو تھی جو میری واپسی کے بعد ہمارے درمیان ہوئی تھی۔ " اور اس دوران میں کیتھرین جب یہاں آئی تو مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ وہ اب یہاں رہے گی۔ حالانکہ وہ مجھ سے پانچ برس چھوٹی ہے لیکن ہم دونوں کم وبیش ایک ساتھ پلی بڑھی ہیں اور جڑواں لگتی ہیں۔ کیتھرین بڑی ہوشیار لڑکی ہے۔ مجھ سے صرف دو جماعت پیچھے تھی۔ میں اس کے کپڑوں کی مہک سے ہی کم وبیش کہہ سکتی ہوں کہ یہ کیتھرین ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں اس کے بارے میں کس قدر کم جانتی تھی"۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوگئی۔ جیسے بات جاری رکھنے کے لیے اپنے اندر حوصلہ مجتمع کر رہی ہو۔

" خیر کوئی بات نہیں" وہ کہتی گئی" میں تمہیں سب کچھ بتاؤں گی۔ معمول کے مطابق جارجز شام کو آیا اور ہم سیر کے لیے باہر گئے۔ جارجز ہمیشہ آدرش شوہر رہے گا سوائے ان لمحوں کے جب وہ بُجھا بُجھا سا ہوتا ہے۔ سب سلاو اپنے آپ میں دُکھی رہتے ہیں۔ اور یہ ایسی بات ہے جسے ہم یورپی یعنی ہم مغربی یورپ کے رہنے والے کبھی نہیں سمجھ سکتے" میڈلین پھر رک گئی اور میری طرف کچھ اس طرح دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو کہ وہ بات جاری رکھے یا نہیں۔

" ہاں! میں سن رہا ہوں"۔ میں نے کہا۔

" ننھی کیتھرین کے دل میں جارجز کے لیے جو عقیدت ہے وہ اب بھی ویسی کی ویسی برقرار ہے۔ جیسے ' جارجز کیا تم یہ کھاؤ گے' ' تمہیں زکام ہو رہا تمہیں یہ احتیاط کرنی

چاہیے' جارجز، تمہیں زیادہ دیر تک باہر سردی میں نہیں رہنا چاہیے۔ تم نے خود کہا تھا کہ تمہارے بازو میں راتوں کو درد رہتا ہے، اور کیا کیا پکوان پکاتی تھی وہ اس کے لیے۔ کھانے پکانے میں بڑی ماہر ہے وہ۔ ایلیشور ہی جانے اس نے یہ سارے جنوبی پکوان بنانے کے لیے کہاں سے سیکھے۔ مجھے اس سب سے خوشی ہوتی تھی کیونکہ جیسا کہ تم جانتے ہو مجھے کھانا پکانا اچھا نہیں لگتا۔ اور جارجز یہ اور جارجز وہ اور "ڈارلنگ یہ کیا؟ تمہیں تو کھانسی ہونے لگی ہے" اور "ڈارلنگ کل ہم سیر کے لیے کا مارگ چلیں گے' وغیرہ وغیرہ"۔ میرا خیال ہے کہ تم نے زندگی بھر ایسے پریمی نہیں دیکھیں ہوں گے۔ میں ان کی خوشیوں کی ان کی خوشی سے خود خوش ہونے کی آرزومند تھی۔

صبح سویرے طلوع سے قبل وہ رسم عشائے ربّانی میں شامل ہونے کے لیے جایا کرتی تھی۔ کبھی وہ بیچارے جارجز کو بھی اس کے بستر سے بھی گھسیٹ لاتی تھی۔ وہ چاہتی تھی وہ آدرش کیتھولک جوڑی بنیں۔ جارجز کو یہ سب کچھ اکھرتا تھا لیکن میں کیتھرین کو جانتی تھی۔ وہ جارجز کو جس قدر اچھا کیتھولک بنائے گی اتنا ہی اس کا اپنا جیون سکھی ہوگا۔ حالانکہ خیال ہوتا تھا کہ جارجز کو اس سے بہتر کیا بنایا جا سکتا تھا، پھر بھی کسی نہ کسی پہلو سے بہرحال آپ کچھ کر سکتے تھے۔ جارجز اپنے طویل اور کامیاب کام اور بچوں کے بارے میں بڑا پُرامید تھا۔ وہ نہ صرف یقین کے سہارے فرانیسی بننے کی توقع رکھتا تھا بلکہ اس کا خیال تھا یہ بالکل اس کا حق ہے۔ اس کے بچّے فرانیسی شہری ہوں گے اور کوئی نہ کوئی جنگ کہیں نہ کہیں ہمیشہ ہوتی رہے گی۔ اور اس کے بچّے اس کی طرح فرانس کی دفاع میں لڑنے کے لیے نکلیں گے۔ اس کے باوجود جب بھی وہ کہتا تھا' نو ینتور فرانسے' ہم ہی اصل فرانیسی ہیں، تو وہ کسی حد تک مضحکہ خیز لگتا تھا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟ بہرحال وہ خود بھی یہ جانتا تھا۔" وہ یکایک رُک گئی اور پھر کہنے لگی" تم سن رہے ہو؟ مجھے پتہ نہیں میں تمہیں یہ سب کیوں بتا رہی ہوں۔"

"کہتی جاؤ"، میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "میں سُن رہا ہوں۔"

لیز وبھی معمول کے مطابق ہر شام آیا کرتا تھا۔ میرے بارے میں اس کا ردِ عمل بالکل

صاف تھا۔ میں 'دی زس ٹنس' تحریک کے دوران لڑکوں کے درمیان بہت دنوں تک رہی ہوں۔ میں جانتی ہوں میں اس انوکھے قسم کے لوگوں کے ساتھ کیسے نمٹا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اُس کے اُس پاگل پن کے بعد۔ اور غلطی میری تھی۔ مجھے مردوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے تھا۔ میں اسے ایسے قابو کر سکتی ہوں جیسے سانڈ سے لڑنے والا کوئی عام شخص ہمارے کامارگ میں سانڈ کو قابو کر سکتا ہے۔ لیکن۔۔۔"

"لیکن؟"

"کیتھرین کا معاملہ بالکل دوسرا تھا۔ وہ اس کے جذبات سے کھیلنا جانتا تھا۔ جیسے بلی اپنے بچوں سے کھیلتی ہے۔ اس کا دھیان ہمیشہ اس کی طرف رہتا لیکن چونکہ وہ جارجز کا قریبی دوست تھا اور ہم ہسپانوی منچلے پن سے واقف بھی تھے اس لیے ہم نے ان کی 'لکا چھپی' کے بارے میں کوئی دھیان نہیں دیا۔ وہ مل کر بچوں کی طرح کھیلتے تھے۔ اکثر جارجز کے سامنے۔ میں چونکہ عمر میں سب میں بڑی تھی اس لیے بعض اوقات مجھے کہنا پڑتا یہ سب بند کرو۔ جارجز کے سامنے یہ بیوقوفی مت کرو۔ میرا خیال ہے جارجز بچپنے کی اس نمائش کو پسند کرتا تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا اس کی ساری تھکن اس کے اندر لوٹ آئی ہے۔ اس نے یہ بھی ضرور سوچا ہوگا جب تک کھیل سکے اسے کھیلنے دو۔ بہت جلد یہ ادھیڑ عمر پروفیسر اس کے سینے پر آٹا پیسنے والی چکی کی طرح چڑھ بیٹھے گا۔ اس پر حاوی ہو جائے گا۔ سلاو لوگوں کے ذہن میں کچھ فرشتہ سیرت ہے۔ سادہ و معصوم، ارفع اور مکمل۔ جارجز کے نزدیک کوئی بھی مرد یا عورت یا تو درویش ہے اور یا بہ نفس نفیس شیطان۔ درمیان میں کچھ نہیں۔ مزاج اور کردار کی کوئی نازک باریکیاں نہیں۔"

"کچھ بھی کہو وہ دونوں جوان ہیں۔"

"ہندوستان میں تمہیں سب لوگ ہی جوان دکھائی دینے چاہئیں۔ اگر فرانیسی تمہارے لیے اس قدر بیگانہ قسم کے لوگ ہیں تو روسیوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"اور لیزد۔۔۔؟" میں نے دخل دیتے ہوئے کہا۔ میری کوشش تھی کہ گفتگو لوٹ کر پھر غیر شخصی سطح پر آجائے۔

زیتون کے پیڑوں کے درمیان چاندنی میں لکا چھپی کے کھیل کا نتیجہ ہمیشہ بے اثر نہیں ہوتا۔"

میڈلین لمحہ بھر کے لیے رک گئی اور پھر یوں گویا ہوئی جیسے درحقیقت وہ اپنے ہی بارے میں بات کر رہی تھی "میں اس وقت تک کچھ زیادہ چل پھر نہیں سکتی تھی۔ ایک روز کی بات ہے۔ جارجز اپنے کالج میں کسی میٹنگ کے سلسلے میں مصروف تھا۔ اور ریزو اور کیتھرین معمول کے مطابق باغ میں ہنس کھیل رہے تھے۔ شاید قصور میرا ہی تھا۔ میں نے کہا "کیتھی تم گھر میں بہت کام کرتی رہی ہو۔ کپڑے دھونا، کھانا پکانا۔ گھر کی صفائی۔ کیا تم نہیں چاہو گی کہ تم دونوں تھوڑی سیر کر آؤ۔ ہاتھی تک گھوم پھر آؤ"۔ "تم ایسا سوچتی ہو کیا؟" اس نے پوچھا شاید سچے دل سے کیونکہ عورتوں میں مردوں کے مقابلے میں بہتر دفاعی اہتمام ہوتا ہے۔ میں نے جواب دیا۔ "بے شک کیتھی، مجھے یقین ہے جارجز ناخوش ہوگا۔ وہ سوچے گا وہ چونکہ یہاں نہیں تھا اس لیے تم سیر کے لیے نہیں گئیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے یقین ہے وہ مجھ سے اس وجہ سے واقعی ناراض ہوگا کہ میں ایسا کرنے کے لیے تمہیں کہا کیوں نہیں"۔ وہ گھاس کے تنکے ایک دوسرے پر پھینکتے ہوئے بڑے معصومانہ انداز میں چل پڑے جیسے بچے اپنے پادری کے ساتھ جمعرات کو جاتے ہیں۔ میں دیر تک ان کا انتظار کرتی رہی۔ وہ بہت دیر سے آئے۔ نَو سے کچھ اوپر کا وقت ہوگا جب وہ لوٹے۔ کیتھرین آتے ہی کچھ بہانہ کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ریزو بتانے لگا کہ وہ کیسے وال سیانت آں میں ایک پگڈنڈی پر چلتے چلتے راستہ بھول گئے۔ انھیں کسی سے راستہ پوچھنا پڑا۔ کافی دیر بھٹکنے کے بعد انھیں ایک جھونپڑا دکھائی دیا۔ وغیرہ وغیرہ۔ رام! میں اکیلی تھی اور کسی بات سے محتاط رہنے کا مجھے تجربہ بھی نہیں تھا۔ میں نے اپنے آپ تسلّی دی۔ وہ سچ ہی کہہ رہے ہوں گے۔ میں نے دیکھا کیتھرین غیر معمولی طور پر خاموش تھی۔ جارجز کے لیے پوری عقیدت لیے۔ کم و بیش ایک ہندوستانی بیوی کی طرح۔ مجھے زیادہ احتیاط سے کام لینا چاہیے تھا۔ میں بھی کیا احمق ہوں۔ ایک ہفتہ بعد میں نے ان لوگوں کو ایک دوسرے کی باہوں میں دیکھا۔

"میں ایک روز غیر متوقع طور پر بعد دوپہر گھر آ گئی کیونکہ ایک طالب علم کی وفات

کے باعث میرا پڑھانے کا کام ردہو گیا تھا۔ اڑھائی بجے کا وقت ہوگا۔ میں دبے پاؤں اندر داخل ہوئی۔ کیتھرین عام طور پر دوپہر کے کھانے کے بعد تھوڑا آرام کیا کرتی تھی۔ میں نے سوچا اس کے آرام میں خلل نہ پڑے۔ میں اندر آئی تو کیا دیکھتی ہوں اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور سرخی چہرے پر پھیلی ہوئی تھی۔ لیزو کا گلوبند ایک طرف کو کھنچا ہوا تھا اور اس کی کمر کی بیلٹ معمول کے مطابق کھلی ہوئی تھی۔ "اوہ یہاں بہت گرمی ہے" اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ میں ادھر سے گزر رہا تھا۔ میں نے سوچا کیتھرین کو ہیلو کہتا جاؤں"۔ کیتھرین آرام کر رہی تھی۔ میں نے کہا۔" آؤ ادھر ڈرائنگ روم میں لیٹ جاؤ۔ ہم باتیں کریں گے۔" اس نے مجھے کافی پلائی۔ اس سے مجھے اور گرمی محسوس ہونے لگی۔ تمہارا جنم اسپین میں ہوا ہو۔ تمہاری ماں بھی ممکن ہے اندلوسین ہو پھر بھی جب سورج چمکتا ہے تو چاہے موسم سردی کا ہو تمہیں ایسا پسینہ آتا ہے جیسا سانڈ کو گرمی کے موسم میں۔ مجھے بڑی گرمی لگتی ہے۔" اس نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ کیتھرین کچھ نہیں بولی۔ اپنی ٹانگیں جھٹکتے ہوئے بڑبڑائی "میرا خیال ہے کہ مجھے نہانا چاہیے۔ اف یہ گھر کتنا گرم ہے"، اور وہ غسل خانے میں گھس گئی۔

"اس شام میرے لیے مشکل ہو رہا تھا میں جارجز کا سامنا کیسے کروں گی۔ لیکن عورتوں میں ایک تحفظاتی حسیت ہوتی ہے۔ کیتھرین جانتی تھی کہ جارجز کا اس کے ساتھ کیا رشتہ تھا۔ کسی نے بھی کچھ نہیں کہا کیتھرین اور لیزو کا بلی کے بچوں کا کھیل یکایک ختم ہو گیا۔ یہاں تک کہ ایک روز جارجز کہنے لگا " بچے ان دنوں اتنے تمیزدار کیسے ہو گئے ہیں؟" "اوہ" میں نے جواب دیا" کھیل کا اپنا وقت ہوتا ہے، اور کام کا اپنا" کیتھرین میری بڑی ممنون تھی۔ ایک صبح وہ برآمدے کی صفائی کر رہی ہے۔ وہ جھاڑو رکھ کر میرے پاس آئی اور میرا گال چوم لیا۔ خوش قسمتی سے میں اگلے ہی ہفتے بیمار پڑ گئی اور یہ قصہ تمام ہو گیا۔ شادی کے موقعہ پر تانت زوبی کہنے لگیں" کیسی بھری پری دلہن لگ رہی ہے کیتھرین"۔ وہ کہتی ہے اب وہ اتنے خوش ہیں کہ انھیں دیکھ کر فرشتوں کی آنکھوں سے بھی خوشی کے آنسو چھلک اٹھیں۔ اب جارجز اس کے ساتھ

کھیلتا ہے۔ جلد ہی ان کے یہاں بچّہ ہو جائے گا اور پھر وہ دونوں اس کے ساتھ کھیلا کریں گے۔ یہی دنیا ہے سوائے وم سنسار۔"

"میڈلین! یہ بات آخر تم نے مجھے کیوں سنائی ہے؟"

"میں سوچتی تھی کہ یہ برہمن اپنے دماغی نظام کے شاطرانہ الٹ پھیر کی مدد سے یہ سمجھائے گا کہ ایسے واقعات کیوں ہوتے ہیں۔"

"انسان کی فطری شہوت پرستی" میں نے اپنے آپ کو کسی غیر مناسب بحث سے بچانے کے لیے یہ غیر آرائشی، کھردرے الفاظ استعمال کیے۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کیتھرین اس موٹے لال مونہے کو چھو بھی کیسے سکی۔ جب لیز د نمسکار کہنے کے لیے مجھے چھوتا ہے تو مجھے نہانا پڑتا ہے۔"

"ضرور تمہارے غدود میں کوئی کمی ہوگی" میں ہنسا۔

"شکریہ!" وہ بولی اور بالکل خاموش ہوگئی۔

یہ سوچ کر کہ مجھے اس چیلنج سے اتنی جلدی دست بردار نہیں ہونا چاہیے، میں نے لمحہ بھر کے توقف کے بعد پھر کہنا شروع کیا۔ "سچی بات یہ ہے کہ ہم حیاتیاتی طور پر جانور سے کچھ زیادہ دور نہیں ہیں۔ پیار ایک کھیل ہے۔ یہاں تک کہ موروں کو بھی اپنے پریمیوں پریمکاؤں کو رجھانا پڑتا ہے۔ نر 'گی جاگا' کو بھی اپنی مردانگی ثابت کرنے کے لیے ہوا میں غیر معمولی کرتب دکھانے پڑتے ہیں۔ ایک نرم دل عورت کا کوئی 'ہیرو' ہی آدرش ساتھی ہو سکتا ہے۔ میں پیرس کی ایک انتہائی حسین اور سنجیدہ لڑکی کو جانتا ہوں جو ان دنوں فلسفے کی کتابیں پڑھ رہی ہے اور پارٹیوں اور رقص کی محفلوں میں جانے سے انکار کرتی ہے وہ ایک ریسنگ ڈرائیور کی محبت میں گرفتار ہوگئی جو بالآخر بڑے وقار سے ایک حادثے میں مر گیا۔ اس کی بہت سی محبوبائیں تھیں پھر بھی اس نے جس لڑکی کو چنا وہ سادہ، باعصمت اور نسائیت سے بھرپور تھی۔ جب اس کا محبوب مر گیا تو کئی عورتوں کی آنکھوں سے کھلے طور پر آنسو اُمڈ پڑے لیکن وہ لڑکی لگاتار بیوہ کی طرح رہتی ہے۔ برگساں، میری ڈین اور ہندوستانی فلسفے کا مطالعہ کرتی ہے۔ میں ڈاکٹر رو بیاں

بے سے ای آنگ کے یہاں اس سے ملا تھا۔ وہ سار بون میں ان کی بڑی لائق طالب علم تھی۔
"یہ پیار نہیں ہے" میڈلین نے احتجاج کیا۔
"تو پھر کیا ہے؟ ایک سندر لڑکی ہونا اور چھبیس برس کی عمر میں اپنے ڈرائیور شوہر کی موت پر اتنا سوگ منانا اور اس سب کو سمجھنے کے لیے فلسفے کا مطالعہ کرنا۔"
"شاید یہ ہے۔ مان لیتی ہوں۔"
"بہر حال جارجز ۳۲ سال کا ہے۔ لیکن وہ بیمار ہے۔ اس کا صرف ایک بازو ہے اور اگرچہ وہ ممکن ہے سورما رہا ہو اور اس کا کھویا ہوا بازو ایک نوجوان روسی کا فرانس کے لیے تحفہ ہو لیکن وہ اپنے آپ کو بوڑھا محسوس کرتا ہے۔ کیتھرین کو باپ یا گرو کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو ایک ساتھی چاہتی تھی۔"
"تو؟"
"اس لیے جب یہ سب کچھ اپنے آپ اپنی مرضی سے اس قدر قریب آگیا تو جو کچھ وہ پا سکتی تھی اس نے پالیا۔ لیز و چاہے کتنا ہی موٹا ہے لیکن لگتا پکا ہسپانوی ہے۔ ڈھال تلوار سے لیس ہیرو سورما، سورہیر ایک بازو والے بدبودار بوڑھے پادری کی طرح نہیں ہے۔ اس لیے ہندوؤں کا یہ کہنا صحیح ہے کہ کوئی مرد کسی عورت سے صرف اس کے اپنے لیے پیار نہیں کر سکتا۔"
"تو پھر کوئی پیار کیسے کرتا ہے؟"
"اس کے اندر چھپے وجود کے لیے۔ جیسا کہ یگیہ ولکیہ نے مے تریا سے کہا تھا" میں نے اپنی بات جاری رکھی "تمام عورتیں مکمل عورتیں ہوتی ہیں کیونکہ ان میں نسائیت ہوتی ہے نسائی قانون ہوتا ہے۔ یتی۔ پرکرتی..."
"اور تمام مرد —؟"
"مرد تبھی مکمل بنتے ہیں جب وہ درویش ہو جاتے ہیں۔ اور جان لیتے ہیں کہ حقیقت کل ہی انسان کا مقدر ہے۔ وہ مرد کبھی بُرا نہیں ہو سکتا جو یہ جانتا ہے۔ بھگوان ہم اس دنیا کے نہیں ہیں۔"
"اور جب وہ یہ نہیں جانتا؟"
"وہ اپنی مردانگی کھو دیتا جیسے لیز و کھو چکا ہے اور درزن کے ساتھ رہنے لگتا ہے۔"

"اور درزن کی نسوانیت کے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا؟
"اس کے لیے لیزو ایک ہیرو ہے۔ وہ عورت غالباً کمیونسٹ ہے اور اس کے نزدیک فرانس کے دشمن سب کے سب ہیرو ہیں اور وہ اپنے بچّے کا نام اگر لڑکا ہوا تو ولادی میر ای رکھے گی اور اگر لڑکی ہوئی تو پے سیونے ریا رکھے گی اور لیزو کوئی انقلابی گیت گا کر بچّے سے پیار دلار کرے گا۔"
"ہاں۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ میرا خیال ہے کہ وہ کمیونسٹ ہے۔ جو بھی ہو وہ بہر حال کمیونسٹ ہے۔ راہبہ نے ایسا ہی کہا تھا۔"
"تم نے دیکھا میں کیسا عقلمند ہوں" میں نے کہا۔
"ہاں رام بھٹ"، اور وہ پہلے کی طرح ہنس پڑی معصوم، بے ساختہ، شفاف ہنسی تھی اس کی۔
"کچھ لوگ جسمانی طاقت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور کچھ کے اجداد نے نسل در نسل ان کی ذہنی سرگرمی کو اس قدر پُر زور بنا دیا ہے کہ ان کے خیالات بحر الکاہل کی وہیل مچھلیوں کی طرح ڈبکیاں لگاتے رہتے ہیں، چھلانگیں لگاتے رہتے ہیں۔"
"اور کوئی نیک پروفیسر عورت اس اُلجھی ہوئی مردانگی کی تعریف کرتی ہے اور پھر ان میں ایک کے ساتھ بیاہ کر لیتی ہے۔"
"اوہ۔"
"اور پھر؟"
"وہیل سمندر میں لوٹ جاتی ہے۔" میں نے کہا اور چپ ہو گیا۔
"ابھی کچھ دن پہلے بری ٹنی کے ساحل پر بحر الکاہل کی ایک وہیل مچھلی پائی گئی تھی۔" میڈلین بولی۔
"پھر کیا ہوا؟"
"وہ ساحل پر مردہ پڑی تھی۔"
"میں نے تم سے یہی کہا تھا۔ انھوں نے اس کا کیا کیا؟"

"انھوں نے اسے اپس پلاناد د ان وِلادیں رکھ دیا تاکہ پیرس کے سب مرد عورت اسے دیکھ سکیں۔

"میں سوچتی ہوں اس کے جنوبی قطب کے اجداد اس سلسلے میں کیا کہتے ہوں گے۔ امید ہے بحرالکاہل کی وہیل مچھلیوں کو اس سے اچھا خاصا سبق مل گیا ہوگا۔۔"

اس کے کچھ دیر بعد ہی ہم نے رات کا کھانا کھایا اور اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ ہم دونوں کے درمیان واضح طور پر فاصلہ تھا۔ میڈلین کو کچھ ہو گیا تھا۔ میں جانتا تو تھا لیکن اسے کوئی کوئی نام نہیں دے سکتا۔ ایکس میں ایسا کون تھا جس سے یہ پوچھا جا سکتا تھا۔ ممکن ہے جب میں پیرس جاؤں تو تانت زوبی کچھ بتا سکے۔ تانت زوبی پر حال ہی میں فالج کا ہلکا سا حملہ ہوا تھا۔ مجھے اس سے ملنے زوبیاں جانا ہی تھا۔ اس دوران میں ولالے روتے میں زندگی واضح متوازن تہذیبی انداز میں جاری رہی۔

میں میڈلین کے کمرہ میں شاذ و نادر ہی جاتا تھا۔ میں جب بھی جاتا دھوپ اگربتی کی مہک محسوس کرتا۔ اکثر جب مجھے ضروری بات اس سے پوچھنی ہوتی۔ پوسٹ مین کے لیے دستخط کرانے ہوتے یا بجلی کے بل کے بارے میں کوئی بات کرنی ہوتی۔ تو دروازہ کھٹکھٹانے پر میڈلین فوراً کوئی جواب نہیں دیتی تھی۔ باہر آنے میں وہ کچھ وقت لگاتی تھی۔ بعد ازاں جب کبھی کوئی آجاتا اور مجھے اس کی مدد کی ضرورت پڑتی تو میں نے دروازہ کھٹکھٹانا بند کر دیا۔ میں نے ایک نوٹ بک رکھ لی جس میں سب کچھ درج کرتا رہتا تھا۔ وہ اس کو دیکھ لیتی تھی اور جو بھی کرنا ہوتا تھا کر دیتی تھی۔ وہ عام طور پر اکیلی ہی سیر کے لیے جاتی تھی۔ اور جب وہ لوٹ کر آتی تو اس کے چہرے پر سچا سکون ہوتا۔ میں اکثر رات کو اسے کسی منتر کا اچارن کرتے یا جاپ کرتے سنتا۔ میں سوچتا اتنی ساری رسومیاتی دانشمندی اس نے کہاں سے حاصل کر لی۔ وہ بدھ مت کے بارے میں زیادہ سے زیادہ وثوق اور اعتماد کے ساتھ بات کرنے لگی تھی۔ بدھ مت کے بارے میں اس کی واقفیت مجھے کہنا چاہیے۔ مذہبی ہونے سے زیادہ نفسیاتی تھی۔ وہ آربندو کا بھی مطالعہ کرتی تھی اور اس عظیم فلسفی اور سنت کے بیشتر افکار سے اتفاق کرتی تھی۔ "یہی ہے جس کی دنیا کو ضرورت ہے۔" وہ ایک بار کہنے لگی "لیکن مجھے قدیم چیزیں اور قدیم راز و اسرار پسند ہیں۔ میں اپنے بدھ بھکشوؤں سے ہی وابستہ رہوں گی۔" اس نے ہنستے ہوئے اپنی بات پوری کی۔

کئی مہینے بعد ایک روز ہمت کر کے میں میڈلین کے کمرے میں گیا۔ اُسے انفلوئنزا ہو گیا تھا اور وہ بُری طرح کھانس رہی تھی۔ مجھے کمرے میں آیا دیکھ کر اسے سخت حیرت ہوئی۔ اس حد تک کہ دروازہ کھول کر اندر جانے کے بعد میں معذرت کے طور پر دروازے سے اس کے بیڈ کے راستے کے وسط میں ہی رُک گیا۔

"ارے تم کیوں اتنے فکر مند ہو گئے؟" وہ بولی "اٹھارہ عناصر کے اس جسم کو بخار اور دکھ سے تو گزرنا ہی ہے منتشر ہونا مجتمع اشیاء کی فطرت کا حصّہ ہے۔ بھائی!" اس نے ملتجیانہ لہجے میں مجھ سے کہا "بیچارے اس گوشت کے لوتھڑے کے لیے فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

میرا رونے کو جی چاہا۔ میں اس کے پاس کھڑا رہا۔ میرا جی چاہا میں اس کی چھاتی پر کافور کے تیل کی مالش کر دوں۔ اس نے دھیرے سے میرا ہاتھ ہٹا دیا جیسے میں ضروری حد تک 'ساتوک' یعنی پاک صاف نہیں تھا۔ کمرے اور اس کے درمیان کچھ ایسی قربت پیدا ہو گئی تھی جس نے مجھے وہاں اجنبی بنا کر رکھ دیا تھا۔ لیکن بدھ جس کے آگے تیل کا ایک دِیا جل رہا تھا اس کی پوجا سے خوش لگ رہا تھا۔ اس کے سامنے رکھی تانبے کی شفاف پلیٹ میں بھرے سادہ پانی میں بے سنہ کے سندر پھول تیر رہے تھے۔ ایک طرف اس نے اپنی کتابیں بڑے قرینے اور احتیاط سے لگا رہی تھیں۔ اور انھیں پیلے اور اینٹ کے رنگ کے کپڑے سے ڈھانپ رکھا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا تر پاٹھک ہوں گے۔

جب میں نے اس کی کتابوں کی طرف دیکھا تو اس نے بتایا "اب میں پالی آسانی سے پڑھ سکتی ہوں۔ فرش پر ایک چھوٹی سی چٹائی تھی۔ سرکنڈوں کی بنی ہندوستانی چٹائی۔ مجھے حیرت ہوئی اس نے یہ کہاں سے حاصل کی ہو گی۔ وہاں ہندوستانی مندروں میں پائی جانے والی نندی کے اوپر مڑھی ہوئی ایک گھنٹی، ایک دھوپ دان اور

فولڈنگ طرز کی ایک چوکی بھی تھی جو صرف برہمنوں کے پوجا گھروں میں ہوتی تھی۔

"تم مجھ سے زیادہ بڑی برہمن ہو۔" میں نے کہا۔ وہ میری بات سے متفق لگی کیونکہ اس نے کچھ کہا نہیں۔ "تمہارے لیے گرم پانی کی بوتل لے آؤں، گرم پانی کی پوتر بوتل" میں نے التجا کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں" اس نے کہا "میرے جسم کو اپنی ہی حرارت تلاش کرنے دو' سنتپیہ تی سوم دیہہ ....' جیسے تمہارے تے تی رے آ میں کہا گیا ہے۔ اس بیکار چیز کی سیوا کیوں کی جائے ؟" وہ مجھے وہاں دیکھ کر اس قدر بے چین لگ رہی تھی کہ میں وہاں سے چلے جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس نے مجھے روک لیا اور کہنے لگی "میرے پریتم یہ تمہیں ہو جس نے مجھے یہ سب دیا ہے۔" وہ کسی غیر موجود سے بات کرنے کے انداز میں بولی۔ میں نے سوئی گیسے کے بدھ کی جانب دیکھا اور اتنے بڑے دھوکے کے لیے اس سے معافی مانگی۔ میں نے دیکھا اس کا بستر لکڑی کے تختے کا تھا اور اس پر میری ہتھیلی جیسا پتلا گدا تھا۔ وہ میرے دل کی بات سمجھ رہی تھی "تم جانتے ہو میں جو کچھ بھی کرتی ہوں پوری طرح کرتی ہوں۔ میں ایک سادھکا ہوں۔ میرا بدھ دھرم بڑا گمبھیر ہے۔ رام! تم اچھے برہمن ہو۔" اس نے ایسے کہا جیسے وہ دعا کر رہی ہو۔

میں ایک مایوس چھوٹے سے جاندار کی طرح اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ میرا تنفس اندر ہی اندر غیر متوازن ہو گیا تھا۔ تو یہی وہ میڈلین تھی جسے میں نے بنایا تھا اور اپنے دل میں بسایا تھا۔ اگلے روز میری کچھ بے قاعدگیاں جاتی رہیں۔ میں نے اپنا کھانا، بستر اور کپڑے اپنی اصلی ضرورت کے مطابق کم کر دیئے۔ میڈلین میری ان تبدیلیوں کے باعث بہت دکھی ہوئی۔ "تم اس ملک کے نہیں ہو۔ اس کے علاوہ تمہیں اپنے پھیپھڑوں کے بارے میں بھی سوچنا چاہیے۔" اس نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ لیکن اگلی بار جب میں اس کے کمرے میں گیا تو اس نے مجھے اجنبی نہیں سمجھا اور نہ ہی وہ آدمی جو زبردستی اس کے پوجا گھر میں گھس آیا ہو۔ میں اس کے لیے سوپ، دوا وغیرہ لے جانے لگا۔ کبھی کبھی جب میں دروازہ کھٹکھٹاتا تو وہ سرگوشی میں کہتی: "آجاؤ۔" میں دیکھتا اس کے ہاتھ میں منکوں کی مالا ہے۔ یہ مالا اب وہ مجھ سے چھپاتی نہیں تھی۔ میں نے پھر سے مالا جپنا، مالا

پھیرنا تو شروع نہیں کیا لیکن دھیان پوجا زیادہ سنجیدگی سے کرنے لگا۔ سچی بات یہ ہے کہ اس سے میری صحت پہلے سے بہتر ہو گئی۔

لینو کا آنا جانا رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا۔ میں نے سوچا اسے اپنی موزیک کیونسٹ اور بچے کے کارن کچھ دقت ہو رہی ہو گی۔ یا پھر ممکن ہے والاے روشے کا ماحول اس کے لیے تکلیف دہ بنتا جا رہا تھا۔

"ہم کتنے خوش ہیں۔ کیوں رام؟" ایک روز میڈلین نے پوچھا جب میں اس کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ پورے موسم سرما میں اس کی صحت ٹھیک نہیں رہی تھی۔ اس کے باوجود وہ مجھے اپنے کمرے میں آگ نہیں جلانے دیتی تھی۔ وہ کہتی تھی: "یہ عیاشی کیوں؟" میں التجا کیا کرتا تھا وہ اسے ایک برہمن کی طرف سے دی گئی رشوت کے طور پر ہی قبول کر لے۔ اسے اب بھی مزاح کی مدد سے منایا جا سکتا تھا۔ اور وہ مان بھی گئی کہ میں روز شام کو آ کر آگ جلا دیا کروں۔ "آخر برہمن کا سب سے پہلا فرض تو آگ روشن کرنا ہی ہے۔" میں نے رگ وید کے ایک منتر کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔

کبھی کبھی میں جب اس کے کمرے میں جاتا تو وہ اپنے تنگ سے بستر پہ پدم آسن میں بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی ہوتی۔ بعض اوقات وہ مجھ سے پالی کے کسی لفظ کا مطلب پوچھتی لیکن میں تو پالی سرے سے نہیں جانتا تھا۔ اور سنسکرت سے ہمیشہ کام نہیں چلتا تھا۔

اس کا چہرہ کچھ اس طرح روشن تھا جیسے وہ موت کے قریب پہنچ گئی ہو۔ اس کی آنکھوں میں نورِ حق تھا۔ اس نے اپنی خوراک طے شدہ مقدار میں کم کر دی تھی۔ وہ موسم کے مطابق سال بھر کے آٹھ موسموں میں مناسب سبزیاں، ترکاریاں کھاتی تھی۔ وہ ہر تیوہار مناتی۔ گھر کو دِیوں اور منڈلوں سے سجاتی اور ہر جگہ اگر بتیاں جلاتی۔ اس نے گرہن سے ایک رات پہلے برت رکھا۔ گرہن سے پہلے بھی اشنان کیا اور گرہن ختم ہوتے ہی پھر اشنان کیا۔ حالانکہ گرہن بڑے تڑکے لگا تھا۔ مجموعی طور پر وہ زیادہ حلیم ہو گئی۔ لیکن جب کبھی غصے میں آتی تو آگ اُگلنے لگتی۔

ایک تبتی کتاب کو پڑھنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ ہر روز کی ضرورت کے لیے تین سو الفاظ کافی تھے۔ اس لیے ہفتے میں ایک بار سنیچر کے روز وہ مون برت رکھنے لگی۔

"جس طرح ہندوستان کے مقابلے میں مجھے یہاں زیادہ کپڑوں کی ضرورت ہے اسی طرح فرانسیسی زبان کے لیے بھی زیادہ الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے۔" میں نے اسے چڑاتے ہوئے کہا۔ "فرانسیسی زبان میں حرف جار کی تعداد زیادہ ہے... اس لیے میں نے لیزو کی مدد لی اور اس کی محدود لفظیات میں ڈیڑھ سو سے زیادہ مزید الفاظ کا اضافہ کر دیا۔"

اگر سادگی اور سچائی خوشی کی علامات ہیں تو مجھے کہنا چاہیے کہ میڈلین خوش تھی۔ مجھے لیزو نے بتایا اس کے ساتھ کام کرنے والے لوگ اس کی عزت کرتے تھے۔ اور انھوں نے اسے کالج سنڈیکیٹ کا صدر منتخب کر لیا۔ جب بھی انسپکٹر معائنہ کرنے آتے۔ اس کے کام کے بارے میں ہمیشہ بہترین رپورٹ دیتے۔ ہیڈ مسٹرس ہنس کر کہتی: "یہ سیمون ویل کی ہم زاد ہے۔ سیمون ویل کو سدا اس بات کا افسوس رہا کہ وہ ہندوستان کبھی نہیں جا سکی۔ اب اس کی امید پوری ہوئی ہے۔" اس اعزاز کا کچھ حصّہ مجھے بھی مل گیا۔ ان کا خیال تھا میڈلین کے تغیّر کا یہ اعلیٰ محرّک میں ہی تھا۔

کبھی کبھی میڈلین صرف ایک جوڑا معمولی سینڈل پہن کر ہی صبح صبح مختلف پوجا گھروں کی یاترا پر نکل پڑتی۔ اس نے سیاں ادفیلی کے راستے میں ایک جائے پرستش تلاش کر لی تھی جسے وہ "بلیک میڈونا" کہتی اور جو اس کے سوالوں کا جواب دیتی تھی۔ ایک بیچاری عورت کا خاوند انڈو چائنا کے مورچے پر تھا۔ اور پچھلے چھ یا سات ہفتوں سے اس کا کوئی خط نہیں آیا تھا۔ بلیک میڈونا سے میڈلین کے سوال کا جواب مل گیا: "وہ خیریت سے ہے اور بہت جلد سیگون کے مورچے سے گھر لوٹ آئے گا۔ دس روز میں تمہیں اس کا خط مل جائے گا۔" نو دن گزر گئے لیکن کچھ نہیں ہوا۔ صبح کے اپنے پڑھانے کے کام کے بعد میڈلین صحیح صورتِ حال کا پتہ کرنے اور اگر ضرورت ہو تو اس عورت کی ڈھارس بندھانے اس عورت سے ملنے گئی "غلطی میری ہی ہو گی حالانکہ میں اب بھی واضح طور پر دیکھ سکتی ہوں جیسے کلاس روم کے بلیک بورڈ پر لکھے ہوئے یہ الفاظ: "دس دن"۔" اس شام میڈلین اور میں ایک ساتھ سیر کے لیے گئے۔ اور جب ہم لوٹ کر آئے تو وہی نوجوان عورت دروازے پر ہمارا

انتظار کر رہی تھی۔ اس کا تین برس کا سب سے چھوٹا بچہ" اس کی گود میں تھا اور اس کا چہرہ احساسِ ممنویت سے جگمگا رہا تھا۔ بلاشبہ خط آیا گیا تھا اور ژاں کا رپ مچھلی مچھلی کی طرح خوش تھی۔ وہ تحفے کے طور پر ہمارے لیے کچھ سنگترے لے کر آئی تھی میڈلین نے انھیں چھوا تک نہیں۔ کہنے لگی "میں کوئی پادری نہیں ہوں۔ میں بھی ایک دکھیاری عورت ہوں۔" "مادام یہ تمہاری دعاؤں کا اثر ہے۔ تمہاری دعاؤں کا میری دعاؤں کا نہیں۔" ہم اس کو اندر لے آئے، اور کافی پلائی کیونکہ اس دن بہت سردی تھی۔

ایسے بھی دن ہوتے تھے جب میڈلین کندھے پر اپنا تھیلا ٹانگ کر میرے لیے ایک نوٹ چھوڑ جاتی تھی: میں پہاڑوں میں جا رہی ہوں۔ پروانس میں پہاڑوں اور پوجا گھروں کی کمی نہیں ہے۔ وہ لگاتار کئی کئی کلومیٹر چلتی رہتی اور رات دیر سے گھر پہنچتی۔ ان سیاحتوں میں اس نے کئی غاروں اور پرانے بھولے بسرے پوجا گھروں کا پتہ لگایا۔ اسے یقین تھا زیادہ تر کنواریاں، پرانے رومن دیوتا یا دیویاں تھیں۔ اکثر اس نے کسی مینار کی کرسی کو کھرچ کر متر، برہسپتی یا بدھ کا نام کھوجنے کی کوشش کی لیکن میرا خیال ہے اس سلسلے میں اسے کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اس نے ان کے چرنوں میں پھول چڑھائے اور شاید بودھ گیت گائے۔ اس کے نزدیک جو کچھ بھی کیتھولک نہیں تھا، سچا اور پوتّر تھا۔ وہ کہتی تھی اب یہ کافی حد تک ثابت ہو چکا ہے کہ ڈرواڈ بدھ مت سے وابستہ تھے۔ یہ سب پوجا گھر بنیادی طور پر بدھ مت سے تعلق رکھتے ہیں۔ سمادھی سے اسے حیرت انگیز اشارے ملتے تھے۔ کبھی کبھی وہ مجھے بھی اپنی روحانی سیاحتوں، پر جیسا کہ میں انھیں کہتا تھا لے جاتی" تھی۔ اگر ہم اس طرف جائیں جس سمت میں یہ گھاس کا تنکا خود بخود جھک کر گر گیا ہے"۔ ایک بار وہ کہنے لگی۔ "اور ہم پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ جائیں تو ہمیں ایک پرانی پون چکی کے کھنڈر ملیں گے۔ میں اسے ویسے ہی واضح طور پر دیکھ سکتی ہوں جیسے ایک بلّی رات کے اندھیرے میں دیکھ سکتی ہے۔ پھر ہمیں بائیں جانب مڑنا ہوگا اور بیس گز کا فاصلہ طے کرکے وہاں کی جگہ کو کھودنا ہوگا۔ ہمیں ایک قدیم پتھر ملے گا۔ مجھے یقین ہے یہ ضرور کوئی پوجا گھر رہا ہوگا۔"

"ہم پہاڑی پر گئے۔ یہ سیاں یوواں کے قریب تھی۔ یون چکی ٹھیک وہاں تھی۔ ہم نے بیس گز کی دوری پر کھدائی کی لیکن ملا کچھ نہیں۔ مایوس ہو کر اس نے چاروں طرف تلاش کی۔ ٹھیک اسی طرح جیسے پہاڑ پر چڑھنے والے لوگ کرتے ہیں جب وہ برف کے تودوں کی سمت کے بارے میں سوچتے ہیں۔ اس نے اپنے شومیاں دکرستال کی تلاش کے لیے گہری سانسیں لیں اور بولی "اب مجھے پتہ لگ گیا ہے۔ یہ یہاں چشمے پر ہونا چاہیے"

جب ہم نے پتھر کو دھو کر تھوڑا سا کھودا تو وہاں واقعی ایک کھنڈر موجود تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا وہ رومن تھا، یا یونانی یا عیسائیت سے متعلق۔ یہ ایک چھوٹا سا گول چپٹا پتھر تھا۔ سنگ مرمر کا سا اور یقیناً اس پر کسی زمانے میں کچھ حروف کندہ کیے گئے ہوں گے لیکن میں یا میڈلین انھیں پڑھ نہیں سکے۔

اس نے چشمے میں پھول ڈالنے شروع کر دیئے۔ "مجھے یقین ہے کہ اس سے شفا ملے گی"۔ اس نے کہا "ہمیں مادام فے لے اِنڈ ریر پر اسے آزمانا چاہیے۔ تمہیں یاد ہے جب ان کے بیٹے کو دورہ پڑا تھا تو تم جانتے ہو میں نے اسے وہ کپڑا دیا تھا جو میں آٹھ روز تک پوجا کے دوران اپنے ہاتھ میں پکڑے رہی تھی۔ مادام فے لے اِنڈریر نے مجھے بتایا کہ بچہ کئی مہینے بعد پہلی بار اُٹھ کر بیٹھا تھا۔" یہ بات ٹھیک ہو گی کیونکہ میڈلین نے مجھے ان سے ملوایا تھا۔ بچہ پورے ہوش و حواس میں تھا۔ اور اس نے بڑے پیار سے ہماری طرف دیکھا تھا۔ ہم اس کے لیے بادام۔ نمکین بادام۔۔ لے گئے تھے اور اس کی ماں نے بڑی پھرتی سے پیکٹ کھول کر دو بادام میڈلین کو اور ایک مجھے کھانے کے لیے دیئے تھے۔

"ہم تمہاری فے لے اِنڈیر کو یقیناً تمہارے اس رومن چشمے میں اشنان کرائیں گے۔" میں نے ہنس کر کہا "آخر کیوں نہیں؟"

نہیں۔ میں میڈلین کی قوت پر شبہ نہیں کر سکتا تھا لیکن وہ محسوس کرتی تھی کہ سب میری وجہ سے ممکن ہوا تھا۔ "میں تو لا مذہب تھی"۔ وہ کہتی تھی۔ "اور چرچ سے ڈرتی تھی۔ یہ تم اور تمہاری برہمنیت تھی جس نے مجھے دیکھنے کے لیے آنکھیں عطا کیں"۔

"بدھ مت دیکھنے کے لیے" میں نے احتجاجاً کہا اور پھر سے ہنس پڑا۔

"دیکھو شام کتنی سہانی ہے" اس نے گھاس پر بیٹھتے ہوئے کہا" رام! ہم ہاتھی اور ابیل سے کتنا آگے نکل آئے ہیں۔ تم میرے انتہائی عزیز دوست رہے ہو۔ وعدہ کرو تم ہمیشہ خوش رہو گے!"

"میں وعدہ کرتا ہوں" میں نے جواب دیا میں کیسا احمق دکھائی دے رہا ہوں گا۔ کبھی کبھی وہ معجزے بھی دیکھتی تھی۔ پھول اس سے باتیں کرنے لگے تھے۔ ماگریٹ ڈیزی اور ہارس ٹیل۔ سبھی! ایک روز بلیک میڈونا کی یاترا سے پہاڑی سے نیچے اترتے ہوئے اس نے بڑی ملائمیت سے التجا کی کہ بین زی کا ننھا سا پودا جو اسے سڑک پر کچلا پڑا ملا تھا، برباد نہیں ہونا چاہیے۔

"یہ کسی وحشی کا کام ہے" وہ بڑبڑائی۔ "یہ دنیا ایسے ہی جاہلوں سے بھری پڑی ہے۔ یہ لوگ ایسے بے رحم ہیں کہ ان معصوم پھولوں کو بھی توڑ لیتے ہیں" چاندنی میں پھول کو سہلاتے ہوئے اس نے کہا۔" اور پھر اسے پھینک کر ایسے چل دیتے ہیں۔ جیسے یہ دنیا صرف انسانوں کے لیے بنی ہے۔ اگر کوئی ان کے بچّوں کے ساتھ ایسا سلوک کرے تو انھیں پتہ چلے۔ اور یہ یورپ ہے" اس نے باغ کے بنچ پر بیٹھتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ "جس نے دو جنگوں کی ہولناکی اور ہٹلر کے وہ کیمپ دیکھے ہیں جہاں لوگوں کو زندہ جلایا جاتا تھا۔ ہے بھگوان! ہے پرماتما!" اپنی آنکھوں میں آنسو لیے اس نے چھوٹا سا ایک گڑھا کھودا اور نیلے رنگ کے کھلی آنکھوں والے بین زی کے پھول اور ننھے اور دو پتیوں کو زمین پر رکھ دیا۔" رام" مجھ سے التجا کرنے لگی "مجھے تھوڑا سا پانی لا دو" میں کچن سے پانی کا ایک جگ لے آیا۔" رام، مہربانی کر کے اسے اپنے ہاتھ سے چھو دو تمہارے ہاتھ پوتّر ہیں۔"

"واقعی پوتّر ہیں!" میں نے قہقہہ لگایا "برہمنی ظلم کے باعث پوتّر"

"لیکن یہ برہمنیت ہی ہے۔ میں جانتی ہوں تمہارے اندر قوت ہے!"

"قوت ہے یا نہیں۔ میری ننھی میڈلین اسے تجھے دے دو" میں نے کہا اور پودے کو چھو کر بے دلی سے اسے لوٹا دیا۔

اس نے 'ہوں۔ ہوں'، اوم ہم اور منی پدمے۔ ہوں' کا بار بار جاپ کرتے ہوئے پودے کو دھرتی میں لگا دیا۔ پہلے اس نے اپنے فراک پر رکھ کر تنے اور پتیوں کو سیدھا کیا اور پھر آنکھیں بند کر کے اس نے بڑی نرمی اور احتیاط سے ٹوٹے ہوئے چھوٹے سے تنے کو زمین میں گاڑ دیا۔ "آج شرون کے چاند کی نویں تاریخ ہے"۔ وہ بولی "اور یہ بڑا شبھ دن ہے"۔

میں نے پین زی کو پانی سے سینچا۔ ہم اسے بدھ کا پودا کہتے تھے اور رات کو سونے سے پہلے میڈلین باغ میں جاکر یہ دیکھا کرتی کہ چاندنی میں بدھ کا یہ پودا پنپ رہا ہے یا نہیں۔ پین زی کا یہ پھول بہر حال خوش دکھائی دیتا تھا۔ بحرہ روم کی چاندنی میں کون خوش نہیں ہوگا۔ اور پھر وہ جس کی ایسی پیار بھری دیکھ بھال ہو رہی ہو۔ سویرے اٹھ کر میڈلین دیکھتی تو وہ ٹھیک وہاں ہوتا۔ شاندار دھوپ میں اس کا چہرہ مسکراتا رہا ہوتا۔

میڈلین نے بچّے کی طرح دعا کی۔ "ایسی طرح اچھے بنے رہو" اور پھر اسے پانی دیا۔ ہم نے اس کے ارد گرد نالی سی بنا دی اور جتنی بار ہو سکا اسے پانی دیتے رہے۔ میڈلین اپنے کمرے میں گئی اور بدھ کا پوتر جل لے کر آئی۔ "یہ سب سے اچھا گنگا جل ہے"۔ اس اعلان کیا۔ پین زی کا یہ پھول چمکیلے رنگ کا تھا اور ہم اسے دیکھ کر خوش تھے۔ مجھے بھی اس سے لگاؤ ہو گیا۔ آپ جو کچھ بھی تخلیق کرتے ہیں اس سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ دنیا بھی آپ ہی تخلیق کرتے ہیں اور پھر اس کے ساتھ آپ کا لگاؤ ہو جاتا ہے۔

"میڈلین" میں نے کہا۔ "دیکھو یہ اب جمنے لگا ہے"۔

"بے شک یہ ٹھیک ہو رہا ہے۔ اور ہو بھی کیوں نا! اگر ہسپتال میں انسانوں کے زخم ٹھیک ہو سکتے ہیں تو ایک پودا، ایک پیڑ۔ یہ کیوں نہیں ٹھیک ہو سکتے؟"

"تم نے جگدیش چندر بوس اور روتے ہوئے پیڑ پودوں اور ان پر ان کے تجربات کے بارے میں سنا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بے شک۔ یہ جاننے کے لیے کہ پیڑ پودے تکلیف میں ہیں تمہیں برقی مقناطیسی آلے کی

ضرورت ہوتی ہے۔ پھر بھی ایک ہندوستانی نے ہی یہ ثابت کیا کہ پودوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے۔"

"اور پھر ایک بنگالی نے" میں نے کہا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟"

"بنگالی بڑے خوبصورت، شیریں، شاعرانہ فراخ دل اور ہنس مکھ لوگ ہیں۔"

"سننے میں یہ بہت اچھا لگتا ہے" اس نے کہا۔

"ان کے لیے یہ سارا سنسار ہی برندابن ہے۔ جس میں مور ہیں، ندیاں ہیں، کنول ہیں۔ ہاتھوں میں مالائیں لیے ہوئے رقص کرتے ہوئے گوپ۔ گوپیاں ہیں اور جھکی ہوئی شاخوں والے مغموم پیڑوں کی نغمگی کا حسن ہے۔"

"اور پھر؟"

"اور پھر شانتی نکیتن اور رابندر ناتھ اور وہ سب ہے۔ دنیا کو ہمیں خوبصورت بنانا ہے۔ وہ اطالوی لوگوں کی طرح ہیں۔ دنیا کو بہر حال سورگ جیسی بنانا ہے۔"

"اور تم دکشن بھارتی۔ جنوبی ہندوستان کے رہنے والے"۔

"ہمارا گھر شیو کی شمشان بھومی میں ہے۔ ہم اپنی لمحاتی موت پر رقص کرتے ہیں۔ سورگ کے لیے ہمارے پاس وقت ہی نہیں ہے۔ اور پھر سورگ کے لیے" میں نے کہا۔

"وقت اور جگہ کی ضرورت ہے۔"

"پین زی کھلتی ہے۔ جگہ اور وقت چاہیے اسے۔" اس نے یہ کہہ کر اس موضوع پر اپنی بات ختم کر دی۔

ہم پودے کو سینچتے رہے۔ وہ ایسی تیزی سے بڑھ گیا کہ ہم بذات خود زندگی کی تعریف کرنے لگے۔ نہ صرف پرانی پتیاں اُٹھ کھڑی ہوئیں بلکہ کچھ اور نئی پتیاں بھی نکل آئیں۔ میڈلین کی پوجا کی چوکی پر ایک خاص برتن رکھا ہوا تھا۔ چاندی کا وہ گلاس جو میرے اپ نین سنسکار کے وقت سے میرے پاس تھا اور جسے میں دادا رمنا کی یادگار اور عقیدت کے طور پر اپنے ساتھ یورپ لے آیا تھا۔ بعد میں میں نے یہ گلاس ہری ہر پورہ

نے خاندانی تحفے کے طور پر میڈلین کو دے دیا۔ دادا رمنا کے اسی گلاس سے پین زی کو سینچا جاتا تھا اور پین زی کا یہ پھول ہم وتی اور میسور کے پربتوں کو کم و بیش یاد کرتا محسوس ہوتا تھا۔ پین زی کے پودے میں کمودنی جتنے بڑے نئے نئے پھول آرہے تھے۔ ہم نے ولا بیلموں سے مالی بلایا۔ وہ حیران ہو کر کہنے لگا۔" بڑی حیرانی کی بات ہے مادام۔ یہ پین زی صحیح سلامت ہے"۔ میڈلین بولی" رام اگر تم آدھی رات کو یہاں کھڑے ہو جاؤ تو میں تم سے وعدہ کرتی ہوں۔ تمہیں گھنٹی کی آواز سنائی دے گی۔ ٹن ٹن کرتی گھنٹی کی آواز" یقین کرو میرا تجربہ ہے کہ میرے اردگرد کچھ گھومتا رہتا ہے۔ شبیہیں، آنکھیں موجودگیاں، بعض اوقات میں مڑ کر انھیں دیکھنے کی کوشش کرتی ہوں لیکن وہ ہمیشہ وہاں ہوتی ہیں جہاں میں انھیں دیکھ نہیں سکتی۔ جو کچھ بھی ہو مجھے کوئی شک نہیں کہ وہ وہاں موجود تھیں۔

اب میڈلین نے زخمی سنڈیوں کی تلاش شروع کر دی "اوہ" وہ بولی "کاریں کیسے ان بیچارے آہستہ رو کنکھجوروں کو کچل کر نکل جاتی ہیں"۔ انھیں ایک پیڑ سے دوسرے پیڑ تک جانا ہی چاہیے۔ اس طرح رینگنا ان جانداروں کی فطرت ہے انھیں چیڑھ کے ایک پیڑ سے دوسرے پیڑ تک بہر حال جانا ہی چاہیے۔ اگر انسان نے سڑک بنائی ہے اور پہاڑیوں کو کاٹ کر راستے تیار کیے ہیں۔ اور بیٹری یا اور اندرونی تمازت انگیزی سے چلنے والی تیز رفتار گاڑیاں بنائی ہیں تو یہ کوئی جواز نہیں کہ یہ بیچارے جانور کچلے جائیں۔ بیچارے بے بس جانور" یہ کہتے ہوئے وہ ان روئیں دار خارش پیدا کرنے والے جانداروں کو اپنی گود میں یا بازو میں لے لیتی اور انھیں سڑک کے اس پار لے جا کر چیڑھ کے کسی پیڑ پر چھوڑ دیتی۔ جس دن اس کا کوئی کلاس نہیں ہوتا تھا وہ بڑی سڑک لوبے روں پر چلی جاتی اور کسی ایسے گندے سے چیڑھ کے ایک پیڑ کے پاس بیٹھی رہتی جو سنڈیوں کے لیے مخصوص تھا۔

"سنڈیاں چونکہ پیڑ کو کھا جاتی ہیں اس لیے انھیں بہر حال مار دینا چاہیے" میں نے میڈلین کو چڑاتے ہوئے کہا۔

"اوہ نہیں ہمیں دونوں کو بچانا چاہیے" اور اس لیے اس نے ایک پیڑ کے نیچے

ایک بڑا سا پتھر رکھ دیا۔ اور وہ گھنٹوں اس پر دو زانو کے انداز میں بیٹھی رہتی اور اپنے منتروں کا پاٹھ کرتی رہتی یا پھر کوئی کتاب اٹھا لیتی۔ ترجیحاً پالی کی کوئی کتاب اور اسے پڑھتی رہتی۔ اس طرح اس نے ان اسکولی بچّوں سے دوستی کر لی جو ہر بر ہسپت وار کو ادھر سے گزرتے تھے۔ لیکن ایک بار جب وہ اسٹار لنگز کا گھونسلہ دیکھنے ایک پیڑ پر چڑھ گئے تو میڈلین بڑے زور سے چلائی۔ واقعی! اور پادری سے کہا کہ وہ پرماتما کے سب بچّوں کا خیال رکھا کریں۔ صرف انسان کے بچّوں کا نہیں۔ اس نے سینٹ فرانسس آف اسی سی کی مثال دے کر بچّوں کو منوا لیا۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ میڈلین نے اپنے اندر قوتیں پیدا کر لی تھیں۔ غیر معمولی قوتیں۔ اس نے کسی طرح لیزو کے ذریعے تبتی ران کی ہڈی کا ننگ لنگ حاصل کر لی تھی اور اس کے ساتھ گھنٹیاں باندھ لی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں جو بلا شبہ تبت سے ہی آئی تھیں۔ وہ اسے ہلانے، آواز دیتے اور منہ ہی منہ میں اپنے آپ سے پرارتھنا کے الفاظ بڑبڑانے لگی تھی۔ ہم۔ ہم۔ فٹ"۔ وہ سورج کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگی تھی اور وہ آسمان کی لامحدودیت پر دھیان مرکوز کرنے لگی تھی۔ "ماضی کے بارے میں مت سوچو۔ مستقبل کے بارے میں مت سوچو" وہ ناگ ارجن کا مقولہ دہراتی "اور اپنے من کو اس کی پُرسکون حالت میں رکھو"۔

وہ ایک سرخ گیند پر بھی دھیان لگاتی تھی۔ ایک ایسی گیند جو آپ بچّوں کے کھیلنے کے لیے کسی بھی بڑے اسٹور سے خرید سکتے ہیں۔ پھر یکایک وہ ایک چھڑی پر اپنا دھیان لگا لیتی۔ گرنتھوں میں یہی لکھا تھا۔ اس نے پوتر چیڑھ کے پیڑ سے۔ سنڈیوں والے اس پیڑ سے ایک شاخ توڑی۔ اس کی چھڑی بنائی۔ اسے رگڑ رگڑ کر چمکایا۔ اور دھویا اور اسے گیروے رنگ سے رنگ دیا۔ اور پھر وہ اسے اپنے کمرے کے جنوب مغربی کنارے میں رکھ کر اپنا جاپ کرنے لگی۔ اس سے اس کی نگاہوں میں سبز اور سیّال حالت قرار کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس کی مسکراہٹ میں نرمی اور ملائمت آ گئی اور ایسا لگا اس کا غصّہ دن بہ دن کم ہوتا جا رہا ہے۔ پھر جب وہ نئے چاند یا گرہن کا برت پورا کر لیتی

تو اپنے پوتر کیے ہوئے پانی کو ہمیشہ دادا رمنّا کے چاندی کے گلاس سے چیڑھ کے پوتر پیڑ پر پھینک دیتی اور پھر چیڑھ کے پیڑ پر نئی ہری بھری سوئیوں جیسی تیز بے قرار کونپلیں نکل آئیں۔

بدھ نے اپنے پچھلے کسی جنم میں نوالے کے طور پر اپنے آپ کو شیر کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ بودھی استو چیڑھ کے پیڑ کی طرح ہے۔ میں نے میڈلین کو بتایا۔ اس سے اسے بڑا اطمینان ہوا۔ اس لیے ہم چیڑھ کے اس پیڑ کو بودھی استو چیڑھ کا پیڑ کہنے لگے۔ سنڈیاں شاید کبھی اتنی خوش نہیں ہوئی ہوں گی۔ پرندوں کو، خاص طور پر کوؤں، ابابیلوں اور فلیمنگو پنچھیوں کو پیڑ بہت اچھا لگتا تھا۔ اول تو سنڈیوں کے کارن اور پھر اس لیے کہ میڈلین انھیں، مونگ پھلی، چاول اور گیہوں وغیرہ کھلاتی تھی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ کس طرح جین چیونٹیوں کو شکر کھلاتے ہیں تو وہ بھی چھپ چھپ کر چیونٹیوں کو چینی ڈالنے لگی۔ جب میں لائبریری سے گھر لوٹتا اور آتے ہی میڈلین کو گھر میں نہ پاتا تو وہ مجھے یقین ہوتا تھا کہ وہ اپنے وجر آسن میں ہوگی (میں ایسا ہی کہا کرتا تھا) اور اپنی کتاب پڑھ رہی ہوگی۔ کبھی کبھی وہ موں سیانت وِک ہو یار کی خالی وادی کی گہرائی میں جھانکتی۔ وہ یہ محسوس کرتی لگتی کہ دنیا حقیقی ہے۔

لیکن اکثر وہ بڑی مایوس لگتی تھی۔ یہ اس کی آنکھوں سے ہی عیاں تھا۔ کبھی کبھی اس کی آنکھیں زرد ہو جاتیں اور وہ کھوئی کھوئی، رُوکھی رُوکھی سی ہو جاتی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا۔ وہ کھانا، کمرہ، کتابیں۔ سب چیزوں سے نفرت کرنے لگی ہے۔ وہ کہتی: "رام میرے ساتھ صبر سے پیش آؤ۔ یہ صرف عورت کے مزاج کا ماہوار تقاضا ہے۔" ایسے واقعات کے سلسلے میں اس کا زائچہ خاصا باقاعدہ سا تھا۔ مجھے شک تھا کہ مابعد الطبیعاتی اعتقادات کے مطابق انسانی حیاتیات میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہتی تھیں۔ ایسا ممکن ہے کیوں نہیں؟"

یوگ آسن سے اسے بڑا فائدہ ہوا۔ اس نے یوگ پر سوامی پرما آنند کی لکھی ہوئی ایک کتاب خرید لی تھی اور بڑی مہارت سے ٹنڈی اور ہنس آسن کرنے لگی تھی۔ اس نے شیر کی

مُدرا میں دائیں کروٹ سونے کی بدھ دھرم کی طے کردہ قسم کھائی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ وہ بڑے آرام سے سوتی تھی، اور صرف پانچ گھنٹے کی نیند اس کے لیے کافی تھی۔ اس کے کچھ طالب علموں نے مجھے بتایا کہ پڑھائی کا معیار بھی بڑا شاندار ہو گیا تھا۔ ہیڈ مسٹرس اس سے صلاح مشورہ کرنے لگی تھی۔ اس کے ساتھی خانہ داری کے معاملات میں اس کی مدد لینے کے لیے آتے تھے۔ صبح کی دھیان سمادھی میں جو بھی تجربہ اسے ہوتا تھا اس کے بارے میں وہ ان لوگوں کو بتاتی تھی۔ جب شادی بیاہ یا کسی مالی مشکل جیسا کوئی کٹھن مسئلہ ہوتا تھا تو میڈلین بہت سے منڈل بنا کر ان کے بیچ بیٹھ جاتی تھی۔ جیسے ہندوستان میں برہم مہورت میں لوگ جاگ جاتے ہیں ویسے ہی وہ بھی تڑکے تین بجے اٹھ جاتی تھی اور آٹھ بجے تک سمادھی میں بیٹھا کرتی تھی۔

ایک دن پین زی کا پودا سوکھ گیا۔ "کیونکہ اٹھارہ عناصر کی بنی ہوئی یہ زندہ چیز کی طرح اسے بھی بہرحال مرنا تھا" میڈلین نے کہا۔ اور پھر رسموں کے مطابق اس کا آخری سنسکار کیا گیا۔ ہم نے اسے نہلا کر اسے گھاس کے بستر پر لٹا دیا۔ یہ دیکھ کر ہمیں حیرت ہوئی کہ سترہ دن سرسبز رہنے کے باوجود اس کی جڑ نہیں بنی تھی۔ "اوم۔ اوم۔ اوم۔ تم۔ تم۔ تم۔ ہری۔ ہری۔ ہری۔ ہا۔ ہا۔ ہا" کے ساتھ ہم نے اس کا داہ سنسکار کیا۔ اسے آگ کی نذر کر دیا۔ اور اس راکھ بودھی استو پیڑ کے قدموں میں دفن کر دی۔

کئی روز تک جب میڈلین برت رکھ چکی تو اسے بلیک میڈونا نے درشن دیئے۔ دیوی نے دواؤں۔ اچھے اور برے دنوں۔ صحیح اور غلط لوگوں کے بارے میں خاص ہدایات دیں اور جب کبھی مجھے بخار ہو جاتا میڈلین اس کے ساتھ پرارتھنا کرتی۔ "رام" وہ کہتی "تمہیں اچھا ہو ہی جانا چاہیے۔" ایک روز اچانک اس نے اعلان کیا۔ "میں بدھ اَدلوکتے شور کا اکتالیس دن کا برت رکھ رہی ہوں۔ مجھ پر یہ انکشاف ہوا ہے کہ میں یقیناً تمہیں صحتیاب کر سکتی ہوں۔" اور اس نے اشون کے مہینے کی ساتویں تاریخ کو صبح سویرے سے جب چاندنی میں اوس کے قطرے چمک رہے تھے اپنا برت اور پرارتھنا شروع کر دی۔

وہ اکتالیس دن بڑے اثر انگیز اور اہم تھے۔ میں میڈلین کو تڑکے دو بجے (اس نے اپنے لیے نئی الارم گھڑی خرید لی تھی)۔ اُٹھ کر، نہا دھو کر۔ اپنے مخصوص شا ارن تیز لہجے میں منتر پاٹھ کرتے اور گھر کی آٹھوں دشاؤں میں پانی چھڑک کر ہر ایک دیوتا کا نام لیتے اور اس کا گن گان اس کی تعریف و ستائش کرتے ہوئے سنا کرتا تھا۔ اس کے بعد وہ میرے دروازے کے پاس دیر تک بڑی دیر تک کھڑی رہتی اور اس کے بعد اچانک اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ مجھے اس کے منتر پاٹھ کی آواز مزید گہری، سنجیدہ اور بلند ہوتی ہوئی سنائی دیتی جیسے اس کے منتر دنیا کے ساتھ، رات کے ساتھ ہم آہنگ ہونا چاہتے تھے۔ پھر منتر پاٹھ تیز تیز اور زیادہ متکلّم اور گمبھیر ہوتا جاتا۔ یہاں تک کہ تڑکے چار بجے تک سارا گھر، دیواروں سے لے کر اوپر چھت سے نیچے رسوئی تک ایک ہی آواز سے گونجنے لگتا۔ ایسا محسوس ہوتا کہ پیڑ تن کر کھڑے ہیں۔ پرندے سوتے ہوئے بھی جاگ رہے ہیں۔ سڑکیں اٹھ کر آسمان کو چھو رہی ہیں۔ جالوز خلا میں جھانک رہے ہیں۔ ایکس کی پوری وادی اور اس سے پرے کے دیر تک جگمگانے والی روشنیوں والے پہاڑ صرف ایک ہی خیال، ایک ہی جذبے، ایک ہی تجربے کی تجسیم میں ڈھل گئے ہیں۔ اور پھر زیر مداخلت سکوت کے وقفے کے بعد الفاظ تیز تر تواتر سے رواں ہو جاتے۔ منتر زیادہ سہانے ہو جاتے۔ سویرے کے سواگت کے لیے پھول کھل اٹھتے۔ بحرہ روم کے ساحل گنگنانے لگتے۔ پرندے چہچہانے لگتے۔ بچّے جاگ جاتے اور شور مچانے لگتے۔ اور مرد کسی بچّے، کسی سُکھی باپ، نئی دھرتی پر ایک نئے جنم کے جذبے کے ساتھ اپنے کام کے لیے نکل پڑتے۔ صبح کی ٹرین سویرے اپنی مرضی کے مطابق شور مچا سکتی تھی یا ٹرام کارلیس میرابو میں مڑتے ہوئے تیز آواز کر سکتی تھی۔ دنیا بدل رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا۔ کنول کے پھول کی آگ جیسے دل سے کچھ گلابی سنہرا نمودار ہوگا اور رام پھر سے مکمل ہو جائے گا۔

"آہ کہتے ہیں اب سب گھروں میں اس تیہوار کی خوشی محسوس کی جا رہی ہے" مادام تراں جب کام کرنے آئی تو اس نے بتایا۔ وہ میڈلین کی سادھنا کے بارے میں

کچھ نہیں جانتی تھی۔ لیکن میں پوچھتا ہوں جب دیوی دیوتا آس پاس اور پروانس میں ہوں تو کیا کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت ہوتی ہے؟"

اور دیوی دیوتا واقعی آس پاس تھے۔ اس سے کون انکار کر سکتا تھا عجیب و غریب مترنم آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ سریلے سازوں کی آوازوں کے بجائے نقارے پر پڑنے والی تھاپ سے ملتی جلتی آوازیں۔ اور پھر ان میں بھی سارے سر نہیں تھے۔ صرف تین یا چار تھے۔ دو۔ رے۔ فا۔ تی یا پھر صرف دو۔ رے۔ تی۔ جیسے ہم پہلے سے زیادہ پراسرار، نرم و نازک اور لطیف ہو گئے تھے۔ ہم زیادہ دیر تک ایک دوسرے سے کھیلتے تھے۔ میڈلین اور میں۔ اور یہ کہنے کے لیے مجھے معاف کر دیجیے اور میری بات کا یقین کیجیے۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا تھا کہ کسی اور کی موجودگی بھی ہمارے اس کھیل میں شامل ہے۔ لال گیند اِدھر اُدھر اُچھلتی تھی۔ ایسے رک جاتی تھی جیسے کسی نے اسے ساکت کر دیا ہو۔ خیال آتا تھا زمین تو گردش میں ہے لیکن گیند حرکت میں نہیں ہے۔ مکاں تو حرکت میں ہے زماں نہیں۔ پھر آواز خود مجسم ہو کر ایک جگہ کھڑی ہو جاتی تھی اور گھومتی تھی۔ اور اس میں سے طوطے جیسے سرخ اور سبز رنگ یا پھر ہمالیہ کی پہاڑیوں جیسے نیلے رنگ نکلنے لگتے تھے اور چاروں طرف لپکتے ہوئے شعلوں کی زبانیں دکھائی دینے لگتی تھیں۔ کبھی کبھی مجھے جنوبی آفتاب کی گرمی میں ایکس کی ٹرام گاڑیوں کی کھردری آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ لیکن یہ شعلے پھر بھی لپکتے رہے۔ سبز اور سرخ قوسیں بناتے ہوئے۔ اپنی ہی جانب مڑتے ہوئے سیدھے چھت تک جا پہنچے۔

میڈلین نے میری طرف دیکھا۔ وہ بہت خوش تھی۔ "سنو سنو یہی وہ سنگت ہے۔"

نقارے کی آواز واقعی بہت زوردار تھی۔ جونہی ایک تھاپ رکتی دوسری زیادہ پرزور تھاپ اُبھرتی جیسے پہاڑ، ندیاں، سمندر، سڑکیں اور انسان تخلیق کر رہی ہو۔ مجھے ریڑھ کی ہڈی کے کنارے سے ایک جھرجھری سی تھر تھرا کر اُبھرتی ہوئی محسوس ہوئی اور میں بھونچکا کھڑا رہ گیا۔ "میڈلین" میں نے آواز دی۔ لیکن وہ تو فرش پر بیٹھی تھی۔ بڑی عقیدت سے آنکھ بند کیے۔ میں اپنے کمرے کی مانوس فضا میں لوٹ آیا۔ بے شک، مجھے

کچھ نہیں ہوا تھا اس بیچ سب چیزیں اپنی اپنی جگہ پر لگتی تھیں لیکن ہر چیز۔ دھلی، پونچھی اور صاف ستھری تھی۔ میں ڈر گیا۔

میڈلین خوف سے آزاد تھی "میں محض شاران تیز نہیں ہوں۔ میں سیان تیز ابھی ہوں اور ہم اوقیانوسی جنگلوں کے لوگ ڈرتے نہیں ہیں"۔

اس کے بال گھنگھریالے ہوگئے۔ جلد کچھ سوکھ گئی۔ اس کے جسم سے کچھ ایسی باس آنے لگی جسے اگر شائستہ زبان میں بیان کریں تو کچھ ایسی خوشگوار نہیں تھی۔ مجھے محسوس ہوتا تھا یہ سڑتے ہوئے پھولوں کی باس تھی۔ مرے ہوئے پرندوں کے مردہ جسموں کی باس۔ متعفن ہواؤں کی، جلے ہوئے ناخنوں، بالوں اور گیلی نمی بھری جانوروں کی کھالوں کی بدبو۔ شام کو جب ہم گھر لوٹ رہے ہوتے تو کبھی کبھی مجھے آوازیں، سرگوشیاں اور نغم۔ فٹ اکے دھماکے سنائی دینے لگتے۔ ایک بار میں نے اپنے آگے آگے ایک آدمی کو چلتے ہوئے دیکھا۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ سا تھا۔ مہاتما گاندھی جیسا لگتا تھا لیکن قد میں ان سے لمبا۔ بہت دراز قد اور جھکا ہوا۔ میرے آگے تیز تیز اور بڑے پرجوش انداز میں چل رہا تھا۔ میڈلین اس شبیہہ سے بہت خوش ہوئی۔ یہ دھرم گرنتھوں کے عین مطابق تھا۔ "بائیسویں دن تم اپنے آگے چلتے ہوئے ایک آدمی کی شبیہہ دیکھو گے، ڈرنا نہیں یہ جسم ہی ہے اپنے قطعی مادی روپ میں"۔ واقعی یہ صحیح تھا۔ میڈلین نے جب مجھے متعلقہ متن دکھایا تو میں حیران رہ گیا۔ جی ہاں یہ صحیح تھا اور واقعی صحیح تھا۔

پرندے ہمارے ساتھ بہت گھل مل گئے۔ میڈلین سیر کرتے ہوئے جب ان کے آگے کھانے کے لیے دانہ ڈالتی تو ان میں سے کچھ چڑیاں اُڑ کر اس کے کندھوں پر بیٹھ جاتی تھیں۔ ایک بار ایک پتھر پر بیٹھی جاپ کرتے کرتے وہ بیہوش ہوگئی۔ چاند نکلنے تک میں اس کے پاس بیٹھا صبر سے انتظار کرتا رہا۔

"رام! میں کسی دوسری دنیا میں تھی۔ اور کیسی خوبصورت دنیا تھی وہ۔ رام انسان اس دنیا میں کیوں لوٹ آتا ہے"۔

"میڈلین، یہ ہو یا وہ ہو، بہرحال دونوں دنیائیں ہی تو ہیں"۔ میں نے جواب دیا۔

جس سے گفتگو آگے نہیں بڑھ سکی۔

عجیب بات ہوئی۔ اپنی زبان، آواز، حجم اور خصوصیات کے اعتبار سے انتہائی حیرت انگیز روحیں آتیں۔ کچھ دھونے، صاف کرنے، ناک سے سڑ سڑ کرنے اور ناچنے کے لیے، کچھ چیخ چلانے کا سا شور مچاتیں اور کچھ ایسے بات کرتیں جیسے ان کی آوازیں ہڈیوں کی گہرائیوں سے آرہی ہوں۔ کچھ فرانسیسی میں باتیں کرتیں، کچھ دوسری ہندی یا تبتی میں، لیکن سب کی سب مفلس اور بے یار و مددگار لگتی تھیں۔ میں انھیں کم ہی دیکھتا تھا کیونکہ مجھے ان کی پروا نہیں تھی۔ لیکن بہر حال دروازوں کی اوٹ میں یا کچن کی انگیٹھی اور سنک کے درمیان میں ان کی موجودگی کو محسوس کرتا تھا۔ وہ کوڑے دان پر بیٹھ جاتیں۔ پیڑوں سے ان کی آوازیں آنے لگتیں۔ وہ خوب چرچر باتیں کرتیں۔ شعلے کی صورت میں تمہارے آگے آگے چلتیں۔ چھوٹے چھوٹے پست قد جانداروں کی طرح تمہیں خواہشیں پالنے کی التجا کرتیں۔ اور پھر ان کا سرخ یا گلابی روپ تمہیں دکھاتیں۔ میڈلین سے اور مجھ سے باتیں کرتیں لیکن ایسا لگتا تھا وہ میرے ساتھ بیک وقت پُر تکبّر اور شرمندہ ہیں۔ کبھی کبھی میں ان سے کہتا ”دفعہ ہو جاؤ“۔ اگر انگریزی یا فرانسیسی ان کی سمجھ سے باہر تھی تو میں سنسکرت یا کنڑا میں چلّا کر انھیں سمجھاتا۔ اور اکثر اس کا زیادہ اثر دکھائی دیتا۔ وہ بندروں کی طرح اُچھلتی کودتیں، کبھی کبھی جب اپنے کمرے میں میڈلین ان سے باتیں کرتی تو میرا دھاڑیں مار مار کر رونے کو جی چاہتا۔

انتیسواں دن آہستہ آہستہ قریب آرہا تھا۔ اور مکان جو بخار جیسی گرمی لیے ہوئے تھا۔ ٹھنڈا ہونے لگا۔ مدھم ملائم آوازیں آنے لگیں اور روحوں کے رنگ زیادہ نفیس ہو گئے۔ بینگنی اور سبز رنگ زیادہ دکھائی دینے لگے۔ اکثر ایسا لگتا جیسے وہاں کوئی بادل کا ٹکڑا تھا یا کسی آسمانی پھول کی کوئی پتی۔ سنگیت کے سُر زیادہ اچھے اور سُریلے ہو گئے تھے۔ اور اب ایسا لگتا تھا جیسے روحیں ناقابلِ اعتبار قسم کی خوشبوئیں بکھیر رہی ہوں۔ پہاڑی پرندوں کی آوازیں آتیں اور آپ کو زیادہ پہچانی سی لگتیں۔ یہ

روحیں آپ کے پہلو میں آکھڑی ہوتیں۔ آپ کے سامنے نہیں اور ان کی شکلیں بڑی خوشگوار ہوتی تھیں۔ وہ کسی ہرن یا کسی سڈول نوجوان گھوڑے سی لگتی تھیں۔ کچھ سنگیت بھرے ہنسوں کی طرح تیرتی اور اڑتی تھیں۔ میڈلین کی خوشی بڑی گہری اور گمبھیر تھی۔ وہ محسوس کرنے لگی تھی کہ دنیا اس کے سامنے پھیلی ہوئی ہے اور کوئی خیال یا خواہش ایسی نہیں تھی جس کا وہ اظہار کرتی تو دیوتا اسے پورا نہ کرتے۔ دوسری روحوں کے مقابلے میں اب وہ کم درشن دیتے تھے لیکن دنیا کچھ اس طرح بدل رہی تھی جیسے برسات کے بعد دسہرے کے تیوہار تک موسم بدلنے لگتا ہے۔ آپ جلوس میں شامل ہاتھیوں راجاؤں کی تلوار اور تخت کا کنول بخوبی دیکھ سکتے تھے۔ ممکن ہے جلد بہت جلد آپ نو کرنوں والے جواہر پر سمادھی میں بیٹھے مہاتما بدھ کے بھی درشن کر لیتے۔

اگر میں نے کبھی میڈلین چہرے پر خوشی دیکھی تو وہ اب تھی۔ اس نے ٹھیک اس طرح اپنے دروازے پر اکیسویں، بتیسویں، تینتیسویں دن کے نشان لگائے جس طرح ہمارے یہاں کی گوالنیں یہ جاننے کے لیے گوبر سے دیواروں پر نشان لگاتی ہیں کہ ہم نے کتنا دودھ لیا ہے۔ نیکی ایک بار پھر دنیا میں لوٹ رہی تھی۔ ایکس کی وادی پُر اسرار دنیاؤں کی زرد سنہری روشنی سے معمور ہو گئی تھی اور دھرتی اپنی ہی روشنی میں تیر رہی تھی۔ چھتیسویں دن تک پہنچتے پہنچتے ایسا لگتا تھا اب میڈلین کا زندہ رہنا مشکل ہے۔ اس کی آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں اور وہ مشکل سے کچھ کھا پی سکتی تھی۔ وہ جو بھی کھاتی تھی قے کر دیتی تھی۔ دو ایک دن تو اس نے صرف 'وچی واٹر' ایک مخصوص قسم کا پانی ہی پیا۔ میں نے اس میں تھوڑا کافور اور شہد ملا دیا اور اس کا ذائقہ بہتر اور صحت بخش بنانے کے لیے کچھ دھرم گرنتھوں کا حوالہ بھی دیا۔ میں شہد ملا گرم پانی اسے متواتر پلاتا تھا۔ جب اڑتیسواں دن آیا تو وہ چلنے پھرنے سے بھی رہ گئی۔ لیکن اب وہ ہزار پتیوں والے چنبیلی کے پھول یا نیل کنول کی طرح مہک رہی تھی۔ مجھے اس کے پاس بیٹھنا اور اس کی موجودگی کے شیریں تنفس کو محسوس کرنا اچھا لگتا تھا وہ سنت لگتی تھی۔ میں نے اس کی پوجا کی۔

میں نے اسے پانی کی بوتل دی۔ لیکن اب اس نے اسے لینے سے انکار کر دیا۔ کہنے لگی یہ سب بناوٹ ہے ضرورت سے زیادہ۔ اس لیے میں نے اس کے بستر پر للی اور مارگرٹ کے پھول بکھیر دیئے۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے" وہ بولی۔ "لیکن للی نہیں اس سے مجھے پہلے کمیونین کی یاد آتی ہے۔ اور اس نے اپنا اوم دِھم، ادم گہہ، اوم جرہ کا جاپ جاری رکھا۔ پھر سچ سچ اسے گہری نیند آ گئی۔

چالیسویں دن اس نے شہد اور پانی لینا بھی بند کر دیا۔

"تو پھر لیموں اور پانی لے لو" میں نے التجا کی۔ "مہاتما گاندھی بھی لیموں اور پانی لے لیتے تھے۔"

"مجھے اپنے دھرم کا پالن کرنے دو۔"

میں سمجھ گیا اور واپس کچن میں چلا گیا۔

اکتالیسویں دن وہ ایک گھنٹہ پہلے یعنی ایک بجے جاگ گئی۔ اور چھ بجے تک کٹھور سمادھی میں بیٹھی رہی۔ مجھے کوئی آواز یا شور سنائی نہیں دیا۔ مجھے گھر میں ایک عظیم سچی اور مہربان موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ میرے تنفس میں سدھار ہو گیا۔ چھ بجے جب میں ابھی غسل خانے میں ہی تھا تو میں نے ایک فوق الارضی گھنٹے کی تیز مترنم آواز سنی۔ دیر تک جاری رہنے والی پُر نغمہ موج در موج غیر سکوت خیز، کائناتی آواز "دھم بھون گھنٹیوں کے دو تنتروں سے لٹکا ہوا ہے۔" مہاسدّاسن سدھانت کا قول ہے۔ دھرتی دھرتی بن گئی، پیڑ پیڑ بن گئے۔ اور ٹرام کاروں کی آواز معمول کی سطح پر آ گئی۔ انسانوں کی گفتگو غیر شائستہ اور سادہ ہو گئی۔ مسٹر بے گوتن کا دودھ اصلی تھا۔ ہم نے بجلی کے بل ادا کر دیئے۔ اخبارات آئے۔ مادام ژاں کے سر میں درد تھا اور اس کے جسم سے بدبو آتی تھی جب میں الیکس گیا تو میری ناک میں تمباکو کی کڑواہٹ گھس گئی اور ہوائیں گرد پھیل گئی۔

اس شام میڈلین نے ایک کڑوا سنگترہ چھاتی پر ملنے کے لیے مجھے دیا۔ پہلے ایک

پھر دوسرا پھر تیسرا۔ مجھے ۲۱ دن اسی طرح چھاتی پر سنگترہ ملنا تھا اور میرا بخار اور سانس کا روگ جاتا رہے گا۔ چالیسویں دن گیارہ بجے اور پھر اکتالیسویں دن کے درمیان میڈلین کو یہ الہام ہوا تھا اور اسے واضح طور پر پتہ چل گیا تھا خواب میں اسے داڑھی والا اور ماہر طِبّ ایک عربی ڈاکٹر دکھائی دیا تھا۔ "اِکیس دن اور چھاتی پر کرو دے سنگترے" اس نے کہا تھا۔

مجھے بے شک اس بات پر اعتبار نہیں تھا۔ دن گزرتے گئے۔ لیکن ہوا کچھ نہیں۔ میں نے دیکھا پرندے میڈلین سے کچھ زیادہ ہی مانوس تھے۔ چڑیاں اس کے ہاتھ سے دانا چگنے آتیں۔ الّو اس کی کھڑکیوں کے قریب آکر پَر پھڑپھڑاتے اور وہ انھیں پکڑ کر واپس لے جاتی اور کسی مخصوص پیڑ پر بٹھا دیتی۔

لیکن یہ سچ ہے کہ بودھی پیڑ ھرنئی کونپلیں آگئیں۔ یہ واقعی ناقابل اعتبار تھا۔ میڈلین نے مادام تراں کو اس کے دوسرے بچّے کے لیے جس کو شدید دمہ تھا، پانی دیا۔ دمہ ٹھیک ہوگیا۔ مادام تراں نے خود ہمیں اس بات کا یقین دلایا۔

میڈلین نے مجھے بلیک میڈونا کے درشن کے لیے بھیجا۔

"وہ کبھی بودھی تارا ایک درواد دلیوی رہی ہوگی۔ اب میں اس کا نام جانتی ہوں اور اس کا عہد بھی رام! اس دنیا میں رہنا کیسا اچھا لگتا ہے!" جب ہم بلیک میڈونا کے چیپل کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے تو اس نے یہ بات کہی۔

میں کہہ سکتا ہوں کہ بلیک میڈونا۔ اپنی لمبی ناک، نفیس خوبصورت ہاتھوں اور گہری ترچھی مشرقی آنکھوں سے بائی زن تینی لگتی تھی۔ ایل بیل کے لرزتے ہوئے رنگ اور نیچے بہتی دلیورانس کو دیکھ کر مجھے آتر رام حیرت کی یاد آگئی اور میں نے اسے میڈلین کو گا کر سنایا۔

اے تت تدلیو ہی دَنم بنز دیہ درشتم
یا ہمتی بھوم چرم الیہ بُرادسنت!
ارنیہ کا پچ گرہن پچ رتا سودُھے

سانسار کیشو و تکھے شو وِیَم رنگیہ!!
اے تے ت ایو گریو ورو دنم یورا
ستانییو مت ہری نانی و نستھالینی
آم جوم جل رو تانی و تانیہ تنی
رزن دھرنی ندی چلانی سرت تانی
میگھا مالیویش یہ پنجار استریو وبھا بیتے
گری ، پرسرون ۔ سویم یتر گوداوری ندی !!

"اس کا کیا مفہوم ہے؟"

"کم اِدَم آ بتیم آدے رامیسہ؟" اس نے کچھ اس انداز میں کہا جیسے میں میڈلین سے سنسکرت میں بات کر رہا تھا۔

"اس کا مطلب ہے ... ؟"

"رام کو کیا ہوا ہے؟" میں نے جواب دیا اور سنانا جاری رکھا۔

جرا دوے گارتی پرسرت۔ اوتیورو وش رس
کت سنچیت سنو یگا تیر چل اِو شلیہ سیہ شکل
درنو روڈھ گرنتھی سفوٹت اِو ہرنم مانی تن
گھنی بھوت شوکو۔ وکلیہ تی ماں نوتن اِد

میڈلین ابھی بھی چیپل اور سڑک کے درمیان پتھر کی سل پر بیٹھی تھی کبھی کبھی چیپل کی چھت پر چیڑھ کر کوئی پھل گرتا اور زور دار آواز کے ساتھ پھسلتا ہوا نیچے نالی میں جا گرتا۔ فروری کے مہینے کی بعد دوپہر کے حساب سے دن کچھ زیادہ ہی گرم تھا۔ اور شہد کی مکھی کی طرح مترنم تھا۔ میں بھوبھوتی کے اقتباسات سنا رہا تھا جیسے میں میڈلین کو کچھ سمجھا رہا تھا۔

ایکہ سمبرتی ناشت پریتم ستام دیہ رام کتھم
پاپ بنح دُھم دِلو کیہ تو دگھے تو اسم بھادیہ وا

اور اب میڈلین سمجھ گئی۔ ے ری اُس کے مردہ اور زیر خاک فوجی۔ وہ سب سخت دل مہذب لوگ جو جرمنوں کے خلاف لڑے اور جنھوں نے گال پر فتح پائی۔ جن کی ہڈیاں ضرور ہمارے آس پاس کہیں دفن ہیں۔ ان سب نے بھی اپنے کان اس سنجیدہ تقریر کی طرف لگائے ہوں گے اور اسے سمجھ لیا ہوگا۔

''سے پن' اور 'سیپ'، یہ سنسکرت زبان زبان کے لفظ 'سَپ' سے بنے ہیں۔'' میں نے کہا۔ جیساکہ یہ سچ کی تعریف تھی۔ ڈکشنری یعنی لغات اکثر غیر متکلّم لوگوں کی بائبل ہوتی ہے۔ علم صرف اور گرامر مجھے خیال آیا۔ شادی بیاہ کے رشتوں میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

یہ وہ اشلوک ہیں جو فروری کی اس بعد دوپہر کو رام نے میڈلین کو گاکر سناتے۔

یہ وہ جنگل ہے جسے میں اب دیکھ رہا ہوں
ہم یہاں راہبوں کی طرح بھی رہے ہیں اور گرہستیوں کی طرح بھی
مدّتوں سے ہم اپنی مذہبی رسمیں ادا کرتے آئے ہیں
ہمیں وجود کی مسرتوں کا علم تھا

تو یہ وہ پہاڑ ہیں جہاں مور بولتے ہیں
اور وادیوں میں بارہ سنگھے گھومتے ہیں
بانس کے جنگل ہیں۔ ملائم آواز میں گنگناتے ہوئے
گہرے نیلے جھرمٹوں میں ندیوں کے کنارے

جہاں پرَسرون آکاش کو چھوتا ہے
اور میگھ مالا کی طرح گوداوری بہتی ہے

کسی گہرے زہر کا جلتا ہوا پھیلاؤ
کسی انجانی طاقت کی کھودی ابھاری ہوئی کرچیاں
دلِ نازک پر مندمل زخم کا لمس
ان سب کی طرح شدید۔ میرا درد!
مجھے کچھ اس طرح کمزور کر دیتا ہے
جیسے یہ کل ہی ایکا ایکی جنما ہو۔

پنج وٹی جہاں میں اس کے ساتھ مدتوں رہا ہوں
جیسے یہ میرا اپنا گھر تھا
پنج وٹی ہماری متواتر گفتگو کا فوری مرکز
لیکن اب رام اکیلا ہے۔ اور اس کی سب سے پیاری چیزیں بے رنگ ہوگئی ہیں
اگر میں ٹکٹکی لگائے انھیں دیر تک دیکھتا نہ رہوں
یا پنج وٹی کے بغیر پرنام کیے ہی چلا جاؤں
تو یہ پنج وٹی کے تئیں میری بے دلی کی بات ہوگی۔

ایکس میں سردی کے موسم کے ان دنوں میں میڈلین اور میرے درمیاں کچھ ایسی سادہ اور گہری قربت پیدا ہوگئی لگتی تھی کہ جب میں ان کے بارے میں سوچتا تھا تو مجھے محسوس ہوتا تھا کہ ان دنوں کی فراواں نرم وگرم دھوپ میں زیتون کے پیڑ سر سے پاؤں تک نہائے ہوئے تھے۔ سرو کے پیڑوں کو ایک وحدت عطا ہوگئی تھی جیسے یہ ایک سمت، ایک فارمولے ایک اصول کے آئینہ دار بن گئے تھے۔

باہر زندگی بڑی حسین تھی۔ مسٹر بےگوئن اپنی بھیڑوں کو راستے کے اوپر تک لاکر چرنے کے لیے چھوڑ دیتے اور خود زیتون کے پیڑ کے نیچے لیٹے 'پےتی پروونسل' پڑھتے۔ دو بکریاں بار بار بڑی قربت اور جان پہچان کے احساس سے میری طرف دیکھتی رہتی تھیں۔ حاملہ بکریاں بچّے دیتیں اور ان کے پھولے ہوئے پیٹ پچک کر معمول پر آجاتے۔ چھوٹے چھوٹے میمنے پیدا ہونے کے احساس سے سرشار لڑکھڑاتے ہوئے باہر آتے اور کھیلنے لگتے۔ میں نے ہندوستان میں سنا تھا کہ بکری کا دودھ کمزور پھیپھڑوں کے لیے اچھا ہوتا ہے۔ اس لیے روز بعد دوپہر میں کھیتوں میں نکل جاتا اور مسٹر بےگوئن تیز بُو والے گاڑھے سیّال کی ایک بوتل لاکر مجھے دے دیتے۔ کبھی بار وہ 'غزالہ' نام کی ایک بکری کا دودھ میرے سامنے ہی دوہتے۔ یہ دودھ عجب مہربان مادرانہ شفقت لیے ہوئے تھا۔ اس دودھ سے مجھے فائدہ ہوا یا نہیں۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن مجھے میری صحت کے بارے میں کوئی خاص تشویش نہیں ہوئی۔

ہسپتال کے ڈاکٹر سیرافن ہنستے اور مجھے ایک اچھے مریض کی مثال سمجھتے تھے۔ اگر میں ان سے تین چمچ کاڈلیور آئل پینے کو کہوں تو یقین مانیے کہ وہ دوڑتا ہوا یہ پوچھنے آئے گا کہ انگریزی قسم کا کافی کا چمچ یا ہمارے یہاں استعمال ہونے والا چھوٹا کافی کا چمچ۔ واقعہ یہ تھا کہ وہ اپنی جیب سے چمچ نکالتا یہ یقینی بنانے کے لیے کہ ڈاکٹر کی ہدایات

پر سختی سے عمل کیا جا رہا تھا۔ اس کے ملک میں ڈاکٹر بننا کتنا آسان ہوگا۔ یہ سب باتیں صدیوں پرانی تہذیب سے پیدا ہوتی ہیں۔ ہمارے یہاں کی طرح نہیں جہاں لوگوں سے جانوروں جیسا سلوک کیا جاتا ہے...

میں اچھا مریض تھا یا نہیں لیکن میں اپنی بیماری کو بہر حال بڑی سنجیدگی سے لیتا تھا۔ میں میڈلین کے لیے مصیبت نہیں بننا چاہتا تھا۔ ہم پہلے ہی ایک دوسرے کے لیے اچھا خاصا مسئلہ بن چکے تھے۔

اگر کوئی کہنا چاہے تو میڈلین کی اپنی بیماریاں کسی حد تک دلکش اور دلفریب تھیں۔ ایک دن وہ آئی تو اس کی ایڑی میں کانٹا چبھا ہوا تھا۔ اور پیر پر اس نے اتنی کس کر پٹی باندھی کہ کچھ روز بعد اس سے بدبو آنے لگی۔ "اس نکمّے پیر کو سڑنے دو" وہ کہنے لگی۔ دھیرے دھیرے کراہتی رہتی خاموشی سے، سُر اور لَے کے ساتھ جیسے منتر پاٹھ کر رہی ہو۔ میں نے اس کے دروازے پر دستک دی۔ کچن سے گرم پانی لایا۔ اور اس کے زخم کو بورک ایسڈ سے صاف کیا۔ وہ اپنے جسم کے کسی بھی حصّے کو ننگا کرنے میں اس قدر شرمانے لگی تھی کہ اس کو پیر آگے پھیلانے کے لیے راضی کرنا بھی مشکل ہوگیا تھا۔ اس نے اپنی پوری ٹانگ کو ڈھانپ لیا اور مجھے صرف اپنے پیر کو چھونے دیا۔ اب وہ چونکہ بہت کم کھانے لگی تھی اس لیے اس کے پیٹ میں تکلیف رہنے لگی تھی۔ اس کے پیٹ میں جب درد ہوتا تو وہ مجھے مالش کرنے کی اجازت بھی نہیں دیتی تھی۔ وہ دن بہ دن نوجوان لڑکی کی طرح ہوتی جا رہی تھی اور اپنے سینے کو اس طرح ڈھانپ کر رکھتی تھی۔ جیسے دو ہاتھوں اور اپنے چوڑے مہربان چہرے کے علاوہ اپنے جسم کے کسی اور حصّے کو دکھانا اس کے نزدیک پاپ ہو۔

"بیچارہ" ایک روز اس نے مجھ سے کہا "میں نے تمہیں راہب کی زندگی گزارنے پر مجبور کر رہی ہوں۔ تمہیں ایک روز مناسب ہندوستانی بیوی تلاش کرنی ہی پڑے گی"۔ لیکن میں بیوی کے لیے کچھ ایسا بے قرار نہیں تھا۔

"میڈلین تمہارا گلا سوج رہا ہے۔ مجھے گرم تولیے سے اس کی سکائی کرلے دو۔"

"ارے یہ کچھ نہیں ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں جب تین برس کی تھی۔ تب سے میرا گلا خراب رہتا ہے۔ ماں سوچتی تھی کہ مجھے کسی دن گلھڑ ہو جائے گا۔ لیکن مجھے کبھی کوئی بیماری نہیں ہوگی۔ میں بیماری کے لائق بھی نہیں ہوں۔"

اب وہ اپنی خوراک ہندوستانی طریقے کے مطابق مٹھی سے ناپتی تھی "دن میں تین بار اور تین مٹھی" بودھی گرنتھوں میں کہا گیا ہے۔ یہ فاقہ کشی کے باعث تھا یا اس کی اندرونی روحانی قوت کے باعث دیکھنے میں وہ نہایت شفاف اور ارفع دکھائی دیتی تھی۔

"جب تم ہندوستان میں تھے" ایک دن اس نے کہا "میں ڈر گئی تھی میں انھیں تکلیفوں کے کارن مر جاؤں گی۔ مجھے ڈر تھا وہ مجھے سیاں ے دار کے قبرستان میں دفن کر دیں گے۔ اس لیے یہاں آنے پر میں نے اپنی وصیت لکھ دی اور تمھیں بھی بتانا چاہتی ہوں جیسا کہ کیتھرین بھی جانتی ہے کہ جب میں مر جاؤں تو میرا مردہ جسم سپرد آتش کیا جائے۔ تم جانتے ہو اس سلسلے میں فرانسیسی قانون بڑا سخت ہے۔ میں چاہتی ہوں میری موت تمہارے یہاں رہتے ہوئے ہی ہو جائے۔ رام تمہیں اب پریفے۔ دے۔ بُش۔ دے۔ رون کو درخواست دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"ایسی اشبھ باتیں مت کرو میڈلین! تم جانتی ہو میں تم سے زیادہ بیمار ہوں۔"

"اسی لیے میں یہ سب کہہ رہی ہوں۔ تم نے مجھے بتایا تھا شہنشاہ بابر اپنے بیٹے ہمایوں کے لیے دعا کیا کرتا تھا۔ میں بھی اس طرح راتوں کو دعا کرتی رہی ہوں کہ تمہارے بدلے میں مر جاؤں۔ تم جوان ہو، مرد ہو۔ تمہیں ابھی زندہ رہنا ہے۔ جب میں پہلے پہل تم سے ملی تو تم پرجوش اور زندہ دل تھے۔ میری وجہ سے ہی تمہاری یہ حالت ہو گئی ہے۔ میں محض گوشت کا ایک لوتھڑا ہوں۔ کوئی بھی میری جگہ لے سکتا ہے۔ لیکن تم تو خاندان کے بڑے ہو۔"

"میڈلین کیا تمہارا مجھے اس طرح ستانا ضروری ہے؟"

"اچھا۔ تب میں چپ رہوں گی۔" اس نے اپنا جسم گیروے رنگ کی چادر سے ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے سبز آنکھوں والے چہرے کے سامنے بھورے رنگ کے منکوا

دالی اس کی مالاد کھائی دے رہی تھی۔ اب وہ سوال پوچھنے کا وقت آگیا تھا جو ہم دونوں کے درمیان حائل تھا۔ میں نے ہمت کرکے پوچھنا چاہا۔ لیکن میرا خیال ہے وہ میرے سوال کو بھانپ گئی اور کہنے لگی

"رام! ہمیں الگ کرنے والا کون ہے؟"

"ہندوستان"

"ہندوستان؟ لیکن میں تو بدھ مت کا پیروکار ہوں۔"

"یہی وجہ ہے بدھ دھرم نے ہندوستان چھوڑ دیا۔ ہندوستان متاعِ دل سے عاری ہے۔"

"لیکن کوئی بھی شخص بدھ مت کا پیروکار ہو سکتا ہے۔"

"جی ہاں وہ عیسائی اور مسلمان بھی ہو سکتا ہے۔"

"پھر۔"

"کوئی شخص مذہب کی تبدیلی سے کبھی ہندو نہیں ہو سکتا۔

"تمہارا مطلب ہے فرد صرف پیدائشی طور پر برہمن ہو سکتا ہے۔"

"یعنی کہ ہندوستانی۔" میں نے ہندوستان کی تفسیر کے طور پر اضافہ کیا۔

"تمہارا ہندوستان تب تو رام، زمان و مکان میں ہوا"

"نہیں یہ زمان و مکان سے جڑا ہوا ہے لیکن کہیں بھی اور ہر جگہ موجود ہے۔"

"میں سمجھی نہیں۔"

"یہ چونکہ زمان و مکاں کے تعلق سے عمودی ہے اس لیے ہر مقام پر موجود ہے۔"

"یہ میرے لیے بھی بڑی گہری پُراسرار بات ہے۔"

"اگر میں کہوں، پیار احساس نہیں ہے۔ یہ تو اگر آپ کہنا چاہیں ایک ایسی کیفیت ہے جو کیفیت سے عاری ہے۔ خود کی مکمل حالت۔ تو کیا تم سمجھ جاؤ گی؟"

"میں نہیں سمجھتی۔ لیکن فرض کر لو میں سمجھ جاؤں تو۔"

"کیا تم جانتی ہو کہ سب چیزیں گھل مل جاتی ہیں۔ سب خیالات، سب احساسات

علم میں ضم ہو جاتے ہیں۔ آپ چیزوں کو دیکھنے اور سننے سے نہیں پہچانتے بلکہ علم سے' گیان سے پہچانتے ہیں۔

"ہاں۔"

"یہی ہندوستان ہے۔ گیان ہی، علم ہی ہندوستان ہے۔"

"لیکن ہندوستان تو گرو کی' بدھ کی دھرتی ہے۔"

"میرے نزدیک تو ہندوستان پوری دنیا کا گرو ہے۔ ورنہ وہ ہندوستان ہی نہیں ہے۔ رشیوں کی نہ تو کوئی سوانح ہے نہ تاریخ۔ یاگیہ ولکیہ یا بھاردواج کے بارے میں کون کیا جانتا ہے۔؟ کوئی نہیں۔ لیکن بندھیل کھنڈ کے کسی چھوٹے سے راجہ کے لیے بھی اگر قصیدہ لکھا گیا ہے تو وہ بھی کسی حد تک غیر شخصی ہے۔ ہم شنکر کے مقابلے میں راجہ ہرش کے بارے میں زیادہ جانتے ہیں۔ جیسا کہ میں بار بار کہتا ہوں ہندوستان کی کوئی تاریخ نہیں ہے۔ ہندوستان سے پوری طرح ایک ہونا ٹھیک ویسا ہی ہے جیسے میڈلین سے شادی کرنا۔ بھلے ہی یہ بڑا پُرخلوص ہو سچّا ہو لیکن یہ تاریخ نہیں ہے۔

اگر تاریخ کچھ ہے تو وہ انسانی خلوص کا اعتراف ہے۔ لیکن سچ خلوص سے بھی ماورا ہے۔ سچ خلوص میں بھی ہے اور عدم خلوص میں بھی ہے اور دونوں سے ماورا۔ اور بس یہی ہندوستان ہے۔"

وہ کافی دیر چپ رہی۔ وہ اپنے خیالوں میں کھوئی مالا کے منکوں سے کھیل رہی تھی۔

"ہماری قوم جواریوں کی قوم ہے۔"

"جواریوں کی؟ یہ کیسے؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور اچانک یہ سوال کیا۔

"پانسا مت پھینکو بلکہ اپنے کھیت میں کھیتی اُگاؤ۔" رگ وید کے اس مشہور اشلوک سے تم واقف ہو۔

"اوہ۔"

"تمہیں یاد ہے دھرم راج اپنی سلطنت ہی نہیں اپنی بیوی تک جوئے میں ہار گیا

تھا۔ اور ہریش چندر سچ کے لیے اپنی سلطنت سے دست بردار ہو گیا تھا۔ شری رام کو بن باس لینا پڑا تھا کیونکہ ان کے جوئے کی ذہنیت والے پتا نے اپنی چھوٹی رانی کو وہ جو بھی مانگے دینے کا وعدہ کیا تھا اور چھوٹی رانی جوئے میں اپنے بیٹے کے لیے سلطنت کا مطالبہ کرنے پر مصر تھی۔ حال ہی میں جب جاپانی ہمارے دروازے پر آپہنچے تھے مہاتما گاندھی نے انگریزوں سے کہا تھا "ہندوستان چھوڑ دو۔ دفعہ ہو جاؤ یہاں سے۔ ہندوستان کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ ہم اپنی دیکھ بھال کیسے کریں گے یہ جاننا ہمارا کام ہو گا۔"

"بڑا عجیب و غریب فلسفہ ہے۔ لیکن تمہارے بیشتر دل پسند فلسفوں کی طرح یہ بڑے آرام سے تاریخ کے سر پر سوار ہے" لمحہ بھر کے توقف کے بعد بولی "یہ جذبہ، یہ رویّہ بہر حال کہاں سے پیدا ہوتا ہے۔ تم ہندوستانی تو بڑے سنجیدہ لوگ ہو۔"

"ہم ہندوستانی واقعی سنجیدہ، انتہائی سنجیدہ ہیں۔ ہر چیز کے بارے میں۔ شاید ہم وہ واحد قوم ہیں جس نے تاریخ کے پورے سفر میں دنیا کے وجود کو، اشیا کے وجود کو شک کی نظر سے دیکھا ہے۔"

"ممکن ہے یہ صحیح ہو۔ لیکن یہ بھی تو سچ ہے کہ چینی لوگ بڑے حقیقت پسند تھے۔"

"زندگی کے بارے میں صرف دو رویے ہو سکتے ہیں۔ یا تو آپ اس بات کو مانتے ہیں کہ دنیا کا وجود ہے، اس لیے آپ کا بھی وجود ہے۔ یا پھر اس بات پر یقین رکھتے ہیں چونکہ آپ کا وجود ہے اس لیے دنیا کا بھی وجود ہے۔ کوئی سمجھوتہ ممکن نہیں ہے۔ جہاں تک فلسفے کی تاریخ کا تعلق ہے یاد رکھئے اٹھارھویں صدی میں سائنس داں بھی فلسفی کہلاتے تھے اور فلسفے کی تاریخ کا مفہوم اس مسئلے کا حل تلاش کرنے کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ 'اگر میں واقعی ہوں تو میں ہی دنیا ہوں'۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ آپ وہ نہیں ہیں جو آپ سوچتے اور محسوس کرتے ہیں۔ یعنی ایک فرد۔ اگر دنیا حقیقی ہے تو آپ بھی اشیا کے مفہوم میں حقیقی ہیں۔ اور یہ ایسی بات ہے جو دلیل سے ثابت کی جا سکتی ہے۔ پہلی صورت حال ویدانت کی ہے، دوسری مارکسی۔ اور دونوں میں کوئی سمجھوتہ ممکن نہیں ہے۔

"اور ان دونوں کے درمیان ...؟"

"اور ان دونوں کے درمیان بہت سے شاعرانہ نظام ہیں۔ وحدیت، ترمیم شدہ وحدیت۔ غیر ثنوی ترمیم شدہ ثنویت۔ خدا اور جنت، اسلام وغیرہ۔ وغیرہ۔"

"تو پھر بدھ مت کس مقام پر ہمارے نظام میں داخل ہوتا ہے؟"

"شاعر کا سب سے اعلیٰ مذہب" میں ہنسا اور اس زور سے ہنسا کر سرو کے پیڑ یا مسٹر بے گوین کی چراگاہ میں میری ہنسی کی آواز سنی جا سکتی تھی۔

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔"

"تم سمجھتی ہو" میں نے ہنستے ہوئے کہا "لیکن تم اعتراف نہیں کرنا چاہتی۔ رحمدلی کے جذبے کا مالک ہونے سے پہلے دنیا کے وجود کو تسلیم کرنا ضروری ہے۔ آپ کے دل میں ہر اس چیز کے لیے رحمدلی کا جذبہ ہونا چاہیے جو درد و کرب میں ہے۔ اس کا مطلب ہے دکھ کا بھی وجود ہے اور رحم و کرم کا بھی۔"

"لیکن بدھ مت اتنا شاعرانہ کیسے ہے؟"

"پہلی وجہ تو یہ ہے کہ ہم ہندستان کی کسی بھی روحانی شخصیت کے مقابلے میں بدھ کی خوبصورت اور اثر انگیز زندگی کے بارے میں زیادہ جانتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم کرشن کے بارے میں کتنا جانتے ہیں۔ پھر بھی ہندوستان میں کرشن جتنا مقبول ہے کوئی دوسری روحانی شخصیت نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جاتک کتھائیں نوع انسان کی سب سے شاعرانہ داستانیں ہیں۔ شوسی جاتک کی مثال لے لیجیے اور اس کا موازنہ مہابھارت سے کیجیے۔ بھیشم، کرن اور دھرم راج کی غیر شخصی شخصیت کے مقابلے میں جاتک کس قدر شخصی اور اثر انگیز ہیں۔ ہندوستان اعتقاد رکھتا ہے اور اسی اعتقاد سے ہی نہ صرف ہمارے فلسفوں نے جنم لیا ہے بلکہ ہمارے مندر، تھیٹر، قلعے، گرامر، شعریات ریاضی، علم و دانش۔ زیورات۔ یہاں تک کہ علم شہوت اور آیورویدجیسا نفیس نظام طب معرض وجود میں آئے ہیں۔ ہندوستان کا اعتقاد ہے کہ دنیا کو حقیقی یا غیر حقیقی ثابت کرنے کے لیے واقعتاً معروضی رویّہ اپنانا ضروری ہے۔ معروضی ہونے کا مطلب ہے آپ

سائنسی نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ اسی لیے تو ڈکن سن نے کہا ہے کہ ہم لوگ جنھیں پراسرار اور صوفی سمجھا جاتا ہے دراصل بہتر طور پر جدید سائنسدانوں کی طرح ہیں۔"

"تو پھر بدھ مت کیا ہوا؟"

"بدھ مت زیادہ سے زیادہ ویدانت اپنانا چاہتا ہے۔ جس نے مہاتما بدھ اوتار کا روپ لے لیتا ہے۔ اور مہایان کم و بیش ایک ویدانتی نظام۔ اگرچہ منفی اور بس! جو کچھ بھی ہندوستانی ہے وہ بچ جاتا ہے۔"

"اور جو ہندوستانی نہیں ہے؟"

"اسے دوسروں کے فائدے کے لیے باہر بھیج دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایکس میں بھی۔" میں یہ کہہ کر ہنسنے لگا۔ یہاں تک کہ میڈلین بھی اس ہنسی میں شامل ہو گئی "تاکہ اپنے کمیونسٹ کامریڈ اور اپنے ننھے منّے بودھی بچّے میں گھرا ہوا الیز و بھی پالی زبان کے گرنتھ پڑھ سکے۔ تم جانتے ہو بچّے کا نام آنند ہے۔"

"میرے مقابلے میں تم بڑے ہوشیار اور چالاک ہو۔"

"برہمن لوگ ریس کے گھوڑوں کی طرح ہوتے ہیں۔ یا تو اپنے کام میں ماہر ہوتے ہیں یا پھر انھیں سلوتری کے پاس گولی سے مرنے کے لیے بھیج دیا جاتا ہے۔ انھیں عام بوچڑ خانے میں کبھی نہیں بھیجا جاتا۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ حیاتیات اور علم اصلاح النسل بڑے دلچسپ علم ہیں۔ آپ کسی بھی چیز میں سے کم و بیش کچھ بھی اُگا سکتے ہیں۔ روس میں وہاں کے لوگ بہت جلد ناشپاتی کے پیڑوں پر گھوڑے اُگائیں گے اور ہیا سنتھ سے بچّے۔"

"بس بس۔ اب چھوڑو یہ بچپنہ۔ ایک اور سوال اور اس کے بعد پروفیسر صاحب اپنے کمرے میں جاکر آرام کر سکتے ہیں۔"

"تاریخ دان حاضر ہے سوالوں کے جواب دینے کے لیے۔"

"میرا سوال یہ ہے کہ یسوع کیا ہے؟"

"بدھ کی طرح ایک شاعر۔ اور عظیم ہندوستان کی طرح افلاطون کی آدرش ریاست سے نکالا جانے والا ایک شخص۔ نئی تہذیب کو بہر حال تکنیک شاہی تہذیب ہونا ہی ہے۔

اس تہذیب کو بہرحال شخصی، ذاتی، روحانی اور شاعرانہ عناصر کو زندگی سے خارج کرنا ہی ہوگا۔ سچا شاعر شاعری کو بطور شاعر قبول کرتا ہے اور دنیا کو 'میں' کے روپ میں!"

"تو پھر دنیا نہ ہوئی؟"

"سب سے اعلیٰ تہذیب وہی ہے جہاں دنیا نہیں ہے لیکن جہاں 'میں' کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ یہ ایک مکمل عدد کی طرح ہے جو ہمیشہ ۱-۱-۱ کا مظہر ہے۔ بدھ مت کے پیروکار کہتے ہیں کہ دنیا یعنی ادراک ہی حقیقی ہے۔ 'سردم کشنکم' ہے۔ ہر شے جس لمحے میں ہم اسے دیکھتے ہیں بس اسی لمحے میں ہے۔ ویدانتی کہتا ہے کہ ادراک حقیقی ہے جی ہاں لیکن حقیقت 'میں' بذات خود ہوں۔ اور یہ اختلاف ہی گوتم کے بدھ دھرم کو ہماری سرحدوں سے دھکیل باہر کرنے کے لیے کافی ہے۔"

"لیکن جب یہ آجاتا ہے تو کیا ہوتا ہے؟"

"اسے الگ ذات کے طور پر لیا جائے گا۔ اگر پاؤں کا زخم تکلیف دیتا ہوں تو ممکن ہے اسے پیار سے صاف کرنا پڑے۔ رحمدلی نہیں۔ یہ پیار ہے جو غیر شخصی ہے۔"

"تو پھر مجھے میرے جہانِ شعر میں ہی رہنے دو۔"

"ہاں! میں کل ہی سوچ رہا تھا۔ ثنویت کا ظاہر ہونا ہی اپنے آپ میں ایک معجزہ ہے۔ بھلے ہی فرا احدلی سے ہو۔ معجزہ اسی قوت کو ثابت کرتا ہے جو اسے ثابت کرتی ہے۔

"میں سمجھی نہیں۔"

"میڈلین پہلے تم پال ویلری پڑھتی تھیں اور میں رے نرمادیا رلکے پڑھتا تھا۔ اور اب تم رلکے پڑھتی ہو۔"

"اور کیا اب تم ویلری پڑھتے ہو؟"

"ہاں جب میں ہندوستان میں تھا تو اسے خوب پڑھا تھا۔ ویلری ویدانت کے کافی قریب ہے۔ رلکے کے فرشتے مجھے بور کرتے ہیں۔ وہ ٹیگور کی گنگا کی طرح اکتا دینے والے ہیں۔ سورگ کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔"

"ایسا کیسے؟"

"دنیا یا غیر حقیقی ہے یا حقیقی۔ یا سانپ ہے یا رسّی۔ دونوں کے بیچ میں کچھ نہیں ہے۔ اور جو کچھ بھی درمیان ہے شاعری ہے۔ درویشی ہے۔ آپ سانپ کے اندر کھڑے ہو کر بے شک 'نہیں نہیں یہ رسّی ہے' کی رٹ لگا سکتے ہیں۔ اور سانپ سے رسّی کو دیکھنا سورگوں، سنتوں، اوتاروں، دیوتاؤں، سورماؤں اور کاہناتوں کو دیکھنے کے مترادف ہے۔ کیونکہ آپ جہاں بھی جاتے ہیں سانپ کی آنکھ سے ہی دیکھتے ہیں۔ آپ اسے ثنویت کہیں یا ترمیم شدہ ثنویت آپ سورگ تک ایک بُرج ایجاد تیار کرتے ہیں اور رسّی کی جانب سانپ کے مقام سے نگاہ ڈالتے ہیں۔ آپ محسوس کرتے ہیں آپ ہی سانپ ہیں۔ آپ ہیں رسّی ہے۔ لیکن سچّی بات یہ ہے کہ آپ جیسی بھی نظر سے دیکھیں کہیں کوئی سانپ نہیں ہے۔ سانپ کبھی تھا ہی نہیں۔ آپ نے اپنی آنکھیں ڈھلتی شام کی نذر کر دیں اور پکار اُٹھے "ارے۔ رے۔ رے یہ تو سانپ ہے۔" آپ دوڑتے ہیں، بھاگتے ہیں، زمین پر لوٹتے ہیں۔ روتے چلّاتے ہیں اور درد کے کارن اپنے یا دوسروں کے درد کے کارن ترس کھانے لگتے ہیں۔ آپ سانپ کو دیکھتے ہیں۔ اور ڈر کے مارے یہ محسوس کرتے ہیں کہ آپ خود ہی سانپ ہیں۔ درویش ہیں۔ یہ کوئی گرو ہوتا ہے۔ جو تمہیں روشنی دکھاتا ہے تب وہ سڑک نظر آنے لگتی ہے۔ لمبی سفید سڑک۔ باضابطہ ستاروں کی ہم سفر۔ "یہ تو محض رسّی ہے۔" وہ تمہیں دکھاتا ہے۔ آپ اپنی آنکھ مل کر دیکھتے ہیں تو آپ کو پتہ چلتا ہے کہ سانپ کبھی تھا ہی نہیں۔ وہ کہاں تھا کہاں۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں۔ وہ شاعر جس نے رسّی کو سانپ کی طرح دیکھا سانپ بن گیا اور اس طرح سنت، درویش۔ اب درویش کو یہ سمجھایا جاتا ہے کہ اس کی درویشی اس کی شناخت تھی، اس کا حاصل احساس نہیں تھا۔ واقعی اور حقیقی کا کوئی نام نہیں۔ رسّی اپنے لیے رسّی نہیں ہے۔"

"تو پھر کیا ہے؟"

"رسّی۔ سانپ کے مدِ مقابل کی طرح نہیں بلکہ رسّی بس ہے۔ اور اس لیے کوئی دنیا نہیں ہے۔"

لیکن کوئی بی ٹریس تو ہو سکتی ہے؟" اس نے التجا کی۔

"ہاں" میں کافی دیر کے بعد کہا۔" ہاں جہاں میں نہیں ہو۔ جب میں مے ترے یی میں خود سے پیار کر سکتا ہوں تو یاگیہ ولکیہ ہو سکتا ہوں"

"تب میرے دوست تم کوئی ہندوستانی مے ترے یی ڈھونڈ لو۔ مجھے سرحدوں پر رہنے والی عورت ہی رہنے دو۔"

"اناوِرامارشاسا" میں مسکرایا۔

"جی ہاں۔ میرے شہزادے"

"وہ جو" میں نے ایک قدیم صحیفے کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔" نہ جسم ہے، نہ ذہن ہے۔ نہ حواس ہے وہی سچّا شہنشاہ ہے"

جنگ آخر ختم ہوگئی۔ میں بڑی دیر تک میڈلین کے کمرے میں بیٹھا رہا ہوں گا کیونکہ جب میں وہاں آیا تھا تو چاند آکاش میں اونچائی پر تھا اور اب وہ کیتھیڈرل کے مینار کے پیچھے چھپ گیا۔ رات الوؤں، جھینگروں اور دور سمندر کے شور سے سنگیت سے بھر گئی تھی۔ رات کی خاموشی میں خاص طور پر سردیوں میں آپ وہاں سے جہاں ہم بیٹھے تھے سمندر کا شور سن سکتے تھے۔ اور دنیا چاہے حقیقی تھی یا غیر حقیقی سمندر بہرحال کسی بے نام چیز کا ثبوت تھا" سمندر۔ سمندر۔ سدا نیا نویلا"

میں کچھ روز بعد شہر گیا۔ اور میڈلین کے لیے کریپ سول والے مضبوط دیہاتی جوتے لے کر آیا۔ اور ایک روز جب اس کے پیر کا زخم قریب قریب مندمل ہو چکا تھا میں نے اس کے پیر پر پٹی باندھتے ہوئے کہا۔" میڈلین میں نے تمہارے ساتھ ایک چالاکی کی ہے۔"

"وہ کیا ہے؟" اس نے مسکرا کر کہا۔ لیکن وہ لگاتار کم کھانے اور بستر میں لیٹے رہنے کے کارن بڑی کمزور ہو چکی تھی۔ اس کی آواز میں وہ نرمی، ملائمت اور افسردگی تھی جو لگاتار دعا پرار تھنا، مون برت سکوت اور حلیمی کے عالم میں رہنے والے لوگوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔

لیکن میں تمہیں ایک کہانی تو سنا دوں۔ یہ وہ کہانی ہے جو رام کرشن پرم ہنس اکثر دہرایا

کرتے تھے۔ یہ ایک ویدانتی کتھا ہے اور کچھ اس طرح ہے:

"ایک دفعہ کا ذکر ہے، بہت زمانہ پہلے ایک نیک آدمی تھا۔ وہ جو بھی کام کرتا تھا بڑی لگن سے کرتا تھا۔ مان لیجئے وہ تارن تیز تھا۔ ایک دن شدید گرمی پڑ رہی تھی۔ وہ اپنے آپ سے کہنے لگا۔ آنگن میں بھی تیز دھوپ ہے اور سڑک پر بھی۔ اس نے کچھ دور نگاہ دوڑائی اور کہنے لگا دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں میں بھی گرمی ہے اور پہاڑی پہ بھی گرمی۔ نیچے وادی میں بھی گرمی ہونی چاہیے۔ اور ندی اور شہروں سے بھی پرے بھی گرمی ہونی چاہیے۔ ریگستانوں اور دھول بھرے میدانوں میں بھی شدید گرمی ہونی چاہیے۔ مطلب یہ ہے کہ ساری دنیا میں گرمی ہوگی۔ اس لیے اس نے اپنے آپ سے کہا مجھے اس جھلسا دینے والی گرمی سے اپنے آپ کو محفوظ کرنا چاہیے۔ میں ساری دھرتی کو چمڑے سے ڈھانپ دوں۔ میں اچھے مضبوط چمڑے کو کاٹ کر اور سی کر دھرتی کے ہر ایک حصے کو ڈھانپ دوں گا اور اس طرح میں کہیں بھی جاسکوں گا۔ یہ کہتا ہوا وہ پھیتی پہ چڑھ گیا اور جانوروں کی کھالوں کے بڑے ٹکڑے لے آیا اور انھیں کاٹنا اور انھیں سینا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر باڑے میں کھڑا بیل زور زور سے ہا۔ہا کر کے ہنس پڑا۔

"اس بھلے آدمی نے پوچھا" اے بیل تم مجھ پہ ہنس رہے ہو، کیوں؟

"ہاں، میرے معزز آقا میں واقعی ہنس رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ میری طرح آپ بھی محسوس کرتے ہیں کہ ساری کی ساری وسیع دنیا میں بہت گرمی اور آپ اپنے آپ کو گرمی سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں اور اسی لیے ساری دنیا کو چمڑے سے ڈھانپ دینا چاہتے ہیں!

"ہاں میں نے ٹھیک ایسا ہی سوچا تھا۔ لیکن تمہیں اس بات کا کیسے پتہ چلا!

"جب میں کھیت جوتتا ہوں اور چھکڑا کھینچتا ہوں تو مالک کو مجھے کچھ زیادہ کہنا نہیں پڑتا!

"نہیں، یقیناً نہیں۔ میرے کوڑا اٹھانے سے پہلے ہی تم جان جاتے ہو کہ مجھے

کٹھل کے کھیت میں جانا ہے یا میرے جوئے پر بیٹھنے اور، ہوئے، کہنے سے پہلے ہی تم سمجھ جاتے ہو کہ میں سدھ پورا یا رام پورا کے میلے میں جا رہا ہوں۔ یہ صحیح ہے۔ لیکن تم ہنسے کیوں تھے ؟

"میرے عالم و فاضل آقا میں سوچ رہا تھا کیسی عجیب بات ہے کہ میرے آقا دنیا کو چمڑے سے ڈھانپ دینے کے بارے میں سوچیں۔ کھال کو کاٹنے، سینے اور پہلے آنگن کو پھر سڑک، جوتے ہوئے کھیتوں، خاموش کھڑے ہوئے جنگلوں اور ندیوں کے کناروں پر پھیلی ریت کو ڈھانپتے ڈھانپتے بہت دن لگ جائیں گے۔ سردی ختم ہو جائے گی اور پھر گرمی آجائے گی۔ سورج نکلے گا، دھوپ تیز ہو جائے گی اور پھر سورج ڈوب جائے گا۔ میرے آقا بوڑھے ہو جائیں گے۔ ان کے بال بچّے ہوں گے اور دھرتی کو ڈھانپنے کے لیے چمڑا سیتے سیتے وہ بھی بوڑھے ہو جائیں گے۔ بیل مر جائیں گے اور ہاتھی اور گھوڑے بھی، بکریاں بھی اور دھرتی کو ڈھانپنے میں طویل عرصہ لگ جائے گا۔ بلا شبہہ یہ دھرتی ایک لمبی مدّت کے بعد روز و شب کے ایک طویل سلسلے کے بعد ایک روز ڈھک جائے گی۔ میں نے سوچا اگر اس کے بجائے میرے آقا جو ہر چار مہینے کے بعد میرے کھروں پر نال لگواتے ہیں۔ اپنے لیے ایک جوڑی اچھی چپل بنا لیں تو گرمی سردی میں اپنی مرضی کے مطابق کہیں بھی جا سکتے ہیں۔ کھیتوں میں جنگلوں میں کہیں بھی اور گرمی سے ان کے پاؤں نہیں جھلسیں گے۔"

"وہ بھلا آدمی جانور کے جواب سے اس قدر خوش ہوا کہ اس نے اسے خوب زور سے اچھی طرح تھپکی دی اور اسے سہلایا۔ اس طرح بیل کی پشت پر کوبڑ ہو گیا اور گردن کے نیچے کھال لٹکنے لگی۔ پھر مالک ہنسا۔ جی ہاں مالک نے قہقہہ لگایا اور اس قہقہے میں پیڑ اور پہاڑیاں بھی اس کے ساتھ ہو گئے۔ پھر اس عقل مند آدمی نے اپنا چھکڑا جوتا اور رام پورا، سدّا پور رہ گیا اور اپنے لیے ایک جوڑی سلیپروں کی بنوائی۔ اب وہ آزادی سے گھوم پھر سکتا تھا اور وہ اپنی آزادی سے خوش تھا۔

"اور جب وہ بیل مرا تو یہ عین فطری تھا کہ وہ بھگوان شو کے کیلاش پربت

پر پہنچ گیا اور نندی کا سیوک، ساتھی بن گیا۔

میڈلین میرے ساتھ ہنسی۔ بڑی نرم، ملائم ہنسی جو چوہے کی آواز یا ننھے منے خرگوش کی آواز جیسی تھی۔ میں اس کا پاؤں دھو چکا تھا۔ زخم کے نیچے کی جلد رفتہ رفتہ سرخ اور صحتیاب ہو رہی تھی۔

اپنے کمرے میں لوٹتے ہوئے میں نے اسے بتایا "یہ رہے تمہارے جوتے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ہندوستان دل سے محروم ہے۔ عقلمند بیل کی طرح ہم سب اچھے آدمیوں پر ہنستے ہیں۔"

"یہ کہانی پادری اور اس کے عقلمند کُتّے کی قدیم داستانوں جیسی ہے۔"

"عقل و دانش خوش قسمتی سے ہندوستان کا اجارہ نہیں ہے۔ لیکن اگر آپ ایکس سے شروع کر کے اس گرم زمین کو ڈھانپنا شروع کر دیں۔۔۔" اس بار وہ کھلکھلا کر اس زور سے ہنسی کہ ہنستے ہنستے اس کے پیٹ میں درد ہونے لگا۔

"تمہیں سو سے بھی زیادہ جنم لینے ہوں گے۔ خوش قسمتی سے تم پُنر جنم میں اعتقاد رکھتی ہو۔"

"ہم یورپی لوگ اچھا انسان بننے میں یقین رکھتے ہیں۔" اس نے سوچ کر اپنی بات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"اور ہم ہندوستانی دانش مندی میں"

"مجھے سرحدوں پر رہنے والی عورت ہی رہنے دو۔" اس نے التجا کی۔

"اور مجھے برہمن، ایک بیل۔"

اسے میرے لائے ہوئے جوتے پسند آئے۔ وہ مٹ میلے رنگ کے اور نیلی کناری والے تھے۔ مجھے خوش کرنے کے لیے اس نے انہیں اس دن پہنا جب میں پیرس اور لندن جا رہا تھا۔ میرا تحقیق کا کام کم و بیش ختم ہو گیا تھا اور مجھے برٹش میوزیم میں اور بوڈلین میں صرف کچھ مسودوں کو دیکھنا تھا۔ تب میں اپنے تھی سس کا کام شروع کر سکتا تھا۔ غالباً چھٹیاں شروع ہونے سے پہلے میں نے سب ضروری کاغذات اور کتابیں

اپنے بکس میں رکھیں۔ بہت سے گرم کپڑے بھی رکھ لیے اگرچہ سردی فی الحال ہلکی تھی لیکن میں نے سوچا ممکن ہے جلد ہی تیز سردی بھی پڑنے لگے۔ میرا بکس بہت بھاری تھا۔ لیکن میڈلین نے ہمارے پڑوسی سے سائیکل ٹھیلا لے لیا اور مجھے اپنا سامان اٹھانے سے منع کر دیا" میں احمق بھلا آدمی ہوں" اس نے کہا۔ وہ مجھے بس اسٹاپ تک لے آئی۔

راستے میں کہنے لگی" میں ایک شرارت کرنا چاہتی ہوں۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گی اور سیاں شارل پہنچ کر تمہیں الوداع کہوں گی" اس لیے ہم دونوں بس میں بیٹھ گئے۔ ایک دوسرے کے نزدیک ایک دوسرے کی تمازت کے حلقے میں لیکن مقدر کی بے ربطی کے احساس کے ساتھ۔

بس بُری نہیں ہے۔ ہے کیا۔ ہم ہمیشہ زیادہ اخراجات والے طریقوں کے پیچھے کیوں بھاگتے ہیں ٹیکسیوں میں گھستے نکلتے رہتے ہیں جبکہ اتنے سارے لوگ دکھ اٹھا رہے ہیں۔ تمہارے پتاجی مہاراجہ نہیں تھے اور نہ ہی میرا باپ ایک اچھے بورژوا کے علاوہ کچھ اور تھا۔"

بس تو ٹھیک ہے لیکن یہ بدبو اور دھکا پیل۔ میڈلین، تم جانتی ہو میرے سونگھنے کے اعضا برہمنی عناصر کے بنے ہوئے ہیں"

" جبکہ میں انقلاب کے نتیجے کے طور پر آزاد کیے گئے کھیت مزدوروں کی پڑپوتی ہوں۔ میرے لیے انسان کی ذات شفیق اور ہزار خوبیوں والی ہے۔ یہاں تک کہ اس بدبو سے بھی میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں"

" ہاں سرحدوں پر رہنے والی خاتون!" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

سیاں شارل میں اس کے میرا بھاری سامان اٹھانے پر میں نے احتجاج کیا۔ قلی آگئے۔ میں نے اپنے لیے فرسٹ کلاس کا ٹکٹ خریدا۔

" آہ مہاراجہ!" اس نے کہا" تم تو ہمیشہ کے پاشا ہو"

میں ڈبے میں داخل ہو گیا۔ میری روانگی کے اعزاز میں میڈلین نے زرد رنگ

کی اور رنگ آبادی ہمرو جیکٹ پہن رکھی تھی جو میں اس کے لیے ہندوستان سے
لایا تھا۔ جیکٹ کے زرد رنگ کے مقابلے میں اس کا اپنا رنگ کچھ زیادہ ہی پیلا تھا۔
لیکن جب گاڑی مجھے لے کر جا رہی تھی تو وہ میری میڈلین کتنی سچی اور کھری لگ
رہی تھی۔

دیوی۔ دیوی ایم پشچمتے رام شر سا پدپم کج سپرش

اے دیوی۔ آخری بار
رام کا سر تمہارے چرن کمل کو چھوتا ہے۔

جیسے جیسے گاڑی شمال کی جانب بڑھی اور ہم اے گئے ارتے رے سکن، اسوی ادن، اور ینچ سے گزرے تو ہوا میں موسم بہار کی سی اچھی خاصی سرشاری آتی گئی۔ اگر ابھی فروری کا وسط تھا۔ مجھے ساوتری کا خیال آیا۔ اس کے کئی خط آئے تھے۔ وہ اب آسام میں تھی اور اس کے خطوں میں وہاں کی برسات، بھوٹیانا گاؤں اور کافی کے باغات کا ذکر ہوتا تھا۔ "بڑا خراب لگتا ہے۔ لگاتار اس طرح بارش ہوتی رہتی ہے۔ جیسے دھرتی کی پیاس بجھنے میں نہ آتی ہو۔ استقبالیے دیتی ہوں اور ہماری نئی جمہوریت مضبوط ہو رہی۔ منسٹر اور اسٹیٹ سکریٹری آتے جاتے رہتے ہیں اور میں سوچتی ہوں ہم یہ کیسا ہندستان تعمیر کر رہے ہیں؟۔ رام مجھے یہ سب دیکھ کر دکھ ہوتا ہے۔ کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ ہمارا ملک بڑوسی ملک چین جیسا بن جائے۔ کچھ دوسرے لوگ چاہتے ہیں سفید چمڑی والے انگلستان کی طرح بنے۔ کوئی نہیں چاہتا کہ ہندوستان، ہندوستان رہے۔ نہرو تو ہملٹ ہے جو بلاشبہ چاہتا ہے کہ اس کا پاگل پن دانش مندانہ ہے جبکہ دوسروں کو صرف بھوت پریت ہی دکھائی دیتے ہیں۔ اوفیلیا بے شک مر گئی ہے اور زیر خاک دفن ہے۔ شیلانگ میں پولو کھیلتے ہوئے پرتاپ کو چوٹ لگ گئی تھی۔ خط لکھنا۔ س" میں نے اس کا خط بار بار پڑھا اور اس کا ایک ایک لفظ میری سمجھ میں آ گیا۔ اس کے حروف کی ساری باریکیوں کو سمجھ گیا۔ میڈلین کے ساتھ ہر چیز تشریح تھی؛ تفسیر تھی۔ ساوتری کے یہاں پہچان تھی، اعتراف تھا۔

ہیملٹ نہرو نہیں تھا، میں تھا۔ میری دیوانگی میں ذہانت کا دخل بھی نہیں تھا۔ میں سر پکڑ کر رو سکتا تھا ... کے بجائے میں جاگیرداروں کے خوبصورت گھر دیکھتا۔ جن کے محراب دار چھو... چھوٹے راستے اچانک مڑ جاتے اور دائرۂ ادراک میں آجاتے۔ چھکڑوں میں جتے گھوڑے ... اور کھاد ڈھوتے اور مرغیاں اور بطخیں لیے

آنگن میں آزادی سے اڑتی پھدکتی رہتیں۔ مجھے ایک فرانسیسی شاعر کی یاد آگئی جو مجھے پیرس کی ایک محفل میں ملا تھا۔ اس نے کہا تھا:

"کسی لکھنے والے کے لیے بہترین پیشہ لیول کراسنگ کی چوکیداری ہے۔ اور اس کے ساتھ کلکاریاں مارتے ہوئے بچّے ہونے چاہئیں۔ آپ کو صرف لال اور ہری جھنڈیاں دکھانی ہے اور وہ بھی گھنٹی بجنے پر۔ آپ کورٹ مارشل کے انداز میں کسی فوجی عدالت کے سامنے ایک بھگوڑے کی طرح کھڑے ہو جاتے ہیں اور بچّے ہیر پرکے پیچھے سے چلّاتے ہیں۔ گھونسے دکھاتے ہیں اور کبھی کبھی اپنی پینٹوں میں سے ننھا شیطان بھی دکھاتے ہیں۔ بڑا مزا آتا ہے۔ بعد دوپہر آپ دودھ اور ساسیجز لینے نزدیک کے کسی فارم پر جاتے ہیں۔ پولش لڑکیوں سے تھوڑی گپ شپ کرتے ہیں۔ فرانس کے دیہات میں بہت سی پولش لڑکیاں رہتی ہیں۔ اور پھر شاعری کرنے کے لیے گھر لوٹ آتے ہیں۔ جدید شاعر کے لیے یہ آدرش زندگی ہے۔ ظاہر ہے آپ کی بیوی موٹی اور جھگڑالو ہونی چاہیے لیکن بہت جھگڑالو نہیں۔ آپ جو کچھ بھی لکھتے ہوں وہ اس کا ایک لفظ بھی نہ سمجھتی ہو۔ لیکن بستر میں گرمی دیتی ہو اور ضروری تعداد میں بچّے پیدا کر دے۔ اس طرح تمہارے تین کام ہیں۔ فرصت میں شعر کہنا۔ گھنٹی بجنے پر راستہ روکنے والا ڈنڈا نیچے کر دینا اور مناسب اور ضروری تعداد میں بچّے پیدا کرنا جس سے سرکار ہم سب کو لگاتار اور اچھی طرح خوراک مہیا کرتی رہے۔ اس صورت میں آپ بادلیر کی طرح لکھ سکتے ہیں۔"

میں نے اس ادھیڑ عمر کے بارے میں سوچا جس کی آنکھوں میں جوشِ شاعری تھا لیکن جس کا جسم ان میں سولین کے تعلق سے باعث کمزور تھا۔ وہ جلدی ہی مرنے والا تھا اور وہ بھی رقص و موسیقی کے اور اپنے کام کے بغیر۔

اسٹیشن پر کیتھرین اور جارجز موجود تھے۔ حالانکہ میں نے انھیں نہ آنے کے لیے التجا کی تھی۔ "رام میرے باپ کے مؤکل نہیں ہیں۔ ہیں کیا؟" پھر بھی میں اکثر جاتی ہوں اور اپنے باپ کے مؤکلوں کو کسی نہ کسی بہانے سے لے آتی ہوں۔ اس کے علاوہ ہمارے

پاس کار بھی ہے۔" وہ مجھے سیدھے ہی روشیل آنج میں اپنے فلیٹ میں لے گئے۔ جبکہ میں نے ان سے کوارٹیر لیٹن میں کمرہ ریزرو کرانے کے لیے کہا تھا

"یہاں سے تمہیں سوربون دور پڑے گا۔" کیتھرین نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں گھر بھر کی شوفر ہوں۔ مجھے پیرس میں اِدھر اُدھر گھومنا اچھا لگتا ہے۔ پیرس کا باسی بڑا ذہین جانور ہے۔ اسے دیکھنے میں مزا آتا ہے۔"

روشیل آنج والا فلیٹ پرانی طرز کا، بے ڈھنگا، بھدّا بڑا سا فلیٹ تھا۔ اس میں ہر جگہ الماریاں تھیں۔ بڑے بڑے برآمدے تھے اور بدبودار کونے گوشے تھے۔ میرا اپنا کمرہ کچن کی بغل میں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔

"یہاں مناسب درجۂ حرارت میں تم آرام سے رہو گے اور ہمارا وعدہ رہا جب تک تم یہاں رہو گے ہم گوشت نہیں پکائیں گے۔ ہم کھانا کھانے کے لیے بہ آسانی رستوراں میں جا سکتے ہیں۔ اور صبح جیسا کہ ہم جانتے ہیں تم جلدی اُٹھ جاتے ہو اور اپنا برہمنوں والا اشنان کر لیتے ہو اس لیے یہ رہا دودھ اور کافی۔ آرام سے یہاں گھر کی طرح رہو۔"

چارلز بہت خاموش اور کھویا کھویا سا رہنے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں کی تیز پُرجوش چمک جاتی رہی تھی بلکہ اب اس میں پختگی، سادگی اور علیحدگی آ گئی تھی

"اچھا جناب" اس نے کہا "پیرس ایکس نہیں ہے۔ یہاں کرنے کے لیے ضرورت سے زیادہ کام ہیں۔ پیرس میں طالب علم کم کام کرتا ہے۔ اس کا دھیان کئی باتوں سے بٹتا رہتا ہے۔ لیکن وہ چیزوں کو بہت جلد سمجھ لیتا ہے۔ سترہ برس کی عمر میں ہی وہ اتنا ہوشیار ہو جاتا ہے یہ سوچ کر بڑی حیرانی ہوتی ہے۔ یہ نسل جس نے جنگ کے دوران بچپن سے جوانی میں قدم رکھا ہے وہ غیر معمولی طور پر ذہین ہے۔ لڑائیاں بالآخر ایسی بری نہیں ہوتیں شاید!"

رات کا کھانا میز پر لگا دیا گیا تھا۔ کیتھرین بڑی خوبصورت لگ رہی تھی۔ میں رشک کرنے لگا کہ شادی کسی کو اس حد تک اطمینان اور خوشی عطا کر سکتی ہے۔ وہ خوش تھی اور ہر چیز کے بارے میں بڑے اعتماد کے ساتھ بات کرتی تھی۔ چچا چارلس بہرحال بوڑھے ہو رہے

تھے۔ ان میں اب پہلے جیسی توانائی نہیں تھی۔ اور وہ اپنی وریدوں کی سوزش کے باعث فکر مند تھے۔ انھیں جلد ہی لیوک سیل جانا پڑ سکتا تھا۔ تانت روبی کا دورہ خطرناک نہیں تھا لیکن اس کے پہلے جیسا ہو جانے کا اب کوئی امکان نہیں تھا۔ وہ حال ہی میں اپنے پہلے شوہر کی بہن ڈائنے کے پاس گئی تھی جو برسلز میں ایک بیوپاری کے ساتھ بیاہی ہوئی تھی۔ نارمنڈی میں ان کی بہت بڑی حویلی تھی۔ بحری ہوا۔ استقبالیوں کے ماحول کشتی رانی وغیرہ سے یقیناً ان کی صحت پر اچھا اثر پڑنے کی امید تھی۔ لیکن جب وہ لوٹ کر آئی تو پہلے سے زیادہ تھکی تھی۔ جب انسان بوڑھا ہو جاتا ہے اس کی خوشی بھی کم ہو جاتی ہے۔

"ایک دن میری بچی۔ میں اپنے آپ سے کہتی ہوں، کیتھرین نے کہا" تم بھی بوڑھی ہو جاؤ گی۔ تب تک ہم نوجوانوں کی طرح رہیں۔ کیا خیال ہے جارج تمہارا؟"

"تمہارے لیے ایک خوشخبری ہے میرے پاس،" جارج نے اپنے خیالات کی رَو میں اور میز پر پڑے چاقو سے کھیلتے ہوئے کہا۔ وہ لمحہ بھر خاموش رہا۔ بڑی عقیدت سے کیتھرین کی جانب دیکھا اور پھر اس نے یہ اعلان کیا "کیتھرین پانچ چھ مہینوں میں ماں بننے والی ہے۔ اور رام! تم پہلے شخص ہو جسے میں یہ خبر سنا رہا ہوں۔"

آج تک میں نہیں بتا سکتا کہ کیوں ایسا محسوس کیا۔ لیکن بہر حال میں نے محسوس کیا کہ گنگا ندی میں بار بار ڈبکی لگا کر میں پوتّر اور مکمل ہو گیا ہوں اور شراون مہینے کے سنیچروار کی دھوپ سے جگمگا اٹھا ہوں۔ میں خاصا جذباتی لگ رہا ہوں گا کیونکہ کیتھرین نے میرے سامنے سوپ رکھا۔ سر دجا کے انداز میں میرے سر کو چھوا اور بولی۔

"جب وہ بڑا ہو گا تو تم اس کی دیکھ بھال کرو گے اور اسے اپنی ساری دانشمندی عطا کرو گے۔ کرو گے نا!"

ہم کافی دیر تک خاموشی سے سوپ لیتے رہے ہوں گے کیونکہ اس کے بعد جو پہلا سوال سامنے آیا وہ کیتھرین کی طرف سے نہیں تھا بلکہ جارج نے یہ سوال پوچھا تھا۔

"مادو کیسی ہے؟"

"وہ مجھ سے زیادہ ہندوستانی ہے۔ وہ پہلے ہی بدھ دھرم کے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتی ہے"

"کیتھرین۔ میں کہتا ہوں تمہیں روسی زبان سیکھنی چاہیے۔ تم میرے اجداد کی زبان سیکھے بغیر مجھے کبھی نہیں سمجھ سکتی۔ مجھے قطعی طور پر کوئی شبہہ نہیں کہ میرے تمام تر خفیہ افکار روسی زبان میں ہی تشکیل پاتے ہیں!"

"تم تین بچے اور اپنے لیے ایک اچھا سا گھر چاہتے ہو۔ اور تم یہ بھی چاہتے ہو کہ میں تمہارے کام میں مدد کروں۔ واہ واہ" کیتھرین نے کہا "مرد کبھی عورتوں سے مطمئن نہیں ہوں گے"

"یہ سب تم رام کے سامنے کہہ رہی ہو!"

"لیکن رام۔ نہیں ہے۔ نہیں ہے" کیتھرین مناسب الفاظ تلاش کرنے کی کوشش میں تھی۔

"مرد نہیں ہے" جارجز نے سرگوشی میں کہا اور ہم سب ہنس پڑے۔

"نہیں میرا مطلب ہے وہ عام مردوں جیسا نہیں ہے۔ وہ ہندوستانی ہے"۔ اس نے اپنی بات پوری کی۔ اس یقین کے ساتھ کہ اس نے میری تعریف پیش کر دی ہے

جب ہم سونے کے لیے اُٹھے تو صبح کا ایک بج چکا تھا۔ کیتھرین نے دروازے پر مجھے الوداع کہا اور مجھے رخساروں پر چوما۔

"میں کہنا چاہتی ہوں تم میرے لیے ایک پرارتھنا ایک دعا کی طرح ہو۔ جی ہاں دُعا۔ میں پھر کہتی ہوں۔ تم کس قدر پرائے ہو گئے میرا مطلب ہے۔ قدیم۔ قدیم۔ رام!" اس نے اپنی بات میں اضافہ کیا اور پیار بھری لمبی سانس لی۔ میں سو گیا اور پہلی بار مجھے خوب گہری نیند آئی۔ کوئی خواب نہیں آئے۔ صبح اُٹھ کر میں نے میڈلین کے بارے میں سوچا۔ میں جانتا تھا اس کو بھی خوب گہری نیند آئی ہو گی۔ افسوس کی بات ہے کہ صبح اُٹھ کر اُسے اپنے لیے خود کافی بنانی پڑی ہو گی۔ مجھے خیال آیا لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ آج تو دیروار تھا۔ اور اسے کام پر نہیں جانا تھا۔ میں

پھر سو گیا اور گھنٹہ بھر سوتا رہا۔ جب اُٹھا تو کیتھرین رسوئی میں کافی کے بیج پیس رہی تھی۔

"اس بار میں کافی لاؤں گی" اس نے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے کہا "آج برہمن کو بستر میں ہی کافی ملے گی۔ وہ معمولی اصولوں کی خلاف ورزی کے جرم میں اگلے جنم میں جانور نہیں بن جائے گا۔ تم کہتے ہو کہ میری حالت میں عورتیں شُبھ ہوتی ہیں" اس نے بات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا "اس لیے میرے جیجاجی یہ لو شُبھ کافی!" یہ کہہ کر وہ دروازہ بند کر کے چلی گئی۔

میں نے پہلے کی طرح اپنا وقت ریلو دے رش لیے اور سوربون میں بانٹ لیا۔ کیتھرین روز صبح مجھے ببلیو تھکیہ نیشنیل لے جاتی۔ پہلے کچھ دنوں میں اس نے زور دیا کہ میں لنچ کے لیے گھر آجایا کروں اور وہ ہر روز مجھے لینے آجاتی۔ لیکن بہت جلد اسے یہ احساس ہو گیا یہ طریقہ زیادہ دیر تک نہیں چل سکتا۔ اس لیے وہ مجھے سینڈوچ دے دیتی اور میں کسی پُرسکون کیفے میں جا کر چاکلیٹ پی گیا۔ وہاں کافی دلچسپ لوگ آتے تھے۔ روز روز دیکھنے کے بعد میں ان کے چہرے اور ان کی خصوصیات پہچان گیا تھا۔ ان میں سے ایک اسیریائی علوم کے بارے میں تحقیق کر رہا تھا۔ بادشاہت اور گرامر سے متعلق سمیریائی صحیفوں کے بارے میں۔ دو زبانوں والے ان نسخوں کی مدد سے جو آسر بانی پال کی لائبریری میں موجود تھے۔ ایک دوسرا شخص وسطی ایشیا کے ملبوسات کے پیٹرن نقل کر رہا تھا۔ خاص طور پر عورتوں کے ملبوسات کے۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ نیس ٹورین عیسائیت کا آغاز خالصتاً بدھ مت سے ہوا۔ کیونکہ عورتوں کے ملبوسات پر صلیب کا نشان نہیں ہوتا تھا۔ دراصل وہ آج تک ایک ایسا کراس پہنتی ہیں جو بدھ دھرم کے سواستک سے ملتا جلتا ہے۔ یہ علماء اپنے کام کے بارے میں گفتگو کرتے تھے۔ اور میں اپنے کام کے بارے میں لیکن عجیب بات یہ تھی کوئی کسی دوسرے کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ تحقیق ریگستان میں راہ گم کردہ شخص کی طرح ہے۔ آپ جدھر بھی نگاہ دوڑائیں صرف ستاروں کو ہی دیکھ سکتے ہیں۔ ہر جگہ آپ کو کوئی نہ کوئی ستارہ نظر آئے گا۔ اور اس پر نظر یں جمائے دھول مٹی اور جنگل میں سے گزرتے

ہوئے آپ یقیناً ایک ایسی سلطنت تک جا پہنچیں گے جہاں یقیناً ایک شہزادہ ہوگا جس کی شادی کے لائق بہت سی بیٹیاں ہوں گی۔ اگر آپ صحیح کام صحیح طریقے سے کریں گے۔ یعنی اگر آپ مقام، رنگ اور چلن کے اعتبار سے اپنے کسی مخصوص ستارے کے ذکر سے آغاز کر کے علم نجوم کے بارے میں اپنی گفتگو کے ذریعے اپنی طبع زاد ذہانت کا اظہار کر سکیں گے تو آپ پورے کے پورے گول آسمان کا قطعی طور پر مختلف نقشہ پیش کر سکیں گے۔ یہ سب اس بات پر منحصر ہے کہ آپ شروع کہاں سے کرتے ہیں۔ اور انجام کار ہمیشہ ایک شہزادی ہوگی جو آپ سے شادی کرنے کے لیے آپ کی راہ دیکھ رہی ہوگی۔

میرا استارہ، میرا منفرد ستارہ اس تھیوری کی شکل میں تھا کہ ایران، ترکی اور بلگاریہ کے درمیانی علاقے میں کہیں غالباً یوفرے ٹس کی وادی میں یا پھر کہیں اوپر ایشیا مائنر میں جہاں پر انسانی تہذیب کے نشانات موجود ہیں مجھے یقینی طور پر ہندوستان کے کیتھار بدعت کے ساتھ تعلق کا براہ راست ثبوت ملے گا۔ میں نے اس سلسلے میں بہت سی کتابوں مطالعہ کیا۔ میری رہنمائی بیشتر اس فطری احساس نے کی جو تحقیق کرتے ہوئے طالب علم کے اندر پیدا ہو جاتا ہے۔ اور جب ذہن اور جسم پوری طرح فعال ہوں تو کم و بیش بس دیکھتے ہی ایک نظر میں ہی وہ کہہ اٹھتا ہے "اس کتاب میں اس بھاری بھرکم پُرجوش صحیفے میں ہی۔ غالباً اس کے دوسرے حصے میں۔ نہیں درمیانی یا تیسرے حصے میں میرا مخصوص حوالہ موجود ہوگا" میں نے اس طریقے سے بہت سی معلومات جمع کر لی تھیں۔ جارجز یہ کہہ کر میرا مذاق اڑایا کرتا تھا کہ پیشگی ادراک کی یہ قوت بلاشبہ مجھے یوگِک ابھیاس یعنی یوگا کی مشق سے حاصل ہوئی ہوگی۔

"تمہیں اپنی قوت ادراک کا اعلان ببلیو تھیکیہ نیشنیل کے دروازے پر ایک نوٹس بورڈ پر کر دینا چاہیے۔ "تحقیق بذریعہ غیب دانی۔ بارہ سبق اور تمام اسرار واضح ہو کر سامنے آ جائیں گے۔" یہ ایک ایسا نیا کام ہوگا جو آج تک کسی نے نہیں کیا۔"

چاہے تمام دوسرے لوگوں میں ایسی وجدانی قوت تھی یا نہیں میری تحقیق بہر حال اہم تھی۔ ویسے میں نے جن تحقیق کرنے والے لوگوں سے بات کی مجھے ایسا لگتا تھا وہ مجھ سے

کہیں بڑھ کر ایسی وجدانی قوت کے مالک تھے۔ میں نے دُرُوزوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا۔ یہ لوگ عربوں کے اس پراسرار فرقے کے لوگ تھے جن کا تعلق اسلام اور عیسائیت دونوں سے تھا لیکن اس کے باوداں کے اپنے پروہت اور اپنے خفیہ صحیفے تھے۔ جن کا امتحان کرنے کی کوئی شخص جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ پھر بھی میں پتہ لگایا پہلے اس غیر معمولی، اگرچہ خبطی شاہی عالم گوبینو کی تصانیف سے اور بعد میں کاونٹ سیلی دے مالن فورٹ کی کتابوں سے جو عربوں کی تاریخ کے بارے میں علم، بصیرت اور نوعیت کی صحت کے اعتبار سے شاہکار تصانیف کا درجہ رکھتی ہیں کیونکہ دروز صحیفوں میں واقعی ہندوستان اور ہندوستانی دانش کے بارے میں حوالے موجود تھے۔ اس نے لکھا تھا" مابعد الطبعیاتی عناصر ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ ینگریت۔ والڈنسی بدعت اور کیتھار تحریک۔ سب کا آغاز ممکن ہے براہ راست ہندو دھرم سے ہوا تھا۔ بودھ افکار سے نہیں جیسا کہ میکس مولر کا خیال ہے"۔ میں نے دروز لوگوں کے بارے میں سیلی کی تمام تحریروں کا مطالعہ کیا۔ مارگین سٹن اور دے لینبی کو بھی پڑھا۔ زبان کے غیر عالمانہ استعمال کے باوجود دے لینبی خلاف توقع بہت بڑا عالم ہے۔ (عالمانہ تحریریں "مجھے کوئی شک نہیں" یا "یہ سوچنا حماقت ہے" جیسے جملے اور غیر عالمانہ زبان کی اجازت نہیں ہوتی) دے لینبی بنیادی طور پر سپاہی اور منتظم تھا یہ دوسری بات ہے دے لینبی وہ شخص تھا جس نے ہندوستان میں سکندر کے حملے اور پیش قدمی کے بارے میں اہم ارک تحریروں کو دریافت کیا تھا اور پھر بڑی مہارت سے ان کو مرتب کیا تھا۔ بہر حال دے لینبی سے مجھے بڑی مدد ملی۔ اور پھر میسی لون کے گہرے علم اور اس کی ہندوستان کے لیے بے پناہ عقیدت سے۔

میرے تھی سس کا کام تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ لیکن دے لینبی کے مزید حوالوں کے لیے مجھے بدلیاں جانا پڑا۔ گیراڈ نے سامی لوگوں کی مسیحی روایت کے بارے میں اپنی تحریریں کچھ اہم مسودوں کا ذکر کیا ہے۔ کیتھرین اور جارجز کے ساتھ کم و بیش ڈیڑھ مہینہ گزارنے کے بعد ان سے رخصت لینے کا میں نے سوچا۔ یہ اچھا بہانہ تھا۔ اس لیے

میں انگلستان پہنچ گیا۔

میں وہاں ۱۹۵۳ء کے موسم بہار کے ان خوبصورت دنوں میں پہنچا جب سارا ملک باہر سے آنے والے مہمانوں کے خیر مقدم کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اب ایک خوبصورت نوجوان عورت انگلستان کی ملکہ تھی اور اس کی تاجپوشی ہونے والی تھی۔ ایسا لگتا تھا پیڑ پودے اور دھرتی بھی انگلستان کی مدد کر رہے ہیں۔ اس بار سردی بھی ہلکی رہی تھی اور خوشگوار اور بہار کا موسم بھی جلدی شروع ہو گیا تھا۔ اور اس کے ساتھ باغوں یا رکوں میں آئیرس کے لال، پیلے اور بینگنی پھولوں کے گچھے کے گچھے کھل آٹھے تھے۔ لندن کے لوگ پہلے سے کہیں زیادہ خوش لباس، شائستہ دکھائی دے رہے تھے۔ ہر آنے والا انگلستان کا مہمان تھا اور انگریز مرد، عورتیں اپنی خوش اخلاقی کو اپنا نجی فرض سمجھ رہے تھے۔ سڑکوں پر شراب کے نشے میں دُھت بہت کم لوگ دکھائی دیتے تھے۔ اور عورتوں کے لباس بہتر ذوق کے آئینہ دار تھے۔ اسٹائل کے اعتبار سے یہ ملبوسات انگریزی طرز کے تھے۔ گھٹیا ڈائر یا فاتھ نہیں تھے۔ انگریزوں کو اس نئے موڈ میں دیکھ کر میں بہت خوش ہوا۔ ان میں شہنشاہی شان و شوکت والے دنوں والا فاتحانہ تکبّر نہیں تھا۔ بلکہ اب ان کا زیادہ دھیان اپنے آپ پر تھا۔ وہ زیادہ ارفع اور پر اعتماد نظر آرہے تھے۔ یہ سچ ہے افریقہ کے تعلق سے ان کا ضمیر صاف نہیں لیکن ہندوستان سے چھٹکارا پاکر وہ بڑی راحت محسوس کر رہے تھے۔ میں ہنس پڑا اور اپنے آپ سے کہنے لگا "اب یہ لوگ کچھ زیادہ ہی برہمنوں جیسے ہو گئے ہیں۔"

آکسفورڈ ہمیشہ کی طرح مہربان اور اطاعت شعار تھا لیکن کیمبرج کے مقابلے میں یہاں کی فضائیں زندہ دلی اور تازگی کچھ کم ہی تھی۔ شاید میں نے کیمبرج کو ساوتری کی نگاہوں سے دیکھا تھا اور اب میں آکسفورڈ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آنند بیلی اول میں تھا لیکن میں اس سے ملنے نہیں گیا۔

میں جلد ہی لندن لوٹ آیا۔ یہاں پہنچ کر مجھے ایک خوشخبری ملی۔ گِکس نے مجھے ساوتری کا ایک خط دیا۔ اس کے خط کھولنے اور پڑھنے کے لیے میں ہمیشہ گرین پارک میں

جایا کرتا تھا۔ گیٹ کے سامنے ۱۴۳ نمبر بس اسٹاپ سے تھوڑی ہی دور ایک لمبا چوڑا میدان تھا جو مجھے خاص طور پر پسند تھا۔ وہاں ایک پیڑ سے ٹیک لگا کر میں کھڑا ہو جایا کرتا تھا۔ آج بھی میں نے وہاں پہنچ کر اس کی تازگی کو محسوس کرنے اور ساوتری کی چھٹی پڑھنے کے لیے اس کے تنے پر اپنے ہاتھ رگڑے۔ ساوتری نے لکھا تھا کہ وہ اپنے پتا جی کے ساتھ تاجپوشی کے موقعے پر انگلستان آ رہی ہے۔ اس کے پتا کا خیال تھا وہ چونکہ انگریزوں کے وفادار رہ چکے ہیں اس لیے ملکہ کی تاجپوشی کے موقعہ پر ان کا انگلستان میں ہونا ضروری ہے۔

" وہ اسے اپنے تئیں وفاداری کا ہی حصہ سمجھتے ہیں۔ ہندوستانی حکومت نے بے شک انھیں نظر انداز کر دیا ہے۔ انھیں کسی وفد کے ممبر کے طور پر باہر نہیں بھیجا گیا۔ ان کا شاہی بھتّہ بھی کم کر دیا گیا ہے۔ 'ان معمولی سرکاری ملازموں، اُجڈ غیر مہذب احمقوں سے کون لڑے۔ انھیں تو میں کلرک کے طور پر بھی نہیں رکھ سکتا۔ ایسا زبردست نکما پن' وہ غصّے میں چلاتے ہیں۔ وہ اپنے "ٹ صاحبوں کے درمیان پہنچ کر خوش ہوں گے۔ پتا جی جیسے فعّال شخص کو بوڑھا ہوتے دیکھ کر دکھ ہوتا ہے۔ اگرچہ سورج پور ایک لاکھ کی آبادی والی چھوٹی سی ریاست تھی پتا جی بہت سے کاموں میں لگے رہتے تھے۔ کم از کم ہاتھی اور گھوڑوں کی دیکھ بھال تو بہر حال تھی ہی اور پھر امرا اور رعایا میں کیسے کیسے شاندار خاندانی جھگڑے ہوا کرتے تھے جنھیں صرف پتا جی ہی سلجھا سکتے تھے کیونکہ وہ چار پانچ، یہاں تک کہ چھ پشتوں سے ایک ایک اہم خاندان کے بارے میں سب کچھ جانتے تھے۔ جب اس سے دل بھر جاتا تو وہ شیر کے شکار پر نکل پڑتے۔ انھیں اس میں بڑا مزا آتا تھا۔ اب شیر کا شکار مہنگا ہو گیا ہے اور اب ان باتوں کا لطف لینے والا ہندوستان میں رہا بھی کون ہے۔ میں انھیں تیرتھ یاترا اور سادھو سنتوں کے درشن کے لیے جنوبی ہندوستان میں جانے کے لیے منانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ شمالی ہندوستان تو ختم ہو چکا۔ جلد ہی یہ ناٹنگ ہل گیٹ کی طرح ہو جائے گا۔ جنوبی ہندوستان میں اب بھی کافی حسن و دانش اور پاکیزگی باقی ہے۔ پتا جی کہتے ہیں کہ وہ پہلے انگلستان

جائیں گے اور وہاں سے لوٹ کر کیلاش پربت سے کنیا کماری کی یاترا کریں گے۔ بس جانتی ہوں وہ کچھ نہیں کریں گے۔ لیکن میں پھر بھی چاہتی ہوں کہ پتاجی کو کہیں سکون مل سکے۔ اگر پنڈت نہرو انھیں بلوا کر یہ کہہ دیں: "کیا آپ ڈکیومیں، واشنگٹن میں ہندوستان کا سفیر بننا پسند کریں گے؟" تو پتاجی ایک دولھا کی طرح تروتازہ دکھائی دینے لگیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ لندن میں سفیر بکنگھم پیلیس میں پان کھاکر فرش پر پیک تھوکنے والا کوئی 'کھادی والا' ہی بنے گا۔ پتاجی بات کافی بڑھا چڑھا کر کرتے ہیں۔ بہرحال ہندوستان کوئی اچھی جگہ نہیں ہے۔ آج کل تمہیں میرے ہندوستان ہو۔ تم سے ملاقات ہی میری خوشی ہوگی۔ اس کے علاوہ میں چاہتی ہوں کہ پتاجی تم سے ملیں، تمہیں جانیں۔ ممکن ہے تم انھیں وہ دے سکو جس کی انھیں تلاش ہے۔ کبھی کبھی مجھے یاد کرلیا کرو۔

——ایس

میں نے نیچے کی ہری گھاس اور دھند میں سے برہنہ سنہرے پیڑوں کو دیکھا۔ سڑک کے پرے اور اس سے پرے کے پارک کے پرے بکنگھم پیلیس۔ اس کی جانب چلتے ہوئے نہ جانے کیسے میں نے اپنے آپ کو ممنون محسوس کیا۔ میں ایک نئے انگلستان کی روشنی میں چل رہا تھا۔

اگلے کچھ مہینوں میں مجھے ڈر ہے میرے تحقیق کے کام بہت زیادہ ترقی نہیں ہوئی مسئلہ جیسا کہ کچھ لوگ سوچتے تھے۔ انگلستان کی آب وہوا یا میری سبزی خوری کا نہیں تھا۔ بلکہ مسئلہ تھا کسی فوری اور پراسرار پریشانی کا۔ میں جانتا تھا میں کچھ کھو رہا ہوں اور دوبارہ کچھ حاصل نہیں کرسکوں گا۔

اس نئے خوش وخرم انگلستان میں اپنے پھیپھڑوں کے بارے میں مایوسی کے احساس کے بدولت میں کھویا کھویا سا محسوس کر رہا تھا۔ جیسے کوئی شکاری جانتا ہے کہ شیر کہاں ہے، ویسے ہی میرا جسم میرے وجود کے جاننے سے پہلے ہی جانتا تھا کہ خون کے سرخ خلیے میرے ذہن اور شہرت یافتہ وجدان کے مقابلے میں کہیں زیادہ ذہین تھے۔ ساوتری نے بتایا تھا" میرے پتاجی اکثر جان جاتے ہیں کہ شیر کہاں ہے۔

پاؤں کی انگلیوں کے بالوں سمیت آنکھوں کے سامنے یا اس کے کان سب سنتے ہوئے"۔ میں نے محسوس کیا میری حالت بگڑتی جا رہی ہے۔ حالانکہ آئیس رے میں کسی غیر معمولی حرکت کا کوئی سایہ نہیں تھا۔ آکسفورڈ اور اس کی نم دار آب و ہوا یقیناً میرے لیے ناموافق تھی۔ میں نے سوچا میں کیمبرج دوبارہ نہیں جا سکتا تھا۔ اس لیے برائٹن میں رہ کر دیکھا۔ اور پھر جلد ہی لندن لوٹ آیا۔ پہلے سے زیادہ بیمار۔ اور اس بار ہسپتال پہنچ گیا۔ یہ ہسپتال یوسٹن کے قریب تھا اور یہاں 'ٹراپیکل' بیماریوں کے علاج کے لیے خاص انتظام تھا ہندوستانی ہونے کے ناطے اپنے ہائی کمشنر کی مدد سے میں اس ہسپتال میں علاج کے لیے داخل ہو گیا۔

ڈاکٹر لمبے عرصے کے لیے مکمل آرام کے لیے مجھے بستر پر رکھنے کا طریقہ آزما کر دیکھنا چاہتے تھے۔ اگر اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا تو 'تھورے کو پلاسٹی' بہر حال موجود تھی۔ سارا مسئلہ اچھی طرح سانس لینے کا تھا۔ انھوں نے مجھے ایک مخصوص نشست میں بٹھایا اور اِدھر اُدھر کی بہت سی باتیں سمجھائیں۔ اور دائیں کروٹ لیٹنا بھی سکھایا۔

"بھلے آدمی،" ڈاکٹر برنہم نے کہا "اگر تم جلد اچھے نہیں ہو جاتے تو میں تمہیں چکن سوپ دوں گا" اور ہنس کر بولے" اور ڈِنر میں بچھڑے کا گوشت!" نرسیں میری طرف بہت مہربان تھیں اور مجھے کو آنکھ مارتی تھیں۔ ڈاکٹر برنہم میرا معائنہ کرنے اور میرا ٹمپریچر چارٹ دیکھنے کے بعد کہنے لگا "مسٹر راماسوامی، تمہیں ٹھیک ہو جانا چاہیے۔ تم ضرور ٹھیک ہو جاؤ گے"۔

وہ نیوموتھوریکس کے خلاف تھا اور اس کا ذکر بڑی حقارت سے کرتا تھا۔ وہ اسے ہندوستانی "آم اندر جال" کہتا تھا "تم آم کو دیکھ تو سکتے ہو لیکن کھا نہیں سکتے"۔ "تھورے کو پلاسٹی بینک آف انگلینڈ کی طرح ہے"۔ اس نے بات ختم کرتے ہوئے کہا "لیکن اگر تم میرا کہنا نہیں مانو گے تو میں چچا سیتا راموکو لکھوں گا۔ گڈ بائی۔

اچھا جی ہِمتے" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

ہے پربھو میں نے چچا سیتا رامو کا ذکر محض ایک بار کیا ہوگا اور اسے یاد تھا۔ ان لوگوں کا دل کتنا پوتر ہوگا جو دوسروں کا دکھ جھیلتے ہیں۔

لکشمی (کیمبرج والی) جس سے میں اتفاقاً ملا تھا۔ ان دنوں جب میں وہاں کی شاندار لائبریری میں کام کر رہا تھا۔ اکثر مجھے دیکھنے کے لیے آیا کرتی تھی۔ اسے یقین تھا میں کسی بد دعا کا شکار تھا۔

احساس تحفظ اور احساس نسائیت کے ساتھ بولی "پرماتما جانتا ہے کہ ہندوستان کے محل دعا اور نیکی کے گہوارے نہیں ہیں"!

میں اتنا کم عقل نہیں تھا اس لیے میں اسے آنے سے منع کیا۔ لیکن بڑی قم قم کی بندی اور گہری سُریلی آواز والی وہ لکشمی آئنگر کیسی نیک لگتی تھی۔ میڈلین ٹھیک کہتی تھی۔ ہندوستانی عورتیں معصوم لگنے کے بجائے عقلمند، نیک اور پتی ورتا لگتی ہیں۔

لکشمی نے مجھ سے کبھی میڈلین کے بارے میں بات نہیں۔ اس کے لیے یورپی عورتیں تھی ہی نہیں۔ میرا خیال ہے وہ انھیں ناپسند کرتی تھی۔ وہ محسوس کرتی تھی یورپی عورتیں شہوت پرست ہوتی ہیں۔ ہمیشہ مردوں کو خوش کرنے میں لگی رہتی ہیں۔

"یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ تم مرد کو اپنے جسم کے ساتھ چپکالو۔ جیسا کہ یہاں ناچتے وقت عورتیں کرتی ہیں اور نیکی اور پاکبازی کی باتیں کرو۔ میرا تو جی چاہتا ہے میں ہندوستان لوٹ جاؤں"!

لکشمی بچّوں کی نفسیات کا مطالعہ کر رہی تھی اور وزارت تعلیمات نئی دہلی میں واپس جانے والی تھی۔ وہاں وہ بچّوں کی نصابی کتابوں کا کام دیکھے گی۔ اور پھر ہندوستان میں چاروں طرف نیکی ہی نیکی ہوگی نیکی اور پاکیزگی کا سیلاب آجائے گا۔

مجھے اس با اخلاق ہندوستان سے نفرت تھی۔ یہ سچ ہے کہ ہندوستانی اخلاق مابعد الطبعیات کُل پر مبنی ہے۔ ہریش چندر نے سچ بولا اور اپنی سلطنت اور بیوی

کھو بیٹھا۔ لیکن بہر حال اس نے سچ تلاش کر لیا۔ میں ہندوستان کی ان نیک باعصمت عورتوں کو ستیہ ورت کی کہانی سنانا چاہتا تھا۔

مہا بھارت میں یہ کہانی کچھ اس طرح ہے۔ ایک ہرن ڈر کے مارے منہ سے جھاگ اُگلتا اور ہانپتا ہوا آتا ہے اور سنیاسی کی کٹیا میں پناہ لے لیتا ہے۔ ہرن کا پیچھا کرتے ہوئے اور اسے کوستے ہوتے اور طرح طرح سے آوازیں کرتے عجیب و غریب شور مچاتے ہوئے شکاری آجاتا ہے۔ لیکن سنیاسی کو دیکھ کر اس کو ڈنڈوت پرنام کرتا ہے اور ستیہ ورت سے پوچھتا ہے۔ "اے گیانی پربھو کیا آپ نے کوئی ہرن دیکھا ہے؟" کیا وہ ستیہ ورت سچ بات بتا دے گا؟ "میرے گھر میں پانچ بچے ہیں۔ جو بھوک کے مارے کھینچ تان کر رہے ہیں۔ ایک بھاری بھرکم پریشان بیوی ہے۔ اور چھ دن سے گھر میں چولہا نہیں جلا ہے۔ اے شفاف نظر، مہربان سنیاسی مجھے ان سب کو فاقے اور موت سے بچانا ہے۔ سوکھے کے کارن سب غیر محفوظ جانور یہاں سے چلے گئے ہیں اور ہمیں بھوکوں مرنا پڑے گا۔" کیا ستیہ ورت اس معصوم ہرن کو شکاری کو سونپ دے گا؟ نہیں۔ اس لیے وہ اپنے آپ میں کھو گیا اور اس عظیم ویدانتی سچ کا اظہار کیا۔ "وہ جو دیکھتا ہے کچھ کہہ نہیں سکتا، اور وہ جو کہہ سکتا ہے اس نے دیکھا ہی نہیں ہے۔"

صرف سچ ہی وہ چیز ہے جو ہندوستان دے سکتا ہے اور سچ مابعد الطبیعاتی ہے۔ اخلاقی نہیں۔ لکشمی اصلی ہندوستان نہیں تھی۔ لکشمی وہ ہندوستان تھی جس نے آہوں اور سلام و نیاز کے ساتھ حملہ آوروں کو قبول کیا۔ چاہے وہ مسلمان تھے یا انگریز۔ لکشمی رات بھر مہا بھارت کا پاٹھ نہیں کرے گی۔ اپنی انگلی کاٹ کر اپنے جوان خون سے اپنے دیوتا کا تلک کرے گی اور زندہ جل مرے گی۔

"اے خدمت گار اس سے پہلے کہ میں چلی جاؤں مجھے بتاؤ کہ سوامی کا چال چلن کیسا ہے؟"

"لڑائی کی فصل کاٹنے والے کے روپ میں۔ میں ان کی تلوار کا ادنیٰ خوشہ چین ان کے پیچھے پیچھے چلا تھا۔ اے رانی کے بستر پہ انھوں نے قتل ہوئے لوگوں کا غالیچہ بچھایا تھا۔ ایک وحشی کو اپنا تکیہ بنایا اور اب وہ دشمنوں میں گھرے ہوئے محوِ خواب ہیں۔"

"اے خدمت گار مجھے ایک بار پھر بتاؤ کہ سوامی کا چال چلن کیسا تھا؟"

اے ماں۔ ان کے کارنامے کون بیان کرسکتا ہے۔ انھوں نے خوف زدہ ہونے یا اپنی تعریف و توصیف کرنے کے لیے کوئی دشمن ہی نہیں چھوڑا تھا۔

اس نے مسکراکر خدمت گار کو الوداع کہا اور بولی "میرے سوامی تاخیر کے لیے مجھے ڈانٹیں گے"۔ اور ایس کلار مند کی طرح شعلوں میں کود گئی۔

گلاے د موٹنے گل نے یہی لکھا ہے۔ کیتھارہیرون لپک کر سورگ سدھار گئی اور راجپوت شہزادی اپنے آپ میں سما گئی۔ اور راکھ کی سفید ڈھیری بن گئی۔ سورگ سچ کی تقلیب ہے اور نسوانی ہے۔ یہ کنوارے پن کے اکیلے پن تک مرد کا پھیلاؤ ہے۔ ہولی گریل خوشی کا تلچھٹ ہے۔

نیکی بڑی زرخیز ہے۔ ہر نیک باعصمت عورت کے پیچھے مجھے ایک بیوہ محسوس ہوتی ہے۔ لیکن ہمیں اصلی بیویوں کی ضرورت ہے۔ جیون، مرن دونوں میں۔ مجھ میں کچھ ایسا ضرورت سے زیادہ شعور تھا کہ میں برہمن کے علاوہ کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ برہمنوں نے پچھلے دروازے سے ہندوستان کو بیچ ڈالا تھا۔ یاد کرو دیوگری کو۔ اور اگلے دروازے سے مسلمان آگھسے تھے۔ پرنیا نے ٹیپو سلطان کے سب راز بیچ دیئے اور انگریز سرنگاپٹم کے بڑے دروازے سے داخل ہوگئے۔ ہمت اور حوصلے سے عاری سچ کسی غلام یا کسی بیوہ کی نیکی ہی ہوسکتا ہے۔ گاندھی جی کا کہنا تھا کہ عدم تشدد باحرکت اور بہادرانہ ہے۔ ہمیں ہمیشہ کسی سرزمین پر تسلط قائم کرنا چاہیے۔ جہالت، بزدلی شترمرغ کی سی خودفریبانہ نیکی وہ دھرتی ہے، جسے ہمیں غلامی سے نجات دلانی چاہیے۔ یہی سچا سوراج ہے۔ یہ سوراج حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ ستیہ گرہ۔ آؤ ہم اس راہ پر آگے بڑھیں۔

ڈاکٹر کہتے ہیں کمزور پھیپھڑے اعصاب کے لیے نقصان دہ ہیں۔ لیکن ایک روز میں نے آخر لکشمی کو نکال باہر کر ہی دیا۔

"تم سوچتے ہوگے کہ ساوتری تم سے شادی کرتی۔ ہے بھگوان اس نے نہ جانے

کتنے مردوں کو ساڑھی کے پلو سے نچایا اور پھر انہیں ہاتھیوں کے آگے پھینک دیا۔ تم مرد لوگ ہم عورتوں کو، خاص طور پر ہندوستانی عورتوں کو کبھی نہیں سمجھ سکتے۔ راما سوامی ساوتری تم جیسے دانشور برہمن سے بیاہ کرنے کے بجائے کسی بھی روز کسی موٹے، پیک تھوکنے والے، نزتک، کرکٹ کلب کے مہاراجہ یا کسی رئیس بنیے سے شادی کرے گی جیسا کہ اس کی بہن نے کیا ہے۔ بھلے ہی اب وہ وزیر بن گیا ہو لیکن ہے تو وہ بنیا ہی۔ آج ہندوستان میں تم پیسے سے کچھ بھی خرید سکتے ہو۔"

"تب تو میں بھی رئیس بنوں گا اور اپنے لیے ایک بیوی خرید وں گا" میں نے جواب دیا اور بالکل خاموش ہو گیا۔ لکشمی میری کتابیں دیکھنے لگی۔ ان کے ورق الٹنے لگی کہیں کہیں دو ایک جملے پڑھے۔ اٹھ کر میری چادر ٹھیک کی۔ کھڑکی سے باہر جھانکا۔ ہنسی اور بولی:

"ارے یہ انگریز یہ دوکانداروں کی نسل! ایک ہاتھ سے وہ ملکہ کی تاجپوشی کریں گے اور دوسرے ہاتھ سے ڈالر گنیں گے۔ انھوں نے ہندوستان کو آزادی اس لیے دی ہے کیونکہ ایسا کرنا وزیر مالیات اور عظیم بورڈ آف ٹریڈ کے لیے فائدے کی بات تھی۔

"میں تو شاہ پرست ہوں" میں نے آہستہ سے اور مناسب ڈھنگ سے کہا" اور میں ملکہ کی تعظیم کرتا ہوں۔"

"کسی ہندوستانی کی زبان سے یہ بات مضحکہ خیز لگتی ہے۔" اس نے اٹھ کر اپنی گردن کے گرد لپٹا ہوا اسکارف ٹھیک کرتے ہوئے احتجاج کیا۔ میں اس کے اپنا بھاری بھرکم اوورکوٹ پہننے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے بتایا یہ اس نے پراگ میں خریدا تھا۔ حالانکہ یہ بڑا سستا ہے لیکن سب سے اچھے استرخوان کا بنا ہوا ہے۔"

"میں مہابھارت ٹیگ کا آدمی ہوں۔" میں نے کہا " اور میرا بورڈ آف ٹریڈ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

وہ میری بات سمجھ گئی اور چلی گئی۔ کئی ہفتوں تک وہ مجھے ملنے نہیں آئی۔ اس نے کیمبرج سے ایک خط کے ذریعے اطلاع دی کہ وہ فائنل امتحان کے سلسلے میں مصروف ہے۔

گرمیوں میں امتحان کا ہونا میرے لیے اچھا تھا۔ میں متواتر بادشاہوں کی تاجپوشی کے خواب دیکھ سکتا تھا۔

ایک مہینے میں ستمبر شروع ہوگا
کینٹربری کا آرچ بشپ
بادشاہ کی تاجپوشی کے موقعہ پر آئے گا۔

میں نے کمار سوامی کا مطالعہ شروع کر دیا۔ وہ ایک ہندوستانی باپ اور ایک خوش مزاج انگریز ماں کا بیٹا تھا جس نے کافی منفرد انداز میں اپنا بیشتر وقت بوسٹن میں گزارا اور وہیں وفات پائی۔ اینگلو سیکسن ذہن ہندوستان کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا مغرب میں ہندوستان کو سب سے اچھی طرح سمجھنے والے زیادہ تر لوگ فرانسیسی تھے (اس سلسلے میں میرے ذہن میں سے نار، لیوی، گوئی نان، گروسے، میسوں اور رسل، پرائی زل سکی کے نام آتے ہیں) کچھ جرمن بھی ہوئے ہیں لیکن انگریز بہت کم لیکن جب آپ سر ولیم جونز، سر جان وُڈ روف جیسے لکھنے والوں کو دیکھتے ہیں جو کسی بھی برہمن سے کہیں بڑھ کر برہمن تھے اور کمار سوامی کو پڑھتے ہیں تو ان غیر معمولی انگریزوں کے تئیں اپنے آپ کو شکر گزار محسوس کرتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اینگلو سیکسن ذہن ہندوستان کو بہت کم سمجھتا ہے۔ لیکن برطانوی ذہنیت میں کوئی خلل آمیز انوکھی جھجک ضرور ہے جو ان باتوں سے خوف زدہ ہو جاتی ہے جن کو ہم بے وزن باتوں، کے نام سے پکارتے ہیں ورنہ تھورو اور ایمرسن یا پھر وہٹ مین سے بہتر اینگلو سیکسن کون ہو سکتا ہے۔ بوسٹن کا یہ برہمن آنند کمار سوامی انڈین نیشنل کانگریس کے کسی بھی لڑکھڑاتے بوڑھے صدر سے کہیں زیادہ قابل، سچا اور روایت پرست تھا۔ ہندوستان کو بنانے کا کام کبھی بھی سیاست دانوں اور پولیٹیکل سائنس کے پروفیسروں سے نہیں ہوگا۔ یہ کام تو الگ تھلگ پڑی ان ہندوستانی موجودگیوں کے ذریعہ ہوگا جن میں ہندوستان کو بار بار یاد کیا جاتا ہے، برتا جاتا ہے اور رشتۂ ترسیل میں باندھا جاتا ہے۔ ماورائے تاریخ ایک روایت' ایک سچ کے طور پر۔ کوئی بھی آدمی جغرافیائی، یہاں تک کہ سیاسی ہندوستان حاصل

کر سکتا ہے ۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ لیکن کمار سوامی کے اس ہندوستان کو کون چھین سکتا ہے؟ کون؟ نہ تیمور، نہ جوزف اسٹالن۔

عورت دھرتی ہے، ہوا ہے، آکاش ہے، آواز ہے۔ عورت ذہن کا عالم اصغر ہے۔ خلا کا متکلم ہے۔ علم میں علم حاصل کرنے کا عمل۔ عورت آگ ہے۔ پہاڑی ندی کی سی شفاف اور تیز حرکت اور روانی۔ عورت وہ ہے جو اس کے خلاف مقابلے میں وہ کچھ تلاش کرتی ہے، جسے تلاش کیا جاتا ہے۔ متر کے لیے وہ ورُون ہے، اِندر کے لیے اگنی ہے۔ رام کے لیے سیتا ہے اور کرشن کے لیے اس کی رادھا۔ عورت لفظ سانس، لمس اور حرکت اور عمل کا مفہوم ہے۔ عورت وہ ہے جو مرد کو یاد دلاتی ہے واقعتاً جو وہ یعنی مرد ہے۔ اور اس کے ذریعے اپنے آپ کو یاد دلاتی ہے خود وہ جو کچھ ہے۔ عورت ایک سلطنت ہے۔ گوشہ نشینی ہے، وقت ہے۔ عورت ترقی اور نشو ونما ہے۔ دیوی دیوتا ہے۔ راسخ ہے، موت ہے کیونکہ عورت ہی کے بطن سے ہر فرد پیدا ہوتا ہے۔ عورت حکمرانی کرتی ہے کیونکہ وہ خود ہی تو کائنات ہے۔ وہ دھرتی کی بیٹی ہے، ملکہ ہے۔ اور اسی کے ساتھ ہاتھی، گھوڑے اونٹ، ہرن، گائے، مور سبھی سر جھکاتے ہیں کہ وہ ہم سب پر حکمراں ہے۔ جیسا کہ کسی صحیفۂ اوتات میں کہا گیا ہے۔ اس نے آکاش کی نیلاہٹ پہن رکھی ہے۔ سارے جانور اور دنیائیں اس کے اِرد گرد کھڑی ہیں سب اس تعریف و ستائش کر رہے ہیں کہ وہ اسی طرح بنی رہے۔ دنیا بنائی ہی گئی تھی جشن منانے کے لیے۔ تاجپوشی کے لیے اور واقعہ یہ ہے کہ جب بادشاہ کی تاجپوشی کی جاتی ہے تو یہ ملکہ ہی ہوتی ہے جس کو سلطنت ملتی ہے۔ کیونکہ جب بادشاہ حکومت کرتا ہے تو ملکہ ہی انصاف ہوتی ہے۔ ہمدردی سے مرد کو جھکانے والی، رحمدلی کا الجھاؤ، سب کے دکھ میں سوگ منانے والی۔ عورت وہ ثنویت ہے جو اپنے ہی عکس خیز آب زاروں کے لیے بنائی گئی ہے۔ وہ یہ دکھانے کے لیے اپنی ہی تاجپوشی اسی لیے کر لیتی ہے کہ مرد اس سلطنت کا باشندہ نہیں ہے۔ مرد مر بھی نہیں سکتا۔ تو پھر اسے اپنے آپ کو اپنے آپ میں جذب کرنا ہوگا اور وجود میں ڈھلنا ہوگا۔ تاجپوشی دھرتی کے نام مرد کا الوداعی سلام ہے۔ دھرتی! خوش رہو، سندر رہو کیونکہ مرد کو تو رخصت ہونا ہی ہے۔

عورت دنیا ہے۔ عورت دھرتی ہے۔ کامرانی کا جلوس ہے۔ بادل کی قوس ہے اور سورج کی گول گول گولائی ہے۔ عورت عمارتوں کے درمیان کی خالی جگہ ہے۔ وہ خفیہ باشعور خالی پن جہاں سے لفظ ایک مکان سے دوسرے مکان تک اور ایک مرد سے دوسرے مرد تک پہنچتا ہے۔ یہ عورت ہی ہے جو کھڑکی سے جھانکتی ہے اور اپنے آپ کو کسی دوسرے میں دیکھتی ہے۔ آئینہ دیکھتی ہے اور اسے روشنی دکھائی دیتی ہے۔ مرد کی طرف نگاہ اٹھاتی ہے تو اس میں اس کو اپنا مہمان دیوتا نظر آتا ہے۔ پکاڈلی میں وہ اپنے نرم نرم بالوں کو چھوتی ہے اور ایک ایسی دنیا کا خواب دیکھتی ہے جہاں بہار ہی بہار ہے اور چاروں طرف پھول ہی پھول ہیں۔ جیسے پانیوں میں تیرتے ہوئے، اور پرندے۔"

عورت کوچ یعنی گاڑی میں بیٹھے گی تو اپنے آپ کو ایسے دیکھے گی جیسے دوسرے دیکھتے ہیں۔ ٹکٹ پہن کر اسے پتہ چلے گا کہ وہ نہ تو عورت ہے، اور نہ ہی اسے کوئی جانتا ہے۔ وہ جرم ملکی، فاختہ، دائرہ نما شکل، لاٹھی ڈنڈا، کسی فوجی سردار اور مرتبے اور رتبے کے خصوصی نشان۔ ان سب کے خواب دیکھے گی۔ اور پھر اسے اس ایسے کا خیال آئے گا جہاں وہ اپنے آپ کو اس طرح دیکھے گی جس طرح ہزاروں برس اسے دیکھتے آئے ہیں۔ ایک کے بعد ایک عورت اس نشست پر بیٹھتی رہی ہے اور پیار کی وہی مالا پھیرتی رہی ہے۔ انگلستان کے سکوں پر عورت ہوگی۔ اور دنیا بھر میں اس کی آواز کا سیمیں ترنم ہوگا۔ عورت تمام دنیا میں گھوم جائے گی۔ اور بہت سے گھروں کو اپنی حلیمی نرمی اور ملائمت عطا کرے گی۔ دنیا کی بہت سی کنواریاں سرخ اسکارف والے نوجوانوں سے بیاہ کریں گی۔ کیونکہ ملکہ، جی ہاں ملکہ ایڈی لیڈی کی گلیوں سے گزرے گی۔ اور کیمسٹ کے اسسٹنٹ، وزیر کی بیٹی اور کھڑکی میں کھڑی فالج زدہ عورت کے دل کو اپنے آشیرواد سے نوازے گی۔ عورت سمندروں کا سفر کرے گی۔ کئی ایوانوں، پارلیمانی عمارتوں کے زینے طے کرتی ہوئی اوپر چڑھے گی کیونکہ عورت ہی سمندروں پر چھائی ہوئی خاموشی کا واحد مفہوم ہے۔ لندن کی چھوٹی چھوٹی گلیوں میں پارکوں اور نالابوں کے پاس کسی کہاوت کے شبدوں کی طرح نئی نئی کنواری گھاس اُگ آئی تھی۔ اور اس نئی کنواری

گھاس کے جشن کی خوشی میں چاروں طرف بچے اپنے کھیل میں مگن تھے کیونکہ دنیا ایک ملکہ کو سونپی جانے والی تھی۔

وقت گزرتا گیا۔ آدمی کشتیوں اور کٹہروں پہ لمحہ بھر کے لیے رک کر اپنے آپ میں ہی جیتا رہا۔ میناروں، ٹرالی بسوں کے اڈوں زیبرا کراسنگز اور وہاں کی نارنجی روشنیوں ترکاری فروشوں کے چھوٹی اور لگاتار ہلتی رہنے والی دموں والے گھوڑوں، بجلی کمپنی لندن کے مقامی میٹر ریڈروں، بے قرار پیڑوں کے سمیٹ کر ایک طرف کیے ہوئے پتوں، ہوا میں اڑتے ہوئے پرانے اخباروں کے چیتھڑوں۔ شراب خانوں کی بددعاؤں اور اطالویوں کے نغموں سے ظاہر ہوتا تھا کہ ماحول پر نشہ چھا گیا ہے اور خوب دھوپ نکل آئی ہے۔ دنیا کے ہر حصے سے لوگ آرہے تھے۔ گھنگھریالے بالوں اور سفید لمبے چوغوں والے ابی سینائی چری ہوئی ناک اور متواتر چبانے کی حرکت میں مصروف چوڑے چہروں والے نرم بے زبی ژدونو سفید پھرتیلے طرار گھوڑوں پر سوار پاکستانی چست ملبوسات میں منکسر مزاج ہندو۔ کشادہ تبسم والی جاپانی خاتون۔ ٹوگو جزیرے کے لوگ۔ کینیڈا کے لوگ، زندہ دل بلند آواز آسٹریلیائی۔ غیر محتاط فرانسیسی۔ لاف زنی کرنے والے جرمن۔ یہاں تک کہ انگلستان کی بیئر پینے کے لیے روسی بھی آئے ہوئے تھے۔ دنیا کے تینوں کونوں سے پھلوں کے پارسل آئے تھے۔ ملایا سے برطانوی ہونڈوراس سے۔ فاک لینڈ سے ایندھن اور کئی سمندروں سے موتی! ہر جگہ سے بادشاہ اور پاشا آئے شکست خوردہ عوام کی گم شدہ نسل کے لوگ جو یہ جاننا چاہتے تھے کہ کیا جاننے سے وہ تنگ دستی کا صحیح ادراک کر سکیں گے۔ بہت سے طلبا اور پروفیسر آئے تھے۔ کاریگر آئے تھے بھیک مانگنے یا سامان بیچنے۔ شادی شدہ جوڑے آئے یہ یقین کرنے کہ انسان اپنے ڈھنگ سے اپنی زندگی جی سکتا ہے اور کھلی آزادی کے ماحول میں رشتوں کا مفہوم سمجھ سکتا ہے۔

دنیا اپنے لیے دعوتوں کا اہتمام کر رہی تھی۔ ہر شخص ہر جگہ موجود تھا۔ وزیر اعظم کی پارٹی میں شیمپین سے لطف اندوز ہو رہا تھا یا گھر پہ بیٹھا بیئر پی رہا تھا۔ کوئی کسی کا دشمن نہیں تھا۔ کیونکہ کوئی دوسرا تھا ہی نہیں۔ ہر چیز صاف اور سادہ ہو گئی تھی۔ جب تک

سانپ اور رسّی

سیاست داں سوچتے ہوں گے اور حیران ہوتے ہوں گے کہ اگلی دنیا کہاں ہوگی۔ سیاست کی شدّت، اس کا عامیانہ پن، اس کا بوجھ ختم ہوگیا تھا۔ آدمی اپنے آپ کو نغمے سناتا ہوا نئے جنم کے خواب دیکھتا ہوا سوتا تھا۔ ہسپتالوں میں کبھی اتنی بھیڑ نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ لندن میں لوگوں کا ہجوم تھا۔ لیکن ایسا لگتا تھا کہ ڈاکٹر اور نرس اس بات کو سمجھ گئے تھے کہ دینا اور لینا ایک ہی واحد عمل کے دو متضاد پہلو نہیں تھے بلکہ ایک ہی زندگی کے دو پہلو تھے۔ بیماریاں غیر مناسب لگ رہی تھیں۔ کچھ میں تو اس گتّے یا چور جیسی جھجک یا شرمیلاپن تھا جو بھولا بھٹکا اس ٹیڑھی بے مصرف دنیا میں آنکلا ہو۔ آدمی سادہ و معصوم تھا اس سڑک کی طرح جس پر وہ چل رہا تھا۔ اپنے پارک کی سڑک کی طرح۔ دھوپ اس تک کچھ اس طرح آسانی سے اور یقین کے ساتھ پہنچ رہی تھی جیسے کرّہ ارض کو ہر فرد واحد کے لیے بنایا گیا ہو۔ اس کے مخصوص نظام کے لیے۔ دھوپ اس کو، اس کے چہرے کو، آنکھوں کو، اس کے ہاتھوں اور اس کے سانسوں کو سرشار کر رہی تھی۔ بہت سے لوگوں نے اپنے پنجرے کھول کر اپنے طوطوں اور میناؤں کو آزاد کر دیا تھا۔ اور لندن کے پیڑ ایسی چہچہاہٹ اور سنگیت سن رہے تھے جس کی ایسا محسوس ہوتا تھا اس سے پہلے کبھی اجازت نہیں تھی۔ گیت نے وقت کی پیشانی پر مرد و عورت کو ایسے رشتے میں باندھ دیا جیسے موت کوئی غیر ضروری شے ہو۔ لمحہ بھر ہر شخص اپنے اندر جھانکتا اور محسوس کرتا کہ اسے کہیں نہیں پہنچنا ہے۔ انسان خوش تھا۔ بہت بہت خوش۔

ان دنوں میں تھامس بی ٹرو ویر پڑھ رہا تھا۔ اس اینگلو۔نارمن شاعر کے نزدیک انگلستان اور فرانس ٹرسٹن اور اسولٹ کی طرح تھے اور لندن ایک خوبصورت شہر!

آپ آئرلینڈ کے بادشاہ کی بیٹی اِسولٹ کے ساتھ کشتی میں سوار ٹرسٹن سے پروکس کا تصور بخوبی کر سکتے تھے۔ اس خوبصورت لڑکی کی شادی بادشاہ مارک کے ساتھ ہونے والی تھی۔ اس کا بھتیجا اس کو بادشاہ کے پاس لا رہا تھا۔ اس نوجوان نے بوڑھے مارک کے ساتھ وعدہ کر رکھا تھا کہ چاہے آگ برسے یا پانی۔ اس وعدے کی تعظیم و تعمیل بہر حال لازمی تھی۔ سمندر پر تیز ہوائیں چل رہی تھیں اور سورج آگ برسا رہا تھا۔ ایک رات جب وہ شطرنج کھیل رہے تھے تو انھوں نے اپنی وفادار برنجیین کو شراب کہا اور شراب

لانے کے لیے کہا۔ وہ وفادار چونکہ نیند میں تھی اس لیے وہ مے محبت جو بادشاہ مارک کے لیے مخصوص تھی پہلے ایک کو پیش کی اور باقی دوسرے کو۔ اور ان کے اندر وہ طوفان جذبات اٹھا کہ سمندر میں اٹھنے والی موجیں تک اس شدید تلاطم اور اس مطالبے سے روشناس ہو گئیں۔ جیسے ہی کارنوال کی پہاڑیوں پر بادشاہ مارک کے ملک میں کارنوال میں ٹنٹاگل کا قلعہ دکھائی دینے لگا اور روشن ہو کر سامنے آگیا اِسولٹ نے اپنے آپ کو ٹرسٹن کے سپرد کر دیا جیسے ٹرسٹن کو آگ اور جنگل میں اذیت اور جلاوطنی میں اس کا عاشق بننا تھا۔ اور جب وہ چلا گیا اور ایک اور اِسولٹ سے اسولٹ آف دی وہائٹ ہینڈز سے اپنے دل کو گرمانے کی کوشش کی تو کوئی گرمی پیدا نہیں ہوئی کیونکہ اس کے اپنے دل میں اب کوئی پیار نہیں رہا تھا۔ آنے والے جہازوں کے ذریعے کارنوال کی اِسولٹ کو اس کی بیماری اور ناامیدی کی خبریں ملیں۔ وہ اپنی کشتی پر سوار ہو کر تیزی سے اس کو ملنے کے لیے روانہ ہو گئی۔ لیکن جب وہ وہاں پہنچی تو ٹرسٹن مر چکا تھا۔ وہ بھی اس کے ساتھ لیٹ گئی اور مر گئی۔ ایک کانٹے دار جھاڑی نے انھیں قبر میں بھی ایک دوسرے سے ملا دیا۔ یہ جھاڑی ٹرسٹن کی قبر سے اُگی تھی۔

ٹرسٹن کی قبر سے پتوں سے سبز و شاداب ایک خوبصورت بیل اُگی اور چیپل پر چڑھ گئی۔ اس کا ایک سرا جھک کر اِسولٹ کی قبر پر گرا اور اندر دھنس گیا۔ گاؤں والوں نے اسے دیکھا اور بادشاہ مارک کو جا کر بتایا۔ بادشاہ نے بیل کے تین ٹکڑے کروا دیئے لیکن اگلے دن بیل پہلے کی طرح ہری بھری تھی اور دونوں قبروں کو ملائے ہوئے تھی۔ یہ معجزہ ٹرسٹن اور اِسولٹ کے ساتھ ہوا۔

کبھی کبھی میں سوچتا تھا اپنے اوپر بھی ایک مقبرہ ہو تو کیسا اچھا رہے۔

ہوا میں جھنڈے لہرا رہے تھے۔ سڑکوں پر ترچھیوں کو آزمایا جا رہا تھا۔ اور عالم شعور میں نمودار ہونے والے خیالات کی طرح چھوٹے چھوٹے ہوائی جہاز اپنے اپنے نقطۂ آغاز کی طرف لوٹ رہے تھے۔ میں نے ہسپتال کے اپنے کمرے کی کھڑکی سے

باہر جھانکتے ہوئے سوچا شاید ان میں سے کسی ایک میں ساوتری تھی۔ بہت دن سے اس کی کوئی خبر نہیں ملی تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ آرہی ہے۔ میں جانتا تھا وہ آئے گی۔ اور وہ جونہی پہنچے گی مجھے پتہ چل جائے گا۔

لندن میں ایک محتاط قسم کے جوش کا ماحول تھا، شہزادے زولو لوگ، فوجی، سیاست داں، تھیٹر کے اداکار، آرائشی محرابوں پر کام کرنے والے مزدور، گھڑ سوار پولیس کے سپاہی۔ گھروں اور میناروں پر لگی بتیوں کے جوڑ توڑ ان میں سے ایسا لگتا تھا سب باہمی طور پر متبادل اکائیاں ہیں۔ جیسے انسان اپنے آپ کو دریافت کر رہا تھا۔ ایک سے زیادہ یعنی انیک ہونا ایک ہونے کی طرح ہے کیونکہ جب بہت سے لوگ ہجوم میں ایک دوسرے سے بات کرتے ہیں تو ایسا لگتا ہے آدمی اپنے آپ سے بات کر رہا ہے۔ اشیا، آوازوں میں ڈوبتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں اور آوازیں اشیا کو پیدا کرتی ہوئی۔ سڑکیں ذہنی تقاضوں کے مطابق چوڑی یا تنگ لگتی ہیں جبکہ اشیا فاصلوں اور خواہشوں کے مطابق غائب ہوتی اور دوبارہ نمودار ہوتی محسوس ہوتی ہیں۔ آدمی نے تیئس دن تک اپنے آپ کو کھلی آزادی دے دی تھی۔

ہوائی جہاز تک بڑے پُراعتماد لگتے تھے۔ سارسوں کی طرح جب وہ مباشرت کے عالم میں ہوتے ہیں۔ کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ٹیمز ندی کے علاوہ بھی کچھ اور چیز ہوسکتی ہے۔ اور جہاں کہیں بھی آپ چھوئیں گے سنگیت کی جھنکار نہیں پیدا ہوگی حیرانی کی بات تو یہ تھی کہ ہر مرد ہر عورت کو چھو کر کسی تاریخی عمارت میں کیوں نہیں ڈھال دیتا اور پھر اپنے عشق میں گرفتار کیوں نہیں ہو جاتا۔ (کیونکہ ہر شخص ہمیشہ اپنے آپ سے ہی پیار کرتا ہے)۔ وہ مرد اس بُت کو باہوں میں لے کر سڑکوں کے دونوں طرف لگے جھنڈوں اور آرائشی محرابوں کے درمیان جلوس کی شکل میں پورے لندن میں گھوم سکتا تھا۔ بات یہ نہیں تھی کہ ملکہ کی تاجپوشی ہو رہی تھی بلکہ اصل بات یہ تھی کہ آدمی ایک وجود، دوران سکوت ایک صدا، یا دور تک پھیلے خنک پانیوں میں تیرتے ایک راج ہنس کو دریافت کر رہا تھا۔ ہم آزاد تھے اس لیے ہم جگمگا رہے تھے۔

ہسپتال میں نرسیں اس قدر پُر اعتماد لگ رہی تھیں جیسے ملکہ ہمیں ملنے آئیں گی اور آ کر ہم میں سے ایک ایک سے ملیں گی۔ جب وہ ہمیں ہمارے بستر پر لٹا کر چادر سے اچھی طرح ڈھانپتی تھیں یا تھرمامیٹر کی طرف دیکھتی تھیں تو انھیں موسم گرما کے کھلے آسمان کی کشادگی دکھائی دیتی تھی۔ انھیں یقین تھا کہ ملکہ ضرور تشریف لائیں گی۔ ہمارے ساتھ ہاتھ ملائیں گی۔ اور گلابی پروں اور برچ گھاس کی بنی جادوئی چھڑی کی ایک جنبش سے ہمارے پوتّر نام پکارتی ہوئی ہمارے دُکھ دُور کر دیں گی۔ جی ہاں ملکہ آئیں گی ہم میں سے ایک ایک کے پاس جی ہاں۔ نرسیں کہتی تو کچھ نہیں تھیں لیکن بہرحال یہی سوچتی تھیں۔ مریض راتوں کو اپنے بستر پر بیٹھ کر اپنے آپ سے پوچھتے تھے کہ کیا یہ سچ ہے؟ برابر کے کمرے میں ڈینگو بخار سے پریشان ایک ملائی ڈاکٹر تھا۔ وہ اپنے بستر پر لیٹا دعا پرارتھنا کرتا ہوا دھاڑتا تھا۔ بلاشبہ وہ مسلمان تھا۔ اس کی دعا اپنے آپ کے سامنے کی جانے والی تقریر کی طرح تھی: "میرے بیٹے، میرے بچّے۔ اپنے آپ کو شانت کرو۔ روز حشر ضرور آئے گا۔ تجدید حیات ضرور ہو گی"۔ چاروں طرف ترچھیوں کا شور تھا۔ اور جھنڈے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ ان دنوں کوئی نہیں مر سکتا تھا کیونکہ تابوتوں کے لیے نہ جگہ تھی نہ وقت۔ گھوڑے کسی اور کام میں مصروف تھے اور لوگوں کی توجہ ایسے اہم کاموں پر لگی ہوئی تھی کہ موت کے بارے میں کوئی سوچتا ہی نہیں تھا۔ اسی وجہ سے ہم ہوائی جہاز خواب میں نظر آنے والی اس ریل گاڑی کے اعتماد کے ساتھ اُڑ رہا تھا جو اپنی پٹریاں ایجاد کرتی ہوئی ہر طرف دوڑتی جاتی ہے۔ اس سلطنت میں نہ تو کوئی اسٹیشن ماسٹر ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی حادثہ۔ اسٹیشن پر آپ کے بچے ہوتے ہیں اور پھولوں سے ڈھکا ہوا اسٹیشن ہوا میں پرواز کر رہا ہوتا ہے۔ آپ محسوس کرتے ہیں آپ کے پارک میں داخل ہوتے ہی پیڑ جگمگا اُٹھیں گے۔ اور جب آپ کسی سے بھی بات کریں گے تو وہ آپ کی زبان میں آپ سے گفتگو کرے گا۔ جب بوسٹن اسٹیشن پر ریل گاڑی نے سیٹی بجائی تو ایسا لگا پچھواڑے میں چچا سیتا رامو کا گدھا ڈھیچوں ڈھیچوں کر رہا ہے۔ اس خواب میں مگن کہ وہ راجہ کے میلے کپڑے اپنی پیٹھ پر ڈھو کر لے جا رہا ہے۔

دراصل ہر چیز واقعتاً حقیقی تھی کچھ اس انداز سے کہ ہر بار جب لفٹ اُوپر آتی تھی آپ سوچتے تھے کہ اس کا دروازہ کھلے گا اور کوئی — کوئی بھی شخص فردِ واحد ایک شخص ہو سکتا تھا۔ باہر نکلے گا اور آپ اس کی جلترنگ ایسی آواز سنیں گے۔ پانی اور برتن ایک آواز پیدا کرتے ہیں اور آپ اس آواز کو بار بار سن سکتے ہیں۔

ان دنوں مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے دنیا نے عصرِ برفانی کے اوائل ایام میں پہلے انسان کے جنم کے موقعہ پر اپنے آپ سے کوئی سوال پوچھا ہوگا جس کا جواب اب دیا جانے والا تھا۔ فوجی مارچ اور ترچھی کے ساتھ۔ وزیرِ اعظم اور حکومت کے وزرا کے جلوس کے ساتھ بادشاہوں اور مذہبی سربراہوں کے اجتماع میں یہ جواب دیا جانے والا تھا۔ ایک لفظ، تحفے کے طور پر نہیں بلکہ ایک نقطہ، ایک علامت ایک اعتراف کی صورت میں۔ ایک ایسے مقام کی نشان دہی کی جائے گی جہاں انسان نے اپنی توجہ اپنے آپ پر مرکوز کی۔ مکمل طور پر ایک نقطے پر۔ اس سچائی پر کہ سلطنت خدا درونِ ذات تھی اور خوب مضبوط تھی۔ "یروشلم ہمارے پاؤں تمہاری چوکھٹ پر ہوں گے۔ یروشلم ایک ایسے شہر کے روپ میں تعمیر کیا گیا ہے جو اپنے آپ میں ایک وحدت ہے۔ یروشلم کے سکون کے لیے دعا کرو۔ وہ جو تم سے پیار کرتے ہیں خوشحال ہوں۔ تمہاری فصیلوں کے اندر ہمیشہ امن و سکون رہے اور ہمارے محلوں میں فراوانی کا دور دورہ رہے۔" اور بدوے کیا محل اور سلطنت کی طرح چھ بہنیں آئیں گی اور جاجب بندر کو دودھ میں پھینک دیا جائے گا۔ لوگوں کو آوازیں سنائی دیں گی۔ چیزیں دکھائی دیں گی اور زندگی کا لمس نصیب ہوگا۔ دنیا پہلے نہیں تھی۔ اس کے بعد دنیا تحلیل ہو کر نہیں رہ جائے گی۔ لیکن یہی لمحہ کل کی تجدیدِ نو کا لمحہ ہے۔ "ہے ایشور تو ہی ہے" کی آواز آئے گی۔ گھنٹیاں بج اٹھیں گی اور پل بھر کے لیے کوئی رک جائے گا اور ملکہ کی تاجپوشی ہو جائے گی۔ ہر شخص بادشاہ کے کے طور پر پیدا ہوا تھا اور جس لمحے میں دوسرا ہاتھ اپنے آپ اوپر حرکت میں آیا وہ شخص ملکہ بن گیا۔ کیونکہ نہ تو کوئی چیز حرکت کرتی ہے۔ نہ ہی کچھ کہا جاتا ہے بلکہ حق بات یہ ہے کہ فرد بذاتِ خود سچ ہے۔

رحمت بالا کا عطا کیا ہوا یہ جشن مبارک
سکھ ہے، زندگی ہے اور آتشِ عشق!

ہے ایشور ایسی ملکہ کی تاجپوشی ہو گی۔ جی ہاں ایسی ملکہ تخت کی زینت بنے گی۔ مَیں نے اپنے آپ سے کہا اور سو گیا۔

پھر ایک دن میں نے سنا "ہتھوڑے کو پلاسٹی" ہتھوڑے کو پلاسٹی"۔ یہ کسی خوبصورت گیت کی دُھن بن گیا۔ میں چاہے چھوٹی ماں کو پکارتا تھا یا چچا سیتا راموکو لیکن۔ جواب میں ایک بات سننے کو ملتی تھی "ہتھوڑے کو پلاسٹی" آپریشن ٹیبل کے اسٹریپ پوچھتے۔ "تم کیسے ہو؟" میں بالکل سفید پڑ گیا تھا۔ سفید ہونا اچھا ہے۔ سفید ہونے سے ہلکا پن محسوس ہوتا ہے۔ ڈاکٹر برنہم بولے "اچھا جی نمستے میں نے تم سے کہا تھا یہ چاندی کی طرح کھرا ہے۔ میں تمہارے لیے دعا کرتا ہوں"۔

آپریشن ٹیبل کے اسٹریپ پھر گرجا گھر کے گھنٹوں کی طرح گا رہے تھے۔ صاف ہوا بیش قیمت لگتی تھی اور دنیا عدم میں سے خلا میں سے خلق کی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اور آواز کتنی سچی تھی۔ بدی جھنجھٹ کا حصہ ہے اور بدی کی بدی ہی بدی ہے۔ بیداری دنیا کو ایسے وعدے کی صورت میں دیکھنا ہے جو عالم خواب میں کیا گیا ہو۔ سچ تو اندر ہی دکھائی دیتا ہے۔ اسے باہر دیکھتے ہیں تو حقیقت یادداشت کو دیا ہوا ایک نام ہوتا ہے۔ اور پرے سنائی دینے والی آبشار کی آواز ہوتی ہے۔ روشنی ہوتی ہے اور کوئی درمیانی غیر واضح شے۔ انسان دنیا میں گیان ڈھونڈتا ہے۔ لیکن اسے لازمی طور پر پتہ ہونا چاہیے کہ یہ تو وہ خود ہے۔ ماورائے خود۔ پھر دنیا ایسے جگمگا اٹھتی ہے جیسے کسی تہوار کے موقع پر۔

موت کو ایک پوسٹر کی طرح دروازے پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ وہ اندر نہیں آ سکتی تھی۔ صرف ملکہ آ سکتی تھی۔ اکیلی، سفید ململ میں ملبوس، جلو میں اپنی سولہ باندیاں لیے وہ ہسپتال کے احاطے کے پتھریلے راستے سے آئے گی۔ سیڑھیاں چڑھے گی۔ اور پوری خاموشی کے عالم میں سرخ اور سبز بتیوں سے روشن غلام گردشوں سے ہوتی ہوئی ہمارے پاس پہنچ کر سنجیدہ ہو جائے گی اور دعا کرے گی۔ دعا کے بعد وہ ہنس پڑے گی اور

ہم اپنی آنکھیں کھول دیں گے۔ ٹمپریچر چارٹ بندوق سے نکلی گولی کی تیزی سے کھڑکی سے باہر نکل جائیں گے اور بدی کی طرح پرندے بن کر پودوں اور پھولوں پر جا بیٹھیں گے ملکہ کافی دیر تک ہمارے ساتھ رہے گی اور دنیا ایک نغمۂ روشن سے گونج اٹھے گی۔

ان کے ساتھ اعجازِ تکمیل کرو

اے آسمانی، پُرنور دلیوی

تم آئینہ ہو خدائی حسن و وقار کا

ایک عظیم ترین جزیرے کی عظیم خاتون

پھر وہ آئی دوبارہ آئی اور اس کے بعد بھی آئی۔

ایک دن وہ میرے پاس آئی۔ ان دنوں وہ بہت سگریٹ پینے لگی تھی طویل خاموشی کے بعد وہ بولی:

"عورت کو نہیں ہونا چاہیے"

"ساوتری۔ ایسا کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"عورت موت کی ہم عصر ہے"

"مطلب؟"

"عورت ہی موت کا مفہوم ہے"

"میں سمجھا نہیں" میں نے احتجاج کیا

"تم نے کہا تھا عورت ہی دنیا ہے۔ دنیا کی سچائی عملِ تحلیل ہے۔ زوال وانہدام ہے۔ یا سچ کا وجود صرف اس لیے ہے کیونکہ موت کا وجود ہے۔ اگر دنیا صرف دنیا ہوتی تو سچ کا بھی کوئی وجود نہ ہوتا"

"جی ہاں ایسا ہی ہے۔ اگر آکسیجن آکسیجن ہوتی اور گینڈا گینڈا ہوتا تو سچ کا کوئی وجود نہ ہوتا۔ تب صرف موت ہوتی اور اس کا تاج ہوتا۔ پر اِیڈ! لیکن تو تمن خاص اور اس کے تاج کے باوجود موت نہیں ہے۔ اپنے آپ میں موت ممکن نہیں کیونکہ وہ جو ایسا کہتا ہے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ ہے"

"اس کا مطلب ہے عورت تو تن خامن ہے۔ عورت کو تاج اور پیرامِڈ سمیت بہرحال مرنا ہے یا پھر عورت کو بہرحال موت بننا ہوگا۔ عورت روگ ہے۔ مرد کی تاریخی خاندانی روایت"۔

"اور مرد؟"

"سچائی" اس نے کہا "نورِ اعلیٰ ہے۔ ہم جعل ساز ہیں۔ بنانے والے ہیں۔ ہم وہ جھوٹ تیار کرتے ہیں جو زندگی ہے، محض کھلونا ہے۔ اسی لیے مرد ہم سے اس قدر نفرت کرتا ہے"۔

"کیا تم مجھ سے اپنی جگہ بدلنے کے لیے تیار ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ اگر تمہیں یہ ذلیل چولا پسند ہو"۔

"اگر تم وہ بن جاؤ جو میں ہوں تو کوئی مسئلہ ہی نہیں رہا"۔

"یہ کیسے؟"

"تب تم راما سوامی ہوتے ہوئے بھی فی الواقع ساوتری بن جاؤ گے"۔

"اور ستیہ وان کون ہوگا"۔

(مہابھارت میں تمام مشکلات کے باوجود ساوتری ستیہ وان سے (حق پرست سے سچے سے) شادی کرتی ہے اور اسے ملک الموت کے ہاتھوں سے بھی آزاد کرا لیتی ہے)۔

"ذات، سچائی" میں نے کہا اور آہ بھری۔ میرے ٹانگے محسوس کرنے میں پُرسکون اور اچھے لگ رہے تھے۔ وہ جلد کے ساتھ اپنے قریبی وجود میں جی رہے تھے۔ نہیں ستیہ وان نہیں مر سکتا۔ مرد کو اپنے تئیں بذاتِ خود بھی ہونا چاہیے اور اپنی دلہن کے طور پر بھی۔ تمہیں یاد ہے میں نے تمہیں بتایا تھا کہ سب دلہنیں بنارس کی پیدائش ہوتی ہیں"۔

"میرے سوامی! اگر بنارس اپنے اندر ہے تو دلہن بھی بنارس میں ہے"۔

"پھر بھی، مرد کو مرنا ہی ہوگا۔ ساوتری!"

"عورت کبھی تھی ہی نہیں اور نہ ہی کبھی ہو سکتی ہے۔ جب ٹرسٹن کی وفات ہو گئی تو اِسولٹ آئی۔ اِسولٹ ہمیشہ بہت دیر سے آتی ہے"۔

"اگر اِسُولٹ مر جاتی تو؟"

"اِسُولٹ تو بذاتِ خود موت ہے۔ جب موت خود مرتی ہے تو..."

"ٹرِسٹن کا جنم ہوتا ہے اور پھر کبھی اِسُولٹ ہوتی ہی نہیں۔"

"تب اِسُولٹ کو کیا ہو جاتا ہے؟"

"وہ ٹرِسٹن بن جاتی ہے۔"

"تو کیا ٹرِسٹن کبھی نہیں مرتا؟"

"ستیہ وان نہیں مرے گا ساوتری۔"

"سچ کو بہرحال قائم و برقرار رہنا چاہیے۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ ساوتری کو بہرحال زندہ رہنا چاہیے۔"

"عورت کی ملکہ کے طور پر تاجپوشی کی جاتی ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ کیسے؟" اس نے پوچھا۔

"مرد اپنی ہی موت کا جشن مناتا ہے۔ مرد کے لیے موت ماورائیت کا تجربہ ہے۔"

"اور ماورائیت؟"

"ماورائیت شان و شوکت ہے۔ تبدیلئ ہئیت مرد کا اعزاز ہے۔ مادرِ خدا کی حقیقی فطرت، وسعت غلبہ نہیں بلکہ مفروضہ ہے۔"

"تو پھر؟" وہ پوچھنے لگی۔

"اس لیے عورت ہی قربانی ہے۔"

"قربانی سے کیا ملتا ہے؟"

"دنیا۔"

"اور دنیا سے؟"

"ایک سلطنت۔"

"اور سلطنت میں؟"

"ایک ملکہ۔ اس طرح مرد نے اپنے آپ کو واپس کر دیا۔"

"اس لیے مرد جادوداں ہے، امر ہے، ماورائے مرگ ہے۔" وہ بولی۔ "ملکہ کے طور پر اس کی تاجپوشی کی جاتی ہے۔"

اندر دیوتا کا ترشٹبھ چھند میں نے گایا:

پنچ دش ہیقر راجہ سوم
مجھے دیوتاؤں کی شکتی کا سہارا ہے
اسی سہارے سے
میں کشتری بن گیا ہوں۔

ہے ایشور۔ ہے پتا!
میں جو کچھ بھی ہوں آپ کی نذر کرتا ہوں
یہی میری قربانی ہے، میرا تحفہ ہے، میری محنت ہے اور
اور میرا نذرانہ

اگنی تم میری گواہ رہنا۔
ہوا تم۔ میری سامع!
آدتیہ۔ تم میرا کھلا اعلان کرنا
میں جو بھی ہوں، ہوں!

چار شیروں والے سنگھاسن پر اب ایک ملکہ جلوہ افروز ہے۔ اور رگ وید "نتیجہ" پیدا ہونے والی صورت حال کی آواز۔

ان دنوں وہ اکثر مجھے دیکھنے آیا کرتی تھی۔ وہ بنا اطلاع دیئے چلی آتی۔ ایسا لگتا تھا ہسپتال والوں نے بھی اس مہینے میں اپنے نظم و ضبط کے معمول میں کچھ ڈھیل دے دی تھی اور اب ملاقاتی اپنی مرضی کے مطابق آتے جاتے تھے۔ صرف نرسوں کا کام اکثر بڑھ جاتا تھا

افسوس ہوتا تھا کہ ٹمپریچر چارٹ اب موسمیاتی چارٹوں کی طرح اپنی لکیروں کو اپنے آپ پر نہیں دکھا پا رہے تھے۔ ساوتری آتی اور دیر تک ٹکٹکی لگا کر میرے چارٹ کو دیکھتی رہتی۔ میرا ٹمپریچر لیتی۔ اپنی موجودگی کے لیے سسٹر زاں کے سامنے بہانے پیش کرتی اور کہتی "جانِ من! آج تمہارا بخار کچھ کم ہے" اوہ۔ میں جانتی ہوں میں ہی بخار ہوں میں ہی ٹمپریچر ہوں" پھر وہ سرد آہ بھرتی اور جب وہ اپنی آنکھیں پونچھتی تو کاجل بہہ کر نیچے آجاتا۔ وہ سب پونچھ ڈالتی اور ایسا کرتے ہوئے اپنی بنگلوری نیلگوں ساڑھی یا سفید لکھنوی ساڑھی کو ایک نشان اور میرا ایک امتیاز، میری ایک خصوصیت عطا کر دیتی۔ "وعدہ کرو تم اسی ساڑھی ہی میں میرا انتم سنسکار کرو گے" وہ رومانی انداز میں التجا کرتی۔ میں جواب دیتا۔

"موت مادہ ہے، نر نہیں ہے۔ اس لیے اسے اپنے آپ کو بہرحال نذرِ آتش ہی کرنا ہے"

پھر وہ میرا کا کوئی بھجن گنگنانے لگتی جس سے ہسپتال کا کمرہ مہک اٹھتا۔ اس میں سکون کا ماحول پیدا ہو جاتا اور اس کو رفعت اور سرفرازی عطا ہو جاتی۔ ایسا لگتا دھوپ میں مزید چمک پیدا ہو گئی ہے کیونکہ ایک راجپوت رانی برندابن میں کرشن کا گن گان کر رہی ہے۔

"میرے پریتم، میرے پریتم" میرے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ کر کہتی "میں کہنا چاہتی ہوں کہ میں تمہارا سارا درد چوس لوں" اور اپنا سر میرے سر کے ساتھ جوڑ کر مجھے محسوس کرنے کی کوشش کرتی۔

"تم جانتے ہو میں تم سے پیار نہیں کرتی ہوں" ایک روز اس نے کہا۔

"میں جانتا ہوں" میں نے کہا "کیونکہ اگر تم پیار کرتیں تو سب کچھ برندابن جیسا ہوتا ہے"

"تو تم مرلی کیوں نہیں بجاتے۔ میں اپنی گائیں اپنے بچے اور وہ شخص جو میرا پتی ہے۔ سب کو چھوڑ دوں گی"

"وہ شخص جو میرا پتی ہے۔ ایسے الفاظ زبان پر مت لاؤ۔ وہ تمہارا پتی ہے اور تم میری ہو"

"بے شک وہ ہے۔ لیکن افسوس وہ میرا پتی ہے"
"ساوتری وہ بڑا اچھا آدمی ہے۔ پتی کے روپ میں اس سے بہتر کچھ نہیں ہو سکتا"
"لیکن تب برندا بن کہاں ہے؟"
"جہاں کرشن ہے"
"اور کرشن کون ہے؟"
"میں، جب میں رام نہیں ہوتا" میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔
"جہاں من نہیں۔ نہ ہی جسم ہے، شریر ہے وہیں گھر ہے اس کا۔ برندا بن۔ اور وہیں مراری جگ مگ کرتا ہے"
"پھر رادھا کا یہ پاپ کیوں؟"
"کیونکہ کرشن ابھی کرشن نہیں ہے۔ اور جب کرشن، کرشن نہیں ہے تو رادھا جیسی کوئی رادھا نہیں ہے۔ بلکہ وہ بذات خود رادھا ہے۔ یہی قول محال ہے ساوتری انسان کا مرگ آشنا قولِ محال"
"یہ قولِ محال ہی بخار ہے۔ ہے ایشور میں اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوں۔ کاش میرا یہ بخار کسی طرح چلا جائے۔ یہ بخار جو بذاتِ خود میں ہوں۔ پربھو مجھے اپنے شرن میں لے لو تاکہ میں اس دنیا کو بھول جاؤں"
"ساوتری کون کس کو لے سکتا ہے؟ جیسا کہ میں نے ایک بار میڈلین کو بتایا تھا جہاں ہم کچھ حاصل کر لیتے ہیں وہاں کوئی پیار نہیں ہوتا۔ اور جہاں ہم پیار کرتے ہیں وہاں کوئی لین دین نہیں ہوتا۔ آپ صرف اپنے آپ کو ہی حاصل کر سکتے ہیں"
"تو پھر فٹافٹ بتاؤ۔ یہ کیسے ممکن بنایا جا سکتا ہے"
"شاگردی قبول کر کے" میں نے جواب دیا۔ جیسے میں اپنے کسی انتہائی پوشیدہ راز کا انکشاف کر رہا تھا:
"شاگردی کس کی؟"
"کرشن کی سچائی کی"

وہ سمجھ گئی۔ کافی دیر خاموش رہی۔ پھر اس نے کھڑکی بند کی اور اپنا کوٹ پہنتے ہوئے بولی۔

”رام! میرا ایک سوال ہے“

”ہاں ساوتری۔ بولو تم کیا پوچھنا چاہتی ہو“

”کوئی بھی فرد کس سے متعلق ہوتا ہے؟“

”اپنے آپ سے ساوتری“

”اس کی شخصیت کے اس حصّے کا کیا ہوگا جو اس کا اپنا نہیں ہے؟“

”تب وہ بہر حال کسی کی ہوگی“

”لیکن اگر وہ مکمل طور پر کسی کی ہو یا کم و بیش مکمل طور پر اور کسی دوسرے کے ساتھ اس کا پلّو باندھ دیا جائے جس طرح بچھڑے کو کھونٹے سے باندھ دیا جاتا ہے یا جس طرح ہوائی جہاز کو راڈار سے منسلک کر دیا جاتا ہے“

”اس صورت میں ہوائی جہاز کو راڈار کی بنائی ہوئی سمت کو ہی قبول کرنا ہوگا تاکہ وہ حادثے سے محفوظ رہے۔ یا تو آپ ہوائی جہاز ہیں اور قومی اور بین الاقوامی رسم و رواج کے مطابق پرواز کرتے ہیں یا پھر پرواز ہی نہیں کرتے“

”اور آپ کی پہلی اُڑان کے موقعہ پر نہ تو آپ کے پروں پر کوئی پھولوں کا ہار ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی ناریل توڑا جاتا ہے“

”ہاں! میرا یہی مطلب ہے“

”اس لیے جب ہوائی جہاز راڈار کا حکم ماننے سے انکار کر دیتا ہے اور صرف کشادہ آسمان، نیچے کے سمندر اور سانتاکروز کی ریت سے پیار کرنے لگتا ہے تو...“

”تو حادثہ ہونا ناگزیر ہے“

”اس لیے ہوائی جہاز کو راڈار کا حکم بہر حال ماننا ہوگا“

”جی ہاں۔ یہی دھرم ہے۔ قانون ہی دھرم ہے۔ دھرم کو نہ ماننا دکھ دینا ہے“

”کسے دُکھ دینا ہے“

" لامحدود آسمان کو۔" میں نے مسکرا کر کہا۔" یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہوائی جہاز کوئی اُڑن طشتری نہیں ہے۔"

" دُکھ کیا ہے؟" اس نے زور دے کر پوچھا۔ میرے پاس لمحہ بھر کے لیے دُکتے ہوئے۔

" دُکھ" میں نے جواب دیا" عمل کی تلچھٹ ہے"

" اور خوشی؟"

" خوشی پیار کی پہچان ہے۔"

" تو مجھے کیا بننا چاہیے؟" اس نے اپنی آواز اپنے آپ میں گھٹتی ہوئی سنی۔

" ایک پتنی، ساوتری۔ ایک پتنی۔ ایک سچی بیوی۔"

" میں ابھی تک سچی پتنی نہیں بن سکی۔ تم جانتے ہو۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں برندابن کا انتظار کر رہی تھی۔"

" میری پیاری ساوتری۔ جہاں دُکھ نہ ہو، وہی جگہ ایسی ہوتی ہے۔ جہاں کرشن اپنی بانسری بجاتا ہے۔ گائیں دوڑی چلی آتی ہیں اور سنگیت سنتی ہیں۔ اپنے منہ اُوپر اُٹھائے۔ اپنے کانوں کو چوڑے سفید کندھوں تک پھیلائے۔ پیڑ سرسبز و شاداب ہو جاتے ہیں۔ ان پر پھول آ جاتے ہیں۔ مور اپنے پر پھیلا دیتے ہیں اور یہ جیون لیلا دیکھنے کے لیے دیوتا دھرتی پر اُتر آتے ہیں۔"

" اور اپنے دُکھ کا کوئی کیا کرے گا؟"

" دھیان رکھو دُکھی ہونا دوسروں کو دُکھ دینا ہے۔ سُکھی رہو ساوتری۔ دوسروں کی خوشی میں خوش رہو۔۔۔ یہی سچائی ہے۔"

" تم مجھ سے ضرورت سے زیادہ توقع رکھ رہے ہو۔ میرے پریتم! کیا میں تمہیں اب بھی یہ کہہ پکار سکتی ہوں۔"

" ہاں، میری ملکہ، میرے اصول۔ تم پکار سکتی ہو۔ دوسروں کی خوشی میں خوش ہونا ہی پیار ہے۔"

اس نے اپنے ہونٹوں کے کونے سے مجھے ہلکے سے چھوا جیسے وہیں پہ سچ تھا۔ ٹھیک وہیں پہ اور وہ لمحہ ہی پورا سچ تھا۔ پھر وہ چلی گئی کچھ روز بعد وہ لندن سے چلی گئی۔ ہوا میں گرمی کے آثار تھے۔ آسمان نیلا تھا۔ اور میرے پھیپھڑے مجھ پہ مہربان تھے۔ "ہاں ملکہ کی تاجپوشی ہو گئی تھی۔ جی ہاں ملکہ کی" جب میری گاڑی واٹر لو اسٹیشن سے چلی تو میری زبان پر یہ الفاظ تھے۔ اگلے روز میں پیرس میں تھا اور چند روز میں برفانی اونچائیوں پر انگے ڈین میں تھا۔ میں خوش، بہت خوش تھا۔ میں برف کی طرح سفید اور جوان تھا۔ برف دھرتی کا آشیرواد ہے۔ برف بتاتی ہے کہ خوشی مکمل ہے، مستقبل اور آپ کے پھیپھڑے اس بات کی گواہی دیتے ہیں۔ پہاڑوں کی خوشگوار ہوا، موسم بہار کی نیرنگی، ایلپس کے گل ہائے ہوا۔ اپنی مون نیلے آئرس، لونڈر، تھائم اور روزمیری اس موت کی طرح تھے جو سفید ہو گئی تھا۔ یا پھر انگ انگ میں دوڑتے خون کی طرح تھے۔ آنکھوں میں میں جگمگاتی تازگی کی طرح تھے۔

سروجا خط لکھتی تھی جنھیں میں سمجھ سکتا تھا۔ میڈلین نے کوئی خط نہیں لکھا۔ میں اس کی خاموشی بھی سمجھ گیا۔ الفاظ اور خاموشیوں میں پھر مفہوم پیدا ہونے لگے تھے۔ دھرتی بخار کی سرشاری نہیں تھی بلکہ ٹھوس تھی۔ اس پہ سنگ میل اور پیڑ موجود تھے۔ پکچر پوسٹ کارڈ بیچنے والی تمباکو کی دکانیں۔ لذیز گرم کافی اور سوئٹزرلینڈ کی وہ مہک بھی موجود تھی جس سے کمرہ جنگل جیسا لگتا ہے اور پانی شفاف، بے داغ!

آدمی دکھ میں درد میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کا پنر جنم اس کی گوشہ نشینی ہے۔ اس کا گیت خود اس کی ذات ہے۔ زرتشت نے یہی کہا تھا ٹھیک یہی بات سادتری نے آنند سے کہی تھی (سادتری اور آنند، ایک اوپیرا کا نام ہے جو ویگنر لکھنا چاہتا تھا۔ بعد میں اس کا نام پارسی فال رکھ دیا گیا تھا)۔ پارسی فال اس سرزمین کا بادشاہ ہے۔ وہ پہاڑوں پر چڑھے گا اور چوٹیوں پہ پنجوں کے بل کھڑا ہو جائے گا۔

اور دھنک کے رنگوں والی موج در موج برف کا نظارہ کرے گا۔ اپنے آپ کے رو برو نغمہ سرا ہوگا کیونکہ اپنے آپ کے سامنے نغمہ سرا ہونا ہی سچی دعا ہے۔ اور جب ایلپس پر گزرتے ہوئے ہوائی جہاز جگمگاتے ہیں تو آپ محسوس کرتے ہیں انھیں خلا کے راز و اسرار سے ایک ایسی سلطنت میں پہنچایا جا رہا ہے جہاں آپ کی رسائی کبھی ممکن ہی نہیں ہے۔ اے انسان رات کی اس سادگی اور معصومیت بھری فضائیں اپنے آپ کو سمجھاؤ کہ تمھیں ایسے ہی جانا ہے جیسے تم آئے تھے۔ اپنے آپ کو یقین دلاؤ کہ خلوت کی سرخوشی ہی حقیقت معظّم ہے۔ دوسروں کی خوشی میں خوش رہو۔ خوش! اور یہ دھیان رکھو۔ تم اپنی نیند کی گہرائیوں میں دنیا کو سرخوشی کی طرح شامل کر لیتے ہو۔!

جب میں پیرس لوٹا تو کیتھرین اور بچے خوب صحت مند اور خوش تھے۔ ایسا لگتا تھا خوشی ان کے اس قدر قریب تھی کہ کٹھل یا بیل کی طرح پودے سے توڑی جا سکتی تھی۔ میں نے بل دار سیاں جارمیاں کے پاس ایک کمرہ کرائے پر لے لیا۔ یہ جگہ گھاٹ سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اس لیے شام کو میں دوڑ کر ندی تک جا سکتا تھا اور پیرس کی مہک اپنے نتھنوں میں محسوس کر سکتا تھا۔ اکتوبر کا یہ موسم بڑا سہانا تھا۔ ہوائیں شمال کے بجائے سمندر کی سمت سے چل رہی تھیں اس لیے ایسا لگتا تھا تیز گرمی کا موسم کچھ طویل ہو گیا ہے۔ اکیلے پھیپھڑے سے انگ انگ ہلکا پھلکا محسوس ہونے لگتا ہے۔ اور سانس گہری اور متوازن ہو جاتی ہے۔ ناتر دام کے سامنے واقع لے کاک در نام کے ایک رستوراں کے بارے میں کچھ کچھ جانتا تھا۔ اور میں جب بھی وہاں جاتا تھا تو مادام چمیئے میرے لیے ہمیشہ مٹر، سلاد اور آرٹی چوک کھانے کے لیے پیش کرتی تھی۔

"وہ بیچارہ بھلا آدمی" وہ اس انداز سے کہتی تھی جیسے مجھے ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق مخصوص خوراک کی ہدایت دی گئی تھی۔ سبزی خوری اس کے نزدیک کوئی اور جواز نہیں تھی۔ وہ ڈاکٹری مشورے کے تعلق سے ہی اسے سمجھ سکتی تھی۔ "بیچارہ بھلا آدمی اس کو اچھی طرح کھلانا ضروری ہے۔" وہ بیروں سے کہنے لگی "وہ پہلے ہی بڑا دبلا پتلا لگتا ہے۔ جونہی شمالی ہوائیں چلنے لگیں گی۔ وہ اسے اڑا کر ندی کے اس پار لے جائیں گی اور وہ کسی سنت کی طرح ناتر دام پر لٹک جائے گا۔" میرا خیال ہے کہ وہ میرے بارے میں سمجھنے کی حد سے ماورا جو کچھ الفاظ کے ذریعے کہتی تھی اس سے کہیں زیادہ جانتی تھی۔ "چلیے" اس نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ "جب آپ پیرس میں ہوتے ہیں تب تو آپ کو خوش رہنا ہی چاہیے، ورنہ آپ کے پتا نے آپ کو گھر سے اتنی دور کیوں بھیجا ہوگا؟ میرا ایک بیٹا ہے جو اسکول جاتا ہے۔ وہ سولہ سال کا ہے اور پڑھائی

میں بھی برا نہیں ہے۔ میں کہتی ہوں "بیٹے پڑھائی کرو، لیکن تفریح کے لیے وقت نکالو۔ اگر جوانی میں بھی تم زندہ دلی کا ثبوت نہیں دیتے تو عمر بھر خوشی سے محروم رہو گے۔" ذرا غور کرو ہمارے چاروں طرف کہاں جنگ نہیں ہو رہی۔ امریکی پھر ہمیں جنگ میں گھسیٹنا چاہتے ہیں۔" اور جہاں تک روسیوں کا تعلق ہے "۔ میں اپنے بیٹے سے کہتی ہوں "انسانیت کی خوشی کا مسئلہ احمقوں کے لیے رہنے دو۔" انسانیت کی خوشی کام کے علاوہ بوتلیں دھونے، آلو چھیلنے یا لے ہال میں بوجھ ڈھونے کے علاوہ کسی اور چیز میں نہیں ہے۔ اور اگر خود بون ڈیو بھی دھرتی پر آ جائے تو مسٹر فکر نہ کرو تمہیں انکم ٹیکس پھر بھی ادا کرنا پڑے گا۔

مادام چیپے میری دیکھ بھال اس طرح کرتی تھی جیسے میں کوئی کھویا ہوا بچہ تھا۔ جب پاتروں مجھ سے کچھ زیادہ پیسے لیتی تو وہ احتجاج کرتی تھی۔

"وہ غریب طالب علم ہے اور اپنے ماں باپ سے اتنی دور ہے مادام لا پاتروں۔ وہ اپنے ملک اور ہم وطنوں کے لیے کس قدر ترستا ہو گا۔ وہاں کیسی چمکیلی دھوپ ہو گی اور یہاں موسم سرما آ لنے، ساؤ، لوس قبرستان میں کسی ایسی بیوہ کی طرح نوحہ گر ہے جس کا شوہر جنگ میں کام آ گیا ہو۔ مادام لا پاتروں میں کہتی ہوں اس سال ایک بار پھر لڑائی چھڑ جائے گی۔ امریکیوں کو دیکھو ذرا۔"

آپ مادام چیپے سے بحث نہیں کر سکتے تھے۔ آپ اخبار میں چھپے ہوئے لفظ سے بحث نہیں کر سکتے۔ فرانس میں دو بدو معرکے بند ہو چکے تھے۔ آپ جو چاہیں کہہ سکتے تھے۔ جو چاہیں شائع کر سکتے تھے۔ ری زسٹنس کی تحریک کے دنوں میں کچھ بہادر لوگوں کے ہاتھوں شروع کیا گیا اخبار 'لا فرانس لبر' بہر حال سچ ہی کہتا ہو گا۔ مادام چیپے کا کہنا تھا کہ اس اخبار کے کالموں سے کئی مردہ لوگوں کو زبان مل گئی ہے۔ اس کا شوہر رینو موٹر کارخانے میں کام کرتا تھا اور وہاں کے لوگ اتنا زیادہ جانتے تھے جتنا کہ کوئی وزیر بھی نہیں جانتا تھا۔

"ایک وزیر کیا جانتا ہے؟" مادام چیپے کی پختہ دلیل تھی "وہ شاید ہی کبھی باہر نکلتا

ہو۔ اور جب نکلتا بھی ہے تو اس کے دائیں بائیں موٹر سائیکل سوار اور آگے آگے ایک سکریٹری رہتا ہے۔ اس کے اسسٹنٹ ہی اس کے لیے پورے فرانس پوری دنیا کی اطلاع فراہم کرتے ہیں۔"

مادام چھپے اپنے شوہر کے توسط سے ہی یہ سب باتیں جانتی تھی۔ اور کیسی کیسی بھیانک باتیں جانتی تھی۔ اور اس کے شوہر کو یہ سب باتیں براہ راست اپنے ساتھیوں سے معلوم ہوتی تھیں۔

"دنیا میں آپ جیسے دُبلے پتلے اور بیمار آدمی نہیں ہونے چاہئیں" وہ بار بار کہا کرتی تھی "دنیا کو پارک د پرنسے کے لوگوں کی طرح زندہ دل ہونا چاہیے۔ جو کھیلیں تو کھل کر کھیلیں اور کام کریں تو ڈٹ کر کام کریں۔ مسٹر کیا آپ مانٹے کارلو کے بارے میں جانتے ہیں؟" اس نے پوچھا "وہاں ایسی شاندار دھوپ ہوتی ہے کہ جی چاہتا ہے سب پرندوں کو پنجرے کھول کر آزاد کر دیا جائے۔"

مادام چھپے کا ایک دشمن تھا۔ وہ سامنے سڑک کے پار پرندوں کا کاروبار کرتا تھا۔ وہ امریکیوں کے مقابلے میں اس سے کہیں زیادہ نفرت کرتی تھی۔ اس شخص کے پاس لوّو، ٹوئیاں، طوطے، کینری، بگلے اور ہکنٹھ پرندے۔ سبھی تھے۔ وہ پرندوں کا دانہ اور اس کی دوائیاں بھی بیچتا تھا۔ وہ پرندوں کے خوبصورت پنجرے بھی تیار کرتا تھا۔ "یہ پیکنگ کے پنجرے ہیں" وہ اپنے گاہکوں کو دکھاتا۔ "یہ کمبوڈیائی ہیں اور یہ سینیگالی اور یہ عربی اور یہ مارٹینیق جزیرے کے" "آپ اپنی قوتِ خرید اور ذوق کے مطابق اپنے پرندوں کو لے کر سنہرے روغنی یا لوہے کے یا شاہ بلوط کی لکڑی کے بنے ہوئے پنجروں میں قید کر سکتے تھے۔

"مسٹر" مادام چھپے کہتی گئی "ان کتب فروشوں جیسا ہونا کہیں بہتر ہے۔ میرے دوست ژاں کو دیکھو۔ میں اسے تیس برسوں سے جانتی ہوں۔ وہ کبھی بوڑھا نہیں ہوا اور ہمیشہ آپ جیسے نیک لوگوں کی خدمت کرتا رہا۔ جب نوجوان آتے ہیں۔ غیر ملکی تو کیا آپ سوچتے ہیں کہ ہمارا ژاں برہنہ عورتوں والے وہ خوفناک فحش ناول کبھی بیچے گا؟ نہیں مسٹر

کبھی نہیں۔ میں اس سے کہتی ہوں ’’ڈراں تمہیں تو پادری ہونا چاہیے تھا۔ تم اس قدر نیک ہو۔ ‘آہ‘، وہ ہنستا ہے۔ میری نیکی میرے کاروبار تک محدود ہے۔ گھر میں میں بڑا ظالم ہوں۔ میرے دو بچے ہیں اور خوفناک بیوی۔ وہ ہسپانوی ہے۔ انڈالوسین کبھی کبھی میں اسے پیٹتا بھی ہوں۔ تم جانتی ہو، ہو سکتا ہے وہ اسے پیٹتا ہو۔ میں کیسے جان سکتی ہوں؟ میرا انیک شوہر تو مجھے بڑے پیار سے چھوتا ہے۔ ہماری شادی کو ۳۱ برس ہو گئے۔ مسٹر، میں ایک پرندے کی طرح خوش ہوں اور میرا بیٹا بھی۔ مسٹر اگر آپ چاہیں تو یہ عالمانہ کتب۔ یہ ڈرائنگ یہ میڈل بیچنا کہیں بہتر ہے۔ لیکن پرندے بیچنا... توبہ! میں اس شخص کے ٹخنے اور منہ میں کنڈا پھنسا کر اسے سین ندی میں ڈبو دوں گی۔ کیا تمہارے ملک میں بھی لوگ پرندے پکڑتے ہیں مسٹر!‘‘

سامنے سڑک پار دالاکتب فردس میرا دوست ڈراں میری ضرورتیں پوری کرتا رہتا تھا۔ مجھے صرف اسے بتانا ہوتا تھا کہ مجھے فلاں کتاب چاہیے اور وہ اپنا اسکارف پیچھے کی طرف ٹھیک کر آنکھ مارتا تھا۔ وہ ٹھیک اسی شخص کو جانتا ہوتا تھا جس کے پاس یہ کتاب موجود تھی۔ اس طرح مجھے بے دی آر، لی، گیسٹن ہیرس اور دوسری کتابیں ملی تھیں۔ میرا کام آگے بڑھ رہا تھا۔

مجھے ہندوستان لوٹنے کی جلدی نہیں تھی۔ وہاں واپس جانے کے لیے آخر تھا ہی کیا؟ چھوٹی ماں سروجا کے ساتھ رہنے کے لیے الہ آباد چلی گئی تھیں۔ سبرامنیا کا تبادلہ ہو گیا تھا۔ چھوٹی ماں بے حد خوش تھیں کیونکہ اب وہ ہر صبح گنگا میں اشنان کر سکتی تھیں۔ سُکماری اور اس کا شوہر دونوں بمبئی میں تھے۔ سُکماری کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو گئی تھی۔ وہ شاذونادر ہی خط لکھتی تھی۔ اس کے نزدیک میں انتہائی رجعت پسند تھا۔ میرے لیے اس کی نفرت میں وہی شدت تھی جو بھائیوں بہنوں کے درمیان اس صورت میں پیدا ہو جاتی ہے جب وہ ایک دوسرے سے اختلاف کرنے لگتے ہیں۔ سُکماری نے چونکہ کرشنمچاری سے بیاہ کر لیا تھا اس لیے اس کی سیاست ہی اس کا اعتقاد بن گئی۔ اپنی خوشی کے تئیں اس کا فرض! اسے اپنے شوہر سے پیار بھی کرنا تھا

اور اس کی پوجا بھی۔ وہ ایسی پکّی ہندو عورت تھی کہ وہ پتی پوجا کے بغیر رہ ہی نہیں سکتی تھی۔ اس صورت میں بہر حال ایک دشمن چاہیے تھا۔ ٹرانسکی غدود کی ضرورت ہے۔

سروجا سنکی تھی۔ اس کی چٹھیوں میں کوئی خاص بات نہیں ہوتی تھی۔ صرف ایک خط میں اس نے لکھا تھا: "میرے لیے زندگی ختم ہو چکی ہے۔ زندگی سے میری مراد۔ امید، کام اور کامیابی کا اطمینان ہے۔ میں کسی چیز کی توقع نہیں رکھتی۔ صرف تمہیں یاد کرتی ہوں۔ میرے بھیّا۔ جلدی لوٹ آؤ۔"

ببلیو تھیک نیشنل میں کام کرتے کرتے کبھی کبھی میں سروجا کا خط کھول لیتا اور یہ سوچ کر اسے بار بار پڑھتا کہ اس دنیا میں کسی لحۂ مکاں میں کوئی تو ایسا ہوگا جس کے پاس میں آزادی سے 'پیار سے' بے تکلفی سے آنکھوں میں آنسو لیے جا سکتا تھا۔ لیکن اس کے لیے مجھے بہر حال ایک گھر چاہیے تھا۔ مجھے بہر حال گھر لوٹنا تھا۔ تب میں سروجا کو گھر بلواؤں گا۔ اور چھوٹی ماں چھ مہینے میرے ساتھ گزارے گی اور چھ مہینے اپنی بیٹیوں کے ساتھ۔ ایک روز میں نے اپنے آپ سے کہا میں چھوٹی ماں کو یورپ لے جاؤں گا۔ وہ سیر سپاٹا پسند کرتی تھیں۔ میں انھیں جنیوا کی جھیل دکھاؤں گا اور پیرس کا لے انولیڈس۔ ممکن ہے میں انھیں لندن بھی لے جاؤں اور انھیں سینٹ پال کا گرجا گھر، ایبے اور ٹاور آف لندن بھی دکھاؤں۔ مجھے یقین تھا کہ کلکتہ اسٹیشن پر پروسی گئی مچھلی کو یاد کر کے وہ "اوہ یہ سمندری بیگن نہیں کہیں گی (میں نے پڑھا تھا کہ بنگالی برہمنوں کی طرح کبھی لوگ بھی یہ "جل توریاں" کھا سکتے تھے کیونکہ وہ آلودہ معاشرت کی پیداوار نہیں تھیں اور پانی سے باہر آتے ہی مر جاتی تھیں)۔ شاید میں چھوٹی ماں کو آنے کے لیے تیار کر سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے سروجا بھی آ جائے۔ میں جاگتے کے خواب دیکھنے لگا۔

میں نے اپنا چشمہ صاف کیا اور انوسینٹ سوم کے فتووں کی جانب لوٹ آیا۔ اس دانشمند اور نیک شخص کو بدعتوں کی پاکیزگی اور رومن چرچ کے تسلسل میں سے ایک چیز کا انتخاب کرنا تھا۔ وہ کرائسٹ چرچ کے بجائے کنواری مریم کے فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ عورت کو ہی دنیا پر بہر حال حکومت کرنی چاہیے۔

یکایک مجھے ساوتری کے وہ آخری الفاظ یاد آئے جو اس نے میرے بجائے لندن کے ہسپتال کی نرس کو مخاطب کرتے ہوئے کہے تھے "مرد کس قدر دکھ جھیلتے ہیں"۔ یہ لفظ اس نے سسٹر ژاں کو دروازہ بند ہونے سے پہلے باہر کہے تھے۔ میرا خیال ہے وہ رکنا چاہتی تھی۔ کسی کو کچھ کہنے کے لیے۔ کسی کو بھی "مرد کس قدر دکھ جھیلتے ہیں سسٹر ژاں! عورت کا درد و کرب جسمانی لگتا ہے۔ چونکہ اس کا آغاز ہے اس لیے اس کا انجام بھی ہے"۔ "آپ ٹھیک کہتی ہیں مادام" سسٹر ژاں نے جواب دیا تھا "میں ہمیشہ زنانہ وارڈ کو مردانہ وارڈ پر ترجیح دیتی ہوں۔ عورتیں ایسا محسوس کرنے لگتی ہیں کہ جسم کے ٹھیک ہوتے ہی سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ صحت مند مکمل!" "اور مرد" ساوتری نے پوچھا تھا۔ "اوہ مادام جہاں تک مردوں کا تعلق ہے میں راما سوامی کا ذکر نہیں کر رہی ہوں۔ وہ تو ایسا نیک مریض ہے! میرا مطلب ہے، مرد عام طور پر دکھ اور درد و کرب کا شدید احساس رکھتے ہیں۔ ہر مرد سولی پر لٹکے عیسیٰ کی طرح ہوتا ہے"!

بیچارہ انوسنٹ سوم صلیب پر لٹکا ہوا ایسا ہی عیسیٰ تھا۔ اس نے کنواری مریم کے تئیں اپنا فرض چکایا۔ دنیوی جرم و سزا کا ادارہ قائم کر دیا۔

جی ہاں، واقعی مرد کتنا دکھ جھیلتا ہے۔ ایک طرح سے ہم کہہ سکتے ہیں عورت کا دکھ حیاتیاتی ہے۔ چونکہ اس کا آغاز ہے اس لیے اس کا انجام بھی ہے لیکن مرد کا دکھ گنگا کنارے کی بڑی سڑکوں کی طرح ہے جنھیں پرانے اور وقت کے ساتھ جھکے ہوئے پیڑ بارش اور دھوپ بچائے رکھتے ہیں۔ لیکن رات آتی ہے اور ہر چیز میں سرایت کر جاتی ہے۔ رات محوِ خواب دیہات، چنگی گھروں، مسافروں کے رہنے کے بنگلوں اور ندی کنارے کی سراؤں تک پہنچ جاتی ہے۔ ایسے میں بھی کہیں نہ کہیں کوئی یاتری ہوتا ہے کوئی پرسی واجک، جو چلتا ہی رہتا ہے۔ ٹوکریاں اور کمبل اٹھائے مرد۔ روتی بلکتی عورتیں۔ سوئے ہوئے بچے۔ تھکے ہارے بیل جو گاڑی آگے کھینچنے سے قاصر ہیں۔ تیز دوڑتی کاریں ہارن بجا بجا کر اپنے شور سے پاگل بنا کے رکھ دیتی ہیں۔ لیکن پو پھٹے ممکن ہے بڑ کے پیڑ پر کوئی طوطا بیٹھا ہوا ہو۔ اس کے سرخ پھل کھا رہا ہوں اور اپنا گیت گا رہا ہو۔

مرد کی خوشی بس اتنی سی ہے۔ مرد کا دُکھ اس دھرتی کا نہ ہونے کا ہے۔ شادی کرنا اس کے لیے دھرتی سے جڑنا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح کیتھرین سے شادی کرنے سے جارجز فرانسیسی بن گیا تھا۔ اب وہ کہہ سکتا تھا "دوسرے فرانسیسی" اور وہ بھی فخر کے ساتھ۔ اس دھرتی کو جاننے پہچاننے کے لیے مرد کو شادی کرنا ضروری ہے۔ بھگ یعنی کوکھ مہان پرکرتی ہے عظیم فطرت ہے۔ اور کوکھ کا مالک بھگ + وان۔ بھگوان۔ شو ہے۔"

شام کو کھانا کھانے کے بعد میں اکثر جارجز اور کیتھرین کے پاس جایا کرتا تھا۔ میں بلوارسیاں مشیل تک جاتا تھا۔ گار منپارناس سے ۸۳ نمبر کی بس لیتا تھا جو مجھے ایوے نیو بوسکوٹ کے درمیان سے اور لے ان ویلڈس کے پیچھے سے پلاس د الما تک لے جاتی تھی۔ میں ندی کنارے کچھ دیر رکتا اور پھر ۶۳ نمبر کی بس لے کر سیدھا لامیو پہنچ جاتا۔ وہاں سے میں رو مشیل آنج تک پیدل جاتا تھا۔ جب میں سیڑھیاں چڑھ رہا ہوتا تو مجھے میڈلین چچا چارلس، تانت زوبی کی یادیں گھیر لیتیں۔ میڈلین شاذونادر ہی خط لکھتی تھی اور اکثر کسی ایسے بل کے بارے میں معلوم کرنے کے بارے میں لکھتی تھی جسے میں نے ادا نہیں کیا تھا یا پھر کسی ایسی کتاب کے بارے میں جو میں نے لائبریری کو لوٹائی نہیں تھی۔ اب وہ میری صحت کے بارے میں کبھی کچھ نہیں پوچھتی تھی۔ اپنے بارے میں بھی مجھے دینے کے لیے اس کے پاس کوئی خبر نہیں تھی۔ "میں اب ایک فرد تک نہیں رہی۔ اس کے بارے میں کیا کہوں؟ جسم کی خبر جسم کو سننے دو باقی کسی دوسرے کے بجائے فرد خود ہی اپنے آپ کو بتا سکتا ہے۔ دراصل کہنے کے لیے کچھ ہے ہی نہیں۔ اس لیے میں تم سے کچھ نہیں مانگتی، کچھ نہیں پوچھتی۔" اس نے میرے لندن کے قیام کے دوران لکھا تھا۔ کیتھرین کے دوست میڈلین سے ملتے رہتے تھے۔ مجھے کیتھرین سے پتہ چلا تھا کہ میڈلین مسلسل بیمار رہنے لگی تھی۔ چیڑھ کے پیڑ کی ایک شاخ کاٹتے چھانٹتے اس کی انگلی کٹ گئی تھی اور زخم بھرنے میں چھ ہفتے لگتے تھے۔ اس نے فاقہ کشی کا نسخہ آزمایا اور جب ایسا لگتا تھا سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے تو اسے بخار

ہونے لگا۔ پھر وہ پھلوں کے رس سے علاج کرنے لگی۔ لیکن بخار نہیں اترا۔ بالآخر اسے پنسلین کے ٹیکے لگوانے پڑے اور اسے افاقہ ہوا۔

اب تک میڈلین نے والاے روشے کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا کیونکہ باغ کی دیکھ بھال اچھا خاصا بوجھ بن گئی تھی۔ پھر وہاں تھا ہی کون اس سے لطف اندوز ہونے والا۔ اس نے رُوسیاں جے فی ویو میں موڑ پر ڈاکخانے کے پاس کرے کرائے پر لے لیے تھے۔ یہ سڑک بڑی پُرسکون ہے۔ اور سب سے اوپر کی منزل میں دو بڑے بڑے کمرے ہیں۔ اس نے کیتھرین کو لکھا تھا (مالک مکان ریٹائرڈ کسٹمز آفیسر تھا اور پرماتما کا شکر تھا کہ اس کا کوئی بچہ نہیں تھا)۔ اس نے غیر ضروری فرنیچر جس میں سبز رنگ کی کرسیاں، ایک بڑا فالتو پلنگ اور دو الماریاں (یہ الماریاں اٹھارھویں صدی کی تھیں اور کہا جاتا تھا یہ ان کو اپنے انگریز اجداد سے ورثے میں ملی تھیں) بھی شامل تھیں کیتھرین کو بھجوا دیا۔ "تمہارا کنبہ بڑا ہے۔ میرا مطلب تمہارا کنبہ بہت جلد بڑا ہو جائے گا۔ ایک اکیلے شخص کو اتنے سارے سامان کی کو کس لیے ضرورت ہے آخر؟" اس نے کیتھرین کو لکھا تھا۔ میرا خیال کیتھرین نے مجھے یہ خط کسی مقصد سے دکھایا تھا۔ اکثر جب میں کمرے میں داخل ہوتا تو وہاں پڑی مخملیں کرسیاں دیکھ کر مجھے کچھ عجیب سا لگتا۔ میں پیچھے مڑ کر دیکھتا شاید دروازہ کھل جائے گا اور میڈلین یہ کہتے ہوئے اندر آئے گی " اف یہ پروفیسر۔ یہ عورتیں۔ ان میں کبھی حوصلہ پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہیں گے لیکن کسی اصول کی خاطر میدان میں نہیں آئیں گے۔ میں تو ان سے تنگ آچکی ہوں" میڈلین کے دل میں عورت کے لیے کوئی خاص ہمدردی نہیں تھی۔

کبھی کبھی چچا چارلس رویاں سے آجاتے تھے۔ وہ کچن کے برابر والے کمرے میں سوتے تھے جہاں پہلے پہل میں آکر ٹھہرا تھا۔ ایک ادھ بار وہ اوتیل دے پارک ریلوے سین میں میرے رہنے کے نئے کمروں میں بھی آجاتے اور مجھے اِدھر اُدھر کہیں بھی لے جانے کی کوشش کرتے۔

"میری بیٹی، اپنی ماں پر گئی ہے۔ میری پہلی بیوی زوبی کی طرح نہیں تھی۔ وہ گرجا گھر کی چوہی تھی۔ بدبودار موٹی جو ہر روز صبح گرجا گھر میں دعا کے لیے جاتی۔ شوہر اور بیٹی کے لیے کھانا پکاتی۔ چرچ اور اسکول کے لیے لڑکی کو کپڑے پہناتی، تیار کرتی اور باقی وقت میں بستر پر پڑی سنتوں، درویشوں کی سوانح عمریاں پڑھتی۔ وقت گذرنے کے ساتھ کیتھرین بھی اپنی ماں جیسی ہو جائے گی۔ اس میں کوئی رس نہیں ہے۔ میں اس سے یہ نہیں کہہ سکتا۔ "آؤ کہیں چلیں"۔ وہ ہمیشہ بچوں کے کھلونے یا اپنی پیاری بچی کے لیے ڈائپر خریدنے کے لیے بازار دے اوتیل دول جانا پسندتی کرتی ہے۔ گلابی گوشت کے گول مٹول شیطانی لوتھڑے" چچا چارلس کہتے۔ پہلے وہ مجھے بلیس کلچی لے گئے اور پھر موں ماتر۔

میرا اپنا خیال تھا حالانکہ میرے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں تھا کہ جب سے تانت زوبی بیمار رہنے لگی تھی چچا چارلس کے پیرس آنے کی وجہ اپنی نواسی سے ملنے کے بجائے کوئی اور تھی۔ ایک بار غیر محتاط جملہ ان کے منہ سے نکل گیا۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ ہر بار جب وہ پیرس آتے تھے تو اپنی بیٹی سے ملنے نہیں جایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ رات کے کھانے سے پہلے وہ ہمیشہ اپنی پرانی بغیر لیبل والی گول ٹیوب سے کچھ پراسرار قسم کی گولیاں نکال کر کھایا کرتے تھے۔

"اب میں پہلے جیسا جوان نہیں رہا" ایک شام انھوں نے بتایا۔ "لیکن اس بات کا بھی کوئی جواز نہیں کہ میری توند نکل آئے۔ رام تمہارے جیسا تو میں کبھی ہو ہی نہیں پاؤں گا لیکن میں مسٹر ہیریٹ جیسا بھی نہیں لگنا چاہتا۔ ان کا چہرہ دیکھ کر ہی مجھے پتہ چل گیا کہ انھیں خود بھی اپنی اس بات پر یقین نہیں تھا۔ کیا خیال ہے تمہارا۔ میں پہلے سے کچھ پتلا ہو گیا ہوں نا! میرے پاس کتنا سارا کام رہتا ہے۔ کاروبار مندا ہوتا ہے تو لوگوں کے ذہن کھوٹے ہو جاتے ہیں۔ لوگ جنگ سے کس قدر خوفزدہ ہیں۔ کیا جنگ ہو گی؟ کیا خیال ہے تمہارا رام!"

"نہیں"، میں نے بنا کسی یقین کے جواب دیا۔

اس قسم کی گفتگو کے بعد میں کہا کرتا تھا "اب میں تھوڑی دیر کے لیے گھوموں گا اور پھر واپس جاکر اپنے کام میں لگ جاؤں گا۔" اور وہ مجھے جاتے دیکھ کر ہمیشہ اداس ہو جاتے۔ بیچارے چچا چارلس۔ وہ چاہتے تھے کہ کوئی نہ کوئی ان کے ساتھ جائے تاکہ وہ ہنس بول سکیں۔ شراب پی سکیں اور ہو سکے تو اپنے ساتھ کسی عورت کو لے جائیں۔ ان کا ساتھی بھی اپنے لیے کوئی عورت چُن سکتا تھا۔ کوئی بھورے بالوں والی یا سنہرے بالوں والی۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس کے لیے بھی خرچ کرنے کے لیے تیار رہتے۔ جارجز نے ایک بار بتایا تھا کہ ایک پراسرار عورت۔ نحیف نوجوان آواز والی عورت ہر جمعرات کو ٹیلی فون کر کے پوچھا کرتی تھی کہ چچا چارلس گھر پر ہیں یا نہیں۔

"اس کے لہجے سے میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ عورت کسی بڑے خاص طبقے کی ہے۔" جارجز نے کہا "وہ بڑی شائستہ ہے۔ بڑے نفیس انداز میں معذرت کرتی ہے۔ کیتھرین کا خیال ہے کہ یہ سب احتیاط کے طور پر ہے تاکہ اگر کچھ گڑبڑ ہو جائے تو وہ ریو مشیل آنج آسکے اور جو کہنا ہے کہہ سکے۔"

"ایسی عورتیں ہمیشہ جانتی ہیں کہ آخری نپٹارے کے لیے کس سے ملنا چاہیے۔"

"ریو مشیل آنج پر رہنے والی بیٹی سے بہتر کون ہو سکتا ہے؟" جارجز نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا "کسی مرد یا عورت کی فطرت کا اندازہ وہ اس کی جائے رہائش سے لگاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے اپنے نجی جاسوس بھی ہوتے ہیں۔ بہر حال ہمارے چچا چارلس شادیوں کے سلسلے میں خاص کامیاب نہیں رہے۔ ایک عورت ان کے مقابلے میں کم مہذب تھی اور دوسری ہونے والی سفیر کی سابقہ بیوی۔ یہ سب سوچ کر بڑا افسوس ہوتا ہے۔ چچا چارلس کتنے اچھے آدمی ہیں!"

لیکن کیتھرین قانونی نتائج کے بارے میں فکر مند تھی۔ کچھ بھی ہو وہ ایک نوٹری پبلک کی بیٹی تھی۔

"واہ! واہ!" ایک شام وہ کہنے لگے۔ "تم جانتے ہو رام میں بدمعاشوں میں بدمعاش ہوں۔ میں تمہارے گاندھی کی طرح نہیں ہوں کہ کوئی میرے دائیں گال پر تھپڑ

مارے تو اپنا بایاں گال اس کے آگے کر دوں گا۔ اس سے پہلے کہ کوئی مجھ پر وار کرے میں ہی اس پر وار کر دیتا ہوں۔ میں روز یہی دیکھتا ہوں کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی جانب سے کی گئی دھوکے بازیوں سے اپنے آپ کو کس طرح محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ لیکن جب کوئی شخص اندازہ لگا لیتا ہے کہ دوسرا آدمی اس کو دھوکا دے گا اس کا مطلب ہے وہ خود بھی وقت آنے پر اس دوسرے آدمی کے ساتھ وہی سلوک کرے گا۔ میں کہتا ہوں اس ملک میں پیار محبت جیسی کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ یہ بالزاک کا ملک ہے۔" انھوں نے بات کچھ اس طرح پوری کی جیسے وہ کسی مذہبی صحیفے کا حوالہ دے رہے تھے۔

کبھی کبھی میں جارجز اور کیتھرین کے ساتھ رویاں جایا کرتا تھا۔ ہم صبح کو جاتے اور اسی شام کو لوٹ آتے۔ اکثر دیر رات بارہ بجے تک پون دے لارش، ورنان اور مین ٹیس سے ہوتے ہوئے۔ تانت زوبی سے مل کر مجھے ہمیشہ خوشی ہوتی تھی۔ بیماری کے کارن ان کا چہرہ کافی مسخ ہو گیا تھا لیکن اس وجہ سے ان کہانیوں کی کشش میں کوئی کمی نہیں آئی تھی جو وہ سنایا کرتی تھی۔ وہ بار بار وسطی یورپ کے اس سفیر کا ذکر کیا کرتی جس کی معاشقانہ مہمات کے قصے سب سفارت خانوں میں مشہور تھے لیکن پھر بھی ہر کوئی اسے ملازمت دے دیتا تھا۔ جب جنگ ختم ہوئی، اور ہر شخص کے پاس جانچ پڑتال کے لیے اصلی دستاویز تھے تو پتہ چلا کہ اس نے سب حکومتوں کے ساتھ دھوکا کیا تھا۔ کبھی احمق ہونے کا ڈھونگ رچا کر، کبھی شرابی کا کبھی عیاش کا۔

"واہ! واہ!" تانت زوبی نے کہا "اس کے معاشقے اس کے چہرے سے ظاہر تھے۔ وہ اپنی عورتیں ٹھیک اسی طرح استعمال کرتا تھا جس طرح وہ کف لنک پہنتا تھا یا اپنا مخصوص چشمہ۔ اور جب جی چاہتا انھیں چھپا دیتا تھا۔ ہائے وہ عظیم روایت باقی نہیں رہی اب۔ اب تو خدمت کے لیے لوگوں کو فحش کلام چاہییں۔ کچھ کہتے ہیں مصری شادیوں میں لڑکے والے لڑکی والوں کو گالی دینے کے لیے کچھ فحش کلام رکھ لیتے ہیں۔ کہتے ہیں اس طرح دلہن خوش رہے گی۔ بے عزت کرنے سے قسمت کھلتی ہے یہ انسانیاتی فلسفے کا قدیم اصول ہے۔ رام تم جتنا زمان یا مکاں میں سیاحت کرو گے۔ تم

آتنا ہی زیادہ اس عمل کو دیکھو گے۔ انسان بڑا اکھڑ اور احمق ہے۔ اگر آپ اس کی
ضرورت سے زیادہ عزت کرتے ہیں تو وہ آپ کو دھوکہ دے گا۔ اگر آپ اس کے ساتھ
شرافت سے پیش آتے ہیں وہ آپ کا حکم بجا لائے گا اور آپ کی بے عزتی کرے گا۔ اس
لیے ایک موقعے پر آپ اسے گرم پانی میں ڈبکی دیں اور دوسری بار سرد پانی میں ٹھیک
اسی طرح جیسے ڈاکٹروں نے مجھے مشورہ دیا ہے۔ اگر آپ پوچھیں کہ فالج کس کو ہوا ہے۔
مجھے یا دنیا کو تو میں کہوں گی۔ مجھے اور دنیا دونوں کو میرا چہرہ اس طرف "ہوا ہے
لیکن ان کے چہرے کچھ اس طرح الٹی سمت میں مڑے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ لوگ کہتے ہیں
شیطان کا چہرہ ہوتا ہے۔ زندہ رہنا بس حماقت ہے۔ لیکن ذرا سوچو مرنا بھی تو ویسی
ہی حماقت ہے۔ ذرا اس بیوقوف عورت لا کمتے دے نوٹلس کے بارے میں غور کرو۔
میں کبھی اسے بڑی اچھی طرح جانتی تھی۔ لا دچیز دآزے کے تعلق سے۔ وہ قبر میں اپنی
خوفناک تنہائی کے بارے میں لکھ سکتی تھی "میں جو زندگی میں کبھی اکیلے نہیں سوئی" میں
تم سے پوچھتی ہوں اسے عقل والے انسان کیا ہر شخص ہمیشہ اکیلا نہیں ہوتا؟ مجھے
بتاؤ چارلس کیا تم نے میرے ساتھ اس لیے شادی کی تھی کیونکہ تم اکیلے تھے۔ بولو تم نے
میرے ساتھ شادی اس لیے کی کیونکہ تمہیں بیوی چاہیے تھی۔ جو تمہارے کپڑوں کے
بٹن ٹانک سکے۔ اور جب تمہارے منہ سے رال بہے تو تمہارا منہ پونچھ دے۔ واہ کیا
شاندار ارادہ ہے۔ شادی بیاہ۔ یہ تمہیں بڑی اچھی طرح قبر کے لیے تیار کرتا ہے۔ آپ کو
میاں بیوی میں ایک دوسرے کے پہلو میں دفنایا جاتا ہے اور ابد تک تم سن رہے ہو ابد
تک۔ 'مسٹر اور مادام چارلس روسے لن، نوٹے آر رویاں (سین اینفی ریلے) کے
طور پر تمہیں جانا جاتا ہے'۔ کم از یونانیوں نے نوحے تو لکھے جس سے موت دلچسپ
ہوگئی۔ زندگی میں سب کچھ کرنے کے لیے وقت ہے عشق و محبت، شادی اور پھر بالکل کچھ
بھی نہیں۔ لیکن اب نوٹے آر چارلس روسے لن "آنٹ زوبی ہنس پڑیں۔ اب تک
چچا چارلس کمرے سے باہر جا چکے تھے۔ موت کے ذکر سے وہ نفرت کرتے تھے۔ اسے جب
آنا ہوگا موت بھی اسی طرح آئے گی۔ جیسے میرا کار ندہ آتا ہے۔ اسے جلدی آنے کے لیے

کیوں کہا جائے ؛ میں اپنی کرسی کا چرخا اور اپنی بوتلوں میں بھری شراب کیوں ضائع کروں ۔ مجھے معلوم ہے جب لوگ میرا تابوت لے جائیں گے تو کوئی کتا تک نہیں بھونکے گا۔"
یہ گفتگو جاری رہتی اسی طرح جب تک جارجز کیتھرین کی طرف نہ دیکھتا اور کیتھرین میرے جانب نہ دیکھتی۔ پھر ہم آہستہ آہستہ اُٹھ کر کھڑے ہو جاتے جانے کے لیے۔ بیچارے چچا چارلس اپنے آپ کو کس قدر اکیلا محسوس کرتے تھے۔ وہ ہمیں کار تک چھوڑنے آتے۔ اور کار کے پائدان پر پاؤں رکھ کر اس وقت تک کھانسی زکام یا موکلوں اور میونسپل دروں کی باتیں کرتے رہتے جب تک تانت زدہ بی چلاّ کر نہ کہتیں۔ "کہیں سردی نہ لگ جائے تمہیں تم نے کوٹ تک نہیں پہن رکھا۔ پاپا!" تب کار ہلتی، شور کرتی اور ہمیں وہاں سے لے جاتی ہے۔ کیتھرین بڑی احتیاط اور بڑے اعتماد سے گاڑی چلاتی تھی۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پر میں ہوتا۔ جارجز کار کی پچھلی سیٹ پر ہوتا تھا۔ اور جو کچھ ہمارے ذہن میں آتا تھا ہم اس کے بارے میں باتیں کرتے جاتے تھے۔

چینی زبان میں جارجز کی تحقیق سے اس کو نسطورین ازم اور بدھ مت کے رشتے کے بارے میں بڑے دلچسپ نظریوں کا پتہ چلا تھا۔ وہ ابھی تک 'فوکن' کے مصوّر کتبوں اور کنول اور صلیب کے رشتے پر کام کر رہا تھا۔ اس کا ذہن جہاں بھی جاتا تھا عیسائیت اس پر سوار رہتی تھی۔ ٹھیک اسی طرح جیسے میرا ذہن ویدانت کو ثابت کرنے کے لیے تاریخ کے ساتھ ساز باز کرتا رہتا تھا۔ دراصل ایسا لگتا تھا کہ معروضی طور پر کم و بیش کوئی بھی نظریہ بہتر حقائق کے ساتھ میل کھا سکتا تھا جیسا کہ شطرنج کھیلنا کم و بیش کسی بھی نظام کے زیرِ ہدایت ممکن ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ آپ کتنی بار یہ کہہ سکتے ہیں خود آپ کی سمجھ میں واقعی ساری بات آ گئی ہے۔ دوسروں کو منوانا آسان ہے۔ اپنے آپ کو دھوکا دینا ممکن نہیں بالآخر سچی تحقیق کی یہی واحد کسوٹی ہے۔

کیتھرین کار چلاتے ہوئے خوش ہوتی تھی اور رستے کے کسی موڑ کی جانب اشارہ

کرتے ہوئے بھی جہاں وہ کبھی اپنے دادا کے ساتھ آئی تھی۔ یا جہاں وہ سیانت یوآن کے میلے میں گھوڑے سے گر پڑی تھی۔ اس کے لیے زندگی یادگار واقعات کا ایک سلسلہ تھا۔ خود موت بھی جب آئے گی تو ایک یادگار واقعہ ہوگی۔

رات کے وقت اس پُرسکون خود اعتمادی سے بھری سین ندی کے پاس سے گزرتے ہوئے میں اپنے آپ میں کھو گیا۔ اور خود کو کسی دوسرے کے روپ میں دیکھنے لگا۔ یہ وہ سین ندی تھی جس نے بادشاہوں کو ان کی طاقت اور فرانسیسی زبان کو اس کی جامعیت عطا کی تھی۔ ایت وار کی راتوں کو گھر لوٹتے ہوئے میں سوچا کرتا تھا کیا میڈلین کسی روز اپنے ساتھ مجھے بات کرنے کی اجازت دے گی یا نہیں ؟ یا ساوتری ہندوستان پہنچ گئی ہوگی یا نہیں۔ کیا وہ خوش ہوگی۔ واقعی خوش ؟ کیا ردار نے واقعتاً ہوائی جہاز سے رابطہ قائم کر لیا تھا ؟ میں سوچتا تھا ساوتری کو سورج پور محل میں واپس جاکر کیسا لگے گا۔ جہاں نوبت بجتی ہے۔ نو قسم کا سنگیت بجتا ہے۔ مہاراج کے جنم دن پر توپیں داغی جاتی ہیں۔ (مہاراج کو پانچ بار کا اختیار تھا) اور رات کو ایسی محفلیں سجائی جاتی ہیں۔ جہاں عظیم ہندوستان کی تعمیر کے لیے نئے بدمذاق کانگریسی اور پرانے عامیانہ ذوق کے لوگ ایک دوسرے کی صحبت میں مل بیٹھتے ہیں۔ لیکن یہ ہندوستان کسی کا بھی نہیں ہوگا اس وقت تک جب تک لوگ بیٹھ کر یہ نہیں سوچتے یاد کرتے کہ ہندوستان دراصل کیا تھا۔

ہندوستان، فرانس یا انگلستان جیسا ملک نہیں ہے۔ ہندوستان تو ایک خیال ہے۔ ایک مابعد الطبعیات ہے۔ وہاں کیوں جایا جائے آخر۔ میں سوچنے لگا۔ میں جلاوطن پیدا ہوا تھا۔ اور جلاوطنی کی زندگی جی سکتا تھا۔ میرا ہندوستان جہاں بھی میں جاتا تھا میرے ساتھ تھا۔ لیکن گنگا کے درشن نہ کرنا۔ اس میں بار بار ڈبکی نہ لگا پانا۔ نہیں گنگا تو میرے لیے روحانی سچائی تھی۔ میرا اعتماد۔ میری برہمنی روایت کا آغاز و انجام تھی۔ میں بہرحال ہندوستان لوٹ جاؤں گا۔ گنگا کی خاطر۔ ہمالیہ پربت کے دیودار کے پیڑوں کے لیے۔ جنگلوں میں رہنے والے ہرنوں کے لیے۔ گہری سنجیدہ خاموشی میں اُبھرتی

ہوئی ہاتھیوں کی تیز چنگھاڑ کے لیے۔ میں ہندوستان جاؤں گا کیونکہ ہندوستان میری زندگی ہے۔ میری زندگی کی واحد حلیمی بھری، دانش بھری ہنڈاس۔ میری ماں! میں نے محسوس کیا میں اب بھی کسی نہ کسی چیز سے پیار کرسکتا تھا۔ کسی ندی سے، پربت سے، کسی عورت کے نام سے۔۔۔۔

میرا جی چاہا کاش میں ندی ہوتا۔ ایک پیڑ۔ ناگزیر خاموشی کا رویّہ۔

میرا تحقیق کا کام بڑے صبر سے اور کبھی کبھی بڑی تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ میں نے ہولی گریل، اس کی تاریخی اہمیت اور اس کی منزل تکمیل سے متعلق اپنے تھیسس کا نواں باب مکمل کر لیا تھا۔ اب صرف دو مزید باب باقی تھے۔ میرا دسواں باب جنت یعنی سورگ کے بارے میں تھا۔ جب میں اس باب تک پہنچا تو مجھے بڑی احتیاط سے کام کرنے کی ضرورت تھی کیونکہ سوربون کے پرانے بوڑھے پروفیسر نہ صرف ہوشیار اور چالاک تھے بلکہ پرانے خیالات کے تھے اور کٹّر اصول پرست تھے۔ اس لیے یہ یقینی بنانا ضروری تھا کہ ہر پہلو پر پہلے سے خوب اچھی طرح غور کر لیا گیا ہے۔ ورنہ بیکار کی اور اکثر اشتعال انگیز بحث میں پھنس جانے کا امکان تھا۔ میں نے اتنے سارے تحقیقی مقالے دیکھ رکھے تھے اس لیے مجھے معلوم تھا کہ سامنے کی باتیں بھی عالمانہ ذہنوں کو بالکل غیر واضح لگتی ہیں۔ خاص طور پر جب وہ لوگ سوربورن میں اور پھر ایک ہی عہدے پر رہے ہوں۔ ان کے لیے کسی مزید کامیابی یا حصول کا کوئی امکان نہیں تھا۔ سوائے اس بات کے کہ وہ اپنے کالج دے فرانس کے موجودہ عہدے پر بنے رہیں۔ یہ بھی ہر ایک کے نصیب میں نہیں ہوتا۔ جہاں تک باقی کام کا تعلق ہے۔ وہ یا تو آپ تاریخی اصولوں کے مطابق رے سائن کی تحریروں میں وقفے لگاتے رہتے ہیں یا پھر پاسکل یا اگریا دآون کی کسی ایسی تصنیف میں ہجّوں کی غلطیاں نکالتے رہتے ہیں جسے آپ ہی کے کسی سابق ساتھی نے جواب حیات نہیں تھا مرتب کرنے میں دس یا بیس برس صرف کیے تھے۔ ڈاکٹر ردبیاں بے سے اپناک کے نزدیک۔ جو ایف سوربون کے مخصوص قسم کے پروفیسر نہیں تھے، ان پر اپنے بوڑھے

عالموں کی نظر میں ہر مفروضے کے امتحان میں کسی دوسرے کے گڑے مردے اکھاڑنے کا امکان ہوتا ہے۔ لاش کا امتحان اور معائنہ ہمیشہ پراسرار نتائج کے حامل ثابت ہوتے ہیں۔ چاہے ان کو کوئی بھی عام بیماریاں رہی ہوں لیکن مختلف جسموں کا ردعمل مختلف ہوتا ہے۔ ڈاکٹر روبیاں بے سے ایناک نے بتایا کہ اس سے فرد کی انفرادیت کی بے پناہ اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ چاہے وکینسر سے مرا ہو یا دل کی بیماری سے۔ موت میں بھی ہر فرد دوسرے فرد سے مختلف ہوتا ہے۔ لیکن سوربون کے پروفیسروں کی مخصوص توجہ کا مرکز وہ عالم تھے جو حیات نہیں تھے۔ لاش میں سے سڑاند آتی تھی۔ ڈاکٹر روبیاں کا کہنا تھا" سب قبروں میں سے سڑاند اٹھتی ہے۔ اور وہ کیمیاوی خمیر والی اس لذیذنمی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہ ان کے ڈبونو کی جگہ لے لیتی ہے" ڈاکٹر روبیاں بے سے ایناک نے کہا اور اس طرح اس موضوع پر اپنی تقریر ختم کی۔

میرے تھی سس کا دسواں باب خاص طور پر مشکل تھا کیونکہ اس کا تعلق فردوس یعنی جنت کی مابعد الطبعیاتی علامتیت سے تھا۔ ہندو نظریہ کے مطابق نہ صرف سچ اور ناسچ (استیہ) کا وجود ہے۔ بلکہ متھیا یعنی مایا، دھوکے اور فریب کا بھی وجود ہے۔ خرگوش کے سینگوں یا ایک بانجھ عورت کے بیٹے کی طرح۔ میرا کہنا تھا کہ فردوس یعنی جنت سچ کی ہی معکوس صورت ہے۔ صاف دیکھنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ صحیح دیکھ رہے ہیں۔ آپ کسی چیز کو اُلٹا بھی دیکھ سکتے ہیں۔ آخر ہرن بھی پانی پینے کے لیے سراب کی جانب گیا تھا۔ ناممکن خوب صورت بن جاتا ہے۔ پیار اپنے ہی سامنے بٹ جاتا ہے تقسیم ہو جاتا ہے جس طرح اے وی نو نن بیتی لے دی نون اور لے دی نون دے پاپے میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ درمیان میں رواں ندی ہے اور سیاں بے نے زے کا شکستہ پل ہے۔ آپ ندی میں دُور تک جا سکتے لیکن اسے پار نہیں کر سکتے۔ بیتی اے نون ہمیشہ جنت ہی رہے گا۔ یہ ندی میں دکھائی دینے والے اے دی نون کی طرح ہے۔ آپ عکس دیکھتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ آپ اسے بچے کی طرح دیکھ سکتے ہیں اور اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ لیکن آپ اپنا ہاتھ پانی میں ڈال کر ذرا اسے پکڑ کر تو دکھاؤ، چھو کر تو دکھاؤ۔ لے دے کے پانی ہی آپ

کے ہاتھ میں رہ جائے گا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے ہرن آپ سراب پیتا ہے یا بانجھ عورت کے بیٹا ہوتا ہے۔

بدعت میں نے آگے لکھا۔ وہ قریبی سچ ہے جسے سچ کے طور پر قبول کرلیا جاتا ہے۔ بدعت رومانی ہے جس طرح بیتی اے وی نون رومانی ہے۔ بدعت وعدۂ فردوس ہے حقیقت کے خوف سے تحفظ کے لیے نرسے بنائی ہوئی مادہ ہی بدعت ہے۔ جس طرح ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں کھرے ٹھوس سونے جیسا انگلستان تھا۔ جنت بندگلی کے کے تواتر کی طرح ہے۔ یہ موت کی پرستش ہے۔ فنا پذیری کا دوام اس لیے جنت میں فرشتے ہی فرشتے ہیں۔ دوام ایک مردانہ تصور ہے۔ دوام کو قبول کرنا انہدام کو للکارنے کے مترادف ہے۔ تحلیل ہونا پتر جنم نہیں ہے۔ جنت کا مطلب ہے آپ جیسے ہیں آپ ویسے ہی بنے رہیں۔ جیسا کہ ممکن ہے آسیب ہوتا ہے۔ نہ صرف اندھیرے میں بلکہ روشنی میں بھی۔ انہدام کو نہ للکارنا بلکہ جاری وساری رہنا۔ اشیا کے واضح وجود کی تصدیق کرنا ہے۔ ملکاؤں، باغ باغیچوں اور محلوں، برجیوں، میناروں، سفید گھوڑوں داساں گوبدنوں خیالی اڑنا گھوڑوں اور دودھ کی ندیوں والی وہ ماورائے وقت جنت تخلیق کرکے جس کا ذکر قدیم مسودوں میں ملتا ہے۔ آپ محبت کی علیحدگی اور تنہائی خلق کرتے ہیں۔ آپ اپنے شریر کو سورگ کے لیے پوتر بنائے رکھتے ہیں۔ آپ آگ میں کود جاتے ہیں اور پوتر ہو جاتے ہیں کیونکہ آپ کو سورگ میں جانا ہے۔ اس لیے سورگ یعنی جنت تکمیل محبت بن جاتی ہے۔

جواہرِ سبز پہ
آرزوئے فردوس لیے
یہ شے ہولی گریل تھی

برجیوں، میناروں، نیلگوں آسمان اور فرشتوں کا وعدہ کیا جاتا ہے۔ اس لیے آپ اپنے پیار کو سمیٹ کر الگ کرلیتے ہیں۔ اسے کسی برج میں مینار میں کسی محل میں بند کر دیتے ہیں۔ آپ ٹوٹے ہوئے پل کے آخری سرے تک جاسکتے ہیں اور بیتی اے وی نون

کا نظارہ کر سکتے ہیں اور اس طرف کھڑے ہو کر گیت گنگنا سکتے ہیں۔ جنت کی باعصمت کنواریاں جھوم اٹھیں گی۔ ان کے سینے اور دلکش ہو جائیں گے۔ ان کے دست و بازو سڈول اور خوبصورت اور ان کے سر پہ تاج پہنا دیئے جائیں گے۔ کچھ دکھ درد نہیں ہے۔ پیار ہی پیار ہے۔ اس دوران میں آپ گھوڑے پر سوار ہو کر یا پیدل ترکوں کے خلاف لڑنے کے لیے نکلیں گے۔ ارض مقدس پر مکمل آزادی ہو گی۔ وہاں بہت سی خوبصورت عورتیں ہوں گی۔ اب ان کے ساتھ بیاہ رچائیں گے۔ ان کی گود بھریں گے اور جب لوٹیں گے تو لوٹی ہوئی دولت سمیٹے سورماؤں کی طرح تسکین حرص و ہوس سے ساکت دست و بازو لیے۔ اس لیے اپنی تلوار خاتون اعلیٰ کے قدموں میں رکھ دیجئے اور اس کی پوجا کیجئے۔ وہ اس کو سونگھ سکتی ہے اور آپ اپنا گیت اسے سناتے ہیں۔

میرے اعضا نہیں ہیں۔ نہ ہاتھ نہ پاؤں
میں بہار میں بنا پیار کے جیتی ہوں
ایسے جیتے ہوئے بھی میں زندہ نہیں ہوں

یہ جنت کی سورگ کی مکمل تصویر ہے۔

قدامت پرست ہونا، فعال اور بامعنی ہونا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ حقیقت کو قبول کرنا ہے۔ اسٹالن قدامت پرست ہے۔ اور کسی دینی درس گاہ کی پیداوار کی طرح کسی جیسوٹ پادری کی طرح بھونڈا اور بدبودار ہے۔ لیکن ٹراٹسکی نے ہمارے ساتھ حسن کا اور جنت کا وعدہ کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب ٹراٹسکی خوبصورت عالمی انقلاب کی باتیں کر رہا تھا۔ اسٹالن سوویت روس کی مویشیا نہ دولت کے اعداد و شمار تیار کر رہا تھا۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ کسانوں کے پاس کھانے پینے کا ضروری سامان اور ان کے بچوں کے پاس دودھ ان کی ضرورت کے مطابق ہے یا نہیں؟

پھر بونا پارٹ نے فرانسیسی انقلاب کا رخ موڑ کر اسے حقیقی بنا کر رکھ دیا۔ اس نے سڑکیں اور پل تعمیر کیے۔ ایک ملٹری اکادمی شروع کی۔ ایک نظام قانون قائم کیا۔ نظام تعلیم کو

سنوارا اور رابے سپیئر کی جمہوریت کو ایک مکمل انسانی تجربے میں بدل کر رکھ دیا د" وہ رابے سپیئر" بے گوئی کا کہنا تھا۔" وہ تو شاہ پرست تھا") لیکن بونا پارٹ سے غلطی اس وقت ہوئی جب دنیا کو بدلنے کے بعد اس نے اپنے آپ کو تبدیلی کی وجہ کے طور پر مسلط کر دیا۔ کانسل بونا پارٹ سے وہ فرانس کا شہنشاہ بن گیا۔ ایک غیر شخصی انقلابی سے وہ سورما بن گیا اور ایک فرد ایک انا کے پیکر کے طور پر تاریخ میں داخل ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ غیر مناسب ہے یہی وجہ تھی کہ وہ چاہتا تھا اس کی تاجپوشی پوپ کے ہاتھوں ہو۔ چرچ کی جانب سے اس کے اقتدار کی توثیق ہو جائے اور اس کی غیر شخصی نوعیت بحال ہو جائے۔ اور مطلق کا یہ چور مطلق کا ہم معنی ہو جائے اور اس طرح وہ شہنشاہ ن۔ ن۔ ن۔ ہو گیا۔ وگرنہ نپولین بھی کسی خندق کے بنکر میں اپنی زندگی کا سفر تمام کرتا۔

کبھار۔ خالص ہٹلر جو صرف ہری سبزیاں، ترکاریاں کھاتا تھا مفنے گوڑ میں رہتا تھا۔ دڑسٹن اور پارسی فال کو یاد کیجیے) اور اپنے ہی بھونڈے پن کا شکار ہو گیا۔ اس نے ایوا براؤن سے بیاہ کیا۔ اسی کو اس کی موت بننا تھا۔ اور بنکر میں جنت کا خاتمہ ہو گیا۔

بیٹرس جنت میں بیٹرس خوبصورت لگتی ہے۔ لیکن وہ ایسی ظالم ثابت ہوتی ہے کہ یقین نہیں آتا۔ یہ وہی ہے جو دانتے کو سچ سے روشناس کرانا چاہتی ہے۔ وہ جو دانتے کے توسط سے روشنی کا نظارہ کرتی تھی اب اسی کو روشنی دکھانا چاہتی ہے۔ یہ سچ کو لاگو کرنا ہے چاہے وہ بدھ مت ہو یا عیسائیت۔ اگر دنیا اپنا انہدام خود نہیں کر سکتی تو پھر دنیا کو اپنے آپ کو مادہ کا روپ دینا پڑتا ہے۔ جس طرح سلسلۂ تولید۔ بچّے کے بعد بچّہ اور نسل در نسل چلتا ہے اسی طرح آپ جتنی چاہیں اتنی جنتیں حاصل کر سکتے ہیں۔ ہندو دھرم میں تنتر داخل ہو گیا۔ اور عورت کی پوجا نے دنیا کو حقیقی بنا دیا۔ اس طرح مرد لافانی فوق البشر خود اپنا غلام بن گیا۔ ایسے تمام فوق البشر افراد کا انجام بالآخر انتہائی تعفن میں کسی خندق کے بنکر پر ہوتا ہے۔ ایوا براؤن نے ثابت کیا کہ دنیا حقیقی تھی آدم خور فوق البشر ہٹلر جس نے گیس چیمبرز اور لوگوں کو اذیت پہنچانے کے کیمپ قائم کیے تھے خود ایک

عام آدمی کی موت مرا۔ کم و بیش ایک بے نام آدمی۔ راون کو اس کے اپنے دس سروں نے شکست دے دی۔ معجزے کی انتہا ناگزیر طور پر صرف ایک خلا ہے اور بس!

لیکن کوئی فعال با عمل شخص۔ کوئی انوسنٹ سوم ہی جانتا ہے کہ یہ دنیا چونکہ غیر واضح اور بعید احساس ہے اس لیے تمام دنیاؤں کی یہی نوعیت ہے۔ نتیجتاً وہ اپنی بصیرت کا رخ درونِ ذات کی طرف موڑ دیتا ہے۔ آپ جہاں ہیں وہاں سے جنّت غائب ہو جاتی ہے۔ سینٹ آگسٹائن کے درونِ ذات کے نظریے کے مطابق دنیا جیسی بھی ہے جاری و ساری رہتی ہے۔ دو تجربے الگ الگ منفرد تجربے ہیں بلکہ ان کی نوعیت ایک ایسے تجربے کی ہے جسے تجربے کے مکمل پن کے طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔

یہ لکھتے ہوئے مجھے رادھا اور کرشن کی ایک دل کو چھو جانے والی کہانی یاد آگئی۔

"ایک روز رادھا کے من میں کرشن پر اپنا حق جمانے کا زوردار خیال آیا: میرا کرشن، اس نے اپنے آپ سے کہا کچھ اس طرح جیسے کرشن کو کسی بچھڑے یا کسی ہیرے جواہر کی طرح اپنے قبضے میں کیا جا سکتا تھا۔ کرشن جو اپنے آپ میں مطلق ہے۔ اس کے دل کی بات سمجھ گیا۔ اور جب بھگوان خود جانتے ہوں تو جاننے کا عمل بذاتِ خود کرنے کا عمل ہوتا ہے۔ واقعات اس کی خواہش کے مطابق ظہور پذیر نہیں ہوتے بلکہ اس کی خواہش خود اس کی موجب ہوتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے عمل اس کے اپنے عمل کا خالق اس کا موجب ہوتا ہے۔"

"اور تبھی درواسا رشی کی آمد کی خبر ملی۔"

پیغام لانے والے نے کہا "سوامی وہ ندی کے اس کنارے پر ہیں اور آپ کو سادر پرنام کرتے ہیں۔"

کرشن اندر کے کمروں میں گئے اور رادھا سے کہنے لگے "پیاری رادھا، مہان رشی درواسا پدھارے ہیں۔ ہمیں انھیں بھوجن کرانا چاہیے۔"

"اچھا میں اپنے ہاتھوں سے ان کے لیے کھانا پکاؤں گی" رادھا نے جواب جواب دیا۔ کرشن اس بات پر بہت خوش ہوئے۔ اور راس لیے بیٹھک میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد سب کچھ پکا کر لے آئی: کھانا تیار ہے میرے سوامی اور میں اسے خود درواسا رشی کے سامنے پروسنے کے لیے لے جاؤں گی"۔

"خوب بہت خوب" کرشن کے منہ سے بے اختیار یہ لفظ نکلے۔ وہ رشیوں کے تئیں اپنی بیوی کی شردھا سے، بھگتی سے بہت خوش ہوئے۔

"میں ابھی گئی اور آئی" رادھا بولی اور ابھی وہ بمشکل دروازے تک ہی پہنچی تھی کہ اسے یاد آگیا کہ جمنا ندی میں باڑھ آئی ہوئی تھی۔ کوئی ملاح اسے پار نہیں لے جائے گا۔ وہ کرشن کے پاس لوٹ آئی اور التجا کرنے لگی" میرے سوامی میں کھانا ان کے پاس کیسے پہنچاؤں۔ ندی میں باڑھ آئی ہوئی ہے"۔

"ندی سے کہو" کرشن نے جواب دیا" برہمچاری کرشن چاہتا ہے کہ تمہیں ندی پار کرنے کا راستہ دے دیا جائے"۔

اور رادھا مطمئن ہو کر چل پڑی۔ لیکن اچانک اسے خیال آیا کہ یہ جھوٹ تھا۔ اس سے بہتر کون تھا جو یہ جانتا ہو کہ کرشن واقعی برہمچاری تھا یا نہیں "یہ جھوٹ اتنا بڑھیا جھوٹ" وہ اپنے آپ سے کہنے لگی۔ اور جب وہ ندی کنارے پہنچی تو یوں بولی "کرشن سوامی، برہمچاری چاہتے ہیں کہ مجھے پار جانے کے لیے راستہ دے دیا جائے"۔

بے شک ندی میں خوب زور کا سیلاب آیا اور ندی رک گئی۔ لیکن پھر اچانک اس میں گاؤں کی پگڈنڈی کی طرح نیلے رنگ کی طرح نیلا سا ایک راستہ کھل گیا۔ جس سے ہوتی ہوئی رادھا ندی کے دوسرے کنارے پہنچ گئی۔ دوسرے کنارے پہنچ کر رادھا نے ندی کا شکریہ ادا کیا۔ مہان رشی درواسا کو پرنام کر کے بڑی عقیدت سے ان کا سواگت کرتے ہوئے پتے بچھا کر ان کے سامنے بھوجن پروس دیا۔

درواسا بہت بھوکے تھے اور انھوں نے کچھ اس طرح کھانا کھایا جیسے ان کی ہتھیلی بھی کھانے کے ساتھ ان کے حلق میں اتر جائے گی۔ دہی چاول اور کئی قسم کے لذیذ

زعفران کی مہک سے آراستہ کھانا کھانے کے بعد رشی نے واہ! واہ! کہہ کر کھانے کی داد دی۔ ڈکار لی اور خوش ہو گئے۔ جب پتّے پر یا برتنوں میں کچھ نہیں بچا تو وہ اُٹھے اور ندی پر جا کر اپنے ہاتھ صاف کیے۔ رادھا بھی دھونے کے لیے برتن ندی پر لے گئی۔ پتّہ ندی میں پھینکا اور جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔ تب اچانک اسے یاد آیا کہ ندی میں باڑھ آئی ہوئی ہے۔ شری کرشن نے ادھر آتے ہوئے تو بتایا تھا کہ رادھا کو کیا کہنا تھا لیکن لوٹتے ہوئے کیا کہنا تھا یہ تو بتایا ہی نہیں تھا۔

رادھا کے پوچھنے سے پہلے ہی دروسا سمجھ گئے کہ اس کا سوال کیا تھا کیونکہ رشیوں میں چیزوں کے بارے میں پہلے سے ہی جان لینے کی قوت ہوتی ہے وہ بولے "ندی سے کہو، ازلی اور ابدی طور پر برت رکھنے والا درواسا ندی سے کہتا ہے' راستہ دو اور رادھا کو اس پار جانے دو۔"

رادھا نے حکم کی تعمیل کی لیکن وہ بہت دُکھی تھی۔ میں نے انھیں ہاتھ بھر بھر کر کھاتے دیکھا ہے اور انھوں نے ڈکار لے کر اطمینان سے پیٹ پر ہاتھ پھیرا ہے۔ یہ جھوٹ ہے، بہت بڑا جھوٹ ہے" رادھا نے کہا لیکن اسی سوچ میں کھوئی ہوئی وہ ندی کنارے پہنچ گئی۔ "ہے ندیا" وہ بولی " درواسا جو سدا سدا برت کی حالت میں رہتا ہے تمہیں کہتا ہے رادھا کو راستہ دو اور اسے اس پار جانے دو۔"

ندی میں گاؤں کی پگڈنڈی جتنا چوڑا راستہ بن گیا اور لہریں اس کے سر کے اوپر ساکت ہو گئیں۔ رادھا دوسرے کنارے پر پہنچی اور ذہن پر دُکھ کا بھاری بوجھ لیے محل میں لوٹ آئی۔ "فطرت جھوٹ ہے اور جھوٹ میں اعتماد رکھتی ہے اور جھوٹ ہی کے حکم کی تعمیل کرتی ہے۔ سوامی یہ کیا سنسار ہے؟" اپنے آپ سے کہنے لگی وہ شوک بھون میں گئی۔ اپنے آپ کو اندر بند کر لیا اور سسکیاں لینے لگی "ہے پربھو۔ یہ سنسار کتنا جھوٹا ہے، کتنا جھوٹا ہے۔"

شری کرشن سب چیزوں کی لے اور ان کے کارن سے واقف تھے وہ دھیرے سے شوک بھون میں آئے اور بولے "پیاری رادھا تم کیوں دُکھی ہو؟"

"میرے سوامی" اس نے جواب دیا" ندی یقین کرتی ہے کہ آپ برہمچاری ہیں اور اس بات کو ماننے سے مجھ سے اور آپ کی پتنی سے کون بڑھ کر انکار کر سکتا ہے۔ جب میں درواسا کے پاس جاتی ہوں تو وہ گلے کے اندر تک ہاتھ ڈال ڈال کر کھاتے ہیں اور کہتے ہیں" ندی سے کہو، درواسا جو سدا سدا کا برت رکھنے والا ہے کہتا ہے کہ راستہ دو اور رادھا کو پار جانے دو" ندی راستہ دیتی ہے گاؤں کے چوڑے راستے جیسا راستہ اور میں اس پار پہنچ جاتی ہوں۔ یہ سنسار گپ ہے۔ غلط نام کا ہے اور جھوٹ ہے۔"

"سنسار میری پیاری جھوٹ نہیں۔ ایک فریب ہے، مایا ہے۔ اس کے علاوہ رادھے مجھے بتاؤ کہ کیا میرا شریر تمہارا پتی ہے"

"نہیں۔ میرے سوامی"

"کیا میرا من تمہارا پتی ہے رادھا؟"

"نہیں میرے سوامی"

"تب تمہارا کیا مطلب ہوتا ہے جب تم اپنے آپ سے کہتی ہو۔ کرشن میرے پتی"

"یقیناً شریر اور من سے پرے کی کوئی چیز۔ کوئی بنیادی اصول"

"مجھے بتاؤ۔ میری پیاری کیا تم اسے حاصل کر سکتی ہو۔ کیا تم اس اصول پر قبضہ جما سکتی ہو"

"نہیں میرے سوامی میں مطلق پر اپنا حق کیسے جما سکتی ہوں۔ میں، تو مطلق ہے" وہ سوامی کے قدموں میں گر پڑی اور ساری بات سمجھ گئی۔ باقی سارا جیون اس نے اسی گیان کی روشنی میں گزار دیا۔

پوری طرح طرح آزاد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ فرد شریر اور من سے ماورا ہے، آزاد ہے۔ پیار کرنا یہ جاننا ہے کہ فرد ہی پیار ہے۔ پوتر ہونا یہ جاننا ہے کہ فرد ہی پوتر ہے۔ آلودگی میلا پن، عمل اور ردعمل میں ہے۔ جو پیدا ہوا ہے اسے بہر حال مرنا ہے۔ وہ جو ہیئت رکھتا ہے ایک دن معدوم ہو جائے گا تعفن اور بدبو سے بھر جائے گا۔ بادلیر کا لاشا رول ایک حقیقت تھا۔ قبول کرنے کے لائق ایک حقیقت تاکہ ہزاں موں سیانت دکھو یار کے

ارغوانی تشدّد بھرے آسمان کی تصویر بنا سکے۔ آپ کو کیتھار بننے کے لیے بتسمہ لے کر آگ میں کودنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ آپ کیتھار کے علاوہ اور ہیں ہی کیا؟ ہر شخص اپنے جسم اور اپنے ذہن سے پرے کیتھار ہے۔ گنگا سارے پاپ ہر لیتی ہے۔ پاپ موچنی ہے۔ مرے ہوئے شخص کی راکھ بھی جسے آگ نے جلا دیا ہے، گنگا میں گھل مل جاتی ہیں اور مکتی پا جاتی ہیں۔

داغ دھبّے دھونے والی
ندیوں کی سکھی سہیلی
ناچتی، چہچہاتی، شفّاف گنگا ندی
میں تمہاری پوجا کرتا ہوں

ایک قدیم ویدانتی گرنتھ میں لکھا تھا۔ بنارس آپ جہاں بھی ہیں وہیں موجود ہے۔ اور سب ندیاں گنگا ہیں۔ اسے سمجھ لینے سے آپ سچّے کیتھار بن جاتے ہیں۔ باقی صرف بدعت ہے جھوٹ ہے۔

لیکن بدھ مت کے ماننے والوں کے لیے میرے دل میں جو ہمدردی تھی وہی ہمدردی میرے دل میں کیتھار لوگوں کے لیے بھی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے جنوب میں جانا چاہیے اور لانگ ڈک کی روشنی میں ہی اس سچ کی سچائی کو دیکھنا چاہیے۔ اس کے باوجود چرچ بھی اپنا ایک سچ ہے۔ آپ کو یاد رکھنا چاہیے۔ انوسنٹ سوم بھی کس قدر حلیم اور مہربان عیسائی تھا۔ دوسری طرف ایسے لوگوں کی بھی کیسے مذمّت کی جا سکتی ہے جو آنکھوں میں حسن اور چہروں پر آسمانی اعتماد کی روشنی لیے منسے گوئے کی کھڑی چٹان سے کود گئے۔ یا پھر جنھوں نے ہاتھوں میں ہولی گریل تھامے اپنے آپ کو اورولیک کے غاروں میں بند کر لیا۔ ان کے لیے بذاتِ خود موت ہی زندگی تھی۔

کیتھار اور سنت درویش دنیا کو اپنے ہی عکس میں ڈھالنا چاہتا ہے وہ سب سے بڑا تخریب کار ہے۔ رشی جانتا ہے کہ دنیا ادراک ہے۔ وہ بادشاہ ہے۔ وہ کرشن ہے، وہ بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔ ایک انیک نہیں ہو سکتا ہے۔ لیکن انیک ایک ہو سکتے ہیں اور

اس طرح غیر ثنوی دہانے تک پہنچا ہوا شخص ایکم ادوَیم ۔ ' دو نہیں ایک ' یہی واقعی سچائی ہے (ان دونوں کے درمیان اخلاق پرست ہے ۔ فرنی کا ریپبلکن ہے جس کا ایک قدم اگر شاہ پرست فرانس میں ہے تو دوسرا زدبگلی کے سوئٹزرلینڈ میں ، جھیل اور یادوں کے تصوّر میں کھویا ہوا !) بھائی ، میرے بھائی ۔ خوبصورت پہ سنسار نہیں ہے بلکہ آپ ہی خوبصورتی ہیں حسن ہیں ۔ حسن کو مت دیکھو ۔ خود حسن و جمال ہو' میرے پارسی فال !

میں ہنری چہارم کے اس خوبصورت محراب دار شہر موں پے ای اے ایک بار پھر گیا ۔ بلوار دے ژرویے دولن میں ایک کمرہ لیا جو پیرو کے آبی نظام سے بس تھوڑا ہی دور تھا ۔ اس کی ہلکی اور صاف ہوا میں آتے جاتے ہوئے دوسری بار بلیک چرچ دیکھنے کے لیے سیٹ کا قبرستان دیکھنے اور کارکاسن تک ریل گاڑی میں جاتے ہوئے ، دھرتی کو محسوس کرتے ہوئے ۔ لان ڈک کے مرد عورتوں کے چہرے دیکھنے میں ، میں اتنا کچھ سمجھ گیا جو کوئی تاریخ مجھے نہیں بتا سکتی تھی ۔ دھوپ بڑی مہربان تھی ۔ سرو کے پیڑوں اور گرگ کے شاہ بلوط کے پیڑوں کی بڑی گہری نظر تھی ۔ وہاں ایسی محبت کا گزر ہوا تھا جس کا فی الحال کوئی نام نہیں تھا لیکن جس نے اس علاقے کو تقدّس عطا کر دیا تھا ۔ لان ڈک کی نغمگی نے جیسا کہ ڈینس دے روجے نے بتایا تھا ۔ جدید انسان کو بنایا تھا ۔ قرونِ وسطیٰ کا غزل گو نغمہ سرا ہی یال ویلیری کا پیش رو تھا ۔ سیٹ کے قبرستان کو حقیقی نوعیت کا حامل ہونے کے لیے کنواری مریم کا ہونا بھی ضروری تھا ۔ مسرت کے وجود کے لیے بحرۂ روم بھی درکار تھا ۔ دھوپ میں ۔ آتش فشاں مٹی کے لمس میں ہی انسان اپنے دوامِ حقیقی میں اعتقاد لا سکتا تھا ۔ یونان نے زندگی کو حقیقی بنایا اور منسے گو نے موت کو ۔ اعتقادِ مرگ خودکشی کرنے کے مترادف ہے ۔ کیتھار برنارڈ لورٹ نے بپتسمہ لینے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ سوچتا تھا وہ نہیں مر سکتا ۔ ایسی زندگی جو اپنے آپ کو موت سے ماورا طوالت دے دیتی ہے ۔ تمام موتوں سے ماورا ۔ قدیم ہے قانونِ حقیقی ہے ۔ رگ وید کا قول ہے "میں کبھی بھی کسی وقت بھی موت کی زد میں نہیں تھا ۔ ایک ہی سچی مایا یعنی موت ہی واحد حقیقی موت ہے ۔ انسان ہمیشہ موت کی ہی موت کا متلاشی ہوتا ہے ۔

آپ زندگی جیتے ہوئے بھی موت کے بارے میں سوچ سکتے ہیں۔ کیا آپ موت کے اندر رہ کر اپنی زندگی کے بارے میں سوچ سکتے ہیں۔ لاشارون نے روح کو ثابت کیا۔ ویلری نے برنارڈ دلبورن کی تکمیل کی۔

"روشنی۔ یا تمہاری موت!"

زندگی کو موت میں بدلنے کے بجائے موت کو زندگی سے ملانا ضروری تھا۔ قبرستان نے بحرہ روم کو ثابت کیا۔ پہاڑیوں پر پھیلی دھوپ میں سر اٹھائے سرو کے پیڑ، چرچ کے بھدّے سا مینار، اس کا بے آواز خالی گھنٹا یہ ثابت کرتے تھے کہ نیلگوں آزاد کشادہ وسیع بحر روم ہی حقیقت تھا۔ زندگی کا معمول تھا۔ بحرہ روم میں سیٹ شامل ہے۔ سمندر، سمندر۔ سدا نیا نویلا سمندر۔

تلخ، پتھریلی دار، لان ڈک میں پروانس جیسی لہردار، خود اعتمادانہ، مٹھاس نہیں تھی۔ رون ندی سبز، نیلگوں ماں رون انھیں الگ الگ کر رہی تھی اور جہاں رون ندی بحرہ روم سے جا کر ملتی تھی وہاں ایک ٹھنٹھ کھڑا تھا۔ سیاں ماری دے۔ لا میر کا مجمع وہ چرچ تھا جہاں آ کر میری میڈی میڈلین اتری تھی اور جہاں اپنے بادشاہ کی تاجپوشی کے لیے آج بھی جپسی آتے ہیں۔ بہت دور جہاں بحرہ روم اندر کی طرف مڑ جاتا ہے۔ ایک جانی پہچانی ملائمت کے ساتھ خشکی کی جانب لوٹ کر سکڑ جاتا ہے اور لگوریا کی قلعہ دار پہاڑی چوٹیاں وضع کرنے کے لیے پھر مڑتا ہے۔ وہاں اٹلی کی سرزمین ہے۔ وہاں انسان اپنے آپ کو مکمل سمجھتا ہے۔ اس لیے وہاں اس نے ایسی جنت کی ایجاد کی ہے جہاں شاہ بلوط کا پھل اُگتا ہے۔ میں نے اپنے آپ کو بند کر لیا تھا۔ اور الگ کیے ہوئے وجود کے حاضر وقفے میں گوشہ نشینی اختیار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گنگا کی بہن ماں رون دوسری طرف بہہ رہی تھی۔ میڈلین کی سلطنت میری دنیا نہیں تھی۔ اس کے پیڑ، کنواریاں، بودھی کبوتر میری سمجھ سے باہر تھے۔ میں توانا گھوڑوں کے درمیان جی رہا تھا۔ میں میڈلین کو خط لکھتا رہتا تھا جن کا کوئی جواب نہیں آتا تھا۔

دن میں بڑے شاندار واقعات ہوتے رہتے تھے۔ دھوپ نے چونکہ مجھے دیکھنے کا دریافت کرنے کا فطری جذبہ عطا کر دیا تھا اس لیے میں کتب خانوں میں جاتا۔ خانہ داروں کو ملتا۔ خانقاہوں کی زیارت کرتا۔ مجھے کیتھاروں کے بہت سے مسودے مل گئے اور ان کی داستانیں بھی دستیاب ہو گئیں کیونکہ کیتھارازم لان ڈک میں زندہ روایت کی طرح ہے۔ میں ان کی بے پناہ فراخدلی دیکھ کر بھی حیران اور ششدر رہ جاتا۔ بہت دن سے ساوتری کا کوئی خط نہیں آیا تھا۔ پھر ایک روز گس کے توسط سے پیرس سے ایک جملے پر مشتمل ایک خط ملا۔ ’رام رداس نے ہوائی جہاز کو وہیں آتار دیا ہے جہاں اسے آترنا چاہیے تھا۔ مجھے معاف کر دینا۔ س‘۔ بلگوریا کا ساحل ایک ایسی گہری سبز روشنی سے منور لگتا تھا جس سے میں اس سے پہلے کبھی روشناس نہیں ہوا تھا۔ مجھے خیال آیا سورگ واقعی ہے! واقعی!

جنوری کے شروع میں سردیوں کی ایک انتہائی سرد شام کو جب برف پڑ چکی تھی اور ساری دنیا کی تخلیقِ نو ہوئی محسوس ہوتی تھی میں اکیس واپس چلا گیا۔ مارسیل کی اسٹریٹ کاروں کا رونا دھونا سنتا۔ شہر کی گہری گھنی صابن جیسی بدبو سونگھتا اور آہستہ آہستہ بڑی شدت سے ان پہاڑیوں، ان اونچے پربتوں کو پھر سے تلاش کرتا جن سے مجھے بے پناہ شیرینی، مٹھاس اور پوتر تا ملی تھی۔ میرے لیے انتہائی جذباتی تجربہ تھا۔ سارا منظر نامہ اس قدر خنک، پرسکون اور شائستہ تھا کہ مہاتما بدھ بھی بہ آسانی ادھر سے گزر جا سکتے تھے۔ ایسا لگتا تھا۔ مہاتما بدھ کی آمد پر وہاں کے پتھر پتھر نہیں رہے تھے بلکہ ان ہاتھیوں کی طرح بن گئے تھے جو ان کی آمد پر اپنی سونڈیں اپنی ٹانگوں کے درمیان سمیٹے بعقیدت سے ان کے سامنے دو زانوں ہو گئے تھے۔ مہاتما بدھ نے ان کو چھوا تھا۔ اور اپنے سوای کے لیے ان کے دل میں اس قدر پیار تھا کہ وہ بے اختیار کہہ اٹھے "ان کا لمس جاوداں ہو جائے" اور یہ کہہ کر وہ پتھر ہو گئے۔ اور ہاتھیوں کی ٹانگوں کے درمیان جہاں انھوں نے اپنی سونڈوں کو سمیٹ کر رکھا تھا گاؤں کے لوگوں نے وہاں چھوٹے چھوٹے پوجا استھان، بنا دیے۔ بعد میں رومن اور فرانسیسی لوگوں نے بھی ایسے ہی پوجا استھان

بنائے۔ پہلے یہ پوجا کی جگہیں سورج اور چاند، اپالو، نزی اُمی، ڈائنا کی پوجا کے لیے بنائی گئیں اور پھر وقت نے انھیں کنواری مریم کے، مادرِ خدا کے گرجا گھروں کا روپ دے دیا۔ جب بس اوپر کی طرف جا رہی تھی تو فرطِ عقیدت سے میرا جی سجدہ ریز ہونے کو چاہا۔ پوترتا وہیں ہے جہاں پیار ہے۔

میں سیاں سو دیار کے کیتھڈرل میں گیا اور گھومتا ہوا اپنے اندر نکل گیا۔ یہ عمارت ایسا محسوس ہوتا ہے فرد کے جملہ اسرار کا آئینہ ہے۔ اپنے آپ کی یاد۔ اپنے وجود کی تصویر۔ لوگ کہتے ہیں رفتگاں میناروں میں رہتے ہیں۔ اور رحمدلی سے ہمیں مخاطب کرتے ہیں۔ باپ، ماں، بھائی، شوہر یا بیٹا۔ کہتے ہیں کہ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے ہمدردی ہے۔ ایک دوسرے کے لیے عزت ہے۔ کیونکہ موت عزت اور احترام سے ماورا ہے۔ موت ایک سایہ ہے، ناامیدی نور ہے۔

میں جھک گیا، میں دوزانو ہو گیا۔ کس کے لیے کیوں میں یہ بھی نہیں جانتا اور میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ نہ میں رویا نہ میں نے کوئی گیت گایا۔ مجھے کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔ میں سجدہ ریز تھا تاکہ خوشی ممکن ہو سکے۔ ہم نادان، بیوقوف، احمق سمجھتے تھے کہ رواں ندی نوعِ انسان کو دو حصّوں میں تقسیم کر رہی ہے اس لیے رفتگان ممکن ہے ہمیں ہمارے گناہوں کے لیے معاف کر دیں۔ پیار کا جنم پروانس کے اہنی گیر گو میں ہوا تھا۔ جب ہم دعا پرارتھنا کرتے ہیں تو پیار ہی ہمیں روشن اور منوّر کر دیتا ہے۔

جہاں ہم چلتے ہیں تو پیار ہی ہمارے اُٹھتے ہوئے ایک ایک قدم میں جگمگاتا ہے۔ برف دوبارہ گری۔ ہم اپنے پیچھے قدموں کے نشان چھوڑ کر بتاتے ہیں کہ ہم نے پیار کیا ہے۔ ہو سکتا ہے وہاں ڈاکخانہ تو ہو لیکن ہماری چٹھیاں لینے سے انکار کر دے۔ کیونکہ لوگوں کا خیال ہے کسی نے پل توڑ دیا ہے لیکن یہ وہ جگہ ہے جہاں سے بڑے بڑے سورما گزرے اور اپنی محبوباؤں کے لیے سلطنتیں فتح کیں۔ تو پھر کیا وجہ تھی کہ وہاں ایک برہمن ایک سادہ لوح برہمن سیڑھیاں چڑھ کر وِلاسیاں سے سل کی دوسری منزل پر پہنچ کر درد شی کا دیدار کیوں نہیں کر سکتا تھا۔ میں بہرحال سیڑھیاں چڑھتا ہوں۔ میں میڈلین کا شوہر۔

راستے کے دونوں طرف آرس کے پودے تھے۔ برف کے بوجھ سے وہ لٹک گئے تھے۔ سنگترے کے پیڑوں پر پڑی برف پتّوں سے جھڑ جھڑ کر نیچے گر رہی تھی۔ میں نے وہ گھنٹی جس کے قریب میرے نام کی۔ آر۔ راماسوامی کی تختی لگی ہوئی تھی بجائی اور میڈلین سیڑھیاں اُتر کر نیچے آگئی۔ وہ دبے پاؤں چل رہی تھی۔ اگرچہ وہ ابھی بھی گول مٹول تھی۔ اس کا موٹاپا ابھی کم نہیں ہوا تھا۔ ٹھیٹر کے چاند کی طرح آکاش میں کہیں ہلال کا چاند موجود تھا اور ستاروں کے اِرد گرد فراواں پاکیزگی کا ماحول تھا۔ میڈلین نے گیٹ کھولا۔

"میں ہوں،" میں نے کہا "میں ہوں میڈلین" وہ حیران نہیں ہوئی۔ وہ نہ تو خوش لگتی تھی نہ ہی کسی تذبذب میں "کیا میں اندر آسکتا ہوں؟" جب وہ باغ کی طرف واپس جانے لگی تو میں نے پوچھا۔ میں نے گیٹ بند کر دیا۔ اس نے میرے اندر آنے کے لیے دروازہ فوراً کھول دیا۔

یہ گھر اجنبی تھا۔ کسی اور کا گھر۔ سیڑھیوں کے بیچ کے چبوترے پر ایک پہیے والے ہتھ ٹھیلے، بوتلیں اور دو بائیسکل تھے۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا۔ کمرے خالی تھے۔ ایسا لگتا تھا کم و بیش سارا فرنیچر ہٹا دیا گیا ہے۔ زرد رنگ کے پلنگ پوش سے ڈھکا ہوا وہی پرانا کم اونچا پلنگ تھا۔ بہت سے چکر اور منڈل تھے جیسے تبتی تناسکا پر ہوتے ہیں۔ میز پر کچھ مزید وجر تھے، عفریت تھے اور ایک بہت بڑا اور خوبصورت اولوکتیشور۔ پانی میں اور اولوکتیشور کے قدموں پر جوا کسُم کے لال پھول تھے۔ کمرے میں ایک ہی کرسی تھی۔ جو اس کی ماں کے ہاں سے آئی ہوئی مخملیں کرسیوں میں سے ایک تھی۔ میں اسی واحد کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ ہندوؤں کی طرح آلتی پالتی مار کر فرش پر بیٹھ گئی اور مالا اٹھالی۔ کمرے میں چندن کی جانی پہچانی خوشبو تھی۔

"تم کیوں آئے ہو؟"

"تمہیں دیکھنے"

"تم اٹھارہ عناصر کے اجتماع کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں دیکھ سکتے۔"

"لیکن اٹھارہ عناصر تو اٹھارہ کو دیکھ سکتے ہیں۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تب میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔" یہ کہہ کر وہ مالا پھیرنے لگی۔ میں چندن کی مہک کے درمیان وہیں بیٹھا رہا۔ اِندر اور پرجاپتی اور وہ بدھ جو تھا اور وہ بدھ جیسے ہوتا تھا۔ ان کی تصویروں میں میں نے پہاڑوں، ندیوں، برف زاروں، جانوروں اور نوعِ انسان کو تاریخ کی راہ پر الٹی سمت میں چلتے ہوئے دیکھا۔ جیسے ہم کسی فلم میں یا کسی پرانی داستان میں دیکھتے ہیں۔ میں دیکھ سکتا تھا میڈلین کسی سنیاسی کے سامنے سجدہ ریز تھی اور کہہ رہی تھی۔ "میرے پربھو آپ انسان ہیں یا کوئی دیوتا؟" زرد کپڑوں والے سنیاسی نے جواب دیا "دیوی کیا میں جان سکتا ہوں کہ میں کون ہوں؟ میں تو بس ایک مسافر، ایک شاعر، ایک بھکشو ہوں۔" اور اس نے اسے اپنے جذبۂ ترحم کی لامحدودیت میں ایک گھر اور ایک کشکول، ہاتھ پیر دھونے کے لیے گرم پانی اور پینے کے لیے ٹھنڈا ٹھنڈا پانی دیا۔ اس عورت نے طرح طرح کے خوشبودار آبٹنوں سے اس کے جسم کو صاف کیا اور اپنے آنسوؤں کے پیار میں اس کو اشنان کرایا۔ اس کے بال لمبے، گھنگھریالے اور کالے ہو گئے کیونکہ شردھا اور عقیدت میں اس کا پیار سچا اور کھرا تھا اور اس کے بیٹھنے اور اٹھنے کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے پیار ایک اشارہ تھا۔ دو زانو ہو کر کیا جانے والا ایک سجدہ اور وہ سنیاسی کے لیے اپنے پیار کو یاد کرتی ہوئی اپنے ہی خود اختیارانہ مضحک عمل کی وساطت سے ماورائے وجود چلی گئی۔ اس نے لمبی، با مقصد، پر استقلال زندگی گزاری جنموں جنموں تک۔ اشنان کرتی رہی، اپنے بال سنوارتی رہی۔ نہا دھو کر، تیار ہو کر ایسے نکلی جیسے شادی کے لیے۔ لیکن جب دھرتی اور پیڑوں اور ندیوں کی روشنی افلاطون کی ذہانت اور ڈیکارٹ کی صراحت نمودار ہوئی تو اس نے اپنے آپ کو ایک نام اور ایک مقام دیا۔ اور اپنے آپ کو ایک تیوہار، ایک جشن کے لیے تیار کر لیا۔

جشن محض اس کی یاد تازہ کرتا ہے جو نہیں ہے۔ آپ ناموجود کی پوجا یہ ثابت کرنے کے لیے کرتے ہیں کہ آپ موجود ہیں۔ آپ کا ایک وجود ہے۔ جب آپ اپنا جنم دن مناتے

ہیں تو یہ کہتے ہوئے اپنی ہی پوجا کرتے ہیں کہ وقت لافانی ہے۔ آپ یہ جانتے ہوئے کہ آپ کو مرنا ہے، اپنے بیٹے کی پوجا کرتے ہیں۔ آپ یہ جانتے ہوئے بھی کہ آپ کا شوہر احمق ہے، چور ہے۔ ناگ ارجن کے اٹھارہ عناصر کا بنا ہوا ایک ناموجود برہمن ہے۔ آپ اپنے شوہر کی پوجا کرتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ باہر باغ میں پڑی برف سفید ہے، پوِتر ہے، یہ بھی سچ ہے کہ دھوپ بہرحال ان سیڑھیوں پر چمکے گی جو پیچھے چھوٹ گئی ہیں۔ یہ بھی سچ ہے مہاتما بدھ اس راستے سے گزرے تھے اور ہاتھی ان کے سامنے دو زانو ہو گئے تھے۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ سیانت لیوآں کی بلیک ورجن ابھی تک خطرناک بیماریوں سے نجات دلاتی ہے۔ بلوط کی چھڑی کو تین بار گھما کر اور چار بار "اوم، جرم" کا پاٹھ کر کے سرخ ڈینڈلین اور شہد کے محلول کا ایک گھونٹ پی کر اور آٹھ راتوں تک سفید بستر پر سو کر۔ اور اگلی صبح جو کچھ بھی آپ دیتے ہیں اس سے روگ دور ہو جاتا ہے۔ اور جو کچھ کہتے ہیں اس سے شفا ہو جاتی ہے۔ لیکن میرے پیار، میرے پیار کا نہ تو علاج کیا جا سکتا ہے نہ ہی اس کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ جیسے یہ پیدا ہوا تھا ویسے ہی اسے مرنا ہے۔ نہ تو اسے جاری رہنا چاہیے نہ اس کا کوئی نام ہونا چاہیے۔ اسے بہرحال مر ہی جانا چاہیے۔ کیونکہ یہ اٹھارہ عناصر کا بنا ہوا ہے۔ پیار جو واقعی پیار ہمیشہ زندہ رہتا ہے وہ گلدان میں سجے جوائسم کے پھولوں کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ جس طرح میری آنکھوں میں بھگوان کا۔ اے برہمن جھانکو، میری آنکھوں میں جھانکو۔ میرے برہمن کو اور مجھے دیکھو!"

بغیر ایک لفظ بولے ہی سب کچھ کہہ دیا گیا۔ آپ صرف مالا کے پھیرتے ہوئے منکے دیکھ سکتے ہیں۔ تب آپ اُٹھ کر ایشور سے، بذات خود مہاتما بدھ سے، غصّے سے بھری بہت سی، بہت ساری باتیں کہتے ہیں: "بھگوان بدھ۔ میرے سوامی۔ آپ تو مجسم ترحم ہیں۔ رحمدلی اور دردمندی کی تصویر ہیں۔ آپ جنھوں نے ولیشیا آمرپالی سے بھی بات کی۔ اچھوت چنڈا کا دیا ہوا بھوجن بھی کھایا۔ میری بات سن رہے ہو کیا؟ میرے پیار کی چھاتیاں بھی اتنی ہی بھرپور اور رس دار ہوں جس قدر قدیم ایکس کے زیتون ہیں۔ ("آہ رومنوں کا وقت آ گیا،" سکارلیٹی نے کہا تھا۔ جیسے اطالوی ہونے کے ناطے وہ تاحال رومن ہی تھا اور جیسے اس نے فرانس

کو فتح کر لیا تھا۔) بھگوان بدھ کیا آپ نے ہی سرو کے پیڑ کے رنگ سے اس کی چمک چھین لی تھی اور اس لیے اس کی جلد سفید پڑ گئی تھی۔ کیا کوئی شخص صرف اس وقت ہی خوش ہوتا ہے جب وہ ناامید ہو جاتا ہے کیا مرد اور شوہر کو سردیوں کی صاف برف پر اپنے ہی بنائے ہوئے قدموں کے نشانات گنتے ہوئے باغ سے باہر جانا چاہیے۔ کیا مالا کے منکے کو لازمی طور پر عقل اور ذہانت کی سیڑھی بننا ہوگا۔ کیا مسیح کا مسلسل فاقہ کشی سے فربہہ ہونا ضروری ہے؟ اس سب میں سے بدبو آتی ہے۔ بھگوان بدھ! اس میں سے بہت بدبو آتی ہے۔ گر یہ ارضی سلطنت باغ کے دروازے کے اندر ہی بند ہو کر رہ جائے۔

ہندوستان۔ اے پرماتما۔ بڑا وسیع اور بھٹکا ہوا ملک ہے۔ ان گنت پہاڑوں، چوٹیوں، صنوبروں دیوداروں، ہاتھیوں، شیروں۔ گٹرگوں، گٹرگوں کرتے کبوتروں اور بولتے ہوئے الوؤں کا بڑا پیارا جیتا ملک ہے۔ بھگوان بدھ میرے ملک میں آم آگتے ہیں۔ اور میرے ملک کی عورتیں پیڑوں کی پوجا کرتی ہے۔ اے بدھ۔ بھگوان بدھ اپنی سمادھی سے اپنی عبادت گاہ سے نکلو۔ تصور اور خواب میں درشن دو۔ اسی مورتی کے روپ میں درشن دو جسے کوئی انگریز گورنر اپنے بکس میں بند کر کے لندن لایا تھا جو آنکھوں میں آنسو لیے اور فاقہ کشی سے موٹے ہو گئے اپنے جسم سمیت راتوں کو کہتی تھی "مجھے واپس بھیج دو۔ مجھے واپس بھیج دو، مجھے اپنے ہی ملک واپس بھیج دو۔" ایک روز اس عورت نے آخر بدھ کو واپس بھیج ہی دیا۔ اور اس کے بعد برائی ٹن کا ماحول پرسکون اور سہانا ہو گیا۔ اے بدھ۔ بھگوان بدھ۔ بلیک ورجن سے ناطہ توڑ دو۔ تبتی منتروں کا جاپ بند کر دو۔ برت رکھنا تیاگ دو۔ اپدیش دینا بند کرو۔ مالا مت پھیرو۔ دروازہ کھولو اور برف پر قدموں کے نشان چھوڑتے ہوئے ہندوستان چلے جاؤ جو ہر جگہ موجود ہے۔

رون ندی گنگا کی طرح بہتی ہے۔ جی ہاں رون بھی میّا ہے۔ سات سمندروں میں جا ملتی ہے۔ اس نے اپنے لیے چیپل بنایا تاکہ زندہ دل جیسی آئیں، گیت گائیں اور سارا کے پوجا گھر میں جا کر اس کی پوجا کریں۔ بحری جہاز، تیز گام بحری جہاز دور بہت دور کے ہندوستان اور برجستہ ہندوستہ ان کی طرف گامزن ہیں۔ دھرتی میّا، رون میّا وہاں

جاؤ۔ وہاں جاؤ۔ اپنی کایا کو برت سے، آنسوؤں سے اور پرارتھنا سے برباد مت کرو ہندوستان بھگوان کی دھرتی ہے، خدا کی سلطنت ہے اور یہ تمہارے اندر ہی موجود ہے۔ تم جہاں بھی دیکھتے سنتے یا سونگھتے ہو اپنی ذات میں اتر جاتے ہو اور اٹھارہ عناصر ایک دوسرے میں گھل مل جاتے ہیں۔ ہندوستان وہیں ہے۔ میں برٹرینڈ دے بارن کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ میں پیگی کو بھی اپنے ہندوستان میں لے جاؤں گا۔ آؤ۔ ماں رون۔ رون میّا!

میں نے ڈاکخانے کے چھ سات چکر لگائے ہوں گے۔ پھر میں پلاس دے لا۔ ریپبلک گیا اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ میں نے ٹیکسی والے سے کہا "مجھے ترسکن لے چلو"، یہ پیار کی کیسی شاندار رات تھی۔ چاند تھا، برف تھی اور رون ندی!

میں پھر اپنے کام میں جٹ گیا۔ میری سمجھ میں اب آیا کہ اِسُولٹ کی ناؤ جس میں پہلے سفید بادبان تھے پھر کالے تو بیاس کے لوگوں کو کیوں ایسے نظر آئی تھی جس سے کالا رنگ اُبھر کر پہلے سامنے آگیا تھا۔ خوبصورت ہاتھوں والی اِسُولٹ کو بہرحال بیوہ ہی رہنا ہے۔ محبت کا مشروب اٹھارہ عناصر کا بنا ہوا تھا۔ دست و بازو اور لب ایک دوسرے کے ساتھ محوِ گفتگو تھے۔ بادشاہ مارک کو بیوقوف نہیں بنایا جاسکا۔ وہ دانش مند تھا۔ وہ جانتا تھا تھا ایک بادشاہ ہونے کے ناطے ایک بنیادی اصول ایک قانون کی حیثیت سے وہ گناہ کو نہیں قبول کرسکتا تھا۔ جہاں گناہ کو قبول کرلیا جاتا ہے، انجام موت ہی ہوتا ہے۔ ٹرسٹن نے سفید ہاتھوں والی اِسُولٹ کو دلہن کے روپ میں اپنایا تھا۔ لیکن اس کی عصمت دری نہیں کی۔ زنا بالجبر اور کنوارے پن کے درمیان، رون ندی بہتی ہے۔ سیانت ماری دے۔ لا۔ میار میں بیاہ رچانے اور زنا چننے والے جیسی جانتے ہیں کہ یہ گناہ نہیں ہے۔ جب آپ کا حکمران کوئی جیسی بادشاہ ہو اور سفر لمبا ہو تو آپ اپنے کو مقدر کے پتے بانٹتے ہوئے زندگی کے ساتھ کھیلنے لگتے ہیں۔ بادشاہ، بیگم، اینٹ یا پان ۔۔ ایک ہی زندگی کے بہت سے پیمانے ہیں۔ جب آپ کسی ناپ کے، کسی پیمانے کے اندر رہتے ہیں تو دنیا آپ کی ہوجاتی ہے۔ آپ فصل کاٹتے ہیں اور لطف اندوز ہوتے

ہیں۔ بچے پالتے ہیں اور خوب موٹے تازے ہو جاتے ہیں۔ آپ یا تو کسی محل میں رہنے لگتے ہیں یا کسی فٹ بال کے میچ کے بعد انعام تقسیم کرنے لگتے ہیں (" الہ آباد فٹ بال فائنل کا ساوتری انعام "۔ میں نے کسی ہندوستانی اخبار میں یہ خبر پڑھی تھی اور وہ تصویر بھی دیکھی تھی جس میں ساوتری کو ایک مضبوط قد کاٹھ والے گدھے کو انعام دیتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔) لیکن پیار تو طول و عرض کے ساتھ جاری و ساری رہتا ہے۔ پیار تو نورِ آسمان ہے۔ اشیا آسمان میں ہی حرکت میں آتی ہیں۔ کبھی دائیں، کبھی شمال کی جانب، کبھی مشرق کی جانب جاتی ہیں۔ لیکن آپ اپنے آپ سے ماورا نہیں جا سکتے۔ پیارا، میرا پیار، میری اپنی ذات۔ پیار سے پیار کرنا ہی پیار ہے۔

" میں ہم آہنگ ہوں۔۔۔"

سیٹ سے ریل گاڑی آئی اور رات کے اندھیرے میں رون ندی کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے مجھے پیرس کی سخت گیر شفاف فضا اور راہبانہ فراخدلی کے ماحول میں لے گئی۔

میں نے بُلے وار سیاں مشیل کے پاس جہاں لِسے سیاں لوئی کے قریب سے مڑ کر ریوڈے وو جی رار اوپر کی جانب جاتا ہے اب ایک کمرہ کرائے پرلے لیا گیا ہے۔ میرا کمرہ ساتویں منزل پر ہے۔ میں کافی عرصے سے یہاں رہنا چاہ رہا تھا اور ہر ہفتے ہوٹل میں اس کے لیے کہتا رہتا تھا۔ اب مجھے یہ کمرہ مل گیا ہے۔ یہ کمرہ چھوٹا سا ہے اور دو رویہ ڈھلوان چھت والا ہے لیکن میری کھڑکی سے سارا پیرس تاڑ کے پتّے کے بنے ہوئے پنکھے کی طرح میرے نیچے پھیلا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ لِسے سیاں لوئی کی چھت سے پرے قطار در قطار دیواریں - مینار رنگین چمنیاں آکاش میں سر اٹھائے کھڑی نظر آتی ہیں۔ اور پھر اچانک نیچے کی طرف پُلوں کے نیچے سبز سین ندی دکھائی دیتی ہے اور ناتر دام کا احاطہ جیسے کسی نے اچانک اسے ایک طرف کر کے رکھ دیا ہو۔

چپّو سے لگنے والے جھٹکے محسوس کرتے ہیں ہم
گیلی غلاموں کے بیٹے غلام، سین کے دونوں کناروں پر
ناتر دام کی سطح پر پڑے ہم گیلی غلام

اپنی پشت کے پیچھے اگرچہ میں تاریخ کو دیکھ تو نہیں سکتا لیکن بہر حال اسے محسوس کر سکتا ہوں۔ کم و بیش وقت کا فن تعمیر جس نے باغ اور لکسم برگ کو جنم دیا۔ میں اکثر وہاں گھومنے جاتا ہوں اور پارک کی صاف ہوا میں سانس لیتا ہوں۔ بچوں کو اِدھر اُدھر کھیلتے کودتے دیکھتا ہوں۔ وہ پانی پر دور دور تک اپنے جہاز چلانے میں مگن ہوتے ہیں۔ ان کے جہازوں کو واقعی بہت سے ملکوں کا سفر کرنا ہے کئی براعظموں کا چکر کاٹنا ہے

"قرمزی اور سنہرے رنگ کے جہاز، دار چینی اور لوبان سے بھرے ہوئے دو منزلہ اور سامان سے لدے ہوئے ناتر دام (ہماری دیوی) کے قدموں میں!"

جب میں تھک جاتا ہوں تو آ کر ان سخت کرسیوں میں سے کسی ایک پر بیٹھ جاتا ہوں

جو مے دے سی خوّارے کے پاس خاص طور پر پیار کرنے والوں کے لیے محفوظ کر دی گئی ہیں۔
ایسا لگتا ہے قطرہ قطرہ ٹپکتا ہوا پانی ہمیں وقت سے غافل کر دیتا ہے جیسے یہ ایک طرف سے
ڈھیلا کیا ہوا آنگلو بند ہے۔ یہاں عورتیں دھوپ کی گود میں بیٹھے مردوں کے ساتھ سرگوشیوں
میں باتیں کرتی ہیں۔ میں اپنی کتاب بند کر دیتا ہوں، اور نیچے بلوار سیاں مشیل کی طرف
چل پڑتا ہوں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ پہاڑ کی چوٹی اور ناتر دام کے احاطے کے درمیان میں
ہی یورپ کی حقیقی ارض مقدّس ہے۔

"جب ہم آفاقی اصطلاحوں میں طبقے اور زمرے کی باتیں کرتے ہیں کیا یہ اصطلاحیں
ذہن سے باہر کی حقیقتوں سے میل کھاتی ہیں؟ قرون وسطیٰ کے آغاز میں علما یہ سوال پوچھا
کرتے تھے۔ "جب ہم نوع انسان اور نوع حیواں کا ذکر کرتے ہیں تو کیا یہ اصلاحیں اجتماع
کا کوئی تصور پیدا کرتی ہیں؟ کیا اجتماع کے اس تصور کی ذہن سے باہر کی حقیقت سے
کوئی مطابقت ہے یا نہیں؟ یا پھر محض ذہنی تصور ہے؟ اگر یہ اصطلاحیں یا آفاقی خیال
محض تصور نہیں ہیں بلکہ حقیقتوں سے مطابقت رکھتے ہیں تو ان کی نوعیت کیا ہے؟ کیا یہ
زمینی ارضی حقیقتیں ہیں، مزید یہ کہ ان کا طریقِ حیات کیا ہے؟ کیا ان کا وجود حواس کے
دائرے سے باہر ہے یعنی فرد کی ذات سے باہر یا یہ اندر بستے ہیں؟" اس طرح اور
ہزار برس تک ابلے لارڈ، سینٹ ٹامس ایکوی ناس اور دانتے اور سب سادھوؤں اور
شاعروں کے توسط سے سوربون کی کرڈیل دھرتی اور وہاں کے گلیاروں میں صدیوں
کے سفر سے آپ محسوس کرتے ہیں کہ مغربی دنیا کا سلسلۂ تنفّس جاری رہا ہے اور اس نے
اپنے آپ کو تشکیل کیا ہے ایک صورت دی ہے۔ پیرس میں گھومنے پھرنے والا کوئی بھی شخص
جب چلتا ہے تو وہ کہیں کسی جگہ از سر نو دریافت کیے ہوئے کسی سچ کی روشنی میں چل رہا ہوتا ہے۔

اکثر جب میں اپنے کام میں کہیں اٹک جاتا ہوں اور خاموشی میں ڈبکی لگانا میرے
لیے ممکن ہوتا ہے۔ میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہوتا۔ آواز سے آشنا کرنے کو اپنے آپ کو باشعور
اور بیدار کرنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا تو میں جواب کے لیے دیواروں سے ماورا کچھ تلاش کرتا ہوں۔
میں ندی کے اوپر پھیلی ہوئی وسعت میں جواب تلاش کرتا ہوں۔ میں ناتر دام کے دو میناروں

کو دیکھتا ہوں۔ یہ کہہ کر مادرِ خدا کے سامنے دعا کرتا ہوں "اے مادرِ مہربان۔ اے مادرِ خدا" اور وہ ہمیشہ جانتی ہے۔ ہمیشہ میرے سوالوں کا جواب دیتی ہے کیونکہ وہ ہی سنسار کی کوکھ ہے۔

جب میں اپنی پسند کے مطابق کوئی جملہ وضع کر لیتا ہوں۔ خاموشی کی حد تک لفظ دہرا کر۔ پیچھے کی جانب حرکت کے ذریعے اسے نئے سرے سے دریافت کر کے اسے مکمل متکلم اور سچّا اور کھرا بنا کر تو میں اس کے کھرے پن کو سینۂ قرطاس پر چھوڑ دیتا ہوں اور سوچنے لگتا ہوں کہ یہ گول اور چپٹی شکلیں بھی معنی دے سکتی ہیں جیسا کہ وہ بحر کے دکھاتی ہیں۔ میں اس خیال سے کانپ جاتا ہوں کہ کوئی فرد بات کر سکتا ہے۔ میں کسی قدیم نغمہ گو کا کوئی شعر دہراتا ہوں اور پھر اپنے آپ کو بتاتا ہوں کہ شاید نصف صدی قبل ورلین انہی گلیوں میں گھوما کرتا تھا۔ یہیں شراب پیتا تھا اور اپنا نام تک بتانا نہیں جانتا تھا۔ اپنا نام بھول جانا بڑی اچھی بات ہے۔ اس سے انسان سنت بن جاتا ہے درویش ہو جاتا ہے۔

جب میں اس کمرے میں بیٹھ کر کام کرتا ہوں تو متواتر ہر شام بیش تر پیرس اُبھر کر سامنے آ جاتا ہے۔ بھوت پریت آسیب، معزز شہری، مجاہد، بادشاہ، شاعر سب لوگ۔ میں باہر نکل کر گھومنا پھرنا چاہتا ہوں۔ وہاں جانا چاہتا ہوں جہاں کسی انسان کے آج تک قدم نہیں پڑے۔ جہاں کسی بھی انسان نے آج تک اپنی اذیت کو نہیں جھیلا۔

'میرے پاس بہت سی یادیں ہیں۔ ہزاروں برس میں جتنی ہوتی ہیں۔ اس سے بھی کہیں زیادہ۔'

تب میں سیڑھیوں سے نیچے جا کر ہوٹل کے دفتر سے جارج کو فون کرتا ہوں کیونکہ میرے اپنے کمرے میں ٹیلی فون نہیں ہے اور وہ جب مجھے آنے کے لیے کہتے ہیں۔ جیسا کہ وہ ہمیشہ کرتے ہیں تو میں پھرتی سے گار موں پارناس سے ۸۲ نمبر کی بس میں بیٹھتا ہوں۔ معمول کے مطابق ندی کے کنارے تھوڑی دیر کے لیے رکتا ہوں اور پھر پار جا کر ۶۳ نمبر کی بس لے لیتا ہوں۔ لا میوِیت میں ایسے چلتا ہوں جیسے میں حیدر آباد یا میسور پہنچ گیا ہوں اور گلی بھی وہی ہے جہاں باپ، بٹیا، ہم دونوں چلا کرتے تھے۔ کس قدر اپنی اور جانی پہچانی بن گئی ہے یہ گلی ہمیشہ کیتھرین ہی دروازہ کھولتی ہے۔ بڑی شاندار مسکراہٹ کے ساتھ

جیسے ہر کوئی اپنی گودی میں بچّے کو لے لینے جیسے یقین کے ساتھ خوشی حاصل کر سکتا ہو۔
"ویرا رو رہی ہے" ایک دن اس نے کہا۔ یہ جانتے ہوئے کہ ویرا میری پکّی دوست بن گئی تھی "تمہیں پتہ ہے رام! اسے بخار ہو گیا تھا اور میں بہت ڈر گئی تھی۔ لیکن جارجز کا کہنا تھا کہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ صرف باہر کے درجۂ حرارت کے اُتار چڑھاؤ کا اثر ہے جسے ہمارا جوان جسم بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ کہو تم کیسے ہو؟"
جب میں نے اپنا کوٹ اُتارا تو جارجز میرے پیچھے تھا۔ میں اسے میرا ہیٹ اور اسکارف لے کر ریک پر لٹکاتے ہوئے محسوس کر سکتا تھا۔ "رام تمہیں دیکھ کر اچھا لگتا ہے۔ یہ خیال کیا دہشت ناک ہے کہ فرانس بھی روس جیسا بنتا جا رہا ہے۔ لیکسول میں درجۂ حرارت ۲۵ درجے نیچے ہے۔ کیا تم سوچ سکتے ہو۔ یہ! الکسم برگ میں بوڑھے لوگ بھی سکیٹنگ کرنے لگے ہیں۔"
"جارجز مجھے بائیس میں سکیٹنگ نہیں کرنے دے گا لیکن جب میں مردوں، عورتوں کو سکیٹ لے جاتے ہوئے دیکھتی ہوں تو میری بڑی خواہش ہوتی ہے کہ جاؤں اور "گی" کہوں۔ چکر کھاؤں اور اپنے اوپر ہی گر پڑوں۔ مجھے برف اور وہ سب جو سفید ہے بڑا اچھا لگتا ہے۔" کیتھرین نے کہا "سفید برف جیسا سفید میرا من پسند رنگ ہے۔"
میں اندر گیا اور ایکس سے آئی ہوئی سبز مخملیں کرسی پر بیٹھ گیا۔ چچا چارلس ان دنوں بہت بیمار تھے۔
"جب کوئی ہٹا کٹا آدمی بیمار پڑ جاتا ہے تو ایسا لگتا ہے کوئی سانڈ ڈھیر ہو گیا ہے۔ اس مصیبت سے نمٹنے کے لیے آپ کو تین اور سانڈ درکار ہوتے ہیں" کیتھرین کہنے لگی "گھوڑے کی اور بات ہے۔ جارجز اگر بیمار ہو جائے تو ایسے اچھا ہو جاتا ہے جیسے وہ کوئی کھیل کھیل رہا تھا۔ مجھے کبھی اس کی بیماری کا یقین نہیں ہوتا۔ تانت زوبی بڑی پریشان ہیں۔"
میں نے وعدہ کیا ہم اگلے ہفتے وہاں جائیں گے۔ اور پھر کیتھرین نے مجھے میڈلین کا ایک خط دیا۔

میڈلین نے میری اور اس کی حال کی ملاقات کے بارے میں لکھا تھا "یہ سب کسی بھوت پریت کی کہانی کی طرح ہے"۔ اس نے لکھا "رام۔ ہندوستان اور دنیا۔ صرف دھیان پرارتھنا ہی وہ سچ ہے جو کسی شخص کو نصیب ہوتا ہے۔ میں پرارتھنا کرتی ہوں کہ مجھے میرے گناہوں کے لیے معاف کر دیا جائے جنھیں بدھ مت کے گرنتھ اگیان یعنی جہالت کہیں گے۔ بہرحال لکھتی تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ رام کے ہندوستان لوٹنے سے پہلے تمام قانونی کارروائی پوری کر لی جائے، ہمیشہ کے لیے؟ میرا اپنا مستقبل طے ہے۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ مجھے بچوں کو پڑھا کر جو کچھ ملتا ہے وہ میرے لیے تاحیات کافی ہے۔ اس لیے میں سوچتی ہوں کہ ویرا اور جو اس کے بعد آئیں گے، سب کچھ انہی کا ہو۔ شارانت کی، رتّیاں کی میری جائداد اور سیاں میدار والی زمین خاندان کی ہی ہے۔ میں صرف سینٹ نزل والا ماں کا مکان رکھوں گی۔ ایک ایسی جگہ جسے میں اپنا کہہ سکوں۔ بس! اور وہ بھی جب تک میں زندہ ہوں۔

مجھے یقین ہے رام کو آزاد کر دینا بھی ٹھیک ہوگا۔ اسے اپنے ہی ملک کی نسبتاً کم عمر کی کسی لڑکی سے بیاہ کرنا چاہیے۔ مجھے کوئی شک نہیں ہے کہ وہ ہندوستانی عورت کے ساتھ خوش رہے گا۔ میں جانتی ہوں کہ اس طرح بات کرنا تکلیف دہ ہے لیکن کسی نہ کسی دن تو سچائی کا سامنا کرنا ہی پڑے گا۔ جو بھی ہو رام کو اپنے خاندان کے لوگوں میں واپس جانا ہوگا۔ اس کے پھیپھڑے ہمارے ملک کی آب و ہوا کو مزید برداشت نہیں کر سکتے۔ اس کے علاوہ وہ فرانس میں کیوں رہنا چاہے گا؟ آج تک طلاق اتنی آسان ہو گئی ہے۔ تم شاید یہ بات چچا چارلس کو ہوشیاری سے بتا سکو گی۔ اس سے بھی اچھی بات یہ ہوگی تم وہاں کسی سے مشورہ لے لو۔ میں یہاں کسی سے مشورہ کرتی ہوں۔

بلاشبہ یہ سب ناگزیر تھا اور ناگزیر سے آج تک کسی کو تعجب نہیں ہوا۔ حیران ہونے سے پہلے ہی آپ جان جاتے ہیں کہ کیا ہونے والا ہے۔ اس لیے میں نے آسانی سے ایک وکیل کے پاس جانا قبول کر لیا۔ جارجز ایک قابل روسی نژاد وکیل کو جانتا ہے جو سب کام آسانی سے کرا دے گا۔ اس دوران میں میڈلین ایکس کے کسی نوٹری سے

ملنے گئی اور میاتر شاد پانیتے سے مجھے ایک خط ملا جس میں مجھے ان کے ایک ساتھی سے ملنے کے لیے کہا گیا تھا۔ دوسرے ہی ہفتے سنیچر وار کو ہم۔ کیتھرین اور میں۔ ریوسیاں ڈیفنس کے کسی گمنام علاقے میں گئے۔ پرت سیاں مارتن اور بلوار سباستے پول سے پرے ایک چھوٹی سی گلی تھی۔

"رام۔ کیا تم جانتے ہو یہ گلیاں کیا ہیں؟"

"نہیں" میں نے کہا۔

"تم اس قدر سیدھے اور معصوم ہو کہ مجھے یقین ہے کہ تم نے کبھی اس علاقے کے بارے میں نہیں سنا ہوگا" میں سمجھ گیا "اس سے پہلے" کیتھرین بولی "پولیس شناختی کارڈوں پر زور دیتی تھی۔ اب ان عورتوں کا ایک ہی پیشہ ہے۔ صرف انہیں میونسپل ٹیکس نہیں ادا کرنا پڑتا۔"

تمہیں یاد ہوگا یہ مارچ کے اس بھیانک طوفان کے بعد کا دن تھا۔ آندھی میں چمنیاں، بے تار کے تار، سوکھنے کے لیے ڈالے ہوئے کپڑے اور دفتروں کے کاغذ سب اڑ گئے تھے۔ بچوں کے کھلونے اور پرانی کرسیاں تک پچھواڑے کے احاطوں میں جا گری تھیں۔ ہوا گیراج کے دروازوں اور اسکول کے محرابی راستوں میں چیخ رہی تھی۔ چمنیوں میں گا رہی تھی۔ کھڑکیوں اور چمنیوں میں سے پرندے، پتے اور رومال اڑ اڑ کر اندر آ گئے تھے۔ بلوار سباستے پول کے پچھواڑے کی گلیوں میں انھوں نے ابھی تک پوری طرح صفائی نہیں کی تھی۔

"فضا میں موسم بہار کی مہک ہے" کیتھرین نے گاڑی پارک کرتے ہوئے کہا۔ "رام اپنے آپ کو اچھی طرح ڈھانپ لو۔ لوگ کہتے ہیں مارچ کی ہوا سے زیادہ خطرناک کوئی اور چیز نہیں ہوتی۔"

ہوا میں واقعی موسم بہار کی خوشبو تھی۔ مکان کا نمبر ڈھونڈتے ہوئے ہم ریوسیاں پی ار میں ادھر ادھر گھومے۔ ہمیں ۷ا نمبر کہیں نہیں ملا۔ تب ہم نے ایک تالا ساز کی دکان میں جھانکا۔ ایک گول مٹول، بھاری بھرکم آدمی ایپرن پہنے باہر آیا اور اس نے ہمیں بلڈنگ

یں داخل ہونے کا تنگ سا راستہ دکھایا۔ ہم تاریک بدبودار زینے سے اُوپر گئے۔ ہم
حیران تھے کہ وہاں روشنی کیوں نہیں تھی۔

کسی نے سیڑھیوں سے نیچے آتے ہوئے کہا، "جیسے آندھی اور طوفان کافی نہیں
تھے۔ اب بجلی بھی دھوکا دے گئی۔ عجیب مضحکہ خیز ہے یہ ملک۔ اتنا سارا انکم ٹیکس
بھی دو اور اتنی روشنی بھی نہیں کہ سامنے کھڑا آدمی دکھائی دے سکے!" اس نے ماچس کی تیلی
جلا کر میرے چہرے کے آگے کی۔ یہ یقین کرنے کے لیے کہ میں کوئی دوسرا آدمی تھا جب
اس نے کیتھرین کو دیکھا تو اسے یہ دنیا مزید مضحکہ خیز لگنے لگی" "آپ کبھی نہیں بتا سکتے
کہ دنیا کیسی ہو گی۔ سفید یا سیاہ۔ پی آر اس سلسلے میں کیا خیال ہے آپ کا؟ اس نے
سیڑھیوں کے نیچے تک پہنچ کر اپنی بات کو ختم کرتے ہوئے کہا۔

اوپر پہنچ کر جھروکے سے اندر آنے والی بعد دوپہر کی روشنی میں کچھ کچھ دکھائی دے
رہا تھا۔ میاں ترسکاں وہاں موجود تھا۔

"بجلی نہیں ہے" کاونٹر کے پیچھے بیٹھی ہوئی اس کی سکریٹری بولی "لیکن آپ
یہاں تشریف رکھئے۔ مسٹر آپ، مادام آپ" اور اس نے جلتی ہوئی ایک موم بتی ہمارے
پیچھے لگا دی۔ "مسٹر سگاں کے پاس کوئی موکل بیٹھا ہے۔ وہ ابھی آپ سے ملیں گے۔ ہم نے دس منٹ بڑی کوفت میں
گزارے۔ ایسا لگتا تھا ہمارے پاس ایک دوسرے کو کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔

"ذرا سوچئے ہر چیز کا انجام تاریکی ہے۔ اس وقت بھی جب موسم بہار کی آمد آمد ہے"۔
بالآخر میں نے کہا اور اس میں اضافہ کیا " اصول سچائی کی موت ہے"۔

" اس قدر آسانی سے مجھے برا بھلا نہ کہو" کیتھرین نے التجا کی " اگر چچا چارلس نے
نوع انسان کی جعل سازی کے بل بوتے پر دولت نہ جمع کی ہو تو میں کہاں ہوتی"۔ جو
بھی ہو اس سے مجھے حوصلہ ہوا، یقین ہوا، ایک مثبت نیکی کا احساس ہوا۔ زندگی وجود
کی گہرائیوں میں رواں دواں تھی۔ اس بار تمہارے بیٹا ہونا چاہیے اور جلد!" میں نے
کیتھرین کو اپنی نیک خواہشات کا یقین دلانے کے لیے کہا۔

" اوہ۔ فی الحال ایک ہی کافی ہے۔ جب تک تم ہندوستان سے لوٹو گے، میرے

دوسرا بچّہ ہو جائے گا۔ میں وعدہ کرتی ہوں۔"
میرے پیچھے والا لکڑی کا دروازہ کھلا۔ میاتر سنگاں چھوٹے قد کا گول مٹول سا آدمی تھا۔ اس نے کالے ربن سے بندھا ہوا ناک پر رکھا جانے والا چشمہ پہن رکھا تھا۔ اس نے ہمیں اندر بلایا۔ جیسے مٹی کے تیل کے لیمپ ہندوستان میں رات کو جب بچے سوئے ہوتے ہوں تو جلتے رہتے ہیں ٹھیک ویسے ہی مٹی کے تیل کے لیمپ کی روشنی کا ایک سفید دائرہ میاتر سنگاں کے ڈیسک کے سبز میز پوش پر پڑ رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور میرا نام، میرے ماں باپ کا نام، تاریخ پیدائش وغیرہ پوچھ کر یہ اطمینان کیا کہ ایکس کے وکیل نے جو کوائف بھیجے تھے وہ صحیح تھے۔ "آپ نے ۱۰ فروری ۱۹۴۸ء کو میری آف دی سیونتھ آیران ڈسٹمنٹ میں میڈلین رُوسے لن سے بیاہ کیا تھا۔ کیا یہ صحیح ہے؟"

"جی ہاں میاتر"

"اب آپ طلاق چاہتے ہیں۔"

"نہیں۔ میں نہیں بلکہ میڈلین رُوسے لن طلاق چاہتی ہے۔"

"ہاں! ہاں" اس نے اپنے سامنے رکھے کاغذات کو اور پھر مجھے دیکھ کر بے یقینی سے کہا "مسٹر، ہم مرد لوگ بڑے نیک چلن ہوتے ہیں۔ صرف عورتیں ہی ہمیں خراب کرتی ہیں۔" میرے جاننے سے پہلے ہی اس نے مجھ پر حملہ کر دیا تھا۔ میں نے اس کی بات کو اپنے ایک ہی ردِّ عمل میں ان سنی کر دیا۔ کیتھرین نے میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو "کوئی کیا کر سکتا ہے؟ یہ پیرس کے وکیل ایسے ہی ہوتے ہیں۔" لیکن مجھے اب بھی یہ محسوس ہو رہا تھا کہ میں اس عامیانہ پن کو نظر انداز نہیں کر سکوں گا۔

"تو آپ اپنی بیوی کو اب پیار نہیں کرتے۔ مسٹر؟"

"میں نے ایسا کبھی نہیں کہا۔ مسٹر"

"لیکن آپ کو یہی کہنا ہو گا۔ یہی قانون ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ کرسی پر بیٹھے جج ہمارے لنگوٹیے ہیں جو ہمارے معاملے کو کچھ ایسی طرح نمٹا دیں گے جیسے آپ کسی کے لیے کوئی تحفہ پیک کرتے ہیں اور نہ صرف یہ بلکہ بعد میں ہمیں اشتہا جام بھی پیش کریں گے۔

"میاتر میں ایک غیر ملکی ہوں" میں نے اسے یاد دلایا" اور میں فرانسیسی قانون نہیں جانتا۔"

"میں فرانسیسی قانون جانتا ہوں مسٹر۔ بے شک آپ غیر ملکی ہیں۔ ایک ہندوستانی ہیں" ایسا کہتے ہوئے اس نے اپنے آپ سے جیسے کہا، ہندوستانی چونکہ گھٹیا لوگ ہوتے ہیں اس اگر کسی ہندستانی نے فرانس کے بارے میں کچھ برا بھلا کہا یا نہیں ۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میاتر سگاں کے لیے ہندوستان ابھی آزاد نہیں ہوا تھا۔ یہ دور دراز کی ایک نوآبادی تھی جہاں کیلے پیدا ہوتے تھے اور لوگ کچھ مضحکہ خیز قسم کے گیت ایسے گاتے تھے جیسے کسی کا مرثیہ پڑھ رہے ہوں۔ یہ مہاتما بدھ کا دیش تھا۔ یہ لیکے کا ملک تھا۔"

"آپ طالب علم ہیں" اس نے لمحہ بھر خاموش رہنے کے بعد پوچھا۔

"جی ہاں میاتر میں طالب علم ہوں۔"

"دیودے واگیرار میں رہتے ہیں"

"ہاں"

"آپ یہاں دستخط کر دیجئے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ آپ میاں بیوی کے ناموافق مزاج کے باعث طلاق چاہتے ہیں۔ مجھے امید ہے آپ کو طلاق مل جائے گا۔ فرانسیسی انصاف اتنا برا نہیں ہے۔ یہ تھوڑا بے ڈھنگا ضرور ہے۔ جیسے یہ عمارت ہے۔ یا یہ لیمپ ہے۔" یہ لیمپ مسٹر آپ اسے اچھی طرح دیکھئے۔ اس نے وکیلوں کی تین پیڑھیاں دیکھی ہیں جیسے اس عمارت نے سگاں کی تین پیڑھیاں دیکھی ہیں۔ میں کہتا ہوں ایک دکیل ہمیشہ کے لیے وکیل۔ کیا خوب کہاوت ہے۔"

"یہ عورت" میں نے جیسے اپنے آپ کو کچھ دینے کے لیے کہا۔ "یہ عورت میری بیوی کی چچیری بہن ہے اور ایک وکیل کی بیٹی ہے۔"

"مِس، مجھے آپ کا چہرہ دیکھتے ہی یہ خیال آیا تھا۔ میں وکیل کی بو ٹھیک اسی طرح سونگھ سکتا ہوں جیسے میں اچھی برگنڈی کی۔ اپنے وکیلوں کے بغیر فرانس کہاں رہے گا؟ ہم ہیلیس بوربورن کے طمطراق والے سیاست دانوں کی طرح اپنے قانون نہیں بناتے

ہم اپنے قوانین کو ہمیشہ عمل کی حالت میں رکھتے ہیں اور بس! آپ جانتے ہیں۔ یہ بہت بڑی بات ہے ہم لالچی دادی سے بچے کو بچاتے ہیں۔ عورت کو اس کے شوہر سے۔ اور عصمت کو نیکی کو سامنے والی گلی میں بکنے والی لڑکیوں کی طرح فروخت ہونے سے بچاتے ہیں۔ ہم فرانس کا تسلسل تواتر بنائے رکھتے ہیں۔"

"جی ہاں میں جانتا ہوں" میں نے فخر سے کہا۔

"اچھا تو مس ..." میاتر سگان نے کہا۔

"مس نہیں۔ مادام کہیے" میں نے ترمیم کرتے ہوئے کہا۔

"مادام آپ بطور گواہ یہاں دستخط کرنے کی زحمت کریں۔ کیسی عجیب بات ہے۔ نہ جانے دنیا کہاں جا رہی ہے؟" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "پہلے اگر کوئی بیوی اپنے شوہر سے الگ ہوتی تھی۔ تو میں کہتا ہوں میاں بیوی الگ ہوتے ہی ایک دوسرے کے کٹر دشمن بن جاتے تھے میرے دادا کے زمانے میں تو طلاق بڑی مشکل تھی۔ چرچ اور دنیا بھر کی مصیبت تھی۔ اگر آپ اس کے بھائی بہن، ماں، چچیرے بھائی بہن وغیرہ کو دیکھتے تھے تو وہ منہ پھیر لیتے تھے۔ مسٹر! آپ منہ پھیر لیتے تھے۔ اور اگر وہ کچھ زیادہ قریب آجاتے تھے تو بڑے گستاخانہ انداز میں ان کی طرف دیکھتے تھے۔ ان کی توہین کرتے تھے۔ کمرے کے سامنے والے کونے سے انھیں کوستے تھے۔ آپ انھیں رو برو مقابلے کے لیے بھی کارڈ دے کر للکارتے تھے۔ اب وہ زمانہ آگیا ہے مسٹر کہ چچیرے بھائی بہن ایک دوسرے کے لیے کاغذات پر دستخط کرنے آتے ہیں۔ اب بدچلن عورت کا شوہر اور عاشق ایک ساتھ ایک ہی میز پر بیٹھ کر برج کھیلتے ہیں۔ مسٹر!" میاتر سگاں نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا دنیا بدل رہی ہے میرے لیے تو بڑی تیزی سے بدل رہی ہے۔"

ہمیں کچھ زیادہ متاثر نہ کر سکنے کے باعث وہ اٹھا اور کہنے لگا "مسٹر آپ جو چاہیں کہیں۔ آپ شہر کے پچاس دوسرے وکیلوں کے پاس چلے جائیں۔ وہ کہیں گے کہ طوفان آگیا اور میری کار میرا مکان اور میری بیوی تک اڑا کر لے گیا۔ اور پھر اپنے دفتر بند کر کے وہ سنیما دیکھنے چلے جائیں گے۔ میں پرانی نسل کا آدمی ہوں۔ اگر طوفان بھی آجائے تو کوئی نہ

کوئی روشنی ہمیشہ برقرار رہتی ہے۔ آں ریئت کیا خیال ہے تمہارا؟" اس نے اپنی سکریٹری کی جانب مڑ کر کہا۔ وہ ادھیڑ عمر کی عورت تھی لیکن چارخانے والی پوشاک میں معزز لگ رہی تھی۔

"چاہے کوئی اور کام کرے یا نہ کرے ہم اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔" اس نے تصدیق کرتے ہوئے کہا "میاتر سگاں ہمیشہ دفتر میں ہوتے ہیں چاہے بیمار ہوں یا ٹھیک۔ پوسٹ مین کے آنے سے پہلے ہی ٹھیک ساڑھے نو بجے سے یہاں ہوتے ہیں۔ بلکہ میرے آنے سے بھی پہلے"۔ مادام آں ریئت نے مسکرا کر کہا۔ وہ اسے خوش رکھنا چاہتی تھی۔

"اس کی بچی" میاتر سگاں نے کہا "اس کی نیک بچی ہمارے ہی گھر میں پلی بڑھی تھی۔ ہم اسے ایک یتیم خانے سے بچا کر لائے تھے۔ یہ ۱۸۷۰ء کی لڑائی کے بعد کی بات ہے۔ اس نے گھر میں ہماری بڑی خدمت کی اور مادام آں ریئت ایسی وفادار سکریٹری ہیں کہ اگر میں مر بھی جاؤں تو میں کہتا ہوں یہ اس دفتر کو چلاتی رہے گی۔ یہ فرانس ہے مسٹر۔ یہ فرانس ہے!"

سڑک پر قمقمے روشن ہو گئے تھے لیکن بلڈنگ میں ابھی تک بجلی نہیں آئی تھی مٹی کے تیل والا چھوٹا سا لیمپ میز پوش پر بدستور پیلی روشنی پھیلا رہا تھا۔ جب اس نے دروازہ کھولا۔ تو مادام آں ریئت اپنے ہاتھ میں قلم لیے ہوئے تھی۔

"مادام ایک بات اور،" میاتر سگاں نے کچھ اس انداز سے کہا جیسے اسے اچانک کچھ یاد آ گیا "آپ نے میرے ہم ہیشہ اپنے اعلیٰ وقار باپ کا نام تو بتایا ہی نہیں۔ آپ نے دستخط کرتے ہوئے تو "کمترین خوش بارتیٹ" یہاں لکھا ہے۔

"میرے پتا میاتر روسے لن ہیں کیونکہ میری چچیری بہن میڈلین رَوسے لن ہے"۔

"بے شک۔ بے شک" اس نے کہا "یہی صحیح ہے۔ اور وہ رویاں کے ہیں آپ نے یہی کہا تھا نا! مادام!"

"ہاں پاپا کا دفتر رویاں میں ہے۔ روسیاں اوئی"

"مادام! اپنے عالی وقار پاپا میاتر رَوسے لن کو میرا سلام کہنا۔ یاد رکھو فرانس

بنیادی طور پر اپنے وکیلوں اور منشیوں کے سہارے چل رہا ہے۔ ہماری سُرخ مہر" اس نے کھونٹی سے مُہر اُتارتے ہوئے کہا" یہ فرانس پر حکومت کرتی ہے" الوداع مسٹر۔ الوداع مادام! مادام آں رِیَت آپ کو زینے کے نیچے تک پہنچا دے گی۔ موم بتّی سے سہولت رہے گی۔ ورنہ آپ ایک دوسرے سے گڑبڑ کر سکتے ہیں اور آپ کو ایک بار پھر میرے پاس آنا پڑے گا۔ الوداع مسٹر!"

موم بتّی سے زینے کے کچھ حصّوں میں کہیں کہیں روشنی ہو گئی۔ نیچے پہنچ کر ہم نے چلاّ کر کہا "شکریہ۔ الوداع مادام۔ آں رِیَت" اور روشنی غائب ہو گئی۔ تالا ساز اب بھی کسی چیز پر ہتھوڑا چلانے میں مصروف تھا۔ اس کے پاس بھی تیل کا ایک چھوٹا سا لیمپ رکھا تھا۔ ٹھنڈی ہوا ہمارے چہروں سے ٹکرا رہی تھی موسم بہار کی آمد تھی۔

۲۷ مارچ ۱۹۵۴ء۔ جی ہاں اپنے آپ سے کہتا ہوں "مجھے یہ دنیا چھوڑ دینی چاہیے۔ چھوڑ دینی چاہیے۔ یہ دنیا چھوڑ دینی چاہیے" لیکن پربھو! میں کہاں جاؤں۔ کوئی کہیں بھی چلا جائے۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ کوئی اپنے آپ سے دور کیسے جا سکتا ہے؟"

میں اپنے دورویہ ڈھلوان چھت والے کمرے میں چہل قدمی کرتا ہوں اور کہتا ہوں "ضرور کوئی ایسی چیز ہے جو ہمیں رفعت عطا کرتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ ہم یہاں کیوں ہیں اور کیا تلاش کر رہے ہیں" اور اچانک جیسے میں بھول گیا ہوں کہ میں کہاں ہوں میں بلند آواز میں گانا شروع کر دیتا ہوں "شووہم۔ شووہم۔ جیسے میں بنارس میں گنگا کے کنارے ہریش چند گھاٹ پر بیٹھا ہوا ہوں اور گا رہا ہوں۔ بنارس میں یہ سب سچ لگ سکتا ہے لیکن یہاں پیرس کے دھندلے آکاش تلے یہ زرد رنگ کا دیوال پیپر، اور آگے پیچھے سارے کمرے میں بل کھاتی ہوئی، قوس بناتی ہوئی اس کی پھول دار بیل چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ میں کہتا ہوں "یہی بیل ہی سچائی ہے سچائی میں ہی ہو گی یہ!" میں گنتا ہوں۔ ایک، دو، تین۔ لگاتار اسی طرح میرے کمرے میں ۱۰۷ ایسی بیلیں ہیں۔ اگر میں اس ہندسے کے ساتھ ایک صفر جوڑ دوں" میں اپنے آپ یہ کہتا ہوں "تو ان کی تعداد ۱۰۷۰ ہو جائے گی اور پھر یہ

دوروبہ ڈھلوان چھت والے دس ایسے کمروں کو ڈھانپ دیں گی" میں کھڑکی سے باہر دیکھتا ہوں۔ اور لمبے سیاں ٹوٹی کی کھڑکیاں گنتا ہوں۔ اس کی اٹھّارہ کھڑکیاں ہیں۔ ایک، دو، پانچ۔ گیارہ، اٹھّارہ کھڑکیاں۔ اور میں کہتا ہوں اگر ان کی دیواروں پر ایسی بیلیں ہوتیں تو تعداد میں کتنی ہوتیں۔ وہاں کا ہر کمرہ میرے کمرے سے تین گنا چوڑا ہے، میرا سارا حساب گڑبڑ ہوجاتا ہے کیونکہ ہر تین دیواروں میں سے مجھے ایک دیوار کو کم کرنا ہے اور یہ بہت بڑا گورکھ دھندا ہے۔ میں اپنے بستر میں لڑھک جاتا ہوں" ہر ہر شو شو" کہتا ہوں۔ جیسے میں دوبارہ بنارس پہنچ گیا ہوں۔ اور پھر میں تالی بجاتے ہوئے چدانند روپ۔ شوہم۔ شوہم، گانے لگتا ہوں۔ برابر کے کمرے میں رہنے والی رومانین عورت مجھے یہ یاد دلانے کے لیے دروازہ کھٹکھٹاتی ہے کہ میں پیرس میں ہوں۔ میں اوورکوٹ پہن کر باہر نکل جاتا ہوں۔ اور ریو دے اساس کے پاس لکسم برگ گارڈنز میں چکّر لگانے لگتا ہوں۔ یہ سوچ کر کہ جس چیز کو آپ پیار کرتے ہیں اس کے تین چکّر لگانے سے آپ کو لازماً مقصد کا احساس ہوتا ہے، سکون ملتا ہے۔ سڑکوں پر بدستور بسیں چل رہی ہیں۔ طالب علم چمکیلے اور آئینوں سے آراستہ ڈولپوں میں اب بھی موجود ہیں۔ کاش میں بھی شراب پی سکتا۔ شراب پینے سے بڑا مزا آتا ہوگا، میں اپنے آپ سے کہتا ہوں۔ طالب علم شراب کے نشے میں کتنے خوش ہوتے ہیں۔ اس دن وہ ڈچ لڑکا نشے میں دھت تھا۔ وہ ایک طرف منہ کیے ہوٹل کے لاونج میں بیٹھا ہوا تھا اور پھر اس نے گانا شروع کر دیا۔ اگر آپ کا دل اداس ہو تو آپ ہمیشہ کوارٹیر لیٹن میں گرمئ آغوش سے فیض یاب ہو سکتے ہیں۔ یہاں سے زیادہ فراخدل لڑکیاں پوری دنیا میں کہیں نہیں ملیں گی۔ وجودیت نے شہوت کی گتھی کو اُلجھی ہوئی بالوں کی لٹ کی طرح سلجھا دیا ہے۔ آپ جہاں بھی جائیں آپ کو لڑکیوں کے بھرپور سینے اور آتشیں سرخ ہونٹ ملتے ہیں۔ انھیں شناختی کارڈ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے نہیں کہ پولیس شناختی کارڈ نہیں مانگتی بلکہ اس لیے کہ لڑکیاں بڑی باعصمت پوتّر ہوگئی ہیں۔ پوترتا کسی عمل میں نہیں ہے بلکہ عمل کے کام کے مفہوم میں ہے۔ اگر میں کچھ کم برہمن ہوتا تو ممکن ہے میں پیار کے بارے

میں زیادہ جان سکتا تھا۔"

۲۹ مارچ ۱۹۵۴ء، میں بلوار سیان مشیل جاتا ہوں۔ روشنی سے جگمگاتے ہوئے فوارے کے سامنے کھڑا ہوتا ہوں اور واپس آجاتا ہوں۔ مجھے یقین ہے میں پہلے سے بہتر ہوں۔ میں "دس ہزار قمیص" والی دکان پر جاتا ہوں۔ ان کے اعداد و شمار کون جانتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں ایک اچھے گلو بند کی قیمت ۱۹۹۰ فرینک ہے۔ اور جوتے کی قیمت اس سے دُگنی ہے۔ اگلی دکان میں سب سے اچھا جوتا چار گُنا قیمت کا ہے۔ میری گلی کے موڑ پر کوئی جھگڑا ہو رہا ہے اور میں ہر شخص کو دیکھ رہا ہوں یہ سوچتے ہوئے کہ میں انھیں دیکھ نہیں رہا ہوں بلکہ انھیں گن رہا ہوں 'ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ پانچ' میں گنتا ہوں ایک شخص چار کو پیٹ دینے کی دھمکی دیتا ہے اور چار مجھے پیٹنے کی دھمکی دیتے ہیں۔ خوف بڑا نوری قسم کا تجربہ ہے۔ میں وہاں سے کھسک جاتا ہوں۔ میں بھاگتا ہوں اور بھاگتا بھاگتا اپنے ہوٹل تک پہنچ جاتا ہوں۔ میرا خیال ہے یہ کسی قسم کا کوئی سیاسی جھگڑا تھا۔ مراکو کے اور ہند چین کے طالب علموں کا ایک گروہ بڑی عمر کے ایک فرانسیسی سے جھگڑا کر رہا تھا۔ تب میں سمجھ گیا ان کا خیال تھا کہ دھمکی دینے والے موٹے فرانسیسی کے خیال کے مطابق میں ضرور کوئی ٹیونیشیائی ہوں۔ آپ کو کسی نہ کسی بات کے لیے بہرحال جھگڑا کرنا ہی ہے۔ آپ رون ندی کی طرح تو سکون سے بہہ نہیں سکتے۔ اس رون ندی کی طرح جو ادی نون کو اوی لون آف دی پولیس اور پتیت ادی لون میں تقسیم کرتی ہے۔

میں دربان سے چابی لے کر اپنے کمرے میں آتا ہوں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ کمرہ اس قدر کشادہ اور مہربان ہے کہ میں اپنی انگلیوں سے آسمان کو چھو سکتا ہوں۔ آپ اپنے کمرے میں ۱۷۷ میلیں ہونے کے باوجود آسمان کو چھو سکتے ہیں۔ ایک برہمن کسی بھی چیز کو چھو سکتا ہوں۔ وہ اس قدر بلند قامت ہے، جتنا بلند قامت اتنا ہی زیادہ آزاد! میں احتیاط سے رکھے ہوئے اپنے تھی سس کے مسودے کو دیکھتا ہوں۔ اس میں ۲۷۸ صفحے ہیں۔ اسے مکمل ہوئے ایک ہفتے سے زیادہ ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر روبیاں بے سے ایکانک نے کہا تھا یہ بڑا دلچسپ ہے۔ واقعی بے حد دلچسپ لیکن انھوں نے کچھ حصوں پر نیلی پنسل

ے نشان لگا دیئے تھے۔ میرے پیش لفظ کے ایک پیراگراف کو پڑھ کر وہ خوب ہنسے تھے۔ "تاریخ خطِ مستقیم نہیں ہے۔ یہ کوئی خط منحنی یا قوس نما لکیر بھی نہیں ہے" میں نے لکھا تھا: "تاریخ وہ خط مستقیم ہے جسے گول دائرے میں بدل دیا گیا ہے۔ اس کا نہ کوئی آغاز ہے نہ انجام۔ یہ وہ حرکت ہے جو بذاتِ خود حرکت میں نہیں آتی۔ تاریخ حقائق کی نفی کرنے کا عمل ہے۔ اگر حق بات کہی جائے تو تاریخ نوعیت کے اعتبار سے تولیدی ہے۔

ڈاکٹر رو بیاں کہنے لگے "تم ہمارے پروفیسروں کو نہیں جانتے۔ اگر وہ کسی لڑکی کو اپنے ہونٹوں پر ضرورت سے زیادہ سرخی لگائے ہوئے دیکھ لیں تو اپنے نوٹوں کے پیچھے چھپ جائیں گے اس کے علاوہ میرے دوست اس ملک کی ایک قدیم روایت ہے۔ ضرورت سے زیادہ سچائی سے خبردار رہو۔ ہم فرانسیسی بدعتوں پر زندہ ہیں۔ اگر بیچارے ابیلےلارڈ نے صرف سوالیہ نشان لگا کر بات ختم کر دی ہوتی اور سکٹو ہشم جیسے لفظ استعمال نہ کرتا تو وہ بالکل فعال آدمی کی طرح پیرس میں گھومتا پھرتا اور اب تک اسے درویش ہونے کا اعزاز حاصل ہو گیا ہوتا۔ تمہیں بہرحال فلسفے کی انتہا تک پہنچنا چاہیے۔ سچائی کے کافی قریب لیکن تمہاری تکمیل سوالیہ نشان پر ہی ہونی چاہیے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ سوالیہ نشان ہی فرانسیسی ذہانت کی علامت ہے۔ ابیلےلارڈ کے جانشین دیکارت کی روایت ہے اور جہاں تک تخیلی طور پر کسی ارفع بات کا تعلق ہے... آپ جانتے ہیں ماہر مشرقیات سلواں لیوی کے بارے میں ایک داستان مشہور ہے۔ اس نے کالی داس کے ڈراموں کے بارے میں آج سے ۰۰ برس قبل ایک بات کہی تھی۔ ان دنوں جیساکہ سب اچھی ادبی تصانیف کے سلسلے میں ہوتا تھا۔ کالی داس کی سب کتابیں طلبا رسے کے انداز میں خوب اچھی طرح وضع کیے ہوئے کسی عالی فکر جملے کے ساتھ ختم ہوتی ہیں۔ تمہیں یقین نہیں آئے گا لیکن ہوا یہ ہے کہ اس کا تھیسس رد کر دیا گیا۔ اسے اپنا مقالا نئے سرے سے دوبارہ لکھنا پڑا۔ میں نہیں چاہتا تمہارا تھیسس بھی رد کر دیا جائے۔ میں جانتا ہوں وہ کیا کہیں گے۔ غالباً یہ تھیسس کبھی کبھار فلسفے کے بیش تر مشرقی مواخذ بنیادی ہندو مواخذ کے بارے میں ہے۔ لیکن یہ ضرورت سے زیادہ شاعرانہ ہے۔ اس میں تاریخی نظم وضبط کی کمی ہے" کسی ایسے شخص کی تلاش کرو۔ بہتر

ہوگا کسی پروفیسر کی جو ہر اس بات کو حذف کرنے میں تمہاری مدد کر سکے جو کسی سوال پر نہیں ختم ہوتی۔ کیا تم ایسا شخص تلاش کر سکتے ہو؟ اس نے مجھ سے پوچھا۔ بے شک میں ایسے شخص کو جانتا تھا۔ جارجز سے زیادہ اور کون میری مدد کر سکتا تھا۔ میں اکثر اپنے بھتی سس کے بارے میں اس سے تبادلۂ خیالات کرتا ہوں اور اس کے کچھ ٹکڑے میں نے اسے پڑھ کر بھی سنائے ہیں۔ وہ یہ تو نہیں کہتا کہ یہ میرے بھتی سس کے لیے مناسب ہوگا یا نہیں لیکن وہ کیتھولکس کے بارے میں میری دفاع سے خوش ہے اور اس کا خیال ہے میری منطق کو جھٹلانا ممکن نہیں ہے۔ اس نے کہیں کہیں کچھ ترمیم کرنے کا بھی مشورہ دیا ہے۔ اور پھر پورے متن کا کسی کو فرانسیسی زبان میں ترجمہ بھی کرنا ہے۔ میں سوچتا ہوں جارجز یہ ذمے داری لے سکے گا یا نہیں۔ نیک دل جارجز بہرحال مان گیا ہے۔ مجھے کل تک مسودہ اس کے حوالے کر دینا چاہیے۔

۲ر اپریل ۱۹۵۴ء: میں اپنے بستر میں پڑا کروٹیں لے رہا ہوں۔ یہ بات نہیں کہ میں بیمار ہوں۔ میں بالکل بیمار نہیں ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے پھیپھڑوں کی حالت کے بارے میں ڈاکٹر کافی مطمئن ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ میری پسلیوں اور چھاتی میں اب کوئی خرابی نہیں۔ اگر میں چاہوں تو، دراصل اب میں یورپ میں بھی رہ سکتا ہوں۔ لیکن میں کیوں ایسا کروں؟ اب یہاں کرنے کو کیا رہ گیا ہے؟ میں سروجا کو یاد کرتا ہوں۔ وہ خوش نہیں ہے لیکن اپنی گھر گرہستی میں رچ بس گئی ہے۔ مجھے چھوٹی ماں کا بھی خیال آتا ہے جو ہر صبح اُٹھ کر گنگا میں ڈبکی لگانے جاتی ہوگی۔ اس برس کمبھ کا میلا ہے اور سورج مکر راشی میں ہے۔ ماں بہت خوش ہوگی۔ اگر میں واپس چلا بھی جاؤں تو کیا میں چھوٹی ماں کو ایسی خوشی دے دے پاؤں گا؟ یہ بیچارہ پروفیسر حیدرآباد پہنچ کر کیا کر سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ میں دو برسوں میں ایک بار انھیں تیرتھ یاترا کے لیے لے جا سکتا ہوں۔ اب کہیں جانے کو کچھ رہا ہی نہیں۔

نہ گھر، نہ مندر، نہ شہر، نہ آب و ہوا، نہ ہی عمر۔

تم کون ہو، کس کے ہو اور کہاں سے آئے ہو:

میں جہاں ہوں وہیں میرا وطن ہے اور میں تکیے میں سر دے کر رو رہا ہوں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ میں ان دنوں بہت رویا ہوں۔ میں بستر میں لیٹا ہوا کچھ پڑھ رہا

ہوتا ہوں۔ طرح طرح کے خیال آتے ہیں میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ ان کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ سوچتا ہوں یہ سب کیا ہوتا ہے؟ اور میں بستر پہ لیٹ جاتا ہوں اور سسکیاں بھرنے لگتا ہوں۔ دادا اکثر کہا کرتے تھے کہ بعض اوقات ایشور کے لیے چاہت اور بے تابی اتنی شدید ہو جاتی ہے، اتنی عظیم ہو جاتی ہے کہ آپ بے اختیار رو پڑتے ہیں اور اس رونے کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ کیا میں ایشور کی چاہت میں بے تاب ہوں؟ پرماتما تو ایک چیز ہے۔ میں ایک چیز کے لیے کیوں بے تاب ہو جاؤں گا۔ میں کسی گول مٹول سرخ رنگ کی شے کی آرزو کیوں کروں جس کو لوگ ایشور کہتے ہیں اور وہ ایشور بن جاتا ہے۔ میں سڑک پر ایستادہ مجسمے کی طرح بن جاؤں گا۔ میں نے ادھر ایک شخص سے پوچھا۔ "مسٹر یہ مجسمہ کیا ہے؟" وہ حیران ہو کر بولا "کیوں؟ یہ سیاں مشیل ہے!" اس دن مجھے پتہ چلا کہ اس سڑک کا نام سیاں مشیل روڈ کیوں رکھا گیا ہے اور یہ کہ سیاں مشیل اژدھے کو ہلاک کر دیتا ہے۔ برہمن ہونے کے ناطے میں اِندر اور پرجاپتی کے بارے میں تو جانتا ہوں لیکن سیاں مشیل یا سیاں ڈینس کے بارے میں نہیں۔ مجھے مذاہب کا انسائیکلوپیڈیا دیکھنا پڑے گا۔ لیکن اس سے بھی کوئی مدد نہیں ملے گی۔ اس انسائیکلوپیڈیا میں ایشور کے بارے میں باسٹھ صفحے ہیں۔ اتنے صفحات سے میری ضرورت پوری نہیں ہوتی۔

۵ اپریل ۱۹۵۴ء: نہیں، نہیں، مجھے ایشور کی نہیں۔ بلکہ گرو کی ضرورت ہے "ہے پربھو! میرے گرو، میرے گرو!" سردیوں کی اس خوفناک نصف شب میں مَیں چلّایا۔ یہ کل رات کی بات ہے۔ اپریل کی طوفانی ہوائیں چلنے لگی ہیں۔ یکسم برگ کے پیڑ اس قدر بلک بلک کر رو رہے تھے کہ آپ کنیا کماری کی دیوی کے تین مہاساگروں کے شور، جیسی ان کے رونے کی آواز سن سکتے تھے۔ "پربھو پربھو۔ میرے گرو۔ پدھارو، مجھے بتاؤ، مجھے چھو کر،" میں چلّایا "مجھے سچ کے درشن کرا دو۔ پربھو میرے پربھو!"

مجھے پتہ نہیں میں کہاں گیا لیکن میں وہاں خوش تھا کیونکہ وہاں ایک سنہرے روشن دان کی طرح ایک اکیلی چوڑی سفید ندی کی طرح ہر چیز آزاد اور کشادہ تھی۔ میں بنارس پہنچ گیا تھا۔ بنارس۔ میں گنگا سے نمودار ہوا تھا اور میں نے ایک روشن شفاف

دنیا اور اپنا گھر دیکھا۔ مجھے ایک سیمگوں کشتی نظر آئی ۔ ملّاح کا چہرہ بھی میرا جانا پہچانا تھا۔ میں اس کا چہرہ پہچانتا تھا جیسے گہری نیند میں کوئی شخص اپنا چہرہ پہچانتا ہے۔ وہ مجھے پکار کر کہنے لگا "بیٹے بہت دیر ہوگئی۔ بہت دیر میں نے تمہارا بڑا انتظار کیا۔ آؤ ہم چلیں" میں چلا گیا۔ اور میرے بھائی میرے دوست میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں لوٹ کر نہیں آؤں گا۔ میں وہاں پہنچ گیا ہوں جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا ۔ لوٹ کر آنے کے لیے تم رہو گے ہی نہیں۔ اور اگر تم ہو تو لوٹ کر آؤ گے کہاں ؟ میرے بھائی، میرے دوست کیا سورج کی روشنی دیکھنے کے لیے تمہیں موم بتّی چاہیے ؟ میں نے ایسے ہی ایک سورج کے درشن کیے ہیں جو لاکھوں کروڑوں سورجوں سے زیادہ شاندار ہے۔ یہ ندی کنارے بیٹھتا ہے۔ پیچ کے نراکار روپ میں بغیر چلے چلتا ہے، بغیر بولے بولتا ہے، بنا ہاتھ پاؤں ہلائے حرکت کرتا ہے۔ بنا کسی نام دینے کے ظاہر کرتا ہے۔ اسی کا انکشاف کرتا ہے جو ہم جانتے ہیں۔ مجھے ایسے ہی ایک سچ تک پہنچا دیا گیا۔ میں اس کا چاکر بن گیا۔ میں نے اس کے پوّتر چرنوں کی سگندھ کو چوما اور اپنے آپ کو اس کا شِشیہ، اس کا شاگرد کہا۔

یہ واقعہ ہوا۔ یہ واقعہ بہت دن پہلے ہوا۔ ایک عرصہ پہلے اتنا پہلے کہ جب سے میں نے اپنے آپ کو جانا ہے۔ جب سے وجود نے اپنے آپ کو وجود کے طور پر پہچانا ہے۔ میں اسے جانتا ہوں۔ یہ وہی ہے، تحفہ ہے جو یاگیہ ولکیہ نے مے ترے یی کو دیا تھا۔ یہ وہی نذرانہ ہے جو گووندنے شنکر کو دیا تھا۔ یہ وہی تحفہ ہے جو اس نے میرے پربھو نے مجھے دیا تھا۔ پربھو مجھے شکتی دو میں پربھو کے لائق بن سکوں۔ پربھو! میرے سوامی اجانہٗ حق! ہے ستیہ دھام!"

میں کبھی کبھی کیتھرین اور جارجز سے ملنے جاتا ہوں۔ جب جارجز میرا مسودہ ٹھیک کر رہا ہوتا ہے۔ اور اسے فرانسیسی زبان کا حسن اور شدّت عطا کر رہا ہوتا ہے تو میں اکثر ویرا کے پاس بیٹھ کر اسے اپنا سچ بتاتا ہوں۔ جتنا کچھ میں جارجز کو سمجھا سکتا ہوں۔ سات مہینے کی ویرا اس سے کہیں زیادہ سمجھ سکتی ہے۔ جب سچ کہا جائے تو اس کا اعتراف کیا جانا چاہیے جیسے پھول کی خوبصورتی کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ سچ میں ویسی ہی خوشبو بھی ہوتی ہے۔ جب میں ویرا کے کمرے میں جاتا ہوں تو مسکرا دیتی ہے۔ اور اس کی ننھی منّی آنکھیں جانتی ہیں کہ میں کون ہوں۔ وہ مجھ سے پرے دیکھ سکتی ہے۔

ویرا کے ساتھ مجھے اتنی خوشی ہوتی ہے کہ جب آیا ہوتی بھی ہے تو میں اس سے کہہ دیتا ہوں "سینما جاؤ، موج کرو، بچّی کی دیکھ بھال میں کر لوں گا" اور کبھی کبھی جارجز اور کیتھرین کو بھی کوئی ڈرامہ دیکھنے یا سنگیت سننے بھیج دیتا ہوں۔ وہ دیکھتے ہیں میں واقعی خوش ہوں اور مجھے اپنی بیٹی کے ساتھ رہنے دیتے ہیں۔ اور جب میں اکیلا ہوتا ہوں تو ویرا کو گا کر سناتا ہوں۔ میں اسے شنکر اور بھرتری ہری کے اشلوک سناتا ہوں اور بتاتا ہوں کہ ایک روز وہ جان جائے گی کہ کوئی جگہ ہے جہاں جانا ہے۔ اب میں ان کا نام جان گیا ہوں جس کے پاس مجھے جانا ہے حالانکہ اس کا نام جانے بغیر بھی میں اس کو جانتا تھا۔ میں ٹراونکور جاؤں گا میں ویرا کو بتاتا ہوں "میں وہاں جاؤں گا اور تمہیں یاد کیا کروں گا۔"

یہ جارجز ہی تھا نیک دل جارجز جو مجھے پہلی بار ریلوے بلیاں دِلے لے گیا تھا وہ کہنے لگا "پیرس میں بھی کچھ ویدانتی ہیں کیا تم ان سے ملنا چاہو گے؟" میں بہت خوش تھا۔ میں ایک ایسے ہندوستانی سے ملا جو مجھے اور میرے خاندان کے لوگوں کو جانتا تھا۔ وہ کافی باتونی تھا۔ لیکن فرانسیسی مردوں اور فرانسیسی عورتوں نے۔ دو ایک

انگریزوں نے اور ایک امریکی لونے سب نے مجھے بہت متاثر کیا۔ میرے لندن چھوڑنے کے کچھ دن بعد اور جنوب کی طرف جانے سے بہت پہلے کا واقعہ ہے یہ۔ میں ایلیپس میں اس کی کتابیں لے گیا تھا اور انھیں بار بار پڑھتا تھا۔ مجھے انھوں نے باور کرا لیا لیکن مجھے مزید بہت کچھ جاننا تھا۔

اب میں سمجھتا ہوں کہ میں جانتا ہوں۔ لیکن اب مجھے جانا ہوگا۔ مجھے ٹراونکور بہر حال جانا ہی ہوگا۔ اب میرے پاس نہ بنارس ہے۔ نہ گنگا، نہ جمنا۔ ٹراونکور ہی میرا وطن ہے۔ ٹراونکور ہی میرا نام۔ پربھو۔ مجھے قبول کرو۔ مجھے یقین دلاؤ کہ وہیں رہوں جہاں مجھے ہونا چاہیے۔ میں جارجز کو یہ سب کیسے بتا سکتا ہوں؟ کیا وہ عام اور دائمی طور پر روشن اور واضح سچ کو سمجھ سکے گی؟ اصل میں سچ وہی ہے۔ گرو! نہیں وہ تعریف کی حد سے پرے ہے وہ ہے اور آپ نہیں ہیں۔

اب جب میں شنکر کے اشلوک گا رہا ہوں تو میری آنکھوں میں اُمڈتے ہوئے آنسو ٹپک کر ویرا کے اوپر گر رہے ہیں "ویرا کیا تم دیکھ رہی ہو؟" میں کہتا ہوں اور اس کے گالوں کو اپنے آنسوؤں سے بھگو دیتا ہوں۔ میں اسے کنڑا زبان کی وہ لوری سناتا ہوں جو میں اکثر سری دھر کو سنایا کرتا تھا۔

راج ہنس جھولا جھلا رہا ہے۔ میرے لال
دھیرے دھیرے کہتے ہوئے "میں وہ ہوں۔ میں وہ ہوں"
وہ بڑی سندرتا سے جھولا جھولا رہا ہے میرے لال
سب کام اور وقت کو بھول کر۔

جارجز اور کیتھرین آج شام اوبے راں دیکھنے گئے تھے۔

"کیسے شاندار منظر تھے" کیتھرین نے کہا "اور سامعین بھی بڑے باذوق تھے۔ لیکن جو بات آج سے سو برس پہلے سچ تھی اب سچ نہیں ہے۔ راجاؤں اور رانیوں کو اب مختلف ہونا ہوتا ہے اور مختلف انداز میں بات چیت کرنی ہوتی ہے۔ صدر جمہوریہ بھی وہاں موجود تھے اور یونان کا شہزادہ جارج بھی۔ لیکن سورگ، رام، اوبے راں کا سورگ۔؟"

"تمہیں صرف ایک گدھے کی ضرورت ہے؟" جارجز نے اُکتا کر کہا۔

"آؤ میں تمہیں اچھا سا گرم گرم چاکلیٹ پلاتی ہوں۔ چاکلیٹ یا کافی میرے بچو!" خوشی سے چہکتے ہوئے کیتھرین نے پوچھا۔

"بچے چونکہ بڑے سمجھدار ہیں" جارجز بولا "اس لیے وہ چاکلیٹ ہی پئیں گے۔"

"ویرا کیسی رہی؟" کیتھرین نے پوچھا "رام تمہیں ملازمت کے لیے ہندوستان جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، تم ویرا کی دیکھ بھال کرو۔ ویرا ابھی تم سے پیار کرتی ہے۔ تم جب یہاں ہوتے ہو تو کیسی چپ چاپ پُرسکون رہتی ہے۔ یہاں رہ کر تم اپنے دقیق فلسفیانہ نظریوں کے بارے میں بھی لکھ سکتے ہو۔ میں تمہیں تمہارا چھوٹا کمرہ واپس دے دوں گی اور جارجز چاکلیٹ پی پی کر تمہارے ذکی خیالات کا ترجمہ کرتا رہے گا۔"

"اگر تم میرے جانے سے پہلے ایک اور بچہ پیدا کر دو میں رُکنے کا وعدہ کرتا ہوں۔" میں نے مذاق میں کہا۔

"رام! تمہاری فطری سمجھ بوجھ شاید اس سے کہیں زیادہ ہے جس حد تک تم سمجھتے ہو یہ ہے۔" یہ جارجز کے الفاظ تھے۔

"واہ! واہ!" کیتھرین بولی "آخر ہو تو برہمن ہی"

"کیا تم جانتی ہو کیتھرین کہ برہمن کیا ہوتا ہے؟"

"نہیں۔ کیا ہوتا ہے؟" وہ کچن کے آدھے راستے سے لوٹ آئی۔

"برہمن وہ ہے جو 'برہم' کو جانتا ہے۔ یہ ایک تعریف ہے اس کی" میں نے جواب دیا "اس کے علاوہ ایک بدنام قسم کی تعریف بھی ہے۔ برہمن وہ ہوتا ہے جو اچھی دعوت پسند کرتا ہے۔"

"یقیناً تم دوسرے زمرے میں نہیں آتے۔ بیچارے رام۔ جب تم چلے جاؤ گے تو ہم کیا کریں گے؟ تم ہم میں سے ہی ایک ہو گئے ہو۔ ہم تو بھٹک کر رہ جائیں گے۔"

جارجز نے میری طرف دیکھا۔ وہ بہت اداس تھا۔

"ہم پچھلے جنم میں بھائی بھائی رہے ہوں گے" وہ کہنے لگا۔ جیسے ہر بات کی وضاحت کرنے کے لیے کیتھرین نے رسوئی میں سے ہی یہ بات سن لی ہو گی کیونکہ وہ واپس آکر بولی۔

"اور میں ضرور تمہاری بیوی رہی ہوں گی۔ اسی لیے ویرا تمہیں جانتی ہے۔ کہتے ہیں شادی بیاہ ایشور کے ہاتھ میں ہے۔ کہتے ہیں! کبھی کبھی یہ شادی بیاہ کے بندھن دھرتی پر بھی بنائے جاتے ہیں۔"

جارجز اور میں اس کے ساتھ ہی کچن میں چلے گئے۔ "کیتھرین میں بتاتا ہوں تمہیں شادی بیاہ کے بندھن بنارس میں بنائے جاتے ہیں" میں نے کہا۔

"جارجز چلو ہم بنارس چلتے ہیں" وہ کہنے لگی۔

"اور لاشوں، چتاؤں اور ان مگرمچھوں کا کیا ہوگا جنھیں کسی فرانسیسی ادیب نے خود اپنی چار آنکھوں سے دیکھا تھا" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ اس نے مگرمچھوں کے بارے میں کسی کتاب میں پڑھ رکھا تھا اور اسے یقین تھا کہ بنارس میں صرف لاشیں ہیں۔ بھک منگے ہیں اور بہت سی جلتی ہوئی چتائیں ہیں۔ اس نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ وہاں سے سات میل دور سارناتھ ہے۔ وہیں بدھ نے دھرم چکر کا آغاز کیا تھا۔

"نہیں، چلو ہم ٹراونکور چلتے ہیں" میں نے کہا۔

"اب یہ کون سی نئی جگہ ہے؟"

"میں تم سے اور اپنے آپ سے اتنے سارے برسوں سے جھوٹ بولتا رہا ہوں۔ میرا اصلی گھر ٹراونکور میں ہے۔ وہیں بنارس ہے اور وہاں نہ تو مگرمچھ ہیں اور نہ ہی چتائیں۔"

"یہ شری لنکا کے سامنے ہے" جارجز نے جغرافیائی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ میری طرح وہ بھی پیدائشی پروفیسر تھا۔

"میں تم دونوں کے لیے ٹراونکور میں چاکلیٹ بناؤں گی۔ ٹراونکور۔ ٹراونکور۔ اس نام میں تو جادو ہے!" کیتھرین نے کہا۔

اور ہم پھر مخملیں کرسیوں پر آکر بیٹھ گئے۔ چاکلیٹ کا خوب مزا آیا۔

راجہ راؤ کا جنم ۱۹۰۹ء میں حسن (کرناٹک) میں ہوا۔ انھوں نے ۱۹۲۹ء میں مدراس یونیورسٹی سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ بعد ازاں انھوں نے مزید تعلیم پیرس کی سوربون یونیورسٹی میں حاصل کی۔ ۱۹۶۵ء سے وہ امریکہ کی ٹیکساس یونیورسٹی سے وابستہ رہے ہیں۔

راجہ راؤ آٹھ کتابوں کے مصنف ہیں جن میں 'کانتا پورا' (۱۹۳۸ء)، 'دی کاؤ آف دبیری کیڈز' اور دوسری کہانیاں (۱۹۴۷ء)، 'د سرپینٹ اینڈ د روپ' (۱۹۶۰ء)، 'دکیٹ اینڈ شکسپیر: اے ٹیل آف انڈیا' (۱۹۶۵ء)، اور 'د پولیس مین اینڈ د روز' (۱۹۷۷ء) شامل ہیں۔ 'د سرپینٹ اینڈ د روپ' کو (۱۹۶۳ء) میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ۱۹۶۹ء میں حکومتِ ہند کی طرف سے پدم بھوشن کا خطاب عطا کیا گیا۔ آپ کو ساہتیہ اکادمی کی فیلوشپ کا افتخار حاصل ہے۔

راجہ راؤ اگرچہ زود گو قسم کے مصنف نہیں ہیں لیکن اپنے پہلے ناول 'کانتا پورا' کی اشاعت سے جو ادبی مرتبہ انھیں حاصل ہوا تھا اس کا وقار قائم و برقرار ہے اور ان کا شمار اب عالمگیر شہرت اور اہمیت کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ان کے کچھ ناولوں کا ترجمہ فرانسیسی اور ہندوستانی زبانوں میں بھی ہو چکا ہے۔ ان کی تحریریں مغربی اور ہندوستانی عناصر کا کامیاب اور فکر انگیز امتزاج پیش کرتی ہیں اور ان کی دانشورانہ قوت اور حسّاس دلی کی آئینہ دار ہیں۔

ممتاز شاعر، افسانہ نگار اور نقّاد بلراج کومل کا شمار اور ہندوستان پاکستان کے اہم ترین اردو ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ان کا جنم ۲۵ ستمبر ۱۹۲۸ء کو سیالکوٹ (پاکستان) میں ہوا۔ اب تک ان کی شعر و نثر پر مشتمل پندرہ تصانیف منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ ۱۹۸۵ء میں انھوں نے اپنے مجموعۂ کلام: 'پرندوں بھرا آسمان' کے لیے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، حاصل کیا۔